دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۲۹ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۸۲ء تا جون ۱۹۸۲ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۹

ماہ جنوری ۱۹۸۲ء تا جون ۱۹۸۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۲ء تا جون سنہ ۱۹۸۲ء

جلد ۱۲۹

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۹ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۲ء عدد ۲

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں اس وقت دار المصنفین کے بین الاقوامی سیمنار کی تیاریاں جاری ہیں جس کا عنوان "اسلام اور مستشرقین" ہے، پاکستان اور عرب ممالک سے برابر خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ وہاں کے فضلاء اس میں شرکت کے لیے پہونچ رہے ہیں۔

دار المصنفین اپنے محدود ذرائع کے باوجود اپنے مہمانوں کے خیر مقدم اور خاطر تواضع کے لیے پوری تیاری کر رہا ہے، یہاں اچھے ہوٹل نہیں ہیں، اس لیے ان کے قیام کا انتظام اچھے رہائشی خیموں میں کیا گیا ہے، جن میں ہر قسم کی سہولت اور راحت کا سامان ہے، مولانا ابو الحسن علی ندوی صدر مجلس عاملہ دار المصنفین اس وقت حجاز میں ہیں اور وہ ذاتی طور پر وہاں کے فضلاء کو اس سیمنار میں شرکت کے لیے دعوت دے رہے ہیں، جو ظاہر ہے کہ اس سیمنار سے ان کے گہرے لگاؤ کا ثبوت ہے، وہاں سے ان کا ٹیلکس آیا ہے کہ اس میں اہم فضلاء کی شرکت ہوگی اور ان شاء اللہ یہ بین الاقوامی اجتماع کامیاب ہوگا، آمین۔ ہندوستان کے اسکالرز بھی کافی تعداد میں شریک ہو رہے ہیں۔

یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر اجتماعی طور پر شاید پہلی بار مذاکرہ ہوگا، امید ہے کہ اس کے ہر پہلو پر مفید اور سیر حاصل مباحث ہوں گے، اس میں شک نہیں کہ بعض مستشرقین نے مفید خدمات

انجام دی ہیں، جو کسی حال میں نظرانداز نہیں کی جاسکتی ہیں، مگران میں زیادہ تر ایسے اہل قلم ہیں، جنھوں نے اپنے ماہرانہ انداز بیان اور مخصوص طرز تحقیقات سے ہماری مذہبی، شرعی، فقہی، تاریخی اور علمی وراثت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کی ایک مثال ڈبلو منٹگمری واٹ ہیں، جنھوں نے "محمدؐ مکہ میں" "محمد مدینہ میں" اور "محمد ایک مدبر کی حیثیت سے" وغیرہ لکھ کر علمی حلقے میں ایک اچھے مستشرق کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کرلی ہے، لیکن ان کی کتابوں کے ماخذوں پر نظر پڑی تو ان کی تمام تحقیقات عیسائی مصنفوں کی کتابوں پر مبنی ہیں، قرآن مجید کے حوالے بھی عیسائیوں ہی کے ترجموں سے دیے گئے ہیں، واقدی ان کا محبوب مصنف ہے، لیکن اس کے لیے ولہاوسن کا ترجمہ سامنے رکھا گیا ہے، ان ماخذوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کو عربی زبان سے اتنی واقفیت نہیں کہ براہ راست عربی کتابوں کو اپنا ماخذ بناسکیں، اس طرح ان کے ماخذ ثانوی درجے کے ہیں۔

وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک مورخ ہیں اور ان کا تجزیہ سراسر مورخانہ ہے، لیکن ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کی گھنی جھاڑیوں میں کبھی تو غیر جانب دار مورخ، کبھی ہمدرد مبصر، کبھی بے درد ناقد، کبھی خالص عیسائی پادری کبھی اپنے انداز بیان میں اپنے ناظرین کو گم کردینے والے مصنف، کبھی چھاپہ مار اہل قلم بن جاتے ہیں، وہ کبھی اسلام کے بڑے ہمدرد ضرور بن جاتے ہیں لیکن اس ہمدردانہ اسلوب میں کچھ نہ کچھ ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ جس سے کبھی تو یقینیات میں شک پیدا کردیتے ہیں، کبھی اپنے ناظرین کے ذہن پر بجلی کی سرعت سے حملہ کرکے اس کو مغلوب بلکہ مفلوج کرکے اپنے خیالات کو منوانا چاہتے ہیں۔

ان کی تحقیقات ان کے موثر لیکن گمراہ کن طرز تحریر میں اس طرح دب کر رہ گئی ہیں کہ ان کے ناظرین ان کی قلمی سحر طرازیوں کے طلسم کی نیرنگیوں سے ایسے مسحور ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحقیقات پر نظر نہیں جاتی۔

وہ بظاہر بڑی فراخ دلی سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ تاریخ کی بڑی شخصیتوں میں مغرب میں کسی اور کا اتنا ہلکا یعنی برا جائزہ نہیں لیا گیا جتنا کہ محمدؐ کا لیا گیا ہے، اور جو بھی قابل اعتراض بات آپ کے متعلق کہی گئی وہ ایک حقیقت کی حیثیت سے مان لی گئی ہے، وہ اپنی تحریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی عظمت پر زور دیتے ہیں اور یوروپین مصنفین آپ پر جو الزامات عائد کرتے ہیں، ان کی تردید بھی جا بجا کرتے ہیں، اس سے اپنی غیر جانبداری کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جب وہ آپ کی ازواج مطہراتؓ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تعداد تیئیس[۲۳] بتاتے ہیں، اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس میں وہ بھی شامل ہیں جن سے آپ شادی کرنا چاہتے تھے، لیکن نہ ہو سکی' وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مکہ کے لوگوں کو آپ نے مشتعل کیا، تب ہی وہ آپ سے جنگ پر آمادہ ہو گئے اور آپ سے جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں جہاد کا جذبہ نہ تھا، بلکہ مکہ کے تجارتی قافلہ کی محض ناکہ بندی تھی، اور یہ ساری معرکہ آرائیاں تجارت میں برتری حاصل کرنے کے لیے ہوئیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ اپنے اس دکھ کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ محمدؐ کو ایک آئیڈیل انسان ثابت کرنے کے لیے عیسائی یورپ میں کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے، اور وہ بظاہر آپ کو ایک آئیڈیل

انسان سمجھتے ہیں، لیکن اس مداحی اور غیر جانبداری کے پردہ میں قرآن مجید سے
اپنے ناظرین کو ہر طرح بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی وحی کے متعلق یہ لکھ کر شک پیدا کر دیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ خواب تھا،
یا محض ایک رویت یا سچی رویت تھی، یا فصاحت کا ایک ذہنی اور بیرونی انداز بیان،
یا آپ نے اس کو کان سے سنا یا خیال کیا کہ وہ سن رہے ہیں، اور جو کچھ وحی کے
ذریعہ آیا، وہ الفاظ کی شکل میں آیا یا الفاظ کے بغیر آیا، یا جو الفاظ ہیں وہ بعد کے
ہیں یا اصلی ہیں، یا یہ ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے، یا ان کے ذہن کا نتیجہ ہے،
وہ یہ لکھ کر بھی شک پیدا کر دیتے ہیں کہ لفظ وحی کا استعمال بعد میں کیا گیا، ایک
جگہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اسلام کے مخالفین کہتے ہیں کہ محمدؐ کو مرگی آتی تھی، اس لیے ان کے
مذہبی الہامات مستند نہیں، وہ وحی و الہام کے متعلق یہ بحث بھی چھیڑ کر دلوں میں
یہ شک پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ الہامات ہیں یا محض تکوینی خیالات ہیں، پھر
ناظرین کو اپنے سے بدظن نہ ہونے کی خاطر یہ لکھتے ہیں کہ کلام پاک میں جو خیالات
پیش کیے گئے ہیں وہ بڑی حد تک سچے اور بالکل صحیح ہیں، لیکن اپنی تصنیفی مہارت سے
کام لے کر فوراً یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے سارے خیالات سچے اور
بالکل صحیح ہوں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بظاہر مداح ہونے کے باوجود
یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ نے جتنے خیالات کی ترویج کی وہ سب کے سب سچے اور
صحیح نہیں ہیں۔

منٹگمری واٹ ہی کی طرح اور مستشرقین اپنے مجادلانہ استدلالوں، گمراہ کن

یا زمنوں ، پھر تحریفات، تلبیسات اور ازکار قیاسات اور احتمالات سے
ات کا سلسلہ پیدا کر کے اسلام کے خلاف زہر چکانی کر رہے ہیں، وہ اسلام اور
اسلام کی کچھ خوبیاں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان کی آڑ میں ان کے متعلق وہ
کچھ سخت سی بات اور برائی بیان کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس پُرفریب انداز بیان
ہوشیار رہنے اور ان کی اصل نیت کو آشکارا کرنے کی ضرورت ہے۔

ان سطروں کے لکھتے وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے عزیز بھانجے جناب
نی حسنی کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر ملی، ان کو مولانا علی میاں اپنے فرزند
برابر سمجھتے رہے، وہ اپنی متانت، سنجیدگی اور خاموشی کی وجہ سے اپنے حلقہ میں بڑی قدر
نظر سے دیکھے جاتے تھے، بڑے اچھے اہل قلم بھی تھے، ان کی کتابوں میں ایمانی حرارت
یت جلوہ گر رہتی تھی، ان کی وفات سے دارالمصنفین بھی سوگوار ہے، اس لیے بھی کہ یہاں
سمینار ہو رہا ہے اس کے روح رواں مولانا علی میاں اور ان کے دست و بازو مولانا
مد رابع ندوی تھے، جو مرحوم کے منجھلے بھائی تھے، ان کی سوگواری سے ہمارے
مینار کی فضا بھی غمناک رہے گی، دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نعیم
ور ان کے سوگوار ماموں، بھائیوں اور بچوں کو صبر جمیل عطا ہو۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۶)

تابعین ۱۹۳۶ء:۔ یہ خاکسار دارالمصنفین جنوری ۱۹۳۵ء میں پہونچا تھا، اس وقت تک صحابۂ کرامؓ کے سلسلہ کی تدوین ختم ہو چکی تھی، ۱۹۳۴ء میں شاہ صاحبؒ کی "عرب کی موجودہ حکومتیں" چھپ کر شایع ہو چکی تھی، ۱۹۳۵ء کے ستمبر یا اکتوبر کے مہینے میں ایک دن شام کی چائے پر سید صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ سے کہا کہ صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعین پر بھی کم از کم ایک جلد ہونی چاہیے اور پھر انہی کو یہ جلد لکھنے کو کہا، دسمبر ۱۹۳۵ء میں سید صاحبؒ سخت علیل ہو گئے، جب ان کو کامل صحت ہوئی تو ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ایک دن شاہ صاحبؒ سے شام کی چائے پر پوچھا کہ تابعین پر آپ نے کچھ لکھنا شروع کیا یا نہیں؟ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب شاہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ وہ تو ختم بھی ہو گئی، خود سید صاحبؒ کو بھی تعجب ہوا، یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں چھپی تو اس کی ضخامت پانسو چھپن صفحے تھی، ان کے قلم کی اس برق روشی پر رفقائے دارالمصنفین بھی متحیر اور خوش تھے، اس کے شروع میں جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر نشین دارالمصنفین کا مقدمہ ہے، جس میں وہ رقمطراز ہیں:

> "دارالمصنفین کو جزائے خیر ہو کہ اس سے پہلے سیرۃ مبارک اور صحابۂ کرامؓ کے حالات میں متعدد جلدیں شایع کر چکا ہے، اب نوبت حالات تابعین کی ہے، اسی سلسلہ میں رفیق دارالمصنفین مولوی معین الدین احمد صاحب ندوی نے

یہ جلد تالیف کرکے مسلمانوں پر خصوصاً اور سارے انسانوں پر عموماً لطف و کرم فرمایا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔

اس کتاب کو پڑھ کر اور مختلف مقامات کو بار بار دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ حق محنت و سعی ادا کیا گیا ہے، مستند اور معتمد ماخذوں سے حالات لے کر صاف و دلنشین پیرایہ میں قلمبند کیے ہیں، ۹۶ اکابر تابعین کے حالات ہیں، ظاہر ہے کہ کل کے مقابلہ میں یہ ایک جزء ہے، تاہم جزء اعظم ہے، میرا خیال ہے کہ ایک جلد اور شایع ہوگی جس میں بقیہ اکابر کے حالات ہوں گے۔"

اس کتاب کی ایک فروگذاشت کی طرف بھی نواب صاحب مرحوم نے یہ لکھ کر توجہ دلائی کہ اکابر تابعین رضؓ کے ناموں کے ساتھ مقررہ اسلوب کے مطابق امام وغیرہ الفاظ کا عدم استعمال اسلوب ادب کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حاشیہ میں یہ اعتذار لکھا کہ حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے لفظ امام وغیرہ اگرچہ میں نے کتاب میں جا بجا لکھا ہے، مگر اس کا ترک بھی ہوا ہے، اس عدم التزام کے سبب میں ان بزرگوں کی روحوں سے شرمندہ ہوں، ان شاء اللہ طبع ثانی میں اس کا پورا لحاظ رہے گا۔

شاہ صاحبؒ نے بھی کتاب کے شروع میں ایک پُر مغز دیباچہ لکھا ہے جس سے تابعین کرامؒ کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ ان کے خیال میں ایمانی قوت، دینی حمیت، مذہبی و اخلاقی روح اور علمی و عملی خدمت کے اعتبار سے اسلام کے تین زریں دور گذرے ہیں، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین، ان ہی تین زمانوں میں مسلمان دینی اور دنیوی سعادت و فلاح کی معراج کمال کو پہونچے، اس کے بعد جو ترقیاں ہوئیں، وہ صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں، تابعین کرامؒ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ دین کے اصلی سرچشمے تھے تو تبع تابعین میں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے۔ تابعین درمیانی کڑی ہیں، انھوں نے صحابہ کرام کی علمی و اخلاقی برکتوں کو زندہ رکھ کر سارے عالم میں پھیلایا، پھر تبع تابعین میں جتنے بڑے

گذرے، سب ان ہی کے حلقۂ درس کے فیض یافتہ تھے، شاہ صاحبؒ تابعینِ کرام کے سوانح حالات لکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچے تھے، اس کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں:

"یہ مقدس جماعت علم و عمل میں صحابۂ رسولؐ کا عکس اور پرتو تھی، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کی علمی و اخلاقی وراثت کو مسلمانوں میں پھیلایا، عہد رسالت کے بعد اور شخصی حکومت کے اثر سے اسلامی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان کی اصلاح کی، اور اگر اصلاح نہ کر سکی تو ان خرابیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مصفا سرچشمہ کو باہر کے گرد و غبار اور کدورت سے اپنی کوششوں سے محفوظ رکھا، مذہبی علوم کی حفاظت و اشاعت کے لیے نئے علوم کی بنیاد رکھی، اسلامی سلطنت کے حدود کو وسیع کیا، اسلام کو پھیلایا، غرض ان تمام برکتوں کو جن کا عہد صحابہ میں آغاز ہوا تھا، تکمیل تک پہونچایا، اور جو پوری ہو چکی تھیں، ان کی حفاظت کی۔"

اس کتاب میں تمام تابعین کے حالات نہ آسکے، اس لیے صرف ۹۶ چھیانوے اکابر تابعینؒ کا ذکر ہے، اس کی تیاری میں حسب ذیل ماخذوں سے مدد لی گئی ہے:

تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، طبقات ابن سعد، طبقات کبریٰ شعرانی، تہذیب الاسماء، تاریخ ابن خلکان، تذکرۂ ابراہیم نخعی، شذرات الذہب، استیعاب، اسدالغابۃ، ابن اثیر، اخبار الطوال، تاریخ ابن عساکر، تاریخ خطیب، مسلم کتاب الفضائل، مستدرک حاکم، اصابہ، انتباہ فی سلسلۃ اولیاء اللہ شاہ ولی اللہؒ، تذکرۃ الاولیاء فریدالدین، صفوۃ الصفوۃ، الطرق الحکمیہ ابن قیم جوزی، تہذیب الاسماء، کشف المحجوب، کتاب اللمع، عوارف المعارف، کتاب العمدۃ ابن رشیق، کتاب الولاۃ کندی، حسن المحاضرۃ سیوطی، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی، تاریخ یعقوبی، خلاصۃ الوفاء، فتح الباری، تاریخ الخلفاء، کتاب الخراج، زرقانی، شرح موطا، نصب الرایہ، فتوح البلدان، العیون والحدائق، بخاری کتاب الایمان، جامع بیان العلم، خطط مقریزی، بخاری کتاب العلم،

کتاب البیان والتبیین، اعلام الموقعین، مروج الذہب مسعودی، دول الاسلام وغیرہ۔

ان بزرگانِ دین کے حالات حروفِ تہجی کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں، آخر میں کچھ کے سوانح کنیت کے مطابق ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں زیادہ تر جنگ وجدل کے واقعات لکھے جاتے ہیں، لیکن ان تابعین کرام نے کلام پاک، حدیث، تفسیر اور فقہ کی خدمات کن کن طریقوں سے کی، پھر انھوں نے زہد، عبادت، ورع، خشیتِ الٰہی، نیاتِ صحت عقیدہ، عبادت کے اخفاء، بارگاہ ایزدی میں الحاح، توبہ، استغفار، تواضع، خاکساری، فضل وکمال، حق گوئی، طہارت، کسب حلال، استغناء، بے نیازی، فیاضی، شہرت سے اجتناب، ماں کی خدمت، مبتدعانہ عقائد سے نفرت، تحدیث نعمت، فروتنی، اخلاص فی العمل، فریب نفس، توبہ کی سپر، موت کے ذوق، شب بیداری، جہاد لوجہ اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، پندار تقویٰ سے پرہیز، شدت احتیاط، اختلاف رائے کے ساتھ اتحاد عمل، وقار، ہیبت، خونِ مسلم کی حرمت، ظلم وزیادتی کے کوڑوں کے مقابلہ میں اعلان حق، ایثار، ہمدردی، غربت پسندی، خانۂ خدا کا احترام، فرمانِ رسولؐ کا پاس، اہل دنیا سے بے تعلقی، احسان میں اخفاء، صبر، استقامت، علم وللہیت، قوت ایمانی، اکل حلال، حلم، بردباری، عفو ودرگذر، نرمی، ملاطفت، محبوبیت وجلالت، نفاست، آیاتِ قرآنی سے تاثر، دنیا سے بے تعلقی وغیرہ کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا، اس کا مطالعہ اس کتاب میں کرکے درس لیا جا سکتا ہے، یہ کتاب تو اس لائق ہے کہ ہر گھر میں موجود رہے اور ان بزرگوں نے اپنی زندگی میں اخلاق کے مذکورۂ بالا محاسن کو جس طرح اختیار کرکے دکھایا، اگر مسلمان اس اسوہ کو برابر سامنے رکھیں اور ان پر عمل کریں تو وہ تمام انسانوں کے لیے رحمت بن سکتے ہیں، اس کتاب کے مقدمہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنی جو یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مولوی معین الدین ندوی صاحب نے یہ جلد تالیف کرکے مسلمانوں پر خصوصاً اور سارے انسانوں پر عموماً لطف وکرم فرمایا ہے، تو بالکل صحیح لکھا ہے۔

اس کتاب میں جتنے تابعین کا ذکر ہے ان میں سے یوں تو ہر ایک کے حالات سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے،

مگر حضرت حسن بصریؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، خیر التابعین حضرت اویس بن عامر قرنیؒ کے حالات شاہ صاحبؒ کے انداز بیان کی وجہ سے بہت اہم ہو گئے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ کے والدین غلام تھے، مگر وہ ایسے جامعِ کمالات تھے کہ وہ بلند مرتبت عالم بھی ہوئے، رفیع المنزلت فقیہ بھی، وسیع العلم عابد و زاہد بھی، تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے مالا مال تھے، اس عہد کے تمام علماء اور اربابِ کمال کا ان کی جلالتِ شان پر اتفاق تھا، عراق میں وہ سب سے افضل سمجھے جاتے تھے، جہاں وہ جاتے خلق اللہ کا مرجع بن جاتے، مکہ تک میں جو مدینہ کے بعد علم کا دوسرا مرکز تھا، لوگوں کا ہجوم لگ جاتا تھا، اہل مکہ آپ کو تخت پر بٹھا کر حدیثیں سنتے تھے، اور اکابر علم کی زبان پر یہ کلمہ ہوتا، کہ ہم نے اس شخص کا مثل نہیں دیکھا، وہ عرفان و حقیقت کے کنگرہ بھی تھے، اس لیے ان کی ذات تصوف کا منبع اور علم باطن کا سرچشمہ بن گئی، تصوف کے اکثر بڑے بڑے سلاسل ان ہی کے واسطے سے حضرت علیؓ تک منتہی ہوتے ہیں، اور تمام صوفیائے کرام ان ہی کی زندگی سے زہد و ورع، فضائل اخلاق، سوز و گداز، خشیت الٰہی، اخلاص فی العمل، فریب نفس کے خوف اور اظہار حق کا درس لیتے ہیں، ان کے ان اوصاف کو شاہ صاحبؒ نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے انداز بیان کا ایک نمونہ یہ ہے:

"خشیتِ الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ ہر آن لرزاں رہتے تھے، یونس بن عبیدؒ کا بیان ہے کہ جب حسنؒ آتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی عزیز قریب کو دفن کیے ہوئے آ رہے ہیں، جب بیٹھتے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے قیدی ہیں جس کی گردن مارے جانے کا حکم دیا جا چکا ہے، اور جب دوزخ کا ذکر کرتے تھے تو ویسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ صرف ان ہی کے لیے بنائی گئی ہے، اس پُر سوز، بلکہ پُر کیف فطرت کا نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی سرتاپا زہد و ورع میں ڈوبی ہوئی تھی، ان کی ذات عبادت و ریاضت اور زہد و ورع کا مجموعہ تھی، حجاج الاسود کا بیان ہے کہ ایک شخص آرزو کیا کرتا تھا کہ کاش مجھے حسنؒ کا زہد، ابن سیرینؒ کا ورع، عامر بن عبد قیسؒ کی عبادت اور سعید بن مسیبؒ کا تفقہ میسر آئے، لوگوں نے دیکھا تو

یہ تمام اوصاف حسنؒ کی تنہا ذات میں جمع تھے ان کی مجلس میں آخرت کے علاوہ کسی شے کا تذکرہ ہی نہ ہوتا تھا، اشعث کا بیان ہے کہ ہم جب حسنؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہم سے نہ دنیاوی خبر پوچھی جاتی اور نہ کوئی خبر دی جاتی، بس صرف آخرت کا ذکر رہتا تھا۔" (ص ۵۸)

حضرت اویس قرنیؒ کے صحیفۂ قلب سے بھی علوم باطن سیکھے گئے ہیں، کیونکہ تابعین میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے بعد ہی ان کی ذات گرامی بھی تصوف کا مرجع ہے، صوفیائے کرام کے بہت سے سلاسل ان کی ذات تک بھی منتہی ہوتے ہیں، انھوں نے راہِ سلوک میں بڑے بڑے مجاہدات کیے، ساری ساری رات پلک سے پلک نہ ملتی تھی، ربیع بن خیثم کا بیان ہے کہ ایک دن وہ ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ وہ فجر کی نماز میں مشغول ہیں، ظہر کی نماز تک اسی طرح مشغول رہے، پھر ظہر سے عصر تک اور عصر سے مغرب تک یہی حال رہا، پھر مغرب سے عشاء تک مشغول رہے، عشاء سے صبح تک یہی کیفیت رہی دوسرے دن نماز فجر کے بعد کچھ نیند کا غلبہ ہوا، فوراً متنبہ ہو گئے، اور دعا کی کہ خدایا! میں سونے والی آنکھ اور نہ بھرنے والے پیٹ سے پناہ مانگتا ہوں، شاہ صاحبؒ نے ان کی زندگی کے پُرکیف واقعات بڑی خوش سلیقگی سے دکھائے ہیں، ان کے متعلق جو یہ خیال ہو کہ ان کا وجود ہی نہ تھا، اس کی تردید شاہ صاحبؒ نے پورے دلائل کے ساتھ کی ہے، ان کے کردار کی تصویر شاہ صاحبؒ نے اپنے قلم سے یہ پیش کی ہے:

"زہد کا یہ عالم تھا کہ گھر بار، لباس اور کھانے پینے وغیرہ جملہ علائق دنیاوی سے ہمیشہ آزاد رہے، ایک نہایت بوسیدہ اور شکستہ مکان میں رہتے تھے، کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ کبھی اونٹ چرا کر، اور کبھی کھجور کی گٹھلیاں بیچ کر قوت لایموت حاصل کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے سلوک کرنا چاہا مگر قبول نہ کیا لباس میں ایک صوف کی چادر اور ایک صوف کا ازار ہوتا تھا اور اکثر وہ بھی میسر نہ آتا تھا، لوگ ننگا بدن دیکھ کر چادر دے دیتے، پیٹ کے کھانے اور بدن کے کپڑے کے علاوہ کوئی چیز پاس نہ رکھتے تھے،

فرمایا کرتے تھے، خدایا! میں تجھ سے بھوکے جگر اور ننگے بدن کی معذرت چاہتا ہوں، لباس جو میرے جسم پر اور غذا جو میرے پیٹ میں ہے اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" (ص ۴۲)

ان چند سطروں میں کیسی موثر مرقع آرائی ہے، جس میں تحریر کے اسلوب کو بھی بڑا دخل ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تابعین میں تھے، اگرچہ وہ بنوامیہ کے سلسلہ کے خلیفہ بھی ہوئے تو انھوں نے راشدہ کی یاد تازہ کر دی، ان کی سیرت کی مصوری بہت سے اہل قلم نے کی ہے، ذرا شاہ صاحبؒ سے بھی اس سیرت نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"سلاطین کی بزم طرب میں موت اور قیامت کا ذکر اور خوف کا گذر بھی نہیں ہوتا، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس بزم عزا ہوتی تھی، رات کو علماء جمع ہوکر موت اور قیامت کا ذکر کرکے اس طرح روتے تھے جیسے ان کے سامنے جنازہ رکھا ہے، رات رات بھر جاگ کر موت پر غور و فکر کیا کرتے تھے، اور قبر کی ہولناکی کا ذکر کرکے بیہوش ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ اپنے ایک ہم جلیس سے فرمایا: میں رات بھر غور و فکر میں جاگتا رہا، اس نے پوچھا، کس چیز کے متعلق؟ فرمایا: قبر اور اہل قبر کے متعلق، اگر تم مردے کو تین دن کے بعد قبر میں دیکھو تو انس و محبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے خوف زدہ ہوگے، تم ایسا گھر دیکھو گے جس میں خوش وضعی، خوش لباسی اور خوشبو کے بعد کیڑے رینگ رہے ہوں گے، پیپ بہ رہی ہوگی اور اس میں کیڑے تیر رہے ہوں گے، بدبو پھیلی ہوگی، کفن بوسیدہ ہو چکا ہوگا، یہ کہہ کر ہچکی بندھ گئی، پھر بیہوش ہوکر گر پڑے، ان کی بیوی پانی چھڑک کر ہوش میں لائیں۔ (ص ۳۵۲/۱۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن شاہ صاحبؒ نے اپنی اس کتاب میں رموز جہانبانی کے سلسلہ میں غصب کردہ مال و جائداد کی واپسی، ظالم عہدہ داروں کے تدارک کے انسداد، بیت المال کی آمدنی کی اصلاح، اس کی حفاظت کا انتظام، ذمیوں کے حقوق، رعایا

احساس، خشیت الٰہی، موت اور قیامت کے خوف وغیرہ کے سلسلہ میں جو کچھ مختصر طریقہ پر لکھا ہے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور مورخ لکھ سکے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر نے شاہ صاحبؒ کی تحریر کی خوبی کی تعریف جو یہ لکھ کر کی ہے کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف دو دلنشین پیرایے میں قلمبند کیے گئے ہیں، وہ شروع سے آخر تک قائم ہے، جو ان کی قوت تحریر کی بڑی دلیل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ان تابعین کرام کے اقوال بھی بڑی محنت سے جمع کر دیے ہیں، جن کو پڑھ کر ایمانی قوت، دینی حمیت اور اخلاقی روح کا بیدار ہوجانا ناگزیر ہے۔ ان اقوال میں سے کچھ ہم بیان کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

حضرت اویس قرنیؒ | لوگوں کے لیے غائبانہ دعا کرنا ان کی ملاقات سے بہتر ہے، کیونکہ اس میں کبھی نمائش اور ریا پیدا ہوجاتی ہے۔

جعفر بن محمد الملقب بہ صادقؒ | جو شخص اپنی قسمت کے حصہ پر قناعت کرتا ہے، وہ مستغنی رہتا ہے، اور جو دوسرے کے مال کی طرف نظر اٹھاتا ہے، وہ فقیر مرتا ہے۔

تم سے کوئی گناہ سرزد ہو تو اس کی مغفرت چاہو، انسان کی تخلیق سے پہلے سے اس کی گردن میں خطاؤں کا طوق پڑا ہے۔

گناہوں پر اصرار ہلاکت ہے۔

خدا نے دنیا کی طرف وحی کی ہے کہ جو شخص میری خدمت کرتا ہے تو تو اس کی خدمت کر، اور جو تیری خدمت کرتا ہے اسے تھکا دے۔

جب تمہارے بھائی کی جانب سے تمہارے لیے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لیے ایک سے ستر تک تاویلیں تلاش کرو، اور اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کا سبب اور اس کی کوئی

تاویل ضرور ہوگی، جس کا تم کو علم نہیں، اگر تم کسی مسلمان سے کوئی کلمہ سنو تو اس کو بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو، جب وہ محمول نہ ہو سکے، تو اپنے نفس کو ملامت کرو۔

جب دنیا کسی کے موافق ہوتی ہے تو دوسروں کی بھلائیاں بھی اسے دے دیتی ہے اور جب منھ پھیر لیتی ہے تو خود اس کی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ | متواضع ہونے کی شرط یہ ہے کہ گھر سے باہر کسی سے بھی ملے تو اس کو اپنے سے افضل اور بہتر سمجھے۔

ایک شخص کی عداوت کے بدلہ میں ہزار آدمیوں کی دوستی بھی نہ خریدو۔

انسان کا علانیہ اپنے نفس کی مذمت کرنا درحقیقت اس کی مدح ہے۔

فقیہ وہ ہے جو دنیا سے کنارہ کش ہو، ذہن میں بصیرت رکھتا ہو، خدائے عزوجل کی عبادت پر مداومت کرتا ہو۔

دنیا درحقیقت تمھاری سواری ہے، اگر تم اس پر سوار ہوگئے تو وہ تم کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے گی، اگر وہ تم پر سوار ہوگئی تو تم کو ہلاک کر ڈالے گی۔

میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس نے دنیا چاہی ہو اور اسے آخرت ملی ہو، اس کے برخلاف جو آخرت چاہتا ہے اسے دنیا بھی مل جاتی ہے۔

سعید بن جبیرؒ | وہ امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ علمائے سوء کو سمجھتے تھے، ہلال بن خباب نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ لوگوں کی ہلاکت کہاں سے ہوگی، فرمایا: ان کے علماء کے ہاتھوں الخ الخ الخ

تاریخ اسلام کی تدوین | جب سید صاحب کی نگرانی میں صحابہ کرام کے سلسلہ کی ترتیب ہو رہی تھی، تو اسلامی ممالک کی تاریخ کی تدوین بھی جاری تھی، مولوی ریاست علی ندوی صاحب تاریخ صقلیہ پورے انہماک اور محنت سے لکھ رہے تھے، جناب محمد عزیر صاحب دولت عثمانیہ لکھنے میں مشغول تھے عہد رسالت و خلافت را

بنوامیہ اور بنو عباس کی تاریخ معرضِ التوا میں تھی، شاہ صاحبؒ سیر الصحابہ جلد ہفتم اور عرب کی موجودہ حکومتیں لکھ چکے تو سید صاحبؒ نے انہی کو ان تمام ادوار کی تاریخ لکھنے کے لیے منتخب کیا، جو بہت ہی موزوں ثابت ہوا وہ فرنگی محل اور ندوہ کی تعلیم کے زمانہ میں اسلام، اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ کی روح سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، جب وہ فرنگی محل میں تعلیم پا رہے تھے، تو ہندوستان میں خلافت کی تحریک کا آغاز ہوا، جس کے حامیوں اور جان نثاروں میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی بھی تھے، شاہ صاحبؒ نے ان کی نگرانی میں تربیت پائی تھی، اس لیے خلافت کی پوری تاریخ کا غلغلہ ان کے کانوں میں پڑا، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء آئے تو سید صاحب کی خلافت اور ہندوستان' اور 'خلافت' ان کی نظر سے گذری، جن کے مطالعہ سے ان کے دل پر خلافت کی اہمیت کا گہرا نقش پڑا، دار المصنفین آئے تو سیر المہاجرین اور سیر الصحابہؓ کی جلدیں لکھنے میں حدیث، رجال، طبقات، تاریخ اور سیر وغیرہ کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا، سیر الصحابہؓ جلد ششم لکھنے میں خلافتِ راشدہ کے عہد یا اس کے بعد کی تاریخ میں جو نشیب و فراز آیا، اس سے پورے طور پر واقف ہوئے، اسی زمانہ میں سیرۃ النبیؐ کی مختلف جلدوں کی تدوین ہو رہی تھی، ان کو اس کے موضوعات سے پوری آگاہی ہوئی، پھر سید صاحبؒ کی صحبت کی علمی گفتگوؤں سے ان کے ذہن کی پوری جلا ہوتی گئی، ۱۹۳۴ء میں عرب کی موجودہ حکومتیں لکھی تو جزیرۃ العرب کے ساتھ عسیر، بحرین، نجد، کویت، شام اور عراق کے جغرافیائی حدود سے اچھی طرح واقف ہو گئے، پھر ان علاقوں کی جو مختصر تاریخ لکھی، تو وہاں کے لوگوں کے مزاج اور ان کے مذہبی پس منظر کا پورا نقشہ ان کے سامنے آگیا، اس لیے تاریخ اسلام کے لکھنے میں جتنی تیاریوں کی ضرورت تھی، وہ سب کچھ ان کے ذریعہ سے ان کو حاصل ہو چکی تھی،

عہد رسالت و خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ بہت ہی الجھی اور پھیلی ہوئی ہے، ان تمام تفصیلات کو سمیٹ کر اور سلجھا کر لکھنے کے لیے قلم میں بڑی سلامت روی اور اعتدال پسندی کی ضرورت تھی، جو شاہ صاحبؒ کو فطری طور پر ودیعت ہوئی تھی، پھر ان خاندانوں کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی آیا جس کو

مسلمانوں کے انتہائی عروج کا عہد بھی کہا جا سکتا ہے، ان میں باہمی نفاق، افتراق، رقابت اور خانہ جنگی ضرور رہی، لیکن ان تاریک پہلوؤں کے ساتھ ان کا یہ زمانہ سیاسی، معاشرتی، تمدنی، تہذیبی اور علمی حیثیت سے طرازریں دور بھی رہا، مسلمانوں کے اہم ترین علمی کارنامے عباسی عہد ہی کی یادگار ہیں، اسی دور میں ایرانی، کلدانی، مصری، رومی، یونانی اور ہندی تہذیب و تمدن کے گوناگوں رنگوں سے عربی تمدن میں وہ نقش آرائیاں ہوئیں کہ اسی کا نام اسلامی تمدن قرار پایا۔

ان سارے کوائف کو سمیٹنے کے لیے ایک شگفتہ، رواں، پختہ اور طاقت ور قلم کی ضرورت تھی، یہ شرط بھی شاہ صاحبؒ سے پوری ہوتی تھی، معارف کی مضمون نگاری اور کئی کتابوں کے مصنف ہو جانے کی بدولت ان کے قلم میں شگفتگی اور روانی کے ساتھ بڑی توانائی اور پختگی بھی آ گئی تھی، مولانا شبلیؒ نے الفاروق اور المامون میں تاریخی واقعات کے لکھنے میں جو اسلوب اور طرز نگارش اختیار کیا تھا، وہ دبستان شبلیؒ کا خاص انداز تھا، اس کا مطالعہ بھی شاہ صاحبؒ نے اچھی طرح کر لیا تھا، اور اسی کی پابندی کی۔

بنوامیہ اور بنوعباس کی تاریخ لکھنے میں جانکاہ تحقیق و تدقیق کی ضرورت نہ تھی، عربی زبان کی تاریخوں میں ان کی پوری تفصیل موجود تھی، صرف خوش سلیقگی اور خوش مذاقی سے ان کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت تھی، شاہ صاحبؒ کی روزمرہ کی زندگی میں یہ اوصاف پائے جاتے تھے، اس لیے بنوامیہ اور بنوعباس کی تاریخ لکھنے میں ان سے ان کو بڑی مدد ملی، اس وقت تک اردو میں ابوالفضل عباسی گورکھپوری اور اکبر شاہ خاں کی تاریخ اسلام موجود تھی، مولانا اسلم جیراج پوری نے تاریخ الامت لکھ کر ایک بڑے خلا کو ضرور پر کیا، لیکن جب شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی چاروں جلدیں شایع ہوئیں تو دبستان شبلی کے اسلوب، تحریر کی شگفتگی، واقعات کی ترتیب کی خوش سلیقگی اور خود مصنف کی خوش مذاقی اور اعتدال پسندی کی وجہ بہت مقبول ہوئیں، یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کی گئیں، اساتذہ اور طلبہ دونوں ان کا مطالعہ کرکے مستفید ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی پہلی جلد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، سید صاحبؒ نے اپنے دیباچہ میں اس کی چاروں جلدوں کے متعلق یہ لکھا،

"اس پورے سلسلہ میں اسلام کے اخلاقی اثرات اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے، یعنی اسلام سے پہلے دنیا کی اخلاقی حالت کیا تھی، اسلام نے کیا سبق دیا، اپنی تعلیم کے اس نے کیسے نمونے پیدا کیے، انھوں نے خود کہاں تک اس تعلیم پر عمل کیا، اور دوسروں کے ساتھ اس کو کہاں تک برتا، دنیا پر اس کے اثرات کیا پڑے، اور انسانیت کو اس سے کیا فوائد پہونچے، مسلمانوں نے علم و فن کی کیا خدمت کی، اور انسانی تہذیب و تمدن کا پیام کہاں سے کہاں تک پہونچایا، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اس کے اثرات و نتائج کے اعتبار سے سب سے روشن زمانہ عہد نبوت اور خلافت راشدہ کا ہے، اس لیے اس حصہ میں اس پہلو کو خاص طور سے دکھایا گیا ہے، سیاسی تاریخ یعنی فتوحات وغیرہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس کا کوئی ضروری پہلو چھوٹنے نہیں پایا، لیکن اس کی جزوی تفصیلات سے کتاب کو طول نہیں دیا گیا ہے کہ ایسی کتابوں کی کمی اردو زبان میں نہیں "

تاریخ اسلام کی چاروں جلدوں کی تدوین کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کے ماخذ یہ تھے،

سیرۃ ابن ہشام، عقد الفرید، انقلاب الامم ابن صاعد اندلسی، امالی ابوعلی قالی، زرقانی، ابوالعباح، روض الانف، طبقات ابن سعد، مستدرک حاکم، فتح الباری، مشکوٰۃ، بخاری، اصابہ، مسند ابن حنبل، زاد المعاد، مسلم، فتوح البلدان بلاذری، بیہقی، ترمذی، ابوداؤد، کنزالعمال، ابن خلدون، ابن اثیر، طبری، تاریخ الخلفاء سیوطی، کتاب الخراج امام ابویوسف، اخبار الطوال دینوری، فتوح الشام، یعقوبی، خطط مقریزی، طبقات الفقہاء بیہقی، ماوردی، سیرۃ عمرؓ بن الخطاب از جوزی، سیرۃ العمرین لابن جوزی، ازالۃ الخفا، تذکرۃ الحفاظ، حسن المحاضرۃ، مسند دارمی، کتاب العمدۃ، تفسیر ابن جریر، اعلام الموقعین، نزہۃ الابرار، ابوالفداء، معارف ابن قتیبہ، الفخری، مروج الذہب مسعودی، دول الاسلام ذہبی، ابن اثیر، تاریخ خطیب، کتاب الوزراء والکتاب جہشیاری،

نجوم الزاہرہ ابن تغری بردی، خلاصۃ الوفاء، تمدن عرب، ابن خلکان، معارف ابن قتیبہ، کتاب الفرق بین الفرق، کشف الظنون، اخبار الحکماء، المستطرف، تاریخ الخمیس، معجم البلدان، دول الاسلام و اختصار قالعربیۃ کتاب المتحن، البدایۃ والنہایۃ، کتاب الولاۃ کندی، کتاب الوزراء صابی، ابن العذاری، تجارب الامم، ہسٹری آف دی ثنیشنز، تاریخ فرشتہ، زین الاخبار گردیزی، جواہر مضیہ، تاریخ ادبیات ایران، مرآۃ الحیات، طبقات الشافعیہ، راحۃ الصدور، تاریخ آل سلجوق، تاریخ مصر ابن میسر، تاریخ ذیل دمشق ابن القلانسی، دولت آل سلجوق، تاریخ گزیدہ، کتاب الملل والنحل شہرستانی، سیاست نامہ، تاریخ یورپ اے. جی گرانٹ، تاریخ یورپ الیو تھیچر، خطط الشام کرد علی، الاخبار السنیہ فی الحروب الصلیبیہ، تاریخ الدولتین زرکشی، المجب کتاب المونس، تاریخ دولت آتابکیہ موصل، صلاح الدین لین پول، کتاب الروضتین، حسن المحاضرۃ، الحروب الصلیبیہ، چنگیز خان ہرلڈلیب اردو ترجمہ، تاریخ جہاں کشائے جوینی، تاریخ گزیدہ۔

ان ماخذوں کو دیکھ کر ناظرین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ان جلدوں کے لکھنے میں پوری محنت کی، اور ہر قسم کے ماخذوں سے استفادہ کیا۔

تاریخ اسلام کی ابتداء رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد سے ہوتی ہے، شاہ صاحب کے لیے یہ مشکل سوال تھا کہ اس عہد کی تاریخ مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق اور حاجی معین الدین ندوی بہاری کی خلافت راشدہ (خلفائے راشدین) میں آ چکی تھی، پھر انھوں نے خود سیر المہاجرین اور سیر الصحابہ جلد ششم میں بہت سے واقعات کا احاطہ کر لیا تھا، مگر ان کی تاریخ اسلام اس عہد کی تاریخ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے انھوں نے اب تک جو کچھ لکھا جا چکا تھا اس کا عطر اپنی تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں پیش کیا، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس جلد میں وہ سارے واقعات یکجا آ گئے، جو مختلف کتابوں میں تھے، اس کے شروع میں قبل از اسلام عرب کے حالات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، ہجرت، غزوات، مذہبی انتظامات، تاسیس حکومت، ازواج مطہرات، اولاد و امجاد کا بہت ہی جامع تذکرہ ملے گا۔

[illegible] کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حضرت علیؓ تک کے حالات ہیں، جن میں اختصار ضرور ہے، لیکن بڑی جامعیت ہے۔ اس کی تھوڑی سی جھلکیاں ناظرین کو دکھا دی جائیں تو مناسب ہوگا۔

حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت دو سال تین مہینے اور دس دن رہی، اس قلیل مدت میں آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی وہ گراں قدر خدمات انجام دیں اور آئندہ حکمرانوں کے لیے ایسا نمونہ چھوڑ گئے جو دوسروں سے برسوں میں ممکن نہ تھا، (ص ۱۴۹) آپ نے سب سے زیادہ اس کا لحاظ رکھا کہ کسی امر میں عہد نبویؐ سے سرمو تجاوز نہ ہونے پائے، گو عہد رسالت کے قرب کے اثر سے اس کے تدارک کی ضرورت کم و بیش آتی تھی لیکن جہاں تجاوز کا ادنیٰ شائبہ بھی نظر آتا تھا، سختی کے ساتھ اس کا تدارک فرماتے، جہاں تک فتوحات اور نظامِ خلافت میں وسعت کا تعلق ہے، خلیفۂ ثانیؓ کا زمانہ آپ کے زمانے سے زیادہ مہتم بالشان تھا، لیکن یہ اسی بنیاد کا نتیجہ تھا، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ رکھ گئے تھے، (ص ۱۴۹) عہد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب ہے، اس کے متعلق شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس سے عام غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآن مرتب نہ تھا، یعنی اس کی آیات اور سورتوں میں کوئی ترتیب نہ تھی، اور نہ سورتوں کے نام رکھے گئے تھے، یہ کام حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں انجام پایا، لیکن ایسا سمجھنا سراسر غلط ہے، قرآن کے احکام کی طرح اس کی آیات و سور کی ترتیب اور ان کے نام بھی الہامی ہیں اور حیاتِ نبویؐ میں قرآن کی پوری ترتیب ہو چکی تھی، قرآن اسی ترتیب کے مطابق ہے، البتہ کتابی صورت میں پورا قرآن جمع نہ تھا، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہی کام ہوا۔ (ص ۱۵۱)

حضرت ابوبکرؓ کے فضل و کمال اور سیرت کا اندازہ شاہ صاحبؒ کے اس تبصرہ سے ہوگا کہ جماعت صحابہؓ میں صدیق اکبرؓ سب سے زیادہ اسرار شریعت کے محرم اور روح اسلامی کے دانائے راز تھے، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، جملہ اسلامی علوم میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا، قرآن پاک کے فہم و تدبر میں ایسا ذہن وقاد اور نظر دقیق پائی تھی کہ ان کی نظر ان نکات تک آسانی سے پہنچ جاتی تھی، جن کی طرف

عام صحابہؓ کا ذہن منتقل نہ ہو سکتا تھا۔ خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ نماز کی حالت میں چوب خشک نظر آتے تھے۔ رقت اتنی طاری ہوتی کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ عبرت پذیری کا یہ حال تھا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ ان کے لیے دفتر عبرت تھا، چڑیوں کو چہچہاتے دیکھتے تو فرماتے پرندو! تم خوش نصیب ہو کہ دنیا میں چرتے، چگتے اور درختوں کے سایے میں بیٹھتے ہو، قیامت کے محاسبہ کا کوئی خطرہ نہیں، کاش ابوبکر تمھاری طرح ہوتا، بات بات پر آہ سرد کھینچتے تھے، یہاں تک کہ اوّاہ لقب ہو گیا تھا۔ (ص ۱۵۵)

حضرت عمرؓ بن الخطاب کا دور خلافت تاریخ اسلام کا سب سے شاندار باب ہے، آپ کے زمانہ میں ایران، شام، مصر، بیت المقدس اور طرابلس الغرب پر اسلام کا پرچم لہرایا، ان فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: بلاشبہ سکندر، چنگیز اور تیمور نے ایک عالم کو زیر نگیں کیا، لیکن وہ صرف جہانگیر تھے، جہاندار نہ تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس احتیاط اور جن قوانین کی پابندی کے ساتھ ایران و روم فتح ہوئے اس احتیاط کے ساتھ دنیا کا کوئی حکمراں زمین کا ایک حصہ بھی فتح نہیں کر سکتا، چنگیز اور تیمور وغیرہ طوفان کی طرح اٹھے اور ایک عالم پر چھا گئے، لیکن جب یہ طوفان تھما تو انسانی لاشوں کا انبار اور تباہ شدہ کھنڈروں کے علاوہ اور کوئی شے نظر نہ آتی تھی، وہ جن ملکوں سے گذرے انھیں ویرانہ بنا دیا، اس کے برخلاف عہد فاروقی میں خون ناحق کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پایا، ملکوں کا تباہ کرنا تو بڑی بات ہے، ہری بھری کھیتیوں اور شاداب درختوں تک کو نہ کاٹتے تھے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر تلوار اٹھانے کی سخت ممانعت تھی، پھر مسلمانوں نے جس ملک میں قدم رکھا اپنے عدل و انصاف اور حسن اخلاق سے اس کے باشندوں کو ایسا گرویدہ بنایا کہ وہ اپنی قوم کے مقابلہ میں ان کے مددگار بن گئے، انھوں نے قوموں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا، اور بہت سی مفتوح قوموں نے ان کا مذہب بھی قبول کر لیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ملک فتح ہوئے وہ سب کے سب آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ (ص ۲۰۱ - ۲۰۰)

حضرت عمرؓ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں جو اولیات حاصل ہوئیں ان کو شاہ صاحبؒ نے مستند ماخذوں کے حوالے سے دُہرا کر ان کی یاد ایک بار پھر تازہ کردی ہے، اور وہ یہ ہیں: (۱) بیت المال قائم کیا (۲) عدالتیں قائم کر کے قاضی مقرر کیے (۳) تاریخ اور سنہ قائم کیا جو اب تک جاری ہے (۴) امیر المومنین کا لقب اختیار کیا (۵) فوجی دفتر ترتیب دیا (۶) والنٹیروں کی تنخواہیں مقرر کیں (۷) دفتر مال قائم کیا (۸) پیمائش کا طریقہ جاری کیا، (۹) مردم شماری کرائی (۱۰) زراعت کی ترقی کے لیے نہریں کھدوائیں (۱۱) شہر آباد کیے، (۱۲) ممالک محروسہ کو صوبوں میں تقسیم کیا (۱۳) عشور یعنی دہ یکی مقرر کی (۱۴) دریا کی پیداوار مثلاً عنبر وغیرہ پر محصول لگایا (۱۵) تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی (۱۶) جیل خانہ قائم کیا (۱۷) درہ کا استعمال کیا (۱۸) راتوں کو گشت کر کے رعایا کا حال دریافت کرنے کا طریقہ نکالا (۱۹) پولیس کا محکمہ قائم کیا (۲۰) فوجی چھاؤنیاں قائم کیں (۲۱) گھوڑوں کی نسل میں اصیل اور دوغلے کی تمیز قائم کی جو عرب میں نہ تھی (۲۲) پرچہ نویس مقرر کیے (۲۳) مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے آرام کے لیے چوکیاں اور سرائیں بنوائیں، (۲۴) راہ پر پڑے ہوئے بچوں کی پرورش کے لیے روزینے مقرر کیے (۲۵) قاعدہ بنایا کہ اہل عرب غلام نہیں بنائے جا سکتے۔

(۲۶) مفلوک الحال عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے (۲۷) مکاتب قائم کیے (۲۸) معلموں اور مدرسوں کے مشاہرے قائم کیے (۲۹) حضرت ابو بکرؓ سے اصرار کر کے کلام اللہ کی تدوین کرائی (۳۰) قیاس کا اصول قائم کیا، (۳۱) فرائض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا (۳۲) فجر کی اذان میں الصلوۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا (۳۳) نماز تراویح جماعت کے ساتھ قائم کی (۳۴) تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی جائیں بائن قرار دیا (۳۵) شراب کی حد اسّی کوڑے مقرر کی، (۳۶) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی، (۳۷) بنی تغلب کے عیسائیوں پر جزیہ کے بجائے زکوٰۃ مقرر کی (۳۸) وقف کا طریقہ ایجاد کیا (۳۹) نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (۴۰) مساجد میں وعظ کا طریقہ جاری کیا، (۴۱) امام اور مؤذن کی

تنخواہیں مقرر کیں، (۲۴۲) مسجدوں میں روشنی کا انتظام کیا، (۲۴۳) ہجو کہنے والے کے لیے درے کی سزا مقرر کی، (۲۴۴) غزلیہ اشعار میں عورتوں کے نام لینے سے منع کیا، (۲۴۴ ۔ ۲۴۳)

حضرت عمرؓ کے اتباعِ سنت کا ذکر شاہ صاحبؒ نے اس طرح کیا ہے کہ آپ کسی کام میں سنت نبویؐ سے تجاوز نہ کرتے تھے، عبادات و معاملات کا ذکر نہیں، روزانہ کی زندگی میں اتباعِ سنت کا پورا اہتمام تھا، عمال کو پابندی سنت کے تاکیدی احکام بھیجتے رہتے کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے، اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش سے ہٹ جاؤ گے تو خدا تم کو جادۂ مستقیم سے ہٹا دیگا، اتباعِ سنت کے خیال سے بڑی تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ اب خدا نے مرفہ الحالی عطا فرمائی ہے، اس لیے آپ کو نرم کپڑوں اور اچھی غذا سے پرہیز نہ کرنا چاہیے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا: جانِ پدر! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت کی زندگی بھول گئیں، خدا کی قسم میں اپنے آقا کے نقشِ قدم پر چلوں گا کہ آخرت کی فراغت اور خوشحالی نصیب ہو، (ص ۲۳۹ ۔ ۲۳۸)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتوحات ہوئیں ان سے شاہ صاحبؒ خوش تو ہوئے کہ اسلامی مملکت کے حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کے صدر دروازہ تک وسیع ہوگئے (ص ۲۵۰) مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ فتوحات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، محاصل و خراج کی زیادتی، وظائف کی کثرت اور زراعت و تجارت کی ترقی نے ملک کو فارغ البالی اور عیش و تنعم کے سامانوں سے معمور کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ اس کے لوازم و نتائج بغض و حسد اور رشک و رقابت کا قدم بھی آیا، کبار صحابہؓ جو اسلام کے سچے خدمت گذار اور شیدائی تھے، اٹھتے جاتے تھے، ان کی جگہ نئی نسل لے رہی تھی، جن میں ان کے اسلاف جیسا خلوص و ولولہ کے بجائے مال و دولت کی ہوس تھی، نو مسلم یہودیوں اور مجوسیوں نے منافق بن کر بنی امیہ اور بنی ہاشم کی چشمک ابھاری، صورت حال اتنی بگڑی کہ نظامِ خلافت کو درہم برہم کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ پر طرح طرح کے الزامات رکھے گئے، مثلاً بعض اکابر صحابہؓ کے ساتھ

نارواسلوک کیا، بیت المال کا روپیہ بے جا طور پر صرف کیا، اپنے اعزہ کو بڑی بڑی رقمیں دیں، بقیع کی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کرلیا، اموی عمال کی بدعنوانیوں کا کوئی تدارک نہیں کیا، ایک مصحف کے علاوہ باقی تمام مصاحف جلاڈالے، سنت رسول اور سنتِ شیخین کے خلاف منیٰ میں دو رکعت کے بجائے چار رکعت نماز پڑھی، فرائض میں تمام امت کے خلاف روایاتِ شاذہ پر عمل کیا، حالانکہ شیخین پوری توثیق کے بغیر روایتوں کو قبول نہ کرتے تھے، حکم بن العاص کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاوطن کردیا تھا واپس مدینہ بلالیا، مصری وفد کے ساتھ بدعہدی کی، وغیرہ وغیرہ۔

شاہ صاحبؒ نے پُرزور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان میں سے بعض تو بالکل غلط ہیں، بعض میں واقعات کو مسخ کرکے بدنما شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور بعض غلط فہمی کا نتیجہ ہیں (ص ۲۷۰) مگر حالات اتنے بے قابو ہوگئے تھے کہ بقول حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ شہید ہوکر دھلے ہوئے کپڑے کی طرح پاک و صاف ہوگئے، اس شہادت سے ہر مسلمان کو دکھ ہے، اسی دکھ، رنج اور غم میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت درحقیقت تنہا آپ کی شہادت کا واقعہ نہ تھا بلکہ وحدت اسلامی کی شکست اور مسلمانوں کے شیرازہ کی برہمی کا حادثہ تھا، اس سے مسلمانوں میں جو تفریق پیدا ہوئی وہ تاقیامت نہ مٹی گی، اس وقت جو تلوار بے نیام ہوئی وہ ہمیشہ کے لیے بے نیام رہے گی، مسلمان شیعہ، سنی، خارجی اور عثمانی فرقوں میں بٹ گئے اور جو متحدہ قوت غیر مسلموں اور اسلام کے دشمنوں کے مقابلہ میں صرف ہوتی تھی وہ ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگی، اور عہد صحابہؓ سے جس خانہ جنگی کا آغاز ہوا، اس کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ (ص ۲۸۹)

حضرت علیؓ کا پورا عہد خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں گذرا، حضرت عثمانؓ کی شہادت کی وجہ سے طرح طرح کے واقعات رونما ہوئے، حضرت علیؓ نے خلیفہ بنتے ہی امیر معاویہؓ کو شام کی ولایت کے عہدہ سے معزول کردیا، جس سے وہ ہمیشہ کے لیے ان کے مخالف ہوگئے، ان سے

جنگ کی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے قصاص اور وقت کے فتنہ و فساد کی اصلاح کے لیے آگے بڑھیں یہاں تک کہ حضرت علیؓ سے جنگ ہوگئی، جو تاریخ میں جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار ہوکر فوج کی قیادت کررہی تھیں، بڑا عبرتناک منظر تھا، ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین حرم محترم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں، دوسری طرف جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمہؓ کے شوہر نامدار، آپؐ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ تھے، بڑی ہولناک جنگ ہوئی، عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ میدان میں جاں بحق ہوئے، بالآخر مصالحت ہوئی، شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ صلح کے بعد حضرت عائشہؓ نے فرمایا: میرے بچو! یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی، اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی سے کام نہ لینا چاہیے، میرے اور علیؓ کے درمیان جو ساس اور داماد میں اختلاف ہوجایا کرتا ہے وہی ہوا، اس کے علاوہ کوئی رنجش نہیں تھی، وہ

وہ ان واقعات کے بعد بھی میرے نزدیک اخیار میں ہیں۔ (ص ۳۲۳)

حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد پر حضرت علیؓ نے فرمایا: ام المومنینؓ سچ فرماتی ہیں، خدا کی قسم میرے اور ان کے درمیان اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی، وہ دنیا اور آخرت دونوں میں نبیؐ کی حرم ہیں، (ص ۳۲۴)

اس جنگ کے بعد امیر معاویہؓ سے بھی تصادم کی نوبت آگئی، انھوں نے بھی حضرت عائشہؓ کی طرح حضرت عثمانؓ کے قتل کے قصاص کا نعرہ بلند کیا، اس کی آڑ لے کر حضرت علیؓ کے مقابلہ میں صفین کے میدان میں اتر آئے، شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں پینتالیس ہزار شامی اور پچیس ہزار عراقی کام آئے، ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہوگئے، یہ مسلمانوں اور کافروں کی جنگ نہ تھی، بلکہ مسلمان مسلمان ہی سے لڑ رہے تھے، اور ایک دوسرے کا خون بہارہے تھے،

امیر معاویہؓ کو جب اپنی شکست کا اندازہ ہونے لگا تو انھوں نے تحکیم کی تجویز پیش کی جو حضرت علیؓ نے منظور کرلی، حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاصؓ

حکم مقرر ہوئے، دونوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں کو معزول کرکے خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے، جب اعلان کا وقت آیا تو ابو موسیٰ اشعریؓ نے یہی اعلان کیا، لیکن عمرو بن العاصؓ نے اس کے برخلاف یہ اعلان کیا کہ ابو موسیٰ کی طرح میں بھی علیؓ کو معزول کرتا ہوں، لیکن معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں، اس فیصلہ سے حضرت علیؓ کے حامیوں میں سخت برہمی پیدا ہوگئی، حضرت علیؓ نے معاویہؓ سے مقابلہ کی تیاری شروع کردی، مگر اسی اثنا میں خارجیوں نے عراق میں بدامنی پھیلادی، امیر معاویہؓ نے مصر پر قبضہ کرلیا، پھر حضرت علیؓ کے دوسرے علاقہ کی طرف قدم بڑھایا، جس سے مسلسل خانہ جنگی اور خون ریزی ہوتی رہی، حضرت علیؓ نے گھبرا کر امیر معاویہؓ سے ۴۰ھ میں صلح کرلی، اس کی رو سے حجاز، عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہا، اور شام اور مصر و مغرب کا علاقہ امیر معاویہؓ کے حصہ میں آیا، (ص ۳۵۶)

اس جھگڑے میں خارجیوں میں سے تین شخصوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ہی وقت میں ان تینوں یعنی حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو قتل کردیں، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تو بچ گئے لیکن تیسرے شخص یعنی حضرت علیؓ پر عبدالرحمٰن بن ملجم کا وار کامیاب ہوگیا اور وہ شہید ہوگئے (ص ۳۵۷)

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تعمیری کاموں کے لحاظ سے حضرت علیؓ کا عہد آپ کے پیش روؤں کے مقابلہ میں ناکام رہا اور یہ ان حالات کا نتیجہ تھا جن میں آپ کو منصب خلافت ملا تھا اور جو بعد میں بھی پیش آتے رہے، ایسے مخالف حالات میں بڑے سے بڑا مدبر فرماں روا بھی مشکل سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا اور جس حد تک بھی آپ نے ان کا مقابلہ کیا وہ بھی کسی دوسرے فرماں روا سے ممکن نہ تھا، (ص ۳۵۹)

اس عہد کی باہمی آویزش کا تجزیہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: حضرت ابوبکرؓ نے جس وقت تخت خلافت پر قدم رکھا اس وقت سارا عرب پُرآشوب تھا، لیکن ان حالات کے مقابلہ کا پورا سامان موجود تھا، عہد رسالت کے قرب کی وجہ سے مسلمانوں میں اسلامی روح زندہ تھی، سب کے سب ایک غرض اور ایک مقصد اعلیٰ کے لیے متحد تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا تھا، حصول مقصد کے

وسائل پر تو اختلاف رائے ہو جاتا تھا لیکن اصل مقصد پر سب متفق تھے، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ضرور تھے لیکن خلافت کا نظام ان صاحب تدبیر و سیاست صحابہ کے مشورے سے چلتا تھا، جنھوں نے شجر اسلام کو اپنے خون سے سینچا تھا، ان کی عزیز ترین متاع اسلام تھا، ذاتی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کا تحمل آپ کی زہد، تواضع، انکسار، لوگوں کے دلوں کی تسخیر، خلافت کے رکن رکین حضرت عمرؓ کا دبدبہ و شکوہ کسی کو جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ دیتا تھا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے یہ خصوصیات مٹنے لگی تھیں جس کے نتائج انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوئے اور حضرت علیؓ کے دور میں قریب قریب سب ختم ہوئیں، نئی پود میں اپنے اسلاف کا اخلاص اور سچا جوش اور ولولہ نہ تھا، اس کے علاوہ جدید الاسلام عربوں اور نو مسلم عجمیوں کے دلوں میں اسلام کیلئے کوئی تڑپ نہ تھی، ان کے سامنے اپنے اغراض ہوتے، ان ہی لوگوں نے اہل بیت اور غیر اہل بیت کا سوال پیدا کر کے مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کا خاتمہ کیا، حضرت عثمانؓ کو شہید کر کے مسلمانوں میں خانہ جنگی کا دروازہ کھولا، پھر حضرت علیؓ کی لاعلمی میں آپ کے ساتھ ہو کر اختلاف کی آگ بھڑکائی، اگر یہ عنصر نہ ہوتا تو جمل اور صفین کے واقعات پیش نہ آتے، (ص ۳۶۲)

کیسا پُر مغز اور چَچا تُلا تجزیہ ہے۔

حیات سلیمان

یہ سید صاحب علیہ الرحمہ کی محض سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ سید صاحب کے پورے دور کی تمام ملی و قومی، سیاسی و علمی اور ادبی و لسانی تحریکوں شلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی پوری تاریخ ہے، اس میں دار المصنفین کی سالہا سال ترقی کی روداد، ترک قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، پھر قیام پاکستان، اور انھوں نے پاکستان میں جو علمی و ملی خدمات انجام دیں ان کی بھی تفصیل آگئی ہے، از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، قیمت ۳۲ روپیے۔ "منیجر"

سلسلۂ شطاریہ اور شاہ وجیہ الدین گجراتیؒ

از

عبدالرحمن پرواز اصلاحی رفیق دارالمصنفین

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری (بارہویں اور چودہویں صدی عیسوی) میں ایران اور عراق سے تین[۲] مشہور سلاسلِ طریقت جنوبی ہند میں داخل ہوئے، چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ، سلسلۂ چشتیہ شمالی ہند میں زیادہ پھیلا، سلسلۂ سہروردیہ سندھ میں اور سلسلۂ فردوسیہ مشرقی ہندوستان کے بہار و بنگال میں پھیلا، مغلوں کے دورِ حکومت میں تین[۳] اور سلاسل طریقت سامنے آئے، شطاریہ، قادریہ اور نقشبندیہ، سلسلۂ شطاریہ کے پیشوا شیخ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن آدم بسطامیؒ (۸۷۳ء سنہ ۲۶۱ھ) ہیں، اس سلسلہ کو ایران میں عشقیہ، روم میں بسطامیہ اور ہند و پاک میں شطاریہ کہتے ہیں۔

شطار کی وجہ تسمیہ | عشقیہ یا بسطامیہ سلسلہ کے لوگ اپنے کو شطاری کیوں کہتے ہیں، اور اس کی وجہ کیا ہے؟ گلزارِ ابرار کے مصنف محمد حسن غوثی جو اس مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، لکھتے ہیں؛

"شطار کی وجہ تسمیہ کے متعلق کسی اہل قلم نے کوئی صریح اور واضح بات نہیں لکھی ہے، لیکن ایک رسالہ ہے "لطیفۂ غیبیہ" نام کا جو شاہ عبداللہ شطاری کی تصنیف ہے، اس رسالہ کی فصل ثانی میں کسی قدر اس کی نسبت آگاہی دی گئی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا شناساں امت محمدی سلوک میں تین مشرب رکھتے ہیں (۱) اخیار، (۲) ابرار اور (۳) شطار، اور ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک گروہ ورد، شغل، ذکر، کشف اور قرب کی جدا جدا شان رکھتا ہے، اور اپنے خاص طریقے کے بموجب صاحبِ استعداد کا حق"

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ علماء اقتی کا نبیاء بنی اسرائیل کے مضمون پر نظر کر کے فرق اور عدم فرق کی رعایت اس گروہ کے بارے میں بھی اسی کے مطابق کی جائے، جس طرح انبیاء علیہم السلام کے بارے میں قرآن شریف کے اندر ارشاد ہے یعنی ان کی نسبت اعتقاد اور ولایت کے اقرار میں تفاوت اور اختلافات کو دخل نہ دیا جائے، اور جو حکم رسولوں کے ایمان کی نسبت لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (یعنی ہم رسولوں میں سے کسی کے مابین فرق نہیں رکھتے ہیں) اسی پر قیاس کیا جائے۔ تاکہ شریعت کا ایسا ایمان حاصل ہو جو طریقت کے وصف کے ساتھ موصوف ہو؛ اور جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں قرب، وحی، معجزات، نسخ اور عدم نسخ، اولوالعزمی، امت کی کثرت و قلت اور نیز ان امور کے سوا دیگر امور کے اعتبار سے فرق سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اس گروہ میں بھی فرق سمجھا جائے، چونکہ یہ گروہ مشابہ انبیاء بنی اسرائیل کے ہے لہٰذا اسی طرح اس گروہ کے اندر بھی فضیلت، سرعت سیر، بطوء سیر، ریاضت اور عبادت کے اعتبار سے سلوک میں بھی عالم آخرت کی طرف سے سمجھی جائے، اور احوال درجات مقامات اور خطابات کے اعتبار سے اعیان ثابتہ (صور علمیہ) کے بموجب منجانب مبدأ سمجھی جاوے، آیت کریمہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے اشارہ سے جو معنی ذہن میں آتے ہیں اسی کے مطابق اس مقام سے یہ بات خیال میں آتی ہے کہ اس لقب کی خصوصیت منازل طریقت کے طے کرنے میں تیز روی کے اعتبار سے ہے، والعلم عند اللہ، ..... چونکہ یہ گروہ عالم مرکبات کو طے کر کے مجردات کے عالم میں معنوی سرعت کے ساتھ جاتا ہے، اس سبب سے اس گروہ کو "شطار" کا لقب دیا گیا ہے۔[1]

مشرب شطار کے اصول ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دسویں صدی کے ایک بزرگ شیخ بہاء الدین بن ابراہیم الشطاریؒ کے تذکرہ میں ان کے ایک "رسالہ شطاریہ" کے حوالے سے مشرب شطار کے دس اصول نقل کیے ہیں جس میں موصوف نے لکھا ہے:

---

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۰۵۔

سلسلۂ شطاریہ اور شاہ وجیہ الدین گجراتیؒ

از

عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی رفیق دار المصنفین

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری (بارھویں اور چودھویں صدی عیسوی) میں ایران اور عراق سے تین مشہور سلاسلِ طریقت جنوبی ہند میں داخل ہوئے، چشتیہ، سہروردیہ اور فردوسیہ، سلسلۂ چشتیہ شمالی ہند میں زیادہ پھیلا، سلسلۂ سہروردیہ سندھ میں اور سلسلۂ فردوسیہ مشرقی ہندوستان کے بہار و بنگال میں پھیلا، مغلوں کے دور حکومت میں تین اور سلاسل طریقت نئے آئے، شطاریہ، قادریہ اور نقشبندیہ سلسلۂ شطاریہ کے پیشوا شیخ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن آدم بسطامیؒ (۲۶۱ھ ۸۷۳ء) ہیں، اس سلسلہ کو ایران میں عشقیہ، روم میں بسطامیہ اور ہند و پاک میں شطاریہ کہتے ہیں۔

شطار کی وجہ تسمیہ | عشقیہ یا بسطامیہ سلسلہ کے لوگ اپنے کو شطاری کیوں کہتے ہیں، اور اس کی وجہ کیا ہے؟ گلزار ابرار کے مصنف محمد حسن غوثی جو اس مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، لکھتے ہیں:

"شطار کی وجہ تسمیہ کے متعلق کسی اہل قلم نے کوئی صریح اور صحیح بات نہیں لکھی ہے، لیکن ایک رسالہ ہے "لطیفۂ غیبیہ" نام کا جو شاہ عبداللہ شطاری کی تصنیف ہے، اس رسالہ کی فصل ثانی میں کسی قدر اس کی نسبت آگاہی دی گئی ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا شناسانِ امت محمدی سلوک میں تین مشرب رکھتے ہیں: (۱) اخیار، (۲) ابرار اور (۳) شطار، اور ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک گروہ ورد، شغل، فکر، کشف اور قرب کی جدا جدا شان رکھتا ہے، اور اپنے خاص طریقے کے بموجب صاحب استعداد کامل

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ علماءِ امتی کانبیاءِ بنی اسرائیل کے مضمون پر نظر کر کے فرق اور عدمِ فرق کی رعایت اس گروہ کے بارے میں بھی اسی کے مطابق کی جائے، جس طرح انبیاء علیہم السلام کے بارے میں قرآن شریف کے اندر ارشاد ہے یعنی ان کی نسبت اعتقاد اور ولایت کے اقرار میں تفاوت اور اختلاف کو دخل نہ دیا جائے، اور جو حکم رسولوں کے ایمان کی نسبت لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (یعنی ہم رسولوں میں سے کسی کے مابین فرق نہیں رکھتے ہیں) اسی پر قیاس کیا جائے، تاکہ شریعت کا ایسا ایمان حاصل ہو جو طریقت کے وصف کے ساتھ موصوف ہو، اور جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں قرب، وحی، معجزات، نسخ اور عدمِ نسخ، اولوالعزمی، امت کی کثرت و قلت اور نیز ان امور کے سوا دیگر امور کے اعتبار سے فرق سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اس گروہ میں بھی فرق سمجھا جائے، چونکہ یہ گروہ مشابہ انبیاء بنی اسرائیل کے ہے لہٰذا اسی طرح اس گروہ کے اندر بھی افضلیت، سرعتِ سیر، بطوءِ سیر، ریاضت اور عبادت کے اعتبار سے سلوک میں بھی عالمِ آخرت کی طرف سے سمجھی جائے، اور احوال درجات مقامات اور خطابات کے اعتبار سے اعیانِ ثابتہ (صورِ علمیہ) کے بموجب منجانب مبدا سمجھی جاوے، آیتِ کریمہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کے اشارہ سے جو معنیٰ ذہن میں آتے ہیں اسی کے مطابق اس مقام سے یہ بات خیال میں آتی ہے کہ اس لقب کی خصوصیت منازلِ طریقت کے طے کرنے میں تیز روی کے اعتبار سے ہے، والعلم عند اللہ ..... چونکہ یہ گروہ عالمِ مرکبات کو طے کر کے مجردات کے عالم میں معنوی سرعت کے ساتھ جاتا ہے، اس سبب سے اس گروہ کو "شطار" کا لقب دیا گیا ہے[1]"

مشربِ شطاریہ کے اصول | شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دسویں صدی کے ایک بزرگ شیخ بہاءالدین بن ابراہیم الشطاری رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں ان کے ایک "رسالۂ شطاریہ" کے حوالے سے مشربِ شطار کے دس اصول نقل کیے ہیں جس میں موصوف نے لکھا ہے:

---

[1] اذکارِ ابرار ترجمہ گلزارِ ابرار ص ۲۰۵۔

"پہلا توبہ ہے، اس کا مقصد خدا کے سوا تمام مطلوب سے خروج ہے، دوسرا زہد ہے، جس سے مقصد دنیا اور اس کی محبت، شہوات و لذات سے پرہیز ہے، خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی ہوں، تیسرا توکل ہے، اور وہ اسباب سے خروج ہے، چوتھا قناعت ہے، اور اس سے نفسانی لذات سے علٰحدگی ہو جاتی ہے، پانچواں عزلت اور تنہائی ہے، اور وہ خلایق کے میل جول سے انقطاع ہے، بالکل اسی طرح جس طرح موت کے وقت ہوتی ہے، چھٹا حق تعالیٰ کی طرف توجہ اور التفات ہے، اور اس کا مقصد ہر بلانے والے سے جو غیر حق کی طرف بلائے اس سے بچنا ہے، جس طرح موت کے وقت نہ کوئی مطلوب ہوتا ہے اور نہ محبوب اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مقصود ہوتا، ساتواں صبر و ضبط ہے، اور یہ مجاہدہ کے ساتھ ہوتا ہے، آٹھواں رضا ہے اور وہ نکلتا ہے نفس کی رضا سے خدا کی رضا میں داخل ہونے کے ساتھ، احکام ازلیہ کی تسلیم اور تدبیر الٰہی کی طرف تفویض کے ساتھ بغیر اعراض کئے، جیسا کہ موت کے ساتھ ہوتا ہے، نواں ذکر ہے، اور وہ نکلنا ہے ماسوا اللہ کے ذکر سے، دسواں مراقبہ ہے، اور وہ نکلنا ہے اس کے وجود اور قوت سے جیسا کہ موت کے ساتھ ہوتا ہے"[1]

ان اصولوں کے بعد شیخ بہاء الدین شطاریؒ نے اس سلسلہ کے اذکار کی تفصیل دی ہے:

ہندوستان میں سلسلۂ شطاریہ کا فروغ

نویں صدی ہجری (پندرہویں صدی عیسوی) کے آخر میں شاہ عبداللہ شطاریؒ (م ۱۴۸۵ء / ۸۹۰ھ) ایران سے برصغیر ہند میں تشریف لائے، اور اس طریقہ کو جاری کیا، موصوف پانچ واسطوں سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد میں ہیں، اور سات واسطوں سے حضرت بایزید بسطامیؒ سے بیعت ہیں، ہندوستان آکر انھوں نے کچھ وقت دیار پورب میں گذارا، اور پھر وہ مالوہ گئے، جہاں انھوں نے بڑا فروغ پایا، ان کا مزار مالوہ کے سابق دارالسلطنت مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے، شاہ عبداللہ کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ شیخ محمد علاء المعروف بہ شیخ قاضن شطاریؒ

---

[1] اخبار الاخیار فی اسرار الابرار ص ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۷۸ھ۔

نے اس سلسلہ کو پھیلایا، ان کا مرکز ضلع مظفر پور (بہار) کا جنوبی علاقہ تھا، ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند اکبر شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست (م مابعد ۱۵۱۹ء بہ ۹۲۶ھ) نے سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت کی، ان کا مزار حاجی پور (بہار) کے قریب ہے، موصوف کے خلیفہ شیخ ظہور حاجی حمید الدین حضور (م ۱۵۲۳ء ۹۳۰ھ) نے اس سلسلہ کو بہت زیادہ فروغ دیا، ان کا مزار ضلع سارن میں رتن سرائے کے اندر واقع ہے

شیخ ظہور حاجی حمید الدین حضور کے انتقال کے بعد موصوف کے خلیفۂ اکبر حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ (۱۵۶۳ء بہ ۹۷۰ھ) سے سلسلۂ شطاریہ کی خوب اشاعت ہوئی، ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ان کے خلفاء ومریدین پھیلے ہوئے تھے، غوثی نے گلزار ابرار میں جو فہرست دی ہے، وہ باختصار یوں ہے:

"گوالیار میں موصوف کے فرزند شیخ عبداللہ مسند نشین ہوئے، شیخ مبارک اور شیخ بدیع الزماں تمندی بھی یہیں تھے، اکبرآباد میں شاہ محمد غوث کے دوسرے فرزند شیخ نورالدین ضیاء اللہ مسند نشین تھے، شیخ عبداللہ صوفی بھی یہیں تھے، برہان پور میں شیخ اکمل الدین برہان، شیخ شکر محمد عارف اور سراج محمد بنبانی سلسلہ کی اشاعت میں کوشاں تھے، بڑودہ میں شیخ صدرالدین، محمد شمس ذاکر اور شیخ حبیب شطاری فیض رساں تھے، احمد آباد میں شاہ محمد غوث کے دو صاحبزادگان شیخ محمد ادلیس اور شیخ اسمٰعیل رونق افروز تھے، اعاظم خلفاء میں شیخ وجیہ الدین علوی اور شیخ علی شیر بنگالی مستفیض فرما رہے تھے، سنبھل میں شیخ محمد عاشق، اجمیر میں مولانا عبدالفتاح ناگوری، سرہند میں شیخ محمد جمالی، کالپی میں شیخ جلال واصل، بدولی میں شیخ جیو عبدالحی، بیجاپور میں شیخ شمس الدین شیرازی، اجین (مالوہ) میں شیخ احمد متوکل اور شیخ عالم، سارنگ پور میں شیخ منجھن و شیخ عمر وغیرہ، غرض سارے اطراف و اکناف میں خلفاء پھیلے ہوئے تھے"[1]

---

[1] اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۸۴ تا ۲۹۰۔

اس کے علاوہ شیخ علی قوامؒ (سید علی عاشقان سرائیری) خلیفہ شیخ عبدالقدوس نظام آبادیؒ کے ذریعہ بھی سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت ہوئی، یہ شیخ عبدالقدوسؒ، شیخ حافظ کے خلیفہ تھے، اور موصوف شاہ عبداللہ شطاری کے خلیفہ تھے، اس طرح ہندوپاک میں دو شاخوں سے سلسلۂ شطاریہ کو فروغ ہوا، سلسلۂ شطاریہ کا کافی عرصہ تک اثر و نفوذ رہا، اور بڑے بڑے علماء اور نامور شخصیتیں اس سلسلہ میں داخل ہوئیں۔

شاہ وجیہ الدین کی شخصیت | گجرات صدیوں سے گہوارۂ علم وفن اور سرچشمۂ روحانیت رہا ہے، یہاں کی خاک سے ایسے علماء، فضلاء اور صوفیہ پیدا ہوئے جن کے فیض سے ہندوستان کے اور علاقے فیض یاب ہوئے، گجرات کی عظیم المرتبت اور جامع کمالات ہستیوں میں حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی برگزیدہ شخصیت بھی ہے جن کے منبع علم سے جہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علوم نے آکر اپنی پیاس بجھائی، وہاں ہزاروں بندگانِ خدا ان کے روحانی فیوض و برکات سے بھی مالامال ہوئے۔

شاہ وجیہ الدین ۲۲ رمحرم سنہ ۹۱۰ھ سنہ ۱۵۰۴ء کو چانپانیر (محمود آباد) میں پیدا ہوئے، تقریباً سات آٹھ برس وہ چانپانیر میں مقیم رہے، اس کے بعد ان کے والد ماجد قاضی نصر اللہ سلطان مظفر حلیم کے زمانہ میں احمد آباد منتقل ہوکر آگئے، تو ان کی نشو ونما احمد آباد ہی میں ہوئی۔

قدرت نے ابتدا ہی سے انھیں نیک طینت اور صالح بنایا تھا، ذہانت اور قوتِ یادداشت بلا کی پائی تھی، تقریباً سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا اور آٹھویں سال تجوید کے ساتھ قرآن پاک علماء کے سامنے سنایا، اس کے بعد علوم متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہوئے، اور اپنے چچا سید شمس الدین سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر اپنے ماموں سید ابوالقاسم سے حدیث کا درس لیا، چودہ پندرہ سال کی عمر میں فن حدیث میں اس درجہ مہارت حاصل کرلی کہ اس زمانہ کے مشہور محدث علامہ محمد بن محمد مالکیؒ اور حضرت ابوالبرکات عبدالملک بنبانی عباسیؒ سے باقاعدہ تحصیل کرکے اس میں سندِ فراغت حاصل کی، اس کے بعد علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی تو علامہ جلال الدین دوانیؒ کے مایۂ ناز شاگرد مولانا عمادالدین طارمیؒ اور ابوالفضل محمد مظہرالدین گازرونی کے سامنے

ہوئے تلمذ تہ کیا اور چوبیس ۲۴ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر لی، تقریباً ستر ۷۰ سال تک احمد آباد میں معقول منقول کے پڑھانے میں اپنی اوقات بسر کی، اور شرح جامی سے لے کر تفسیر بیضاوی تک تینتیس ۳۳ کتابوں کے حواشی شروح لکھے اور استاذ الاساتذہ کا منصب جلیل اپنی زندگی میں ان کو حاصل ہو گیا تھا۔[۱]

شاہ وجیہ الدینؒ کو تصوف کے اعمال و اشغال سے دلچسپی ابتدائے طالبعلمی ہی سے تھی، جب سلوک کی طرف میلان بڑھا تو پہلے اپنے والد ماجد سے چشتیہ اور مغربیہ طریقوں کو سیکھا، پھر ذوق و شوق میں ترقی ہوئی کچھ دنوں حضرت شاہ قاضن چشتی نہروائیؒ کی صحبت سے مستفید ہوئے، شاہ قاضن کے انتقال کے بعد میاں بدر الدین ابو القاسم سہروردی کی طرف متوجہ ہوئے، اس دور کے ایک اور شیخ طریقت حضرت نجم الدین مدنیؒ سے بھی استفادہ کیا، بسا اوقات جذب و شوق کا غلبہ ہوتا تو حضرت سید کبیر الدین مجذوبؒ سے ملاقات کرتے اور درد دل کی شکایت فرما کر علاج کے طالب ہوتے، اس طرح اس زمانہ کے تمام مقبول سلسلہ ہائے تصوف کے اعمال اور اشغال سیکھے، اور ان کے مطابق اپنی زندگی ڈھالی۔ بعد میں جب ان کی علمی قدر و منزلت بڑھی، درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، منصب افتاء پر فائز ہوئے اور سلسلۂ شطاریہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ گجرات تشریف لائے تو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور مراحل سلوک کی تکمیل کر کے خرقۂ خلافت پایا۔[۲]

شاہ محمد غوثؒ کے حلقۂ ارادت میں آنے کا سبب

شاہ وجیہ الدین علویؒ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے حلقۂ ارادت میں کیسے اور کب آئے؟ اس کے متعلق مختلف روایتیں ملتی ہیں، بعض

---

[۱] اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، مصنفہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۴۳، ومنتخب التواریخ مصنفہ ملا بدایونی ج ۳ ص ۴۳ و ۴۴ وطبقات اکبری مصنفہ ملا نظام الدین بخشی ج ۲، ص ۴۷۳، اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار مصنفہ شیخ محمد غوثی ص ۴۰۵ تا ۴۰۹ ومآثر الکرام مصنفہ غلام علی آزاد بلگرامی ج ۱، ص ۱۹۶ و ۱۹۷ ونزہۃ الخواطر مصنفہ مولانا سید عبد الحی حسنی ج ۴ ص ۳۸۵ تذکرۂ علمائے ہند، رحمان علی ص ۲۴۹ و ۲۵۰ وغیرہ [۲] مجموعہ حالات شاہ وجیہ الدین مرتبہ محمد یوسف کھنکھٹے، ص ۷ ۔

ذکرہ نگاروں نے شاہ محمد غوثؒ کے گجرات کے اندر واقعۂ تکفیر کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے
یہی واقعہ شاہ وجیہ الدین کی بیعت اور خلافت کا ذریعہ بن گیا۔[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے اپنے
موں شیخ یحییٰ کے ساتھ شاہ محمد غوثؒ کی خدمت میں تشریف لائے اور شرف بیعت حاصل کیا۔[2]

حالانکہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قرین قیاس اور قابل وثوق شیخ عبدالنبی شطاری اکبرآبادیؒ کا
یان ہے، جسے انھوں نے اپنی کتاب "تذکرۂ اولیائے شطار"[3] میں لکھا ہے، اس بیان کی اور زیادہ اہمیت
س لیے ہے کہ شیخ عبدالنبی اور ان کے والد شیخ عبداللہ عثمانی سندیلوی ثم اکبرآبادی شاہ وجیہ الدین کے
امذہ میں ہیں، اور برسوں ان کی صحبت میں رہے ہیں، شیخ عبدالنبی اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ
ن کے استادوں میں شیخ مبارک دانشمند اور شیخ وجیہ الدین گجراتی تھے، تحصیل علوم کے بعد دو سال تدریس
رائض انجام دیے، پھر خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوا تو تمام کتابیں طلبہ میں تقسیم کر کے گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا،
ور ریاضتِ شاقہ میں مصروف ہو گئے، ان دنوں ان کے یہ دونوں استاد ان کے لیے افطار بھیج دیا کرتے
ی اثنا میں یہ خبر پہونچی کہ حضرت شیخ محمد غوثؒ چانپانیر میں تشریف لائے ہیں، شیخ وجیہ الدین نے
ن کے اوصاف و کمالات شیخ مبارک دانشمند سے سنے تو ان کے دل میں شیخ محمد غوث سے عقیدت
یدا ہو گئی، اس کا اظہار انھوں نے اپنے والد صاحب سے بھی کیا، جنھوں نے کہا کہ ملاقات سے پہلے استخارہ
ر لیں تو بہتر رہے گا، شیخ وجیہ الدین نے فرمایا کہ زیادہ تر لوگ ان کی روحانیت کے قائل ہیں، اس لیے میری
واہش ہے کہ ان کی خدمت بابرکت میں جلد پہونچوں، ان کے والد نے کہا کہ کوئی اپنے دل میں نشانی سوچ لیں،
گر وہ واقعی مرد درویش ہوں گے تو پتہ چل جائے گا، ورنہ پھر لوگ آپ پر طعنہ زن ہوں گے، شیخ وجیہ الدین کو
والد کی یہ بات پسند آئی، انھوں نے بڑی توجہ سے استخارہ کیا، دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

---

[1] تحفۃ الکرام، مصنف میر علی شیر قانع، ج ۱، ص ۴۴۔ [2] مجموعہ حالات شاہ وجیہ الدین، مرتبہ محمد یوسف کٹکٹے، ص ۲

[3] تذکرۂ اولیائے شطار فارسی قلمی، مملوکہ دار المصنفین۔

ب میں دیکھا کہ آپؐ فرما رہے ہیں کہ شیخ محمد غوثؒ کو اللہ تعالیٰ اس دیار میں آپ کے لیے اور بعض دوسر
ں کے لیے لایا ہے چنانچہ دوسرے روز شیخ وجیہ الدینؒ نے فرمایا کہ مجھے حضرت محمد غوثؒ کی خدمت میں
نے کا حکم ہوگیا ہے، تم بھی ساتھ چلو، آخر شیخ وجیہ الدینؒ اور شیخ مبارک دانشمندؒ اس قدوۂ شطار کی
مت میں چانپانیر پہونچے، شیخ وجیہ الدینؒ نے شیخ مبارکؒ سے کہا کہ وہ یہ نہ بتلائیں کہ یہ وجیہ الدینؒ
، جب مرشد نامدار کے دربار میں پہونچے تو حضرت غوثؒ کی خادمہ چنپا دائی نکل کر باہر آئی اور کہا کہ
ضرتؒ نے فرمایا ہے کہ شیخ وجیہ الدینؒ اور شیخ مبارک دانشمندؒ احمد آباد سے آئے ہیں، ان سے کہو کہ
ریف رکھیں، فقیر بھی تجدید وضو کے بعد حاضر ہوتا ہے، یہ دونوں حضرات کچھ دیر بیٹھے تھے کہ حضر
ثؒ باہر تشریف لائے اور بغل گیر ہوئے، اور فرمایا کہ میاں جی! حق تعالیٰ مجھے اس دیار میں آپ کے واسطے
ر بعض دوسرے یاروں کے لیے لایا ہے، شیخ وجیہ الدینؒ تعظیم بجالائے اور عرض کیا کہ حضرت والا کی خدمت
ں ارادت کی غرض سے آیا ہوں، حضرت غوثؒ نے فرمایا کہ میاں جی! آپ کو مرید ہونے کی چنداں ضرورت
تی لیکن میری جانب سے جو کچھ فیض مقدر ہے وہ آپ کو مل کر رہے گا، پھر حضرت غوثؒ نے اپنا
رقۂ مبارک شیخ وجیہ الدینؒ کو پہنا دیا اور فرمایا کہ میاں جی! آپ لوگوں کو ہدایت فرمائیں اور انھیں مرید
ریں، حضرت غوثؒ نے انھیں چند روز اپنے یہاں ٹھہرا کر بعض مراقبات و اشغال تلقین فرمائے اور
پھر انھیں احمد آباد رخصت کر دیا، اور یہ بھی فرمایا کہ آپ چلیں، آپ کے پیچھے ہم بھی پہونچتے ہیں۔

شیخ وجیہ الدینؒ نے واپسی کے بعد والد سے حضرت غوثؒ کی بے حد تعریف کی، اور فرمایا کہ تم
بھی انھیں دیکھ لوگے تو ان کے شیدا ہو جاؤگے، والد صاحب نے کہا کہ جو کچھ ازل میں لکھا جا چکا ہے وہ ظاہر ہو کے رہے گا، چند دنوں کے
بعد حضرت غوثؒ احمد آباد تشریف لائے، دستور خاں گجراتی کے خوبصورت اور دلکش باغ میں ورود فرمایا، شیخ وجیہ الدینؒ
حضرت غوثؒ کی ملاقات کیلیے چلنے لگے تو اصرار کر کے والد کو بھی ساتھ لے لیا، شیخ وجیہ الدینؒ برابر حضرت غوثؒ کی خدمت میں پہنچتے رہے،
ایک روز کچھ ریاضت و مجاہدہ کے سلسلہ میں عرض کیا تو حضرت غوثؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتائج و

ظہورت ضرور ظاہر فرمائے گا، پھر تھوڑی دیر کے بعد شیخ وجیہ الدینؒ نے والد سے کہا کہ کیوں نہ آپ بھی اس سلسلہ میں داخل ہو جاتے؟ والد نے جواب میں کہا کہ یوں تو مشائخ کے بہت سے سلسلے ہیں لیکن میری طبیعت دوسروں سے الگ ہے، میں تو چاہتا ہوں کہ ایسے بزرگ کے حلقہ میں آؤں جو واقعی اللہ کی راہ میں اپنے کو فنا کر چکا ہو، اسی اثنار میں حضرت غوثؒ کی زبان مبارک سے نکلا کہ ہرن شیر کے پنجے میں آگیا ہے، لوگوں کو اس جملے پر حیرت ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد عصر کی نماز حضرت غوثؒ کے ساتھ ادا کی اور رخصت ہونے لگے تو حضرت غوث بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے، بغل گیر ہو کر انھیں رخصت کیا...... سلطان محمود گجراتی نے قصبہ بھڑوچ کے کچھ گاؤں بطور مدد معاش حضرت غوث اور ان کے متعلقین کو عنایت فرمائے اور کہا کہ آپ فی الحال اس جگہ قیام فرمائیں...... بھڑوچ کے دوران قیام شیخ وجیہ الدینؒ اور شیخ مبارک دانشمندؒ حضرت غوثؒ کی خدمت میں برابر آتے، اور بعض دفعہ دو تین مہینے گذارتے[1]۔"

شاہ محمد غوثؒ کی کیمیائی صحبت کا اثر شاہ وجیہ الدینؒ اگرچہ علم و فضل کے اعتبار سے اپنے مرشد سے بہت آگے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ حضرت گوالیاریؒ کی ملاقات سے پہلے خدا کو نہیں جانتے تھے، انھیں ان کے مرشد ہی نے خدا تک پہونچایا ہے[2]، شاہ وجیہ الدینؒ کے مشہور شاگرد گلزار ابرار کے مصنف شیخ محمد حسن غوثیؒ لکھتے ہیں:

"شاہ صاحبؒ نے ایک تقریب کا موقع نکال کر یہ ماجرا بیان کیا کہ جن مقدمات پر الٰہی حقائق کی دریافت اور کشف موقوف ہے ان مقدمات کی تحصیل کا شوق میرے دل میں بھی اس وقت پیدا ہوا جب کہ میں درس و تدریس میں مشغول تھا، ناگاہ مشیت ایزدی جس کی ہر ایک مقدر شے میں سو سو نکتے اور نیرنگیاں ہیں، حضرت غوثؒ کو گوالیار سے گجرات کی طرف کھینچ لائی، یہ صورت مجھے حضرت غوثؒ کی شرف پابوسی سے مشرف ہونے کا باعث ہوئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں صاحب ممدوحؒ کی کیمیائی تربیت کے ذریعہ

---

[1] تذکرۂ اولیائے شطار فارسی قلمی ص ۲۲ تا ۲۵۔ [2] مجموعۂ ملفوظات قلمی ذخیرۂ شیروانی مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میرا اسلام تانبے سے کندن ہوگیا، رسمی عقائد کی قید سے نکل کر حقیقی ایمان کی بہشت میں چہل قدمی کرنا نصیب ہوا، اور چند روز کے بعد خلافت کا خلعت پاکر سرفراز ہوگیا، اور پالیا جو کچھ پاس نہ تھا، اور جو کچھ پاس ہے پھر وہ نہ ملا ہے

آنچہ حق بہر بندگان آراست | آرزو آنچناں نداند خواست[1]"

اسی طرح ایک اور مجلس میں شاہ وجیہ الدینؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت شاہ قاضن چشتیؒ کو خواب میں دیکھا کہ کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں، میں بھی وہاں پہونچ گیا، آپ نے کہا کون ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کا مرید، فرمایا: اس مرتبہ پر کیسے پہونچے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت محمد غوثؒ سے ملاقات کی بدولت، فرمانے لگے: "شیخ محمد غوث تو ایسے ہی مردانِ خدا میں ہیں[2]"

شاہ محمد غوثؒ کی روحانی عظمت | شاہ وجیہ الدینؒ کو جس روحانی شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ شاہ محمد غوثؒ کی شخصیت ہے، شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کا سلسلۂ نسب خواجہ فریدالدین عطارؒ سے ملتا ہے، ان کی ولادت، رجب سنہ ۹۰۶ھ میں ہوئی، جب بارہ[۱۲] سال کی عمر ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں پھرتے ہوئے جونپور تشریف لائے، اور قاضی صدر جہاں کے مکان پر قیام کیا، قیام کے دوران تحصیل علم میں مصروف رہے، کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کیا، پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہوگئے، شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں فیض روحانی حاصل کیا، پھر انہی کی ہدایت پر حاجی حمیدالدین حضور کی خدمت میں گئے، موصوف نے انھیں سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا، آپ کے ساتھ آپ کے برادر بزرگ شیخ پھول (م سنہ ۱۵۳۸ء سنہ ۹۴۵ھ) بھی تھے، حاجی حمیدالدین حضور نے دونوں بھائیوں کو اپنی فرزندی میں لیا، اور تعلیم و تلقین کے بعد شیخ پھول کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہوگئے، اور شیخ محمد غوثؒ کو مزید فیضان کے لیے کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا، شیخ محمد

---

[1] اذکارِ ابرار ترجمۂ گلزارِ ابرار ص ۳۰۳۔ [2] مجموعۂ ملفوظات قلمی۔

تیرہ۱۳ سال چند مہینے عبادت و ریاضت میں مشغول رہے، درختوں کے پتے کھا کر یادِ الٰہی کی، اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضور کے واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا، اسی عرصے میں اپنی مشہور تصنیف "جواہر خمسہ" لکھی، حاجی حمید الدین حضورؒ نے تمام منازل سلوک طے کرائے اور خرقۂ خلافت عطا کیا۔

محمد حسن غوثی نے گلزارِ ابرار میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ محمد غوثؒ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، انھوں نے جس کو قبول کر لیا، اس کے سر کی اور دل کی آنکھوں کو مشاہدہ اور معاینہ کا نور حاصل ہو گیا اور ان میں حقیقت بینی کی قوت آ گئی۔[1]

مغل بادشاہوں میں ہمایوں ان کا نہایت قدر دان اور عقیدت مند رہا، جلال الدین اکبر نے گراں بہا جاگیر مقرر کی، شیخ نے اس رقم سے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی، شیخ محمد غوث نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، رسالۂ معراجیہ، جواہرِ خمسہ، کلید مخازن، کنز الوحدۃ، ضمائر و بصائر ان سے یادگار ہیں، بحر الحیاۃ میں شیخ محمد غوثؒ نے ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کو فارسی میں منتقل کیا اور اپنی ابتدائی تصنیف جواہرِ خمسہ میں بھی ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی، اس سے شطاریہ طریقہ کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے جو اس کا ہندو یوگ سے تھا۔

گجرات میں شاہ محمد غوثؒ کی آمد اور واقعۂ تکفیر

۹۴۷ھ میں جب افغان سور کا غلبہ ہوا اور شیر شاہ برسرِ اقتدار آیا تو اس نے شیخ محمد غوثؒ کو پریشان کرنا شروع کر دیا، چنانچہ مجبوراً وہ گجرات تشریف لائے چونکہ شیخ محمد غوثؒ سے نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کو خاص عقیدت اور تعلق تھا اور بعض مہم میں آپ سے اس نے مشورہ بھی کیا تھا اور مراحمِ خسروانہ سے بھی سرفراز ہوئے تھے، اس لیے شیر شاہ کو ان سے کد پیدا ہو گئی تھی، اس کے علاوہ شیر شاہ کی ان سے نفرت کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ بعض حاسدوں نے ان کی تصنیف "معراج نامہ" شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور یہ کہا کہ اس میں بہت سی باتیں شریعت کے خلاف ہیں

[1] اذکارِ ابرار ترجمۂ گلزارِ ابرار ص ۲۸۹۔ [2] اورادِ غوثیہ مطبوعہ ۱۳۱۳ھ ص ۶۷۔

اس پر وہ غضبناک ہوا، اور ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوگیا، اس لیے آپ گجرات چلے آئے، چنانچہ شیخ محمد غوثؒ اپنی کتاب "اوراد غوثیہ" میں لکھتے ہیں:

"چہل سال بود کہ از بادشاہان تفاوت پیدا شد، سفر اختیار کردہ در ولایت گجرات آمد"۱؎

لیکن اس معراج نامہ کی شہرت گجرات میں بھی پہونچ چکی تھی، گجرات کے متقدر علماء ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے، چنانچہ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

" انھوں نے عروج حال میں ایک کتاب موسوم بہ معراج نامہ تصنیف فرمائی تھی اور اسی میں اپنے عروج حال کے مقامات کا ذکر کیا تھا، جب ہمایوں معزول الریاستہ ہوا اور ہندوستان سے ایران چلا گیا تو حاسدوں نے شیخ کی تصنیف معراج نامہ شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور کہا کہ اس میں شیخ نے بہت سی باتیں خلاف شرع لکھی ہیں، چنانچہ شیر شاہ ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوگیا، مجبوراً شیخ گوالیار سے ہجرت فرماکر گجرات تشریف لائے، علمائے گجرات بھی شیخ کی دشمنی پر آمادہ ہوگئے اور محضر تیار کرکے قتل کے درپے ہوئے، ان علماء میں شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ (جو گجرات کے علماء اور صلحاء اور مشائخ کے پیشوا تھے، اور شیخ محمد غوثؒ سے ان کو ارادت بھی تھی) نے فرمایا کہ جب علماء کی مجلس منعقد ہو اور معراج کے بارے میں بات آئے تو شیخ یہ فرمادیں کہ مجھ کو یہ معراج عالم خواب میں پیش آئی تھی، بیداری اور ہوش کے عالم میں نہیں، الغرض جب علماء کا معرکہ گرم ہوا تو شیخ نے فرمایا کہ یہ معراج اس وقت واقع ہوئی تھی جب کہ مجھے ظاہر کی کچھ خبر نہ تھی، چنانچہ اس تدبیر سے علمائے گجرات نے ان کی ایذا رسانی سے درگذر کیا"۲؎

ملا عبد القادر بدایونی اسی واقعہ کو دوسرے انداز سے لکھتے ہیں، چونکہ وہ شیخ کے معاصر ہیں اس لیے ان کا بیان زیادہ صحیح ہے:

" جب سلطان محمود گجراتی کے زمانہ میں شیخ محمد غوثؒ ہندوستان سے گجرات آئے تو شیخ علی متقیؒ نے

۱؎ اوراد غوثیہ، مطبوعہ ۱۳۱۳ھ ص ۶۷۔ ۲؎ خزینۃ الاصفیاء، حصہ دوم مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۲ء ص ۱۰۰

مشائخ کبار اور علمائے وقت میں بڑے با اقتدار تھے، ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا، سلطان نے اس فتوے کو میاں وجیہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کردیا، چونکہ میاں وجیہ الدین شیخ محمد غوثؒ کے گھر جاچکے تھے اور پہلی ہی بار میں ان کے شیدا و فریفتہ ہو گئے تھے، اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا، جب شیخ علی متقیؒ کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں صاحب کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور پوچھا: "آپ بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ اندازی پر کس طرح راضی ہو گئے"؟ شاہ وجیہ الدین جن کا قلب پہلے ہی شیخ گوالیاری کے دام الفت میں گرفتار ہو چکا تھا، جواب دیا، ہم اہل قال میں سے ہیں اور شیخ محمد غوث اہل حال میں سے ہیں، ہم ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتے اور ظاہری شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

پھر ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ شیخ محمد غوثؒ سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے، اس کا سبب یہی واقعہ ہے، میاں وجیہ الدینؒ کے رویے سے شیخ پھانسی سے بچ گئے، اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے، ظاہر شریعت پر ویسی ہی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقیؒ کی ہے، اور حقائق پر ایسی جیسی ہمارے مرشد کی نظر ہے۔[1]

شیخ محمد غوثؒ اہل و عیال، مریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات میں اٹھارہ سال رہے، کچھ وقت چانپانیر، بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد میں گذارا، اور پھر گجرات میں بھی بڑا اقتدار حاصل کیا، شاہ و گدا سب نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

شطاریہ سلسلہ میں شاہ وجیہ الدینؒ کا مرتبہ ہندوستان میں بیشمار شطاری بزرگ گذرے ہیں لیکن علمی و روحانی لحاظ سے جو جامعیت شاہ وجیہ الدین میں تھی، وہ کسی میں نظر نہیں آتی، وہ جہاں اسلامی علوم و فنون میں تفسیر، حدیث، فقہ کے جید عالم تھے وہاں معقولات میں فلسفہ، منطق، کلام اور ہیئت میں بھی یگانۂ روزگار تھے

[1] منتخب التواریخ ج ۳، ص ۴۴ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء۔

اس پر مستزاد یہ کہ تصوف کے اسرار اور باطنی کیفیات کے راز داں بھی تھے، صوفیوں اور درویشوں کے اخلاق و عادات نے انھیں عوام میں بے حد مقبول بنا دیا تھا، آپ کے علمی و روحانی کمالات کا اعتراف معاصر علماء و فضلاء نے بھی کیا ہے، اور بعد کے مورخین و تذکرہ نگاروں نے بھی۔

آپ کے معاصر مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

"میاں وجیہ الدین احمد آبادی ...... اپنے زمانہ کے بڑے عابد و متقی عالم تھے، شریعت کی نہایت پابندی کرتے اور گوشہ نشینی ان کا شعار تھا، ہمیشہ دینی علوم کے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام علوم عقلی و نقلی پر اس درجہ عبور تھا کہ درسی کتابوں میں صرف حاوی سے لے کر قانون، شفا، شرح مفتاح اور عضدی جیسی کتابوں میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو، ایک مخلوق ان سے فیض اٹھاتی رہی، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی، چنانچہ ہر روز بیشمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے، اور ان کی دعا کا بھی بہت جلد اثر ہوتا تھا، وہ کبھی اپنے طور پر دنیاداروں کے گھر بھی نہیں گئے، بجز ایک دو بار کے، وہ بھی طلب کرنے پر، نہایت کراہت کے ساتھ، اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے سوا باہر نہیں نکلتا تھا، سب کے مرجع و مرکز تھے۔ وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے، موٹے جھوٹے کپڑوں ہی پر قناعت کرتے تھے، جو کچھ نذر و نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے تھے، سادات کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت و ارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے، انھیں کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی، صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔"[1]

دوسرے مشہور مورخ اور آپ کے معاصر خواجہ نظام الدین احمد بخشی لکھتے ہیں:

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳، ص ۳۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء

"میاں وجیہ الدین گجراتی پچاس سال جادۂ ارشاد وہدایت پر گامزن رہے، فقر وفاقہ اور توکل میں زندگی بسر کی، ہر وقت درس دیا کرتے، علوم نقلی وعقلی سے خوب آگاہ تھے، عمدہ تصنیفات آپ کی ہیں اور اکثر علمی کتابوں پر آپ نے شروح وحواشی لکھے ہیں[1]۔"

تیسرے معاصر ملا عبدالباقی نہاوندی ہیں جنھوں نے آپ سے استفادہ بھی کیا ہے لکھتے ہیں:

"... اکثر ہندوستان کے متبحر علماء میاں صاحب موصوف سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں، اس زمانہ کے فضلاء میں کوئی جامعیت میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، مجاہدۂ نفس اور دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی میں کمال درجہ کوشش کی ہے، تزکیۂ نفس میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، میاں صاحبؒ کے عمدہ احوال کی صدور جو شہرت ان کے تفصیلی حالات بیان کرنے سے روکتی ہے[2]۔"

چوتھے معاصر اور جید عالم شیخ عبدالقادر عیدروسی لکھتے ہیں:

"وہ اصحاب علم وزہد میں تھے، انھیں لوگوں میں بڑی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی، طلبہ نے آپ سے بہت سے فنون میں نفع اٹھایا، اور اس کی بڑی شہرت ہے[3]۔"

مشہور مورخ معتمد خان لکھتے ہیں:

"شیخ وجیہ الدین شیخ محمد غوثؒ کے خلفاء میں ہیں، لیکن ایسے خلیفہ کہ مرشد بھی ان کی خلافت پر ناز کرے، سوائے ان کے کوئی نہیں ملے گا، شیخ وجیہ الدینؒ کی ارادت حضرت شیخ محمد غوث کی عظمت کی بڑی واضح اور قطعی دلیل ہے، شیخ وجیہ الدینؒ ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ تھے[4]۔"

ملا محمد صادق فرماتے ہیں:

---

[1] طبقات اکبری ج ۲، ص ۴۳۲، [2] مآثر رحیمی ص ۱۷، حصہ سوم، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ [3] النور السافر من اخبار القرن العاشر، ص ۴۵۶، مطبعۃ الفرات بغداد ۱۳۵۳ھ۔ [4] اقبال نامۂ جہانگیری مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۵ء، ص ۱۰۸۔

"شیخ وجیہ الدین قدس سرہٗ علوی ہیں، اپنے زمانہ کے علمائے کبار میں ہیں، صاحب تقویٰ اور بڑے محتاط، شریعت کے راستہ پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور ہمیشہ درس و افادہ میں مشغول رہتے"[1]

معارج الولایۃ کے مصنف غلام معین الدین فرماتے ہیں:

"شیخ وجیہ الدین علویؒ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، اور شیخ محمد غوثؒ کے خلیفہ تھے، مرید کسی اور سے تھے، نہایت سن رسیدہ، رات میں ریاضت و مجاہدہ کرتے اور دن کو طالبعلموں کے پڑھانے میں مشغول رہتے"[2]

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"جب شیخ محمد غوث گوالیاری صاحب جواہر خمسہ گجرات میں وارد ہوئے تو شیخ وجیہ الدین ان کے جمال میں گم ہوگئے، اور انہی کے زیر سایہ طریقت کی انتہا تک پہونچے، طلبہ ان کے افادات عالیہ سے مستفید ہوئے اور مشرق و مغرب کو اپنے انوار و برکات سے معمور کر دیا"[3]

طریقۂ شطاریہ کی اشاعت میں شاہ وجیہ الدینؒ اور ان کے خلفاء کا حصہ

شاہ وجیہ الدین کی شخصیت گوناگوں اوصاف اور محاسن کا مجموعہ تھی، خانقاہ اور مدرسہ کے حدود سے کبھی باہر نہ گئے، مگر خلائق کا ہجوم ان کے آستانہ پر حاضر رہتا، جہاں ان سے چودہ سو آدمیوں کو فیض روحانی حاصل ہوا، وہاں ان کے تلامذہ کی تعداد ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیل گئی، شطاری سلسلہ کے بزرگوں میں آپ کے شاگردوں اور خلفاء کے ذریعہ سب سے پہلے اس طریقہ کی اشاعت عرب ممالک میں ہوئی، اور اس طریقہ کو علمی حلقہ میں خاص اہمیت دی گئی، شاہ صبغۃ اللہ بھروچی آپ کے مایۂ ناز شاگرد اور نامور

---

[1] طبقات شاہجہانی حصہ اول مخطوطہ ص ۳۱۹، مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

[2] معارج الولایۃ، مخطوطہ ج ۲ ص ۲۰۵، مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ۔ [3] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، ص ۴۵۔

تذکرۂ گلشنِ بے خار

از

جناب خالد حسن قادری صاحب۔ لندن

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ و حسرتی کا تذکرہ گلشن بے خار اردو شعراء کے تذکروں میں ایک م
رکھتا ہے، ان کی تاریخ ولادت مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف درج کی ہے، لیکن زیادہ تر اتفاق
پر قرار پایا ہے[1]، لیکن یہ تاریخ درست نہیں معلوم ہوتی، تذکرۂ گلشن بے خار کے دیباچہ کے آخر میں

"ابتدائے ایں کارنامہ در ابتدائے سال ہزار و دوصد و چہل و ہشت از ہجرت بودہ وانتہا در
انتہائے ہزار و دوصد و پنجاہ .... وامروز اشہب تیز گام عمر رواں بست و شش مرحلہ
طے کردہ ......[2]"

یعنی سنہ ۱۲۵۰ھ میں ان کی عمر چھبیس[26] برس کی تھی، اس حساب سے ان کی ولادت ۱۲۲۴ھ سنہ
قرار پاتی ہے، اس سنہ کی تنقیح ایک دوسری طرح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان
فارسی دیباچہ میں لکھا ہے:

---

[1] نادرات غالب، جناب سید آفاق حسین کراچی، ص ۱۶۵، خطوط غالب، مولانا غلام رسول صاحب مہر، ا
گل رعنا، مولوی عبدالحئی، ص ۳۲۶، دلی کا دبستان شاعری، نورالحسن ہاشمی، ص ۹۸۔ ۲۵۷۔
تحقیق کی روشنی میں، ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ (نوٹ) صرف شادانی صاحب نے اس تاریخ سے اختلا

[2] گلشن بے خار، لکھنؤ ۱۹۱۰ء، ص ۶۔

"..... در سال شانزدہم نیر دے سخن گوئی دادند، شیوا بیانی برتر از عادت بخشیدند، و در بست
و سیوم بال اعراض کرامت کردند، و یکبارہ دل ازیں شغل برگرفتند، ہر دو بار گراں بار منت نہادند،
و آں روز برہزار و دو صد چہل افزوں بود و امروز بر چہل ہفت افزون است ....."[1]

یعنی آغازِ شاعری کے وقت سنہ ۱۲۴۰ھ میں ان کی عمر سولہ[16] برس کی تھی، ۱۶ - ۱۲۴۰ = سنہ ۱۲۲۴ھ یا سنہ ۱۸۰۹ء
اسی طرح ترکِ شاعری کے وقت تیئیس[23] برس کی عمر تھی اور سنہ ۱۲۴۷ھ ، ۲۳ - ۱۲۴۷ = سنہ ۱۲۲۴ھ سنہ ۱۸۰۹ء۔

تذکرۂ گلشن بے خار جیسا کہ خود بیان کیا ہے سنہ ۱۲۴۸ھ میں مرتب کرنا شروع کیا اور سنہ ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں مکمل کیا۔ آغازِ ترتیب اور تکمیلِ تالیف کی دو تاریخیں بھی خود ہی نکالی ہیں، اور حق یہ ہے کہ بہت بے ساختہ اور عمدہ ہیں، محولۂ بالا دیباچۂ تذکرۂ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں:

"..... بسملہ منتخب زیب تاریخ آغاز است و الحمد للہ علی حصول المقاصد و الشکر لہ تاریخ اتمام،
و الحمد للہ علی ذٰلک، و امروز اشہبِ تیز گامِ عمر رواں بست و شش مرحلہ طے کردہ ....."[2]

یہ فقرے اس قدر بے ساختہ ہیں کہ عام طور پر قاری کا ذہن اس طرف مبذول نہیں ہوتا، ورنہ "بسملہ منتخب زیب" سے سنہ ۱۲۴۸ھ اور اگلے پورے فقرے "الحمد للہ علی حصول المقاصد و الشکر لہ" سے سنہ ۱۲۵۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

یہ تذکرہ کس طرح مرتب ہوا، اس کو بھی خود ہی نہایت مرصع اور رنگین نثرِ فارسی میں بڑے لطف کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اپنے متعلق بعض ایسے کلمات لکھ دیے ہیں جن سے بوئے تفاخر بلکہ تجبّر آتی ہے، اور اسی طرح کے بیانات سے ان کے نکتہ چینوں کو حاشیہ آرائی کا بجا طور پر موقع ہاتھ لگا، دیباچہ میں لکھتے ہیں: دوستوں کی خاطر ایک بیاض جمع ہو گئی "روشن تر از سپیدۂ صبحِ صادق، گلستانے آراستہ شد رنگین تر از صفحۂ خیالِ عاشق" اور ایک تذکرہ ترتیب پا گیا جس میں "بنہایت مختصر" طور پر ریختہ گویانِ بلاغت طراز

---

[1] کلیاتِ شیفتہ مرتبہ جناب کلب علی خاں صاحب فائق، لاہور، ص ۲۸ سنہ ۱۹۶۵ء [2] گلشن بے خار، محولۂ بالا، ص ۶۔

کا کلام تھا، لیکن پھر کہتے ہیں کہ میں کہاں اور یہ وبال کہاں، اس کے بعد جو فقرے لکھے ہیں وہ دلچسپ ہیں،

"واو از خویشتن ناشناسی با شایستہ قدر سخن نبود کہ طلسم تازہ درین کہنہ رواق بربستے، و توبہ جہانی

بر فرق افلاطون و ارسطو شکستے کہ از فرط کبر و ناز بہ نثر بو نصر و بو علی چشم التفات نمی کشادم و گوش

رغبت نمی نہادم، باین ہمہ بات چگونہ سرد کارم افتاد۔ بیت

من مرغ خوش ترانہ باغ فضیلتم طبع مرا بزمزمۂ شاعری چہ کار ....."[1]

اسے نواب صاحب کے نشۂ جوانی کی ترنگ سمجھنا چاہیے، عمر کا بھی کچھ تقاضا ہوتا ہے، اگرچہ غیر معمولی

ذہانت کے علاوہ علوم رسمیہ کی تکمیل بھی کر چکے تھے، لیکن پھر بھی صرف چھبیس[۲۶] برس کی ہی عمر تھی، عرفی کی

طرح اس کم عمری میں ہی بلا شبہہ قابل رشک مہارت اور قدرت بہم پہونچائی تھی، فارسی کی رنگینی، فقروں کا

در و بست، الفاظ کا انتخاب، حسن بیان اور لطف معانی کے لحاظ سے شیفتہ کی فارسی نثر بھی ایک خاص

انداز رکھتی ہے، یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ غالب اور عرفی کی طرح وہ بھی شاعری کو "دونِ مرتبہ من است"

کہتے ہیں[2]۔ اور مزید لطف یہ کہ شاعری ہی نہیں بلکہ ریختہ گوئی اور زبان اردو دونوں کو ہی کچھ قابل وقعت

نہیں گردانتے، اسی محولۂ بالا دیباچہ میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ ایک "یارے عزیز، حبیبے دلخواہ" نے

کہا کہ کیا اچھا ہو اگر ایک بیاض مرتب ہو جائے جس میں" ذکر اسلاف کبار و اخلاف سعادت آثار" ہو،

اور یہ مجموعہ نہ صرف ہر وقت اور ہمیشہ دوستوں کی طرح ہمدمی و ہم جلیسی کرے گا، بلکہ بقائے دوام

بھی اس ذکر واذکار کو حاصل ہو جائے گی، اس مشورہ اور فرمایش پر شیفتہ کا جواب ملاحظہ ہو:

"...... گفتمش اے مرغِ دلم شکارِ تو طائر سدرہ نشین را بر چوب مغیلان آشیاں بند و شاد و قلزم

---

[1] گلشن بے خار، محولۂ بالا، ص ۴۔

[2] اگر او نام زد ننگ شد از ذلت شعر شعر از عزتِ او نیک بر آید ز ذلل (عرفی شیرازی)

(شعر العجم، شبلی نعمانی ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۲)

افتادہ در وحل پسند، سرت گردم من و سودائے شعر و آں گاہ ریختہ ......"

ترجمہ :- میں نے اس سے کہا، اے وہ کہ میرا طائرِ دل تیرا شکار، تو [مجھ] طائر سدرہ نشین کیلیے ببول کی ٹہنی پر آشیانہ مت بنا، اور یہ نہ پسند کر کہ [مجھ جیسا] شناورِ قلزم کیچڑ میں پھنسے، میں تیرے قربان میں اور سودائے شاعری! اور پھر وہ بھی ریختہ!! .....

شیفتہ کا وہ یارِ عزیز اور حبیب دلخواہ جس نے ان سے فرمایش کی تھی ان کی اس خود ستائی سے نہ صرف یہ کہ مرعوب نہیں ہوا بلکہ خاصی صاف بیانی سے نواب صاحب سے کہدیا کہ :

"..... نہ اگر دانشہائے پیشینت محیطِ دلم بودے منسوب بجنونت می نمودم و در اثباتِ ایں محتاج برہان و دلیل نبو دم کہ ایں حرف نہ اگر ہذیانست از چیست ......"[1]

ترجمہ :- اگر تمھاری پہلی عقل کی باتیں میرے دل پر نہ چھائی ہوتیں تو میں تمھیں دیوانہ گردانتا اور اس بات کے ثبوت میں مطلق کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ سمجھتا کہ اگر یہ [جو کچھ تم نے کہا] ہذیان نہیں تو اور کیا ہے .....

شیفتہ کے اس محبِ صادق نے صرف یہی نہیں کہا، بلکہ اردو زبان کی تحقیر پر بھی نواب صاحب کی طبیعت صاف کی، پہلے تو شعر و شاعری کی اہمیت کو مختصر مگر موثر الفاظ میں واضح کرکے یہ شعر سنایا :

مداں رتبۂ شعر را سرسری بود شاعری بعد پیغمبری

اس کے بعد زرا دلنشین انداز میں کہا:[2]

"اور یہ جو ریختہ کو تم نے حقیر تر جانا اور اس زبان کو نہایت درجہ ادنیٰ سمجھا تو کیا یہ نہیں سمجھتے کہ اصل مدعا تو معانی سے ہے، لہٰذا جو بھی معانی تازہ الفاظ فصاحت افزا کو بخشے جائیں وہ قابلِ ستایش اور گوشِ دل و جان سے سننے کے لائق ہیں ....."

---

[1] گلشنِ بے خار محولۂ بالا، ص ۵ ۔ [2] ایضاً، ص ۵ ۔

اس گفتگو اور انہام و تفہیم کے بعد شیفتہ نے تذکرۂ شعراء مرتب کرنے کا واثق ارادہ کر لیا۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں کن امور کا التزام کیا اور کس طرح انتخاب عمل میں آیا اور کیا معیار ان کے ذہن میں تھا، اس کی طرف واضح طور پر انھوں نے اپنے تذکرۂ صدر دیباچہ میں اشارے کر دیے ہیں۔ تذکرہ کے لیے فراہمیِ مواد کے سلسلہ میں تین معروف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں، اولاً شعراء کے دواوین فراہم کر کے اس سے انتخاب کیا جائے، ثانیاً اگر دواوین فراہم نہ ہو سکیں تو جو بیاضیں اور تذکرے پہلے مرتب ہو چکے ہوں اور دستیاب ہو سکیں ان سے کلام و معلومات حاصل کیے جائیں، ثالثاً خود اپنے طور پر جو کلام شعراء اور حالات و معلومات علاوہ ان دو ذرائع کے حاصل کیے ہوں انھیں درج کیا جائے۔ شیفتہ نے بھی اپنے دیباچہ میں اسی طریقۂ کار کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں:

"دواوینِ اساتذۂ سلف و خلف بدقت و نصفت ملاحظہ وازاں التقاط کردم، دیوان کسیکہ بنظر نہ رسیدہ و دست بہم نہ داد انگارش از تذکرہ ہا و سفاین دہر آنچہ بخاطر بود بدستورِ بہ نقطۂ انتخاب موشح و ثبت افتاد......[1]"

تذکرہ نگاری کا مقصد بھی شیفتہ کے نزدیک دیگر مصنفین سے ذرا مختلف تھا، وہ محض شعراء کے ناموں کی طویل فہرست مرتب کرنی نہیں چاہتے تھے، بلکہ شاعروں کے احوال کے سوا عمدہ اشعار کی بیاض مرتب کرنا بھی ایک مقصد تھا، اس لیے جہاں اکثر تمام مشہور اساتذہ کے نام آ گئے ہیں، وہاں بعض ایسے شعراء کے حال چھوڑ دیے ہیں جن کے کلام میں ان کے نزدیک کچھ لطافتِ بیان اور لطفِ سخن نہ پایا گیا، کیونکہ ان کے خیال میں مشکل سے کوئی مشہور استاد ایسا ہوگا جس کا ایک شعر بھی قابلِ انتخاب نہ ہو، اس کے ساتھ ہی انھوں نے نہایت دیانت سے اس بات کا اعتراف بھی کنایۃً کیا ہے کہ دو سال کی مدت ایک معقول تذکرے کی تالیف کے لیے کافی نہیں، اور اسے نہایت خوبصورتی سے صرف ایک لفظ میں

---

[1] گلشنِ بےخار، محولۂ بالا ص ۵

بیان کر دیا ہے، یعنی اپنی اس تحریر [تذکرے] کو عجالہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جلدی اور عجلت میں منضبط کی ہوئی تحریر۔ اور اسی لیے کہتے ہیں کہ اگر کسی قابل ذکر شاعر کا بیان اور "خیالات شیریں، وافکار رنگیں" کا حوالہ اس عجالہ میں نہ ملے تو مصنف کو قصور وار قرار نہ دیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ اس کا حال وکلام اس تک پہونچ ہی نہ سکا۔

دیباچہ کے الفاظ یہ ہیں:

"...... چوں مدِ نگاہِ ایں تالیف ومطمحِ نظر ازیں تصنیف فرد آوردنِ اشعارِ دل آراست نہ شمار آسامی، شعرا ازانکہ سامعہ فریب بیتے بہ نظر نہ رسید، عام تر از مجاہیل ومعارف واحیا واموات نامش دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نگردید، اما از مشاہیر کم کسے است کہ شعرے لائق نداشتہ باشد، ناگزیر ایراد ہمہ شاں لازم آمدہ من غیر التزام وبایں علت اکثرے مدعیان کاذب را دریں اوراق نہ بینی جہل از حال شاں بتقصیر نسبت نہ کنی، واگر یکے با خیالات شیریں وافکار رنگیں دریں عجالہ ذکرے نیست پنداری کہ بما نرسیدہ ......[1]"

نقاد کا منصب ہے کہ وہ دوستی دوشمنی کی سطح سے بلند ہو کر جو معیار اور اقدار اس نے اپنے لیے مقرر کیے ہیں صرف انہی کے پیمانے سے کلام کو جانچے اور تولے، مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اس کے معیار و اقدار سے اختلاف کرنا چاہیں تو کریں، لیکن انھیں نقاد کی ادبی دیانت اور غیر جانب داری پر شبہہ کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہونی چاہیے، شیفتہ نے اسی اصول کو مدنظر رکھا ہے، اور دیباچہ میں صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ:

"...... از مہر وکین احباب واعدا ان شاءاللہ چوں دلِ اہلِ صفا دریں بیاض اثرے نیابی واز ان مختصر آمد تا بملالت نہ انجامد ......[2]"

---

[1] گلشن بے خار، محولۂ بالا ص ۶۔۵ [2] ایضاً ص ۶

آخری فقرہ قابلِ غور ہے، جہاں وہ اپنے مخصوص اندازِ نظر کے باعث بظاہر خردہ گیری اور نکتہ چینی پر مائل نظر آتے ہیں، وہاں بھی انھوں نے اختصار کو اس لیے ملحوظ رکھا ہے کہ تنہائے گفتنی کہنے سے کسی دل پر گردِ ملال کا دھبہ نہ پڑے۔ لیکن اس احتیاطِ بیان واحترامِ زبان کے عزم کے باوجود شیفتہ نے جو کچھ کہا اور جس طرح کہا اس نے بعض ادب نوازوں کے سینوں کو ایسا برمایا کہ گویا زبانِ حال سے کہہ اٹھے کہ ؏ "مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا"۔ اور جس جس کو زمانہ نے فرصت دی، اس نے واقعی تماشا بھی دکھا دیا۔

شیفتہ کی اصابتِ فکر، ژرفِ نظر، نکتہ دانی، سخن فہمی اور نقد و نظر کی صلاحیتوں سے انکار محال ہے، لیکن شیفتہ کے مزاج کی تشکیل اور خیالات و افکار کی ترتیب میں جو عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، انھیں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ہماری مشرقی تہذیب کا شایستہ نمونہ تھے۔ ادب ان کے ہاں واقعی ادب کا نام تھا، ان کے ذہن نے ادب بمعنی تعلیم و تعلم اور ادب بمعنی شایستگی و تہذیب دونوں کا ادراک غیر منقسم وحدت کے طور پر کیا تھا۔ بے راہ روی، ژولیدہ بیانی، بے مقصد سطحیت، کردار کی بے تہی اور خیالات کی بے مایگی، عوام پسندی کی بیساکھیوں کے سہارے ان کے ادبی گلیاروں میں تنگا پھسے بے ہنگام نہیں برپا کر سکتی۔ ان کے اس احتسابی کردار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان کا یہ ادبی تقشف کچھ بہت زیادہ مستحسن بھی نہیں، لیکن ان کا مزاج ان کی خاندانی روایات کے سانچے میں ڈھلا تھا اور ان کی طینت و سرشت مسلمانوں کی کئی سو سالہ تہذیب و شایستگی کی دین تھی۔

اس عہد کے شرفائے ادب اگر ادب و شاعری کے عوامی کردار کا صحیح اندازہ نہ کر سکے تو اس میں کسی ایک فرد کو بہت کچھ قصور وار نہیں گردانا چاہیے۔

؏ تمام شہر ہے، دو چار، دس کی بات نہیں

شیفتہ کے نکھرے ہوئے ادبی مزاج اور سلجھی ہوئی تنقیدی صلاحیتوں پر اب دلائل و براہین لانے کی ضرورت نہیں رہی، آزردہ، صہبائی، غالب، حالی سب نے مختلف انداز میں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے، حالی کی رائے اب قولِ مشہور کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس کا نقل کرنا بھی غیر ضروری ہے، البتہ ہم آزردہ اور غالب کے چند فقرے نقل کرتے ہیں، آزردہ گلشنِ بے خار کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

"نقد سخن را تنقیہ ذہن نقادش درکار است واز غور طبع وقادش ناچار چہ تا زر بمحکِ امتحان نزند روئے کامل عیاری نہ بیند، وطلائے ناب تا در بوتہ گداز نیاید نقش سکہ درست نہ نشیند، نقطۂ انتخابش خال رخسار عرائس اشعار...... شعرے کہ بانتخابش نرسیدہ چوں حرفیست مشکوک وہیچے کہ روئے التفاتش ندیدہ ہمچو طلائے ست غیر مسکوک......"[1]

آخری جملے میں جو بات آزردہ نے نثر میں کہی ہے، غالب اس سے پہلے غزل میں کہہ چکے تھے:

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او　　　　نوشت در دیوان غزل تا مصطفٰی خاں خوش نکرد[2]

شیفتہ نے جن شعراء کی تعریف کی ہے ان میں سے بیشتر وہی ہیں جن کی تعریف آج تک تمام سخن سنج و سخن فہم نقاد کرتے چلے آئے ہیں، لیکن بعض کی تعریف کے سلسلہ میں شیفتہ نے جو صیغے افعل التفضیل کے استعمال کیے وہ ان کے حریفوں کے لیے تو ثقیل تھے ہی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے ممدوحین کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ "رکابِ قزل ارسلان کی بوسہ دہی کے لیے کرسیٔ نُہ فلک زیرِ پائے اندیشہ"[3] رکھدی گئی ہے، چنانچہ شیفتہ کے ایک ممدوح اور مادح غالب نے اپنی تقریظ میں شیفتہ کو

---

[1] گلشنِ بے خار محولۂ بالا ص ۲۵۲　[2] کلیاتِ غالب نظم فارسی، نولکشور پریس ۱۲۹۲ھ، ص ۴۱۹۔

[3] ظہیر فاریابی [وفات ۱۲۰۲ھ] نے قزل ارسلان کی مدح میں لکھا تھا:

نُہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پائے　　　　تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

باقی (صفحہ ۱۳۶ پر)

وقت نظر اور ذوق سے خوب تر کی جستجو اور دشوار پسندی کی خو کو سراہنے کے بعد اس بات کا اندیشہ ظاہر کر دیا کہ بعض خردہ گیروں کو ان کی اس روش پر نہ صرف اعتراض ہوگا، بلکہ عیب جو طبیعتیں اور بینگاہیں تلاش معایب میں مصروف رہیں گی، اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں:

"نواب ہمایوں آثار، والا شان و خان زود پیوند فرہنگ پسندیدہ گفتار، آزادہ ماہ گرامی دانش (اندوز و سخن گوئے گرامی نہاد مبارک نفس دوست مہر پیشہ نغز گوہر نواب مصطفیٰ خان بہادر... بہ فراہم آوردن تذکرۂ ریختہ گویان قدسی انجمنے برآراستہ ...... و بہ نظارۂ آب و تاب شناسائی ایں دیرستان آذرکدہ پارس را از آتش بتے دیگر در نہاد دادہ۔ از رشک ذوق بخشی سخنان نغز و غیرت انداز رقم سنج ایں تذکرہ وجد عیش تماشائے ایں ہنگامہ لرزہ در اندام مرعیان بدانساں نیفتادہ کہ باربد راز خمہ از سرانگشت، بلکہ زہرہ با نغمہ از ساز در آنی را خامہ از کف بلکہ عطارد را نقش از قلم و پرویز را زورق از ساتگیں، بلکہ بادہ را تندی از خویش فرو ریزد ...... دانم کہ دیدہ ہا آہو بین است و گروہے از نکتہ چینان در کمین، با ہم سرایند کہ غلانے در ستودن مبالغہ از اندازہ بردہ و بگزاف داد تر زبانی داد، ہے ہے، مدح سخن و آنگہ گمان اغراق نہ آخر بہ تبلیغ و علو بخشی از گفتار و نوعے از کلام است، لاجرم سخن را چنداں کہ ستایند سرمایۂ نطق ہم از گنجینۂ اوست، و از ہر در کہ بجلوہ درآیند ہم در آئینۂ اوست ...."[1]

مولوی امام بخش صہبائی اس دور کے امام فن اور دیدہ ور عالم تھے، ایسے کہ لوگ ان کے

(بقیہ ص ۱۳۵) شیخ سعدی [۱۱۸۴ - ۱۲۹۱ء] نے اسی کے رد میں لکھا:

چہ حاجت کہ نہ کرسیِ آسماں نہی زیر پائے قزل ارسلاں

(بوستان، نولکشور، لکھنؤ ۱۹۶۲ء، ص ۱۹)

[1] گلشن بے خار بحولۂ بالا ص ۸ - ۲۵۶ -

یضِ صحبت کے قائل اور جنھیں ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا، بجا طور
ں پر نازاں تھے۔ غالب نے اگرچہ ان کی شہادت [۱۸۵۷ء] کے برسوں بعد بے وجہ ان پر فقرے
ست کیے اور لکھا،

"..... میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبا کا تلمذ موجب عز و وقار ہو...[1]"

پھر ایک دوسری جگہ لکھا؛

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے آپ [یعنی مولوی امام بخش] کو اپنا امام مان لیا ہے..... اگر حضرت [رحیم بیگ] بفتح قاف ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققَین کہتے تو ایک ماموم [پیرو] آپ اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا .....[2]"

"..... غالب کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ امام بخش صہبائی سب محققوں کے امام تو نہیں ہو سکتے، دو محققوں کے امام ہو سکتے ہیں، ایک رحیم بیگ کے، دوسرے نرائن داس تنبولی کے، صہبائی اس زمانہ میں زندہ نہ تھے ورنہ ان فقروں کا مزہ لیتے.....[3]"

لیکن اس میں مطلق کلام کی گنجایش نہیں کہ صہبائی نہ صرف اپنے دور کے اعلیٰ پایے کے عالم تھے
ہ آج بھی ان کے ہم پلہ ان کے اہل وطن میں بہت نہیں، مولانا صہبائی فارسی نثر میں بھی ایک
خصوص اسلوب رکھتے تھے، انھوں نے گلشن بے خار کی ایک طویل تقریظ لکھی، اس میں سے صرف
ب دو جملے نقل کیے جاتے ہیں؛

"..... ستوما بحصولِ شہرت طفیلے گیا و مزار زمانے ست، صد قصیدۂ شکر مصنفش زیب بیان

---

[1] خطوط غالب ؛ مولانا غلام رسول صاحب مہر لاہور، بار دوم ص ۵۳۵ [2] ایضاً : ص ۴۲۰ [بنام
مرزا رحیم بیگ] [3] داستان تاریخ اردو ؛ جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری ، آگرہ ۱۹۵۷ء
ص ۹۷ - ۲۰۸.

و بیر تقی را تحصیل تا و اداۂ انعام لوح مرقد جلد کش بے متضمن عبارات سپاس آرائی نگارندۂ این نسخہ ......[1]

شیفتہ نے گلشن بے خار میں آزردہ کے حال میں ان کے اشعار کے متعلق کوئی تنقیدی بات نہیں لکھی، البتہ ان کے علم و فضل کو صد درجہ سراہا ہے، بعض جملے یہ ہیں[2]:

"آزردہ تخلص افضل الفضلاء، اعلم العلماء، قدوۂ بلغائے ذوی الاحترام، اسوۂ فصحائے عالی مقام، حاوی مناقب جلیلہ بکثرہا و قلبا جامع مناصب جلیلہ باسرا جلہا، باعث ظہور فنون عجیبہ، مالک ازمۂ علوم غریبہ، ملک ملکِ بیان و معانی، ..... فرمانروائے قلمرو سخندانی ......"

اس کے بعد دس سطروں میں نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ان کے علوم و معارف، ابیات قصیدہ، زباندانی و سخن سنجی کو سر حد ادراک سے بھی پرے جا کر سراہا ہے، اور پھر کہتے ہیں[3]:

"...... اگرچہ محامد ذکر شریف ایشاں را درین جریدہ آوردن نشاید اما این نامۂ گرامی را بے نام نامیش کہ تا قیام قیامت بر جریدۂ روزگار ثبت باد، در نظر اولوا الابصار قبولے نیاید، لاجرم بگذارش نبذے از جلائل مآثر ایشاں می پردازد، و بدین پایوں مذکور رونق این صحیفہ افزوں تر می سازد۔"

اس کے بعد آگے چل کر کہتے ہیں کہ:

"...... باعتقاد من، روزیکہ بے شرف مجالست ایشاں بپایاں آید، داخل ایام عمر نیست ......"

سبحان اللہ! کوئی صادق الولا مرید با صفا اپنے مرشد ولایت آثار کی اس سے بڑھ کر کیا تعریف کر سکتا ہے؟ غالب کے احوال میں شیفتہ نے زیادہ جگر کاوی نہیں کی، پھر بھی لکھتے ہیں[4]:

---

[1] گلشن بے خار، محولۂ بالا، ص ۳ ـ ۲۶۲ [2] گلشن بے خار محولۂ بالا ص ۱۰۔ [3] ایضاً۔
[4] گلشن بیخار محولۂ بالا ص ۱۳۹۔

"..... طوطیٔ بلند پرواز معانی است و بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی پیش بلندیٔ خیالش اوج فلک پستیٔ زمین است و در جنب تہ نشینی غورش سرفرازی قارون کرسی نشین، شاہین فکرش جز بشکار عنقا نپرداز دو اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد، اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی جز بدکانش درنیابی ......"

غالبؔ کے احوال میں شیفتہؔ نے تنقیدی اشارے کیے ہیں، اُن کی عسیر الفہمی، دشوار پسندی کی طرف یہ کہہ کر اچھا اشارہ کیا ہے کہ ان کی فکر کا شاہین عنقا کے شکار کے سوا کسی طرف رغبت ہی نہیں رکھتا، آگے چل کر ان کی غزل کو نظیری کی طرح بے نظیر اور قصیدے کو قصیدۂ عرفی کے مثل بتایا ہے، ان کی نکتہ رسی اور سخن فہمی و خوش گوئی کی خوب تعریف کی ہے، اور یہ فقرے تو گویا غالب جیسے خود بین و خود آرا شخص کے لیے بھی سند افتخار ہوں گے:

"...... اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ می رسی چہ خوش فکر اگرچہ کم یاب است اما خوش فہم کیاب تر خوشا حال شخصے کہ از ہر دو مشربے یافتہ و حظے بردہ ......"

نظیرؔ اکبرآبادی کے متعلق شیفتہؔ نے لکھا:[1]

"..... گویند کہ نظیرؔ در حلم و خلق و انکسار بے نظیرِ روزگار است، بتعلیم صبیان بسر می برد، کم مدت است کہ ازین خاکدان بروضۂ رضوان رفت، اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاریست و نظر بآن ابیات در اعداد شعراء نشاید ش شمرد، اما برعایت ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد ....."

کہا جا سکتا ہے کہ نظیرؔ کے ساتھ بے شک شیفتہؔ نے انصاف نہیں کیا، لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ اور کس نے کیا، سوائے محدودے چند نقادوں کے آج بھی اس کا نام احتیاط کے ساتھ لیتے ہیں اور بیان سے پہلے تمہید باندھتے ہیں۔

---

[1] گلشن بیخار، محولۂ بالا، ص ۲۳۱۔

شیفتہ کا تذکرہ اپنی ان خصوصیات کی بنا پر خاصہ ہنگامہ خیز ثابت ہوا، اور غالب کا اندیشہ اس کے بارے میں بعد کے واقعات کی روشنی میں درست نکلا، یہ تذکرہ جیسا کہ بیان کیا گیا ۱۲۴۸ھ کے اوائل میں شروع ہوا اور سنہ ۱۲۵۰ھ کے اواخر میں ختم ہوا، دو نسخے جو عام طور پر رائج ہیں، نول کشور لکھنؤ کے مطبوعہ ہیں، دوسرا نسخہ ماہِ اگست سنہ ۱۹۱۰ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ کا طبع شدہ ہے، مطبع کی جانب سے اس پر بار دوم لکھا گیا ہے، اس سے قبل کا نسخہ اکتوبر ۱۸۷۴ء مطابق رمضان شریف سنہ ۱۲۹۱ھ کا ہے، لیکن اس میں بار اول نہیں لکھا گیا، دونوں نسخوں میں مطبع کی طرف سے خاتمہ کی عبارت ایک ہی ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ تذکرہ گلشن بے خار دار العلم و سلطنت دہلی جس زمانے میں کہ شعرائے نازک اندیشہ سحر بیان اور فضلائے بلاغت پیشہ سحباں زبان کے اجتماع سے شیراز و اصفہان کے لیے باعث رشک بنا ہوا تھا، مؤلف نے تصنیف کیا تھا اور "دراں عہد بار اول در مطبع انطباع فرمود"

دوسرے نسخے میں بھی یہی عبارت ہے کہ اسی عہد میں کسی مطبع میں شائع کرا دیا تھا اور چونکہ نایاب ہو گیا تھا اس لیے جناب ممدوح روزگار منشی نول کشور نے "بوفور تجسس کیا نسخۂ پارینہ اش کہ از جا با وقف کرم دگمس و از فرط پریشانی شیرازۂ اوراقش گسستہ نفس بود" فراہم کر کے شایع کر دیا۔

اس تذکرہ کے کم سے کم دو جواب لکھے گئے جو مطبوعہ صورت میں اب بھی ملتے ہیں، ان میں سے پہلا تذکرہ مولوی نصر اللہ خاں خویشگی کا گلشن ہمیشہ بہار ہے، یہ تذکرہ مولوی نصر اللہ خاں خویشگی نے اپنے دوران ملازمت بجنور میں تحریر کیا، بجنور میں ان کا قیام سنہ ۱۸۳۹ء، ۱۲۵۵ھ سے ۱۸۴۲ء، ۱۲۵۸ھ تک رہا، وہیں انھوں نے شیفتہ کا تذکرہ پڑھا اور اس سے ناخوش ہو کر اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا جو ۱۲۵۸ھ میں مکمل کیا اور سنہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں شایع ہوا، تحریر اور اشاعت میں تیرہ سال کا فصل ہے۔[1] چونکہ مولوی نصر اللہ خاں خویشگی نے بجنور میں تذکرۂ شیفتہ کے مطالعہ کا ذکر کیا ہے اس سے

---

[1] گلشن ہمیشہ بہار: پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۔

قیاس ہوتا ہے کہ کم سے کم ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) سے پہلے کسی تاریخ میں گلشن بے خار شائع اور عام ہو چکا تھا۔

لیکن ہمیں گلشن بے خار کا جو مطبوعہ نسخہ ملا ہے وہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) کا چھپا ہوا ہے، اس کا سرورق اس طرح پر مرتب کیا گیا ہے:

گلشن بے خار

تذکرۂ اشعار زبان اردو

من مؤلفات

نواب مصطفیٰ خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ، خلف الصدق عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ، مرتبۂ دویم۔

در مطبع

دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر گذر اعتقاد خاں میں متصل پنجہ شریف باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر اور پبلشر کے چھاپہ ہوا۔

[illegible] ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء

یہ نسخہ نہایت عمدہ نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے، متن کی عبارت میں بالعموم فرق نہیں لیکن حواشی پر بعض فوائد درج ہیں، جن سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن اس نسخہ پر یہ نہیں لکھا کہ کون سی اشاعت ہے، صرف سال اشاعت درج ہے، مولوی نصر اللہ خاں خویشگی "۱۸۴۲ء میں بجنور سے مظفر نگر تبدیل ہو گئے"[1] تذکرۂ بالا نسخہ دہلی اردو پریس کا ۱۸۴۳ء کا مطبوعہ ہے، اس لیے یہ تذکرہ خویشگی کے پیش نظر نہیں ہوگا۔

---

[1] گلشن ہمیشہ بہار، محولۂ بالا، ص ۳۴۔

اسپرنگر کی فہرست مخطوطات[1] میں گلشن بے خار کی ایک اور اشاعت کا ذکر ملتا ہے، اس میں گلشن بے خار کی تفصیلات کے تحت یہ معلومات درج ہے:

"Lithographed at Dilly, Second edition in 1253. A.D. 1837 8 Vo 383 pp."

اس کا مطلب یہ ہے کہ گلشن بے خار دہلی سے ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ میں شایع ہو چکا تھا، یہ نسخہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے اس کے متعلق سوائے اسپرنگر کے اندراج کے ہم مزید معلومات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ نسخہ ہمارے محولۂ بالا نسخہ سے جس کا سرورق ہم نے نقل کیا یقینی طور پر مختلف ہے، سالِ اشاعت الگ ہے اور ہمارے محولہ نسخہ میں ۴۰۱ صفحات ہیں، اسپرنگر کے محولہ نسخہ میں ۳۸۳ صفحات ہیں، لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اسپرنگر نے اس نسخہ کو بھی دوسری اشاعت قرار دیا ہے جیسا کہ محولۂ بالا اقتباس میں درج ہے، اور یہ ۱۸۳۷ء بمطابق ۱۲۵۳ھ کی اشاعت ہے۔

۱۸۴۳ء بمطابق ۱۲۵۹ھ کے نسخے کو جس کا سرورق ہم نے نقل کیا، ایڈورڈ ایڈورڈز نے دوسری اشاعت قرار دیا ہے، اس کا حوالہ یہ ہے[2]:

[Notices of Rekhta poets, with Specimens of their works. Second edition pp. 401. Lithographed Delhi 1843] گلشن بے خار

جناب ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی نے بھی اپنی تحقیقی کتاب ذوق[3] میں اسی نسخے کا حوالہ دیا ہے،

---

[1] اسپرنگر، فہرست کتب خانۂ اودھ، ج ۱، کلکتہ ۱۹۰۵ء، یہ فہرست بہت مشہور ہے اس لیے اس کا مکمل نام نہیں دیا۔ ۱۲

[2] فہرست مطبوعہ کتب فارسی برٹش میوزیم ۱۹۲۲ء، ص ۵۰۰۔

[3] ذوق؛ جناب تنویر احمد صاحب علوی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء، فہرست ماخذات۔

جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملک ہے، ڈاکٹر علوی صاحب نے بھی حوالہ میں اسے طبع دوم ہی لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں نسخے جو ۱۸۳۷ء اور ۱۸۴۳ء میں شایع ہوئے ہیں بیک وقت دوسری اشاعت قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اب اس التباس کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے اسپرنگر اور اور پھر ایڈورڈز کو کیوں یہ التباس ہوا۔ جیسا ہم نے عرض کیا اسپرنگر کا نسخہ ہمارے پیش نظر نہیں، اس لیے کچھ کہنے سے قاصر ہیں، لیکن ایڈورڈز نے جس نسخے کا اندراج کیا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے، اور اس پر کہیں طبع دوم نہیں لکھا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارا قیاس غلط ہو، لیکن ہمیں اس کی وجہ بڑی دلچسپ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے ہمارے اور ایڈورڈز کے پیش نظر نسخہ پر شیفتہ کا نام اس طرح درج ہے:

"نواب مصطفیٰ خان بہادر متخلص بہ شیفتہ خلف الصدق عظیم الدولہ سرفراز الملک، نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ، مرتبۂ دویم۔"

خیال ہے کہ اسی طرح کا اندراج پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مطبوعہ نسخہ میں بھی ہوگا، مظفر جنگ کے بعد مرتبہ دویم سے ہم نے یہ سمجھا ہے، جو ہو سکتا ہے کہ غلط ہو، کہ یہ اس خطاب اور منصب کا مرتبہ ظاہر کرتا ہے، یعنی دوسرے درجہ کا خطاب و منصب، اور اس مرتبۂ دویم کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کتاب کی دوسری اشاعت ہے، جیساکہ ایڈورڈز نے اور اس سے پہلے اسپرنگر نے سمجھا، ورنہ ۱۸۳۷ء یعنی ۱۲۵۳ھ سے پہلے کی کوئی اشاعت گلشن بے خار کی ثابت نہیں ہونی چاہیے، جس کی بنا پر ۱۸۳۷ء کو دوسری اشاعت قرار دیا جائے، مگر پھر ۱۸۴۳ء کی اشاعت کو طبع دوم کہنے کا کیا جواز ہوگا؟

بہرحال یہ بات دلچسپ ہے اور اس کی وضاحت ضروری تھی۔

ہمارے پیش نظر گلشن بے خار کا ایک مخطوطہ بھی ہے، یہ مخطوطہ اس اعتبار سے دلچسپ اور یادگار ہے کہ یہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی کی ملک رہ چکا ہے، اب یہ برٹش میوزیم کی ملک ہے، جو

۲۲ اپریل ؁ کو پیرس کے ایک کتب فروش سے میوزیم خریدا تھا، اس میں دو سو دس (۲۱۰) ورقے (فولیو) ہیں، نہایت عمدہ نستعلیق لکھائی ہے، فولیو شمار ۱ کی نقل اس طرح ہے :

تذکرۂ گلشنِ بیخار

نواب مصطفیٰ خاں کا

یا فتاح

رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تمم بالخیر

آخر میں کاتب کا نام درج نہیں، ؁۱۲۵۲ھ میں تمام ہوا۔

اس مخطوطہ کے سرورق کی عبارت اس سے زیادہ نہیں، اس لیے شیفتہ کے والد نواب مرتضیٰ خاں بہادر کے القاب اور ان کے مراتب کا بھی ذکر نہیں، مطبوعہ نسخوں میں بھی صرف ؁۱۸۴۳ء اور ؁۱۸۷۴ء کے نسخوں میں یہ تمام عبارت درج ہوگی، ورنہ مروجہ نولکشوری اشاعتوں میں اس کا بھی ذکر نہیں۔

تذکرۂ گلشنِ بےخار خود شیفتہ کی حیات میں دوبار شایع ہوا، اور جب تیسری بار منشی نول کشور نے ؁۱۸۷۴ء میں شایع کرنا چاہا تو بڑی مشکل سے انھیں ایک نسخہ مل سکا، کتاب کی مقبولیت کا ادراک ثبوت ہو سکتا ہے کہ فارسی میں لکھی ہوئی کتاب، شاعروں کا احوال، پھر سب لوگ اس سے خوش بھی نہ ہو سکے، اس کے باوجود دوبار مصنف کے سامنے ہی شایع ہو جائے۔

تذکرۂ گلشنِ بےخار میں اسپرنگر کے قول کے مطابق تقریباً چھ سو شعراء[1]، فہرست مخطوطات بانکی پور کے نزدیک آٹھ سو شعراء[2] اور جناب پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی کے بقول چھ سو چوالیس (۶۴۴) شعراء[3] کا ذکر ہے، ہو سکتا ہے کہ

[1] اسپرنگر، محولۂ بالا، ص ۱۸۹۔ [2] بانکی پور فہرست مخطوطات ج ۸ عدد ۷۱۱، ص ۱۵۸، حوالہ ماخوذ از شعرائے اردو کے تذکرے، مصنفہ جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب لاہور، ؁۱۹۵۲ء، ص ۵۲ [3] گلشنِ ہمیشہ بہار، محولۂ بالا، ص ۲۸۔

غلط ہو، لیکن ہمارے حساب سے چھ سو اکہتر (۶۷۱) شاعروں کا حال درج ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے یہ تذکرہ بہت زیادہ حد تک مجموعۂ نغز مصنفہ قدرت اللہ قاسم سے ماخوذ ہے، اسپرنگر نے حکیم قطب الدین باطن کے تذکرہ نغمۂ عندلیب المعروف بہ گلستانِ بےخزاں کے متعلق بھی کہا ہے[1] کہ اس تذکرہ کو سابقہ یعنی تذکرۂ گلشن بےخار کا ناقابلِ فہم ہندوستانی میں ترجمہ سمجھنا چاہیے ...۔"

یہاں پر چند کلمات مغربی علمائے ادب اور بالخصوص مستشرقین کے متعلق کہنے بے محل نہ ہوں گے، اب تک ہمارے یہاں یہ رویہ رہا ہے کہ اہلِ مغرب اور بالخصوص انگریز نے [ف: ڈاکٹر اسپرنگر جرمن تھا] جو کچھ مشرق، مشرقی ادب، اسلام اور اسلامیات کے متعلق لکھ دیا وہ گویا حرفِ آخر ہے، اور ان کی آراء و افکار و اقوال کو بغیر کسی تنقیح کے وحیِ آسمانی کی طرح انتقاماً کیا جاتا رہا ہے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مغربی محققین نے بڑی جانکاہی اور دیدہ ریزی سے بعض امور کے متعلق بڑی قابلِ قدر تحریریں مرتب کی ہیں اور ان کی خدمات کو نہ کسی طرح فراموش کیا جا سکتا ہے نہ اس سے روگردانی یا اس کی تحقیر مقصود ہے، لیکن اس میں بھی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ صدہا امور کے متعلق ان کی رائے پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی اور اکثر اوقات تحقیق کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سرے سے بے بنیاد ہے، یا کسی غلط فہمی [اور یہ لفظ اپنے اصل معنی میں سمجھنا چاہیے] کی بنا پر قائم ہے، یا عمداً تحریف کی گئی ہے، اور اس معاملہ میں شاذ و نادر ہی کسی کا استثناء ہو تو ہو ورنہ نولدیکی، ڈوزی، گبس، نکلسن، براؤن، مونٹگمری واٹ، اسمتھ، اسپرنگر، زیہنر اور دوسرے تمام قابلِ ذکر قدیم و جدید مستشرقین اس میں شامل ہیں، اس وقت سب کی یا صرف چند کی مثالیں بھی پیش کرنا طولِ عمل اور طولِ امل دونوں ثابت ہوگا، صرف موضوعِ زیرِ بحث کو ہی لیتے ہیں، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسپرنگر نے، یا اور جن

---

[1] اسپرنگر، محولۂ بالا، ص ۱۸۹۔

مستشرقین نے فہرست کتب و مخطوطات مرتب کی ہیں اور ان کے مندرجات کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ سب ان کتب کے تفصیلی، غائر اور تنقیدی مطالعے پر مبنی ہیں۔

ان کی رائیں اور تبصرے دو قسم کے ہیں، ایک تاریخی امور سے متعلق، دوسرے نقد ادب و شعر کے بارے میں، جہاں تک تاریخی تحقیق کا تعلق ہے، وہاں بیشتر ان حضرات کی رائے اور تحقیق درست ہوتی ہے اور نہایت قابل اعتماد، سوائے بعض خاص امور کے، اور وہ بھی بعض مخصوص حضرات کی رائے، جو ان کے جانبدارانہ رویہ پر عمداً مبنی ہوتی ہے، مثلاً بعض تاریخ اسلام کے واقعات یا صوفیائے کرام کے احوال و مکاشفات کی تعبیرات میں بعض مستشرقین نے بڑی تدلیس و تلبیس سے کام لیا ہے، اصل میں تاریخ ان کا دلپسند موضوع ہے، اور اس کی تحقیق و تنقیح کا انھیں ملکہ ہے، رہا نقد شعر و ادب، تو سخن فہمی عالمِ بالا معلوم شد، اور ایک طرح یہ زیادتی بھی ہوگی کہ ایک اہل مغرب سے جو جرمن، فرنچ، ڈچ یا انگریز وغیرہ ہے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اردو فارسی یا عربی کی نظم و نثر پر اسی طرح حاوی ہوگا، جیسی توقع ایک اہل زبان اہل علم سے ہوتی ہے، اہل مشرق بھی جو بزعم خویش اپنے آپ کو انگریز سے زیادہ انگریزی شعر و ادب و تنقید کا عالم و ماہر سمجھتے ہیں مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں، اس لیے جہاں شعر و ادب کے متعلق، شاعر کے مرتبے اور اس کے کلام کے درجے کے تعین کا سوال ہے مغربی ماہرینِ اردو و فارسی کی رائے کچھ بہت زیادہ وقیع نہیں، الا ماشاء اللہ۔

متعدد و مبسوط و ضخیم مخطوطوں کا کما حقہٗ پڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں، اہل زبان کا بھی اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے، چہ جائیکہ کسی مغربی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ حرفاً حرفاً اسے پڑھ کر اس سے قرار واقعی طور پر استخراج و استنباط کر سکے گا، مثال کے طور پر اسپرنگر کی رائیں ہی پرکھی جاسکتی ہیں، جن کا اس وقت پورا موقع نہیں، لیکن یہ واضح ہے کہ اسپرنگر نے یہ تذکرے بالاستیعاب نہیں پڑھے، اور سرسری ورق گردانی کر کے ایک کو دوسرے سے ماخوذ قرار دیدیا ہے، مثلاً اس کی یہ دونوں رائیں جو اوپر نقل ہوئیں، غلط ہیں، تذکرۂ باطن تذکرۂ شیفتہ

کے ترجمہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جس زبان کو اسپرنگر نے ناقابلِ فہم ہندوستانی قرار دیا ہے وہ اکثر جگہ نہایت پُر لطف طنز و تشنیع سے بھرپور ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اشارے اور یہ زبان کسی الماوی النسل ڈاکٹر کی سمجھ میں آنی مشکل ہے۔

اسی طرح تذکرۂ شیفتہ کا تذکرۂ قاسم سے ماخوذ ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، اسپرنگر نے قاسم کا حال ہی شیفتہ کے ہاں نہیں دیکھا، جس میں شیفتہ نے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ

"... تذکرہ در حالِ فکر ریختہ نگاشتہ است و بملاحظہ نرسیدہ ......"[1]

خوشگی کا تذکرہ شیفتہ کی زندگی میں ہی شایع ہو گیا تھا، شیفتہ کی وفات ۱۲۸۶ھ، ۱۸۶۹ء میں ہوئی، قیاس ہے کہ انھوں نے مولوی نصر اللہ صاحب کے چبھتے ہوئے فقروں سے لطف بھی اٹھایا ہوگا۔

یہاں مولوی نصر اللہ خاں خویشگی کے تذکرے کا تفصیلی ذکر مقصود نہیں۔ جناب ڈاکٹر پروفیسر اسلم فرخی صاحب نے اسے عالمانہ طور پر مرتب کر کے شایع کر دیا ہے، بعض اعتبارات سے یہ اہم اور قابلِ مطالعہ تذکرہ ہے۔　　(باقی)

---

[1] گلشنِ بیخار، محولہ بالا، ص ۱۵۷۔

گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بہ عہد کے تمام ممتاز اردو شعراء کا یہ پہلا اور بہت ہی مکمل تذکرہ ہے، جس میں مولانا محمد حسین آزاد کے شہرۂ آفاق تذکرہ آبِ حیات کی بعض اہم غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، اور اردو زبان کے پہلے شاعر ولی دکنی سے لے کر مولانا الطاف حسین حالی و جناب اکبر تک کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب ہے، مولفہ مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم۔

قیمت ... ۲۲　　　"منیجر"

کلاسکی عربی میں فارسی عنصر

از

ڈاکٹر محمد سلیم اختر، دی آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی، کینبرا۔ آسٹریلیا

عباسی دور کے معروف اہل قلم اصمعی، کسائی، معمر بن مثنی، خلیل بن احمد اور ابن درید وغیرہ کے آثار میں عربی زبان میں فارسی الاصل الفاظ کی موجودگی کی جانب جستہ جستہ اشارے ملتے ہیں، لیکن اس موضوع پر پہلی مستقل کتاب "المعرب من الکلام الاعجمی" کی ترتیب کا سہرا چھٹی صدی ہجری کے مشہور مصنف ابومنصور موہوب بن احمد بن محمد بن الخضر الاہوازی معروف بہ جوالیقی کے سر ہے، ان کے بعد گیارہویں صدی ہجری میں شہاب الدین احمد خفاجی کوفی نے شفاء الغلیل مرتب کی جو اپنے محتویات کے اعتبار سے اول الذکر کتاب کے درجہ سے آگے نہ بڑھ سکی، موجودہ دور میں بیسویں صدی کے آغاز میں الالفاظ الفارسیۃ المعربۃ تالیف ادی شیر بیروت سے چھپی اور پھر اس سلسلہ کی چوتھی اہم کڑی اور فارسی زبان میں پہلی کتاب ۱۹۶۸ء میں تہران سے سید محمد علی امام شوشتری نے فرہنگ واژہ ہائے فارسی در زبان عربی کے نام سے شایع کی۔

اس موضوع پر کام کرنے والے مستشرقین میں ڈوزی کی تحقیقات سرِفہرست ہیں، اور اس سلسلہ میں جو مقالات اب تک چھپے ہیں ان میں احمد تیمور پاشا مصری کی مجلۂ 'المجمع العلمی' دمشق (۱۹۳۲ء) میں 'الالفاظ العبابیۃ' اور دکتر محمدی محقق کی مجلۂ دانشکدۂ ادبیات تہران میں 'تاثیر زبان فارسی در عربی' کے عنوان سے تحریریں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر مہدی محقق (متولد ۱۹۲۹ء) اسلامی عقلی علوم اور عربی و فارسی زبان و ادبیات میں یکساں دستگاہ کے مالک ہیں، وہ انگلستان اور کینیڈا کی بعض ممتاز یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے علاوہ دانشگاہِ تہران میں ایک عرصے سے فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں اور صدر شعبہ کی ذمہ داریاں بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتب اور ذاتی تالیفات میں اشتر نامۂ عطار، پانزدہ قصیدۂ ناصر خسرو، لسان التنزیل، وجوہ قرآن حبیش تفلیسی، السیرۃ الفلسفیہ رازی، تحلیل اشعار ناصر خسرو اور فیلسوف ری شامل ہیں۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ایران میں بادشاہت کی تاسیس کی پچیس سویں (۲۵۰۰) سالگرہ کی تقریبات کی مناسبت سے جب بعض چیدہ چیدہ دانشوروں سے اپنی اپنی پسند کے موضوعات پر مقالات لکھنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے The Problem of Persian Elements in Classical Arabik کا موضوع منتخب کیا، چونکہ اس سلسلے میں شائع ہونے والے سبھی مقالات الگ الگ کتابچوں کی صورت میں چھپے اور بالعموم اعزازی طور پر ہی تقسیم ہوئے، ان کے نسخے ایک خاص حلقے سے باہر نہ نکل سکے اور نہ ایران کے کتب خانوں سے باہر یا عام قارئین تک ان کی رسائی ممکن ہو سکی، ڈاکٹر محقق کے مذکورۃ الصدر مقالے سے جہاں موضوع کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اور اس پر مزید تحقیق کے لیے نئے ابعاد کا سراغ ملتا ہے، وہاں مصنف کی علمی ثقاہت اور وسعت مطالعہ کا کرشمہ بھی قدم قدم پر قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہوا نظر آتا ہے، اس مختصر تمہید کے بعد مناسب ہوگا کہ قارئین اب باقی روئیداد خود مصنف کی زبان سے سنیں: (م۔س۔ا)

"اس مقالہ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ فارسی زبان تاریخی اعتبار سے ہمیشہ اور مختلف پیرایوں میں عربی زبان پر اثر انداز رہی ہے، زمانۂ ماقبل اسلام میں اعراب نے ایران کے ساتھ اپنے روابط کی بدولت فارسی الفاظ و تراکیب اور روایات کو اپنی زبان میں سمویا، اعشیٰ ابن قیس جس نے ایرانی دربار دیکھا تھا، اپنی شاعری میں بہت سے فارسی الفاظ اور محاورات استعمال کرتا ہے، اس کے ایک قصیدے میں بہت سے پھولوں کے فارسی نام مثلاً بنفسج (فارسی: بنفشہ) سوسن، شاہسفرم (فارسی شہسپرم) اور یاسمین

ملتے ہیں[۱] ایک اور قصیدے میں وہ آلات موسیقی کا ذکر کرتا ہے، جن میں صَنج (فارسی: چنگ) بھی شامل ہے[۲]، چونکہ عربی شاعری میں سب سے پہلے یہ لفظ اسی کے یہاں ملتا ہے، اس لیے بعض لوگ اسے صنّاجۃ العرب کے لقب سے یاد کرنے لگے[۳]

ساسانی سلطنت کے سرحدی علاقوں مثلاً حیرہ وغیرہ میں اعراب کے درمیان فارسی قصوں اور روایات میں دلچسپی فطری بات تھی، نضر ابن حارث کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ قرآن مجید سے ہٹانے کے لیے رستم و اسفندیار اور اسی قسم کی دوسری کہانیاں بیان کیا کرتا تھا[۴] چنانچہ اس کی مذمت میں قرآن کریم کی درج ذیل آیۂ کریمہ نازل ہوئی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ
وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ[۵]

بعض عرب فارسی نام اور القاب بھی استعمال کرتے تھے، مثلاً نعمان بن منذر کا لقب ابو قابوس (فارسی: کاوس) تھا[۶] اور لقیط بن زرارہ کی بیٹی دَخْتَنُوس (فارسی: دختنوش) کے لقب سے معروف تھی[۷]

قرآن میں بھی فارسی الفاظ مثلاً اِسْتَبْرَق[۸] (فارسی: استبرک) اور اِبْرِیق[۹] (فارسی: آبریز) استعمال ہوئے ہیں، چونکہ قرآن کریم واضح طور پر کہتا ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ

---

۱. الصبح المنیر فی شعر ابی بصیر، لندن ۱۹۲۸ء، ص ۲۰۱ ۲. ایضاً ص ۲۴۸ ۳. ابن قتیبہ الشعر والشعراء بیروت ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۹ ۴. ابن ہشام، سیرۃ النبی، قاہرہ ۱۹۳۶ء، جلد ۱، ص ۳۲۱

۵. لقمان: ۳۱، ۶، نیز دیکھیے زمخشری، الکشاف، قاہرہ ۱۹۴۸ء ج ۳، ص ۴۹۲

۶. الجوالیقی، المعرب، قاہرہ ۱۳۶۱ھ ص ۲۵۹ ۷. ایضاً ص ۱۴۲ ۸. الکہف: ۱۸، ۳۱، ۹. الواقعہ: ۵۶، ۱۸۔

بعد میں علماء کے درمیان بحث وتمحیص کا موضوع بنے رہے۔[1] سیوطی نے اپنی ایک کتاب میں قرآن میں استعمال ہونے والے فارسی الفاظ کو جمع کیا ہے۔[2] مستشرقین میں سے اس موضوع پر کام کرنے والوں میں آرتھر جفری بالخصوص قابل ذکر ہیں۔[3]

قرآن کریم کی ایک آیت[4] میں تنزیل پر جملہ بیرونی اثرات کی تردید کی گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آیۂ کریمہ دوسروں کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین صحابہ میں سے تھے اور جن کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مشہور ہے کہ علم اگر بنات النعش میں بھی ہوتا تو بعض ایرانی اس تک بھی پہونچ جاتے۔[5] بعض ایسے موارد بھی موجود ہیں جن میں حضرت سلمان فارسیؓ نے فارسی محاورات سے استفادہ کیا ہے۔[6] تاہم آپ کے اثر کی اس سے بھی واضح مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ بعض ایرانیوں کی درخواست پر آپ نے سورۂ فاتحہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے ان کو بھیجا تاکہ وہ نماز میں اسے پڑھ سکیں۔[7]

کتبِ احادیث میں بھی بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں آنحضرت صلعم نے فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں، حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث میں فارسی لفظ سور اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہونے والی ایک حدیث میں فارسی ترکیب اشکنب درد (شکم درد) ملتے ہیں۔[9]

---

[1] السیوطی۔ المزہر، دار الاحیاء الکتب العربیۃ، قاہرہ ص ۲۶۶ [2] السیوطی، المتوکلی، دمشق ۱۳۴۸ھ، ص ۷۔

[3] Arthur Jeffery. The Foreign Vocabulary of The Qur'an (Baroda: Oriental Institute, 1938)

[4] النحل ۱۶، ۱۰۳۔

[5] الزمخشری ج ۲، ص ۲۱۸ [6] ابن خلدون، مقدمہ، قاہرہ ۱۹۶۰ء ج ۴، ص ۱۲۴۹، ابن عبد البر، الاستیعاب، مطبعۃ نہضت مصر ج ۲، ص ۶۳۶ [7] سید المرتضیٰ، الشافی، تہران، چاپ سنگی، ص ۲۱۲ [8] السرخسی، المبسوط، قاہرہ، ۱۳۲۴ھ ج ۱، ص ۳۷ [9] ابن الحیان الاصبہانی، اخلاق النبی، قاہرہ ۱۹۵۹ء ص ۲۷۵۔

فتح ایران کے بعد جب ایران و عرب کے روابط بڑھے اور آمد و رفت میں اضافہ ہوا تو فارسی زبان کے اثرات اور بھی ظاہر ہونے لگے، بعض ایرانی خاندان عرب علاقوں کو نقل مکان کر گئے، عربوں اور ایرانیوں کے درمیان شادیاں ہونے لگیں جن میں مرد بالعموم عرب ہوتا اور عورت ایرانی، اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ ایرانی خواتین کم از کم ایک نسل تک تو ضرور اپنی زبان بولتی ہوں گی، ان کے بچوں کا اپنی مادری زبان سے متاثر ہونا بدیہی امر تھا، عرب شاعر ابن مقادہ اپنی ایک ایرانی کنیز سے مخاطب ہو کر کہتا ہے،

اگر تو عربی زبان میں تکلم کرے تو کتنی بھلی لگے[1]

اس ضمن میں ظہور اسلام کے بعد عربوں نے ایرانی القابات کے استعمال کا جو سلسلہ شروع کیا وہ بھی قابل توجہ ہے، مثلاً ابن قتیبہ مشہور شاعر جریر کے ایک معاصر علی بن خلیل کا ذکر اس کے فارسی لقب بروخت سے کرتا ہے[2] جو فارسی لفظ "پرداخته" کی معرب صورت ہے، اسی طرح یزید بن یزید بھی اپنے فارسی لقب رشک سے معروف تھا[3]

دنیائے عرب کے مختلف حصوں میں فارسی الفاظ کا رواج ظہور اسلام کی ابتدائی چند صدیوں ہی میں ہو گیا تھا، جاحظ کے بیان کے مطابق اہل مدینہ خربوز (پھل) اور رُزذق (فارسی: رده، آنتیں) کے الفاظ استعمال کرتے تھے، اہل کوفہ چوراہے کو چارسو (فارسی: چهارسو) کہتے اور منڈی کو وزار (فارسی: بازار) کے نام سے یاد کرتے تھے[4] اسی طرح بصرہ کے نواح میں ظرف مکان بنانے کا مشہور فارسی لاحقہ "آن" بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا، جس کی مثالیں مہلّبان، طلحتان اور خیابان ایسے الفاظ میں ملتی ہیں[5] ایران کے جنوب میں موجودہ شہر آبادان کا نام اسی قاعدے کی رو سے

---

[1] ابوالفرج الاصفہانی، الاغانی ج ۲ ص ۱۱۲ [2] ابن قتیبہ ص ۹۰۰ [3] السمعانی، الانساب لندن ۱۹۱۲ء ورق ۲۵۲ ([4] جاحظ البیان والتبیین، قاہرہ ۱۹۳۲ء ج ۱، ص ۳۲-۳۳ [5] یاقوت، معجم البلدان ج ۱، ص ۶۴۵۔

عبادان تھا۔[1] جاحظ اپنی کتاب البخلاء میں بہت سی اغذیہ اور مشروبات کے فارسی ناموں کا ذکر کرتا ہے، مثلاً جوارش (فارسی: گوارش، ہاضمے کے لیے مفید غذا) شُبارِقا (ایک قسم کی مٹھائی جو فارسی میں پیش پارہ کہلاتی ہے) اور فالوذج (فارسی: پالودہ، ایک قسم کا شیریں مشروب[2]، اسی طرح تجارہ نامی اپنی کتاب میں وہ بہت سی اشیائے خرید و فروخت کا ذکر کرتا ہے جن میں الفیروزج الشیر بام الآسمانجونی (فارسی: فیروزۂ شیرفام آسمانگونی) بھی شامل ہے[3]

صولی کے بیان کردہ اس واقعے سے بھی عرب علاقوں میں فارسی الفاظ کے رواج کا پتہ چلتا ہے، ایک دفعہ ایک ایرانی اور ایک عرب ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر رہے تھے، دوران گفتگو ایرانی نے عرب سے کہا: ہم کسی بھی معاملہ میں تمھارے دست نگر نہیں جب کہ تمھیں قدم قدم پر ہماری ضرورت پڑتی ہے، یہی نہیں بلکہ تم نے اپنی بعض غذاؤں مثلاً اِسفیداج، سِکباج، اور دُوغ باج وغیرہ، مشروبات مثلاً سکنجبین، خلنجبین اور جلاب وغیرہ اور انتظامی اصطلاحات مثلاً روزنامج، اُسکو دار، اور فروانک کے نام تک ہم سے حاصل کیے ہیں،[4]

فارسی الاصل عرب شعراء نے بھی فارسی الفاظ و محاورات کو عربی زبان میں منتقل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا، بشّار بن بُرد جسے اپنے فارسی الاصل ہونے پر فخر تھا[5] اور ابونواس جو قدیم عرب شعراء سے متنفر تھا[6]، دونوں اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، موخر الذکر نے تو اپنی بعض منظومات میں پہلوی اور زمانہ ماقبل اسلام کے الفاظ و محاورات سے بھی استفادہ کیا ہے[7] ان دو کے علاوہ

---

[1] مقدسی، احسن التقاسیم، لیڈن سنہ ۱۹۰۶ء، ص ۴۱۲ [2] جاحظ، البخلاء، قاہرہ سنہ ۱۹۶۳ء، ص ۲۵، ۲۰۳.
[3] جاحظ، التبصر بالتجارۃ، قاہرہ بار ۲ سنہ ۱۹۳۵ء، ص ۱۴. [4] الصولی، ادب الکتاب، قاہرہ سنہ ۱۳۴۱ھ، ص ۱۹۳.
[5] جاحظ، البیان، ج ۱، ص ۵۶ [6] ابونواس، دیوان، قاہرہ سنہ ۱۹۵۳ء، ص ۶۹۱.
[7] ابونواس، دیوان، مخطوطہ در کتابخانۂ مجلس شوریٰ ملی، تہران، ص ۳۴۲.

دوسرے عرب شعراء کے یہاں بھی کبھی کبھی فارسی الفاظ کا استعمال دکھائی دیتا ہے، مثلاً بحتری نے درفش، بلبل اور نموذج[1] اور معری نے شطرنج کی اصطلاحات شاہ، رخ اور بیادق کو[2] اپنے آثار میں جگہ دی ہے۔

فارسی الاصل الفاظ کا استعمال عربی شاعری تک ہی محدود نہیں، اس کے نشانات نثری متون میں بھی ملتے ہیں[3]، مثال کے طور پر ہم یہاں تین مشہور کتابوں کا ذکر کریں گے، پہلی کتاب عثمان بن منقذ کی الاعتبار ہے[4] جو چھٹی صدی ہجری میں شام میں لکھی گئی، اس میں ہم سرفسار، سرہنگ، خودہ، درکاہ، خشت اور برجم ایسے [illegible] دیکھتے ہیں، دوسری کتاب ابن الفوطی کی تالیف الحوادث الجامعہ ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں عراق میں لکھی گئی، اس میں مصنف نے چرخ، سرپوش، زرکش، کارخانہ، خربندیہ اور وزدار قسم کے فارسی الفاظ سے استفادہ کیا ہے، تیسری کتاب آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں مصر میں لکھی گئی، سبکی کی معید النعم[5] ہے، اس میں مہماندار، تیردار، جوکاندار، جمدریہ، امیر شکار اور امیر آخور جیسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

کلاسیکی دور میں فارسی زبان سے عدم واقفیت کے باعث بعض غلط اشتقاقات بھی شہرت و رواج کی سند پا گئے، یاقوت کے بقول جب کسی نے معروف نحوی زجاج سے لفظ قصعۃ کا ماخذ دریافت کیا تو اس نے جواب دیا: لانہ تقصع الجوع، یعنی اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سے بھوک کی تسکین ہوتی ہے[6]، حالانکہ درحقیقت یہ فارسی لفظ کاسہ (پیالہ) ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے، السیوطی کا عقیدہ ہے کہ کسی فارسی

---

[1] بحتری، دیوان، قسطنطنیہ، سنہ ۱۳۰۰ھ، ج ۱، ص ۱۰۹ آخری لفظ کے لیے ملاحظہ ہو چھاپ قاہرہ سنہ ۱۹۶۳ء ج ۱، ص ۳۰۴

[2] معری، شرح التنویر علی سقط الزند، قاہرہ، مطبعہ مصطفیٰ محمد، ج ۲، ص ۲۱۷۔ [3] برنشٹن سنہ ۱۹۳۰ء ص ۱۳، ۲۶، ۴۶، ۴۹، ۵۲، ۶۲۔ [4] بغداد سنہ ۱۳۵۱ھ، ص ۳۶، ۷۷، ۱۹۴، ۲۰۰، ۲۱۹، ۲۳۱۔

[5] قاہرہ سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۱، ۳۵ [6] یاقوت ارشاد، مطبع قاہرہ، سنہ ۱۳۵۵ھ ج ۱، ص ۵۹۔

لفظ کا اشتقاق عربی زبان سے منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ مچھلی پرندے سے پیدا ہوئی ہے[1]

عربی متون کی تصحیح میں مشغول اہل علم کے لیے عربی پر فارسی اثرات آج بھی ایک الجھن بنے ہوئے ہیں، بسا اوقات تو اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن کبھی کبھار الفاظ کی غلط توجیہ کرنے لگتے ہیں، مثلاً دیوانِ بشار کے مرتب نے "مُقَرطَق" کا مفہوم کانوں میں گوشوارے پہننے والا شخص لیا ہے، گویا یہ لفظ "قرط" سے ماخوذ ہو، جس کے معنی گوشوارہ کے ہیں[2]، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ "قرطق" سے بنا ہوا ہے جو پہلوی لفظ کرتک (فارسی: کرتہ) کی معرب صورت ہے[3]۔ اسی طرح دیوان ابو نواس کے مرتب نے لفظ موزج کے معنی پَرا (wings) سمجھ لیے ہیں[4]، جب کہ یہ پہلوی لفظ موزک (فارسی: موزہ) کی معرب شکل ہے[5]۔ ایسی ہی ایک مثال ثعالبی کی یتیمۃ الدہر کے مرتب کی ہے جس نے لفظ تکسود کے مفہوم سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے[6]، جو کہ معروف فارسی لفظ تکسو (تکیہ) ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے[7]۔

اسی طرح ابن خلدون کے مقدمہ کی تازہ ترین اشاعت میں زرکش کا دیان کی ترکیب استعمال ہوئی ہے[8]، جس کی صحیح صورت "درفش کاویان" ہے، یعنی معروف دیومالائی ایرانی کردار کاوہ کا جھنڈا[9]۔ ابوالعلا معری کے رسالۃ الغفران کے مرتب نے لفظ لالکا کا مفہوم سمجھنے سے معذوری ظاہر کی ہے[10]، یہ بھی فارسی لفظ ہے جس کے معنی "جوتے" کے ہیں[11]۔

اس میں شبہہ نہیں کہ جوالیقی، خفاجی[12] اور ادّی شیر[13] کے آثار عربی متون میں فارسی الفاظ کی مشکل کے حل میں ہماری مدد کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی جملہ موارد میں دانشمندوں کی ضروریات کی کفالت پر قادر نہیں، اندریں حالات کلاسیکی عربی متون کو اساس بنا کر فارسی الاصل الفاظ و تراکیب کی ایک جامع لغات کی تدوین کے لیے جو اقدام بھی کیا جائیگا وہ بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا اور ایسی کتاب کی موجودگی سے کلاسیکی عربی متون پر کام کرنے والوں کو بہت آسانی ہو جائیگی۔

---

[1] السیوطی المزہر، ص ۲۸۷ [2] بشار، دیوان ۱۳۶۹ھ مقدمہ ص، [3] جوالیقی ص ۲۶۵ [4] ابو نواس ۱۹۵۵ء ص ۴۴۴ [5] جوالیقی ص ۳۱۰ [6] ثعالبی یتیمۃ قاہرہ ۱۳۶۶ھ ج ۳، ص ۶۹ [7] Dozy, Supplément Aux Dictionaires Arabes (Paris, 1927), Vol II, P. 276

[8] ابن خلدون ج ۳، ص ۱۱۲۳ [9] البیرونی، الآثار الباقیۃ لیپزگ ۱۹۲۳ء ص ۲۲۲ [10] معری الغفران، دار المعارف ص ۵۰۴ [11] دوزی ج ۲ ص ۵۰۰ [12] شفاء الغلیل قاہرہ ۱۳۲۵ھ [13] الالفاظ الفارسیۃ المعربۃ بیروت ۱۹۰۸ء۔

دوسرے عرب شعراء کے یہاں بھی کبھی کبھی فارسی الفاظ کا استعمال دکھائی دیتا ہے، مثلاً بحتری نے ورنش، بلہ اور نموذج[1] اور معری نے شطرنج کی اصطلاحات شاہ، رخ اور بیادق کو اپنے اشعار میں جگہ دی ہے۔

فارسی الاصل الفاظ کا استعمال عربی شاعری تک ہی محدود نہیں، اس کے نشانات نثری تصنیفوں میں بھی ملتے ہیں، مثال کے طور پر ہم یہاں تین نثری کتابوں کا ذکر کریں گے، پہلی کتاب عثمان بن منقذ کی الاعتبار[3] ہے جو چھٹی صدی ہجری میں شام میں لکھی گئی، اس میں ہم سرفسار، سرہنگ، خودہ، درگاہ، خشت اور برجم جیسے الفاظ دیکھتے ہیں، دوسری کتاب ابن الفوطی کی تالیف الحوادث الجامعہ[4] ہے جو آٹھویں صدی ہجری عراق میں لکھی گئی، اس میں مصنف نے چرخ، سرپوش، زرکش، کارخانہ، خربندیہ اور وزدار قسم کے فارسی الفاظ سے استفادہ کیا ہے، تیسری کتاب آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں مصر میں لکھی گئی سبکی کی معید النعم[5] ہے، اس میں مہماندار، تیردار، جوکاندار، جمدریہ، امیر شکار اور امیر آخور جیسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

کلاسیکی دور میں فارسی زبان سے عدم واقفیت کے باعث بعض غلط اشتقاقات بھی شہرت ورواج کی سند پا گئے، یاقوت کے بقول جب کسی نے معروف نحوی زجاج سے لفظ قصعۃ کا ماخذ دریافت کیا تو اس نے جواب دیا: لانہ تقصع الجوع، یعنی اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سے بھوک کی تسکین ہوتی[6] حالانکہ درحقیقت یہ فارسی لفظ کاسہ (پیالہ) ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے، السیوطی کا عقیدہ ہے کہ کسی فارسی

---

[1] بحتری، دیوان، قسطنطنیہ، سنہ ۱۳۰۰ھ، ج ۱، ص ۱۰۹ آخری لفظ کے لیے ملاحظہ ہو چھاپ قاہرہ سنہ ۱۹۶۳ء ج ۱، ص ۲۰۴۔

[2] معری، شرح التنویر علی سقط الزند، قاہرہ، مطبعۃ مصطفیٰ محمد ج ۲، ص ۲۱۷۔ [3] پرنسٹن سنہ ۱۹۳۰ء ص ۱۳، ۳۶، ۴۶، ۴۹، ۵۲، ۶۲۔ [4] بغداد سنہ ۱۳۵۱ھ، ص ۳۶، ۷۷، ۱۹۴، ۲۰۷، ۴۱۹، ۴۳۱۔

[5] قاہرہ سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۱، ۳۵ [6] یاقوت ارشاد، قاہرہ، سنہ ۱۳۵۵ھ ج ۱، ص ۵۹۔

لفظ کا اشتقاق عربی زبان سے منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ مچھلی پرندے سے پیدا ہوئی ہے[1]

عربی متون کی تصحیح میں مشغول اہل علم کے لیے عربی پر فارسی اثرات آج بھی ایک الجھن بنے ہوئے ہیں، بسا اوقات تو وہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن کبھی کبھار الفاظ کی غلط توجیہ کرنے لگتے ہیں، مثلاً دیوان بشار کے مرتب نے "مُقَرطَق" کا مفہوم "کانوں میں گوشوارے پہننے والا شخص" لیا ہے، گویا یہ لفظ "قرط" سے ماخوذ ہو، جس کے معنی گوشوارہ کے ہیں،[2] جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ "قرطق" سے بنا ہوا ہے جو پہلوی لفظ کرتک (فارسی، کرتہ) کی معرب صورت ہے[3] اسی طرح دیوان ابو نواس کے مرتب نے لفظ موزج کے معنی پر (طاوس)[4] سمجھ لیے ہیں جب کہ یہ پہلوی لفظ موزک (فارسی: موزہ) کی معرب شکل ہے[5]، ایسی ہی ایک مثال ثعالبی کی یتیمۃ الدہر کے مرتب کی ہے جس نے لفظ تمکسود کے مفہوم سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے[6] جو کہ معروف فارسی لفظ نمکسود (نمکین) ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے[7]

اسی طرح ابن خلدون کے مقدمہ کی تازہ ترین اشاعت میں زرکش کاویان کی ترکیب استعمال ہوئی ہے[8] جس کی صحیح صورت "درفش کاویان" ہے، یعنی معروف دیومالائی ایرانی کردار کاوہ کا جھنڈا[9]، ابو العلاء معری کے رسالۃ الغفران کے مرتب نے لفظ الالکا کا مفہوم سمجھنے سے معذوری ظاہر کی ہے[10]، یہ بھی فارسی لفظ ہے جس کے معنی "جوتے" کے ہیں[11]

اس میں شبہ نہیں کہ جوالیقی[12]، خفاجی[13] اور ادی شیر[14] کے آثار عربی متون میں فارسی الفاظ کی مشکل کے حل میں ہماری مدد کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی جملہ موارد میں دانشمندوں کی ضروریات کی کفالت پر قادر نہیں، ان حالات میں کلاسیکی عربی متون کو اساس بنا کر فارسی الاصل الفاظ و تراکیب کی ایک جامع لغات کی تدوین کے لیے جو اقدام بھی کیا جائے گا وہ بنظر استحسان دیکھا جائے گا اور ایسی کتاب کی موجودگی سے کلاسیکی عربی متون پر کام کرنے والوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔

---

[1] السیوطی المزہر ص ۲۸۰ [2] بشار، دیوان ۱۳۶۹ھ مقدمہ ص، [3] جوالیقی ص ۲۶۵ [4] ابو نواس ۱۹۵۳ء ص ۴۴۲
[5] جوالیقی ص ۳۱۰ [6] ثعالبی یتیمہ قاہرہ ۱۳۶۶ھ ج ۳، ص ۶۷ [7] Dozy, Supplément Aux Dictionnaires Arabes (Paris, 1927), Vol II, P. 276
[8] ابن خلدون ج ۳ ص ۱۱۲۳ [9] البیرونی، الآثار الباقیہ لیپزگ ۱۹۲۳ء ص ۲۲۲ [10] معری الغفران، دار المعارف ص ۵۰۴ [11] دوزی ج ۲ ص ۵۰۰ [12] شفاء الغلیل قاہرہ ۱۳۲۵ھ [13] الالفاظ الفارسیۃ المعربۃ بیروت ۱۹۰۸ء۔

وفیات

آصف علی اصغر علی فیضی مرحوم

از

سید شہاب الدین دسنوی

۲۲ راکتوبر ۱۹۸۱ء کو آصف علی اصغر علی فیضی بمبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں انتقال کر گئے، ان کی وفات سے ایک بلند پایہ دانشور اور محقق اور اچھے مقرر کی جگہ خالی ہوگئی۔

اپنے مزاج کے لحاظ سے فیضی صاحب نہایت خوش اخلاق، ہنس مکھ، وضعدار اور مہذب انسان تھے، ان کے پہلو میں حساس دل تھا جو کبھی اپنی ملت پر نالہ زن ہوتا، اور کبھی انسانیت کی گھٹتی ہوئی قدروں پر سوگوار، قانون، بالخصوص مروجہ محمڈن لا پر ان کی گہری نگاہ تھی، وہ بیرسٹر تو تھے، مگر پریکٹیس بہت کم کی، ان کا محبوب مشغلہ تنقید اور تحقیق تھا، انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے، ان کے تبصرے اکثر ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے موقر انگریزی اخبار اور رسالوں میں شائع ہوتے جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

فیضی صاحب نے بمبئی اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، گورنمنٹ لا کالج، بمبئی میں پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا، بمبئی ریاست، پھر یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے، مصر میں ہندوستان کے سفیر اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، پھر ریٹائرڈ ہوکر بمبئی میں مقیم ہوگئے۔

۱۹۳۳ء میں اسماعیل یوسف کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر داؤد پوتا اور

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ساتھ مل کر فیضی صاحب نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی، مشہور روسی نژاد محقق اور مستشرق پروفیسر ایوانو اور فیضی صاحب نے مل کر اس ادارے کے تحت اسماعیلی اور فاطمی عقائد سے متعلق کئی نادر مخطوطات ایڈٹ کرکے شایع کیے، اس کام کے لیے سابق آغا خاں کی طرف سے ایک معقول رقم بطور گرانٹ ملی۔ ۱۹۳۲ء میں بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عربوں کی جہاز رانی پر جو خطبے دیے تھے انھیں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نے کتابی صورت میں شایع کیا تھا، اسی ادارے کی دسویں سالگرہ کے جلسہ میں علامہ سید سلیمانؒ نے بمبئی میں ایک خصوصی خطبہ "ادب اور تعمیر ملت" کے عنوان سے دیا تھا۔

فیضی صاحب نے قاضی نعمان کی اہم تصنیف "دعائم الاسلام" کا ایک مستند اور عمدہ ایڈیشن کئی سالوں کی محنت کے بعد تیار کرکے 'دار المعارف' مصر سے شایع کیا، اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ بھی کیا، یہ ان کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ ہے جس پر انھیں بجا طور پر ناز تھا۔

مذہبی امور میں فیضی صاحب کے خیالات، بعض معاملات مثلاً عائلی قوانین کے بارے میں ہمارے علماء کے خیالات سے کچھ حد تک جدا تھے، وہ ان میں زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے ترمیم چاہتے تھے، دراصل وہ اسلام میں جدیدیت کی تحریک دیکھنا چاہتے تھے، جس کا ثبوت ان کی تصنیف A Modern Approach to Islam سے ملتا ہے، مگر فیضی صاحب کو جنھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ یہ جانتے ہیں کہ ہمارے علماے کرام کے وہ دل سے قدردان تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے، دارالمصنفین اور شبلی اسکول کے محققین کی تعریف کرتے تھے، ایک ہزار روپیہ دے کر وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بنے، [illegible] میں جب دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راقم نے فیضی صاحب کے مشورے سے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت شرکائے جلسہ میں سے بعض کی تقریروں کا انتظام کیا، ناسازیِ طبع کے باوجود فیضی صاحب ان نشستوں میں شریک ہوئے، جس

احترام سے انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا، اس سے خود یہ بزرگ بھی متاثر ہوئے، اپنے مضمون "سفر بمبئی" (صدق جدید) میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

فیضی صاحب کی دو خصوصیات کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے، ایک تو وہ انتہائی اصول پسند واقع ہوئے تھے، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یونین سروس کمیشن کی ممبری کے دوران میں ایک مسلمان نوجوان آئی۔ اے۔ ایس کے انٹرویو کے لیے کمیشن کے سامنے پیش ہونے والے تھے، ان کے والد صاحب فیضی صاحب سے تعلقات کی بنیاد پر انٹرویو کی صبح فیضی صاحب کے گھر پہونچے اور باتوں باتوں میں بتا دیا کہ ان کا بیٹا انٹرویو میں جا رہا ہے، فیضی صاحب دفتر جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے، ان صاحب کے چلے جانے کے بعد انھوں نے اپنے دفتر خط لکھ بھیجا کہ ان کے ایک دوست اپنے لڑکے کے انٹرویو کے سلسلہ میں ان سے مل چکے ہیں، اس لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس دن انٹرویو میں وہ کمیشن کے ساتھ شریک ہوں، انھوں نے یہ بھی احتیاط برتی کہ نہ تو امیدوار اور نہ ان کے والد کا نام ظاہر کیا، نتیجہ نکلنے پر لڑکا کامیاب رہا، فیضی صاحب نے مبارکباد لکھ بھیجی۔

دوسری خصوصیت فیضی صاحب کی یہ تھی کہ علمی اور تحقیقی کاموں میں وہ رواداری برتنے کے قائل نہ تھے، تحقیق کے معاملہ میں ان کا مزاج پوری طرح مغربی انداز میں ڈھلا ہوا تھا، الفاظ کی چھان بین، حوالے اور ماخذ معتبر یا غیر معتبر، ہر ایک بات میں حد درجہ احتیاط برتتا، ان کی تنقید نگاری میں اکثر مغربی طرز کا "خشک طنز" پایا جاتا تھا، ایک بار کسی تحقیقی کتاب پر انھوں نے پہلے تو اس کے اغلاط کی نشاندہی کی، پھر لکھا کہ اس کتاب سے ریسرچ کرنے والوں کو البتہ ایک بڑا فائدہ یہ پہونچے گا کہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ تحقیق کس طرح نہیں کرنی چاہیے۔

فیضی صاحب کتابوں کے قدر دان تھے، وہ کتابیں جمع کرنا ہی نہیں بلکہ انھیں سلیقہ اور احتیاط سے رکھنا بھی جانتے تھے، ۱۹۵۷ء میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اپنی بیشتر مطبوعہ کتابیں اس یونیورسٹی

کے کتب خانے کو دے دیں۔ اس سے چند سال قبل اپنے ذخیرے سے انھوں نے اسماعیلی مذہب سے متعلق ایک سو چھیاسی [۱۸۶] مخطوطات اور دیگر تینتیس [۳۳] مخطوطات بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری کو نذر کر دیے۔ ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر ایم. گوربا والا نے ان مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے شایع کی۔ جو چند فقہ سے متعلق مخطوطات ان کے پاس بچ رہے، ان کی فہرست خود فیضی صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شایع کی۔

اردو سے فیضی صاحب کو بڑی محبت تھی، وہ ادیب تو نہ تھے، مگر اپنے علم و دانش کی بدولت جو کچھ لکھتے وہ کافی دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ ان کی اہلیہ سلطانہ فیضی (قاضی کبیرالدین کی صاحبزادی) اچھا لکھتی تھیں، ان کی کئی کتابیں عودِ نیل، چڑیاں وغیرہ چھپ کر خاصی مقبول ہوئیں۔

بدقسمتی سے فیضی صاحب کا آخری زمانہ بڑی حسرت اور ذہنی کوفت میں گذرا، راقم کی ان سے آخری ملاقات یکم جون کو ہوئی جب وہ اپنے لاعلاج مرض کو صحتیابی کے بجائے موت کی طرف لے جانے کے خواہشمند تھے، اس کے باوجود وہ یورپ کے سفر کی تیاری کر رہے تھے جہاں انھیں ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسماعیلی اسٹڈیز قائم کرنے کی دعوت موصول ہوئی تھی، وہ لندن پہونچے بھی، مگر جلد ہی صحت سے مجبور ہو کر واپس آ گئے، بمبئی کے مشہور بریچ کینڈی اسپتال میں داخل ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

فیضی صاحب، بدرالدین طیب جی مرحوم کے نواسے تھے، مسلک کے لحاظ سے سلیمانی بوہرہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اور اس جماعت کے اکثر افراد کی طرح وسیع القلب اور بڑے فراخ دل تھے، عام مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرنے میں کبھی عذر نہیں کیا، خود راقم کو فیضی صاحب کے گھر پر کبھی مغرب کی نماز پڑھنے کا موقع ملا تو فیضی صاحب کبھی تو شریک ہوئے اور کبھی یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی "میں آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا مگر پیروں میں تکلیف کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھتا ہوں، اس لیے اجازت دیں تو دوسرے کمرے میں پڑھ لوں"۔ ان کے ذخیرے میں کلام پاک کے کئی خوبصورت اور قدیم قلمی نسخے تھے جنھیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

مطبوعات جدیدہ

رجال السند والہند (عربی) مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ، دارالانصار، شارع ابن العقاد شارع الکعبۃ ملیۃ قاہرہ

یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو بڑے حذف و اضافہ کے بعد شائع کیا گیا ہے، اور دو جزوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی ضخامت بھی دوچند ہوگئی ہے، پہلے جزء میں ہند و سندھ کے دو طرح کے اشخاص کا تذکرہ ہے، ایک وہ جو یہیں پیدا ہوئے اور مدۃ العمر یہیں رہے، دوسرے وہ جن کا اصل تعلق تو اسی سرزمین سے تھا، مگر ان کی ولادت و سکونت باہر رہی، دوسرے جزء میں باہر سے یہاں آکر واپس چلے جانے والوں یا باہر سے آکر یہیں قیام پذیر ہونے اور یہیں کی خاک کا پیوند ہونے والوں کا تذکرہ ہے، دونوں جزوں میں ساتویں صدی سے قبل کے مختلف طبقوں کے سیکڑوں مشاہیر کا ذکر ہے، پہلے جزء کے شروع میں ساتویں صدی سے پہلے کے عالم اسلام بشمول سندھ و ہند کی مختصر مرقع آرائی کرکے دکھایا ہے کہ علمی، دینی، سیاسی اور تمدنی حیثیت سے یہ مسلمانوں کا عہد زریں تھا، نیز اس دور کے مشہور اور اہم شہروں کے متعلق بھی مختصر معلومات قلمبند کیے ہیں، دوسرے جزء کا آغاز ہندوستان میں آنے والے صحابہ کرام رضہ سے کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف کو یہ صراحت کر دینی چاہیے تھی کہ اکثر صحابہ کرام غازی اور فوجی کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے تھے لیکن انھوں نے نہ تو اس کو اپنا مستقر بنایا اور نہ ان کی یہاں وفات ہوئی، دوسرے اس دور میں کرمان وغیرہ بھی سندھ و ہند ہی کا جزء سمجھے جاتے تھے اور اس زمانہ کے اکثر فاتحین وہیں آئے تھے، یہ کتاب رجال و انساب، طبقات، تراجم، تاریخ و جغرافیہ، فتوح و مغازی اور ادب وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد لکھی گئی ہے اور اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

"ض"

جلد ۱۲۹ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

شذرات

دارالمصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" پر جو بین الاقوامی سمینار ہونے والا تھا وہ گذشتہ ماہ اللہ تبارک تعالیٰ کے فضل وکرم سے بخیر وخوبی انجام پاگیا، اس کی کچھ روداد تو اس شمارہ میں ملے گی، بقیہ آیندہ اشاعت میں شایع ہوگی۔

الحمدللہ کہ یہ سمینار محض ایک دلچسپ علمی نشست تک محدود نہیں رہا، بلکہ اپنے موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ایک مستقل تحریک میں ابھرا، اس کو فروغ دینے کے لیے مختلف ممالک کی انیس متقدر شخصیتوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، جو علمی و معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کی تصحیح کیلئے ایک تصنیفی و تالیفی پروگرام مرتب کرے گی اور اسکول کی سطح کی یونیورسٹیوں کے معیار کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرنے میں مدد دے گی جن سے مسلمان نوجوانوں کے ذہن کی صحیح اور صالح تربیت ہو سکے، یہ اسلامی موضوعات پر حوالجات کی معیاری کتابیں تیار کرنے کی بھی سہولت فراہم کرے گی، یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ دارالمصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گرانقدر کتابیں پیش کی ہیں، ان کو عربی اور آج کی زندہ زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے، تاکہ ان سے بڑے پیمانہ پر استفادہ کیا جا سکے اور اس طرح اس مذاکرۂ علمی کے مقاصد پورے ہوں، یہ بھی طے پایا کہ دارالمصنفین میں ایک سکریٹریٹ قائم کیا جائے جو سمینار کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنائے اور مذکورۂ بالا کمیٹی سے رابطہ قائم رکھے اس کی نظامت اس خاکسار کے سپرد کی گئی اور یہ اختیار دیا گیا ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشورہ سے دفتر رابطہ کی ضروریات کے لیے مناسب اسٹاف مقرر کیا جائے۔

سمینار میں یہ اعتراف کیا گیا کہ بعض مستشرقین نے مفید کام ضرور انجام دیے ہیں، لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے اپنی پُرفریب تحریر و تحقیق سے فتنہ پروری اور شر انگیزی کی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود مسلمان اہل قلم اور ارباب فکر نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ایسا اسلامی لٹریچر پیش نہیں کیا جس کی تلاش مسلمان نوجوانوں کو خاص طور پر تھی، اس خلا سے

ستشرقین نے پورا فائدہ اٹھایا، اب ضرورت اس کی ہے کہ یہ خلاء جلد از جلد پُر کیا جائے، اس سمینار سے جو خوشگوار فضا پیدا ہوئی ہے اس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں۔

مستشرقین کے خلاف ہماری جنگ اب تک مدافعانہ رہی، اب اس میں کچھ جارحانہ رنگ بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے، یہ مستشرقین زیادہ تر اس لئے ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ پر یہ سمجھ کر حملے کرتے ہیں کہ ہم ان کے رسول پر نازیبا حملے نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے ہمارے ایمان میں خلل پڑ جائے گا، یہ صحیح ہے کہ ہم ان کے رسولؑ کی ذات مبارک کے خلاف تو کچھ نہیں لکھ سکتے لیکن ان کے موجودہ تحریف شدہ مذہب پر ہمارا قلم خوب چل سکتا ہے۔

توحید اور رسالت سے متعلق موجودہ عیسائیوں کا کیا تصور ہے، ان کا عقیدۂ تثلیث کہاں تک صحیح ہے، باپ بیٹے اور روح القدس میں ہر ایک کو خدا مان لیا جائے تو کیا خدا ایک رہا یا نہیں؟ کیا حلول وتجسم کا عقیدہ حضرت عیسیٰ کی عین تعلیم کے مطابق ہے؟ کیا حضرت عیسیٰؑ کو پینطیس پیلاطیس کے حکم سے واقعی سولی پر چڑھایا گیا؟ کیا حضرت عیسیٰؑ پھانسی پانے اور قبر میں دفن ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گئے، صلیب مقدس کا نشان حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد ہی شروع ہوا یا تین صدیوں کے بعد شاہ قسطنطین کا اختراع ہے؟ مصلوبیت، بپتسمہ، حیات ثانیہ اور کفارہ کی نوعیت کیا ہے، عشائے ربانی میں روٹی کے ساتھ جو شراب پی جاتی ہے کیا وہ واقعی حضرت عیسیٰؑ کے بدن کا خون بن جاتا ہے؟ عیسائیت کا بانی کون ہے؟ حضرت عیسیٰؑ یا پولس، کیا حضرت عیسیٰؑ اور پولس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں؟ کیا پولس نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں تحریف نہیں کی؟

حضرت عیسیٰؑ کے حواری ان کو کیا سمجھتے تھے اور اب کیا سمجھے جاتے ہیں؟ انجیل یوحنا کی کیا حقیقت ہے؟ کیا یوحنا حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد تھے، کیا یہ یوحنا انجیل کسی یہودی عالم نے نہیں لکھی، کیا انجیل یوحنا جعلی تصنیف ہے؟ یا ایک الہامی کتاب ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد سنہ ۹۵ء تک اس کا ذکر کہیں نہیں آتا؟ کیا حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں کے مستند حالات کبھی لکھے گئے یا ان میں افسانوی رنگ پیدا کر دیا گیا ہے؟ کیا دوسری اور تیسری انجیل یعنی مرقس اور لوقا حواریوں کی ہیں؟ بائبل میں عہد عتیق اور عہد جدید کی تفریق کیوں

کی گئی ؟ کیا بائبل اپنی تحریفات کے باوجود معنوی اختلافات کا مجموعہ نہیں؟

کیا کلیسا اور پاپائیت کی تاریخ داغدار نہیں؟ کیا مشہور پاپائے اعظم سینٹ گری گوری کا زیادہ تر وقت ملکہ برونہاٹ کی خوشامد میں نہیں گذرتا تھا؟ شاہ گونڈی باڈ نے اپنے بیٹوں کو قتل کروا ڈالا تو کیا پادری سینٹ آوسٹن نے اس قتل کو صحیح ثابت کر کے اس کی حکومت کی جڑ کو مضبوط نہیں کیا؟ کیا کلیسا کے اندر مے نوشی اور عیش پرستی نہیں ہوتی؟ کیا یہ پادری اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کرتے رہے؟ کیا یہ پادری اپنی تجرد پسندی کے باوجود خاموشی سے ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ لیتے تھے؟ کیا سینٹ اگسٹائن تعدد ازدواج کو بداخلاقی اور معصیت یا جائز سمجھتا رہا؟ کیا جرمنی کے مذہبی مصلحین سولہویں صدی تک تعدد ازدواج کے قائل نہیں رہے؟ کیا فرانس کے مورو ونجین بادشاہوں کے محل میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں ہیں؟ کیا فریڈرک بار بروسا اور فلپ تھیوڈوٹس کی کئی بیویاں نہیں تھیں؟ کیا شارلیمین نو (۹) بیویوں کا شوہر نہیں تھا؟

تعدد ازدواج کے عیسائی مخالفین کے معاشرہ میں جو آج صنفی آوارگی، بیسوائی، فحاشی، عریانی، نائٹ کلب، برہنہ رقص، منع حمل، اسقاط، طلاق، ناجائز ولادتوں کی کثرت ہے اور ستم بالائے ستم مرد کی مرد اور عورت سے عورت کی شادی کا جو قانونی جواز ہے، کیا ان سے انسانیت کی گردنیں فخر سے اونچی یا شرم سے جھکی ہوئی ہیں؟

کیا عیسائی حکمرانوں نے اپنی لڑائیوں میں اتنا خون نہیں بہایا جو دنیا کے تمام مذبح خانوں میں اب تک نہ بہا ہوگا؟ کیا ولیم اول نے انگلستان فتح کیا تو اس کے حکم سے ایک لاکھ سے زیادہ مردوں، بچوں اور عورتوں کو ہلاک نہیں کیا گیا؟ کیا پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی ۳۲ سالہ جنگ میں بوہیمیا کے تینتیس (۳۳) ہزار گاؤں برباد نہیں کیے گئے؟ کیا ۱۵۶۸ء میں پوپ کے حکم سے نیدرلینڈ کے تیس (۳۰) لاکھ باشندے سولی پر نہیں چڑھائے گئے؟ کیا یہ کہنا غلط ہے کہ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں ایک کروڑ آدمی میدان جنگ میں مارے گئے؟ کیا دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم سے ہیروشیما میں لاکھوں مرد، عورت، بچے اور بوڑھے تڑپتے ہوئے دکھائی نہیں دیے؟ کیا ویٹ نام کی لڑائیوں میں امریکیوں نے اٹھارہ (۱۸) لاکھ ننانوے ہزار، چھ سو اڑسٹھ حملے کر کے وہاں کے چھتیس (۳۶) لاکھ باسٹھ ہزار آدمیوں کو لقمۂ اجل نہیں بنایا؟

یہ سارے موضوعات ایسے ہیں کہ اگر مستشرقانہ انداز میں ان کا معروضی اور محققانہ مطالعہ کیا جائے تو ان کے لکھنے والے ان مستشرقین کے محاذ پر پہنچ کر ان کے خلاف آسانی سے صف آرا ہو سکتے ہیں۔

مقالات

جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۷)

تاریخ اسلام جلد دوم شاہ صاحب کی تاریخ اسلام کی دوسری جلد ۱۹۴۱ء میں شایع ہوئی، اس میں امیر معاویہؓ، یزید اور عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق وہی واقعات ہیں جو وہ سیر الصحابہ جلد ششم میں لکھ چکے تھے، مگر اس جلد میں تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ان سارے واقعات کو دہرانا بھی ضروری تھا، اور انھوں نے ان کو دہرایا بھی، مگر ان کی ترتیب اور نظم کچھ ایسا رکھا کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سیر الصحابہ جلد ششم کی ہو بہو نقل ہے، یہ ان کی تصنیفی خوش سلیقگی کے ساتھ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ان کے قلم میں اتنی قوت آگئی تھی کہ واقعات کے دہرانے میں دوسرا انداز بھی اختیار کر سکتے ہیں، بنی امیہ میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ایک مستقل کتاب شایع ہو چکی تھی، پھر وہ خود اپنی کتاب تابعین میں ان پر سیر حاصل بحث کر چکے تھے، اس لیے اس میں کچھ مزید اضافہ کرنا ممکن نہ تھا، انھوں نے اپنی اس جلد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات قلمبند کرنے میں اس کا پورا خیال رکھا ہے کہ ان کی تحریر اور انداز بیان مولانا عبدالسلام ندوی کی 'سیرت عمر بن عبدالعزیز' سے مختلف ہو، اور پھر 'تابعین' میں جو کچھ لکھ چکے ہیں اسی کو نقل نہ کر دیں، اور اس میں وہ کامیاب رہے،

اس جلد میں امیر معاویہؓ، یزید اور عبد اللہؓ بن زبیر کے علاوہ معاویہ ثانی بن یزید، مروان بن حکم، عبد الملک بن مروان، ولید اول بن عبد الملک، سلیمان بن عبد الملک، حضرت عمرؒ بن عبد العزیز، یزید بن عبد الملک، ہشام بن عبد الملک وغیرہ کے حالات ہیں۔

اس خاندان کی حکومت ۴۱ھ میں شروع ہوئی اور ۱۳۲ھ میں ختم ہوگئی، یعنی کل اکانوے برس رہی، اس دور میں امیر معاویہؓ کے زمانہ میں شیعان علی، شیعان بنی امیہ اور خوارج کی شورش رہی، یزید کے عہد میں کربلا کا عبرت انگیز خونیں واقعہ پیش آیا، عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں توابین، مختار بن ابی عبید ثقفی، محمد بن حنفیہ، عبید اللہ بن الحر جعفی، عمرو بن سعید، مصعب بن زبیر، عبد اللہؓ بن زبیر کے ہنگامے پیش آئے، جن میں مختار ثقفی، عمرو بن سعید اموی، مصعب بن زبیر قتل کیے گئے اور عبد اللہؓ بن زبیر شہید ہوئے، سلیمان بن عبد الملک (۹۶-۹۹ھ / ۷۱۴-۷۱۷ء) کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کے چار عظیم ہیرو قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، عبد العزیز بن موسیٰ کا عبرتناک انجام ہوا، ہشام بن عبد الملک (۱۰۵-۱۲۵ھ) کی حکومت میں زید بن علی ایک جنگ میں ہلاک ہوئے، اسی طرح ولید بن ثانی بن یزید بن عبد الملک کے دور میں یحییٰ بن زید قتل کیے گئے، مروان ثانی بن محمد بن مروان (۱۲۷-۱۳۲ھ) کی حکومت میں امام ابراہیم کا قتل ہوا، پھر بغاوتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، امیر معاویہؓ کے زمانہ میں حجر بن عدیؓ جیسے بڑے صحابی قتل کیے گئے، عبد الملک بن مروان کے خلاف عراق میں اشعث کی بغاوت ہوئی جس میں وہ مارا گیا، ولید بن عبد الملک کے عہد میں اشبیلیہ میں بغاوت ہوئی، سلیمان بن عبد الملک نے قتیبہ بن مسلم پر بغاوت کا الزام رکھ کر اس کو قتل کیا، یزید ثالث کی حکومت میں حمص، فلسطین اور اردن میں بغاوتیں ہوئیں، مروان ثانی کے عہد میں شام میں سرکشی ہوئی، خلیفہ ولید ثانی بن یزید (۱۲۵-۱۲۶ھ) کی اتنی مخالفت ہوئی کہ اس کا قتل ہوا، خارجیوں کی شورش ہر زمانہ میں ہوئی، شاہ صاحب نے بنی امیہ کی تاریخ کے ان تاریک پہلوؤں کو اچھی طرح دکھایا ہے، ایک دیانتدار مورخ کا فرض ہے کہ وہ تاریخ لکھنے میں تاریک پہلوؤں پر پردہ نہ ڈالے، لیکن شاہ صاحبؒ نے

بنی امیہ کی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو بھی اچھی طرح واضح کیا ہے جس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شورشیں اور بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، لیکن اس کے ساتھ فتوحات اور حکومت کی ترقیاں بھی جاری رہیں، امیر معاویہؓ کے زمانہ میں سنتہ، ترکستان، شمالی افریقہ، روڈس، ارواڈ وغیرہ کی فتوحات ہوئیں، ولید بن عبد الملک کے فوجی سرداروں نے ترکستان اور چین کے علاقے فتح کیے، خاقان چین بھی اطاعت گذار ہوا، سمرقند بھی فتح ہوا، محمد بن قاسم نے سندھ کو زیر نگیں کیا، اسی زمانہ میں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے جس طرح اندلس پہونچ کر قرطبہ، تدمر، طلیطلہ، مدینۃ المائدہ، قرمونہ، اشبیلیہ، ماردہ وغیرہ کو فتح کیا ہے اس کو شاہ صاحبؒ نے بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر قلمبند کیا ہے، طارق بن زیاد نے وادیٔ لکہ میں دریا کے کنارے پہونچ کر اپنی ایک تقریر سے اپنے لشکریوں کی جس طرح ہمت بڑھائی ہے، وہ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں سنیے:

" اما بعد، لوگو! میدانِ جنگ سے مفر کی اب کوئی صورت نہیں ہے، آگے دشمن ہے اور پیچھے دریا، خدا کی قسم پامردی اور استقلال میں نجات ہے، یہی وہ فتحمند فوجیں ہیں جو مغلوب نہیں ہو سکتیں، اگر یہ دونوں باتیں موجود ہیں تو تعداد کی قلت سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا، بزدلی، کاہلی، سستی، نامردی، اختلاف اور غرور کے ساتھ تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔

لوگو! میری تقلید کرو، اگر میں حملہ کروں تو تم بھی حملہ آور ہو جاؤ اور جب میں رک جاؤں تو تم بھی رک جاؤ، جنگ کے وقت سب مل کر ایک جسم بن جاؤ، میں اس سرکش یعنی راڈرک پر حملہ کر کے دست بدست مقابلہ کروں گا، اگر میں اس حملہ میں مارا جاؤں تو تم رنج و غم نہ کرنا اور میرے بعد آپس میں جھگڑ کر لڑ نہ بیٹھنا، اس سے تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی اور تم دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ پھیر دوگے اور قتل و گرفتار ہو کر برباد ہو جاؤ گے، خبردار! وقت پر ہراساں نہ ہونا اور اپنے کو دشمن کے حوالہ نہ کرنا، خدا نے مشقت اور جفاکشی کے ذریعہ دنیا میں تمہارے لیے جو عزت، شرف، راحت اور آخرت میں شہادت کا جو ثواب مقدر کیا ہے اس کی طرف بڑھو، خدا کی پناہ اور حمایت کے باوجود اگر تم ذلت پر راضی ہوگے تو

تمہارے ملک سے بے خبر ہو گئے، دوسرے مسلمان ملک تم کو برے الفاظ سے یاد کریں گے، جیسے ہی میں حملہ کروں تم بھی حملہ آور ہو جاؤ۔"

شاہ صاحبؒ ایک یوروپین مورخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اسپین کی فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد ہی عربوں نے ترقی شروع کر دی، ایک صدی کے اندر اندر غیر مزروعہ زمینیں کاشت ہونے لگیں، اجاڑ بستیاں آباد ہو گئیں، بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں، دوسری اقوام سے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اس کے بعد ہی عربوں نے علوم و ادب کی طرف توجہ کی، یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے کرائے، دار العلوم قائم کیے جو مدت تک یورپ میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔

شمالی اندلس کی فتح کے بعد مسلمان فرانس کی طرف بڑھے، مگر وہ پھر پیچھے پلٹ آئے، اسی زمانہ میں ولید نے اپنے بھائی مسلمہ اور اپنے لڑکے عباس کو شام بھیجا، جنھوں نے اہم جنگی مقامات فتح کیے، اسی میں مصیصہ کے علاوہ حصین لوق، حصن اخرم، حصن بولس، حصن عموریہ اور نواحِ آذربائیجان کے بعض علاقے نیز بحیرۂ روم میں جزیرۂ میورقہ اور منورقہ فتح ہوئے۔

سلیمان بن عبد الملک (۹۶ھ تا ۹۹ھ) کے عہد میں جرجان، طبرستان اور قہستان کی فتح ہوئی، یزید بن عبد الملک کے دورِ حکومت میں ترکستان، خزر، قبچاق اور ارمن کے علاقے زیر نگیں ہوئے، ہشام بن عبد الملک (۱۰۵ھ-۱۲۵ھ) کے زمانہ میں ایشیائے کوچک کے علاقے قونیہ، کمخ، قیساریہ، طیبہ، صملہ، خرشنہ اور مطمورہ وغیرہ فتح ہوئے، اسی کے عہد میں فرانس کو فتح کرنے کی کوشش کی گئی، سردانیہ اور صقلیہ پر بھی حملے کیے گئے، ہشام کی فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس نے مشرق میں ترک و تاتار اور مغرب میں بربر کی قوت کا خاتمہ کر دیا، رومیوں کو اسلامی حدود کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، جہاں جہاں خوارج نے سر اٹھایا فوراً ان کو کچل دیا، پھر انھیں شورش بپا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا، اسلامی سلطنت کے ہر حصہ میں فتوحات ہوئیں، جن کا ذکر شاہ صاحبؒ نے کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ اس زمانہ کے عربوں کی سپہ گری کے کارنامے پڑھ کر فخر ہوتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کو حکمرانوں کے کارناموں کا جائزہ لے کر ان کا ناقدانہ تجزیہ کرنے کا خاص ملکہ ہوگیا تھا، اس لیے بنو امیہ کے خلفاء کی سیرت و کردار پر بھی اچھی روشنی ڈالتے گئے ہیں، جس سے ان کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے آتے گئے ہیں، مثلاً امیر معاویہؓ کے متعلق لکھتے ہیں: ان کے زمانے میں نظامِ خلافت میں سب سے بڑا انقلاب یہ ہوا کہ خلافتِ اسلامیہ موروثی و شخصی حکومت کے قالب میں آگئی، جس سے اس کی اصل روح بدل گئی، لیکن اس کا ظاہری ڈھانچہ وہی رہا، جو خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں تھا، بلکہ انھوں نے اس کو مختلف حیثیتوں سے اور زیادہ ترقی دی، مسلسل خانہ جنگی سے نظامِ خلافت میں جو برہمی پیدا ہو رہی تھی، اسے ازسرِ نو قائم کیا، اندرونی اور بیرونی مخالف طاقتوں کا خاتمہ کرکے امن و سکون پیدا کیا، بغاوتیں فرو کیں، ملک فتح کیے، تمدنی ضروریات کے مطابق بہت سے نئے نئے شعبے قائم کیے اور اپنے بعد ایک وسیع اور طاقتور حکومت چھوڑ گئے (ص ۲۹) مگر اسی کے ساتھ شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کی ناحق صف آرائی، اس کی کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل کا استعمال، حضرت علیؓ پر سب و شتم، یزید کی ولی عہدی، یہ سب ان کی ایسی کھلی ہوئی غلطیاں ہیں جن سے کوئی حق پرست انکار نہیں کرسکتا۔

عبد الملک بن مروان کے متعلق بتلاتے ہیں کہ اس نے اپنے استقلال، ہمت اور شجاعت سے نہ صرف تمام مخالف حالات پر قابو حاصل کرلیا بلکہ نئی فتوحات بھی حاصل کیں، سندھ سے لے کر جبرالٹر تک ایک متحدہ حکومت قائم ہوگئی، اور اس کے جانشینوں کو اطمینان کے ساتھ تعمیری کاموں کا موقع ملا، مگر بعض ایسے واقعات بھی ہیں جن سے عبد الملک کے دامن پر دھبہ آتا ہے، مثلاً اس نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے جنگ کرنے میں خانہ کعبہ پر سنگ باری کی، اسی کے عہد میں مشہور صحابی حضرت انس بن مالکؓ اور مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیبؓ اور دوسرے تابعین کی تحقیر و تذلیل ہوئی، گو ان واقعات میں اس کے عمال کا ہاتھ رہا، لیکن اس سے وہ یکسر بری بھی نہیں ہے۔

ولید بن عبد الملک کی یہ مرقع آرائی کی ہے کہ اس کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی، امن و رفاہیت کے

فتوحات ملکی اور تنظیم و ترتیب کے لحاظ سے بنی امیہ کا عہد زریں ہے، اس نے فوجی نظام میں بڑی ترقی دی، جہاز سازی کے نئے نئے کارخانے کھولے گئے، رعایا کے لیے رفاہ عام کے اتنے کام انجام دیے گئے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کے علاوہ اس کی نظیر نہیں ملتی، سڑکیں درست ہوئیں، نہریں کھدوائی گئیں، مسافروں کے لیے جابجا مہمان خانے قائم ہوئے، سارے ملک میں شفا خانے کھولے گئے، بھیک مانگنے کی ممانعت کی گئی، اپاہجوں کی خدمت کے لیے آدمی مقرر کیے گئے، یتیموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا، نظام تعلیم میں ترقی دی گئی، مسجد نبویؐ کی تزئین و آرائش اور جامع دمشق کی تعمیر میں بے دریغ دولت صرف کی، اس کی آرائش میں اس زمانہ کی تمام صناعیاں ختم کر دیں، وغیرہ وغیرہ، ان تمام خوبیوں کے ساتھ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑا سخت گیر تھا، اس لیے اس کے زمانہ میں ہزاروں آدمی قید و بند میں مبتلا ہوئے۔

سلیمان بن عبدالملک کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ حکومت کے عمال کی اصلاح تھی جن کے مظالم اور بدعنوانی سے اموی خلفاء بدنام ہو رہے تھے، خود خلفاء کچھ ایسے جابر و ظالم نہ تھے، بلکہ عام دنیاوی حکمرانوں کی طرح ان میں، اچھے بھی تھے، برے بھی، یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے کچھ ظالمانہ افعال سرزد ہوئے ہوں اور ضرور ہوئے، لیکن ظلم کرنا ان کی طبیعت کا خصوصی رنگ نہ تھا، بنو امیہ کے بعض عمال خصوصاً حجاج اور اس کے ماتحت حکام ظالم اور مطلق العنان تھے، ان کی مطلق العنانی کا بہت کم تدارک کیا جاتا، اس لیے ان کے مظالم بھی خلفاء کی طرف منسوب ہو گئے، سلیمان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا، اس لیے تخت نشینی کے ساتھ ہی اس نے عمال کا مواخذہ و احتساب شروع کر دیا، اس کے دور سے پہلے جو لوگ ناحق قید کیے گئے تھے سب کو رہا کر دیا، جلاوطن اشخاص کو واپسی کی اجازت دے دی، اس سلسلہ میں اتنے قیدی رہا کیے گئے کہ قید خانے خالی ہو گئے، شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ جو سیکڑوں کارناموں اور اصلاحوں سے بڑھ کر ہے وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی ولیعہدی ہے، جنھوں نے اموی سلطنت کو خلافت راشدہ کے قالب میں بدل دیا، اس کی زندگی کا یہ پہلو دوسرے مسلمان حکمرانوں کے لیے قابل تقلید

دسکتا تھا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ خود سلیمان کے بیٹے اور حقیقی بھائی موجود تھے، جس سے اس کا یہ کارنامہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں جو اصلاحات ہوئیں ان کی سعادت میں سلیمان کا بھی حصہ ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی حکومت دو سال پانچ مہینے رہی، مگر انھوں نے اپنے زمانہ میں جو نمایاں کام انجام دیے، ان کی تفصیل بیان کرنے میں شاہ صاحبؒ پر بڑی انشراحی کیفیت طاری ہو گئی ہے، اور یہ عہد اس کا مستحق بھی تھا، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس اور عطر بیز مانے جاتے تھے، مگر تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی ابوذر غفاریؓ اور ابو ہریرہؓ کا قالب اختیار کر لیا، آپ کا اصل مقصد خلافت راشدہ کے دور کا دوبارہ احیاء تھا، اور اس کے لیے پوری کوشش کی جس سے اموی خاندان آزردہ بھی ہوا، خلیفہ بنتے ہی خود انکو اور اموی خاندان کے ارکان کو جتنی جاگیریں ملی تھیں ان کو ان کے اصلی حقداروں کو واپس کیا، اور یہ کام اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کیا، فدک کے علاقہ کی جو صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی اس کو اسی حالت پر لوٹا دیا، خود ان کے خاندان والوں کو بیت المال سے جو وظائف اور گذارے ملتے تھے بند کرا دیا، بیت المال سے خلفاء کے تعیش پر جو رقم خرچ ہوتی تھی وہ بھی رکوا دی، معذور اشخاص کے لیے وظائف مقرر کیے، ایک عام لنگر خانے سے فقراء اور مساکین کو کھانا ملتا تھا، رعایا میں ایسی خوشحالی پیدا ہو گئی کہ کوئی صدقہ لینے والا نہ ملتا تھا، ظالم عمال ہر جگہ سے نکال دیے گئے، انھوں نے ذمیوں کے حقوق کی حفاظت میں عہد فاروقی کی یاد تازہ کر دی، ممالک محروسہ میں بکثرت سرائیں بنوائیں، بہ لحاظ احیائے شریعت اور استیصال بدعت کے احکام جاری کیے، نماز کے اوقات کی پابندی سختی سے کرائی، زکوٰۃ کا باضابطہ نظام قائم کیا، خطبہ میں حضرت علیؓ پر جو طعن کیا جاتا تھا اس کو رکوا دیا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے اس وقت تک جو خوں ریزی ہو رہی تھی اس کو روکنے کے لیے اتنی احتیاط برتی کہ سرکش اور فتنہ جو اسلامی فرقوں کے مقابلہ میں سرگرم تھے ان کے خلاف بھی تلوار نہ اٹھائی، خارجی نہ صرف حکومت کے

خلاف تھے، بلکہ ان کا وجود امن عامہ کے لیے بھی خطرناک تھا۔ ان کے مقابلہ میں بھی تلوار روک لی۔ ان اوصاف کے ساتھ وہ علمی اعتبار سے جلیل القدر عالم تھے، اس عہد کے اکابر علما ان کے سامنے طفلِ دبستان تھے، ان کے دربار میں علما و فقہا کا بڑا اچھا اجتماع ہوگیا تھا، ان کا سب سے بڑا مذہبی کارنامہ احادیث نبوی کی حفاظت اور ان کی اشاعت ہے، ان کا ایک مجموعہ مرتب کرا کے تمام ممالک محروسہ میں بھجوایا، مغازی اور سیرت کے درس کا انتظام کیا، ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ برابر گریہ و بکا کرتے رہتے، لوگ اس کے متعلق کچھ کہتے تو فرماتے کہ تم لوگ رونے پر مجھے ملامت نہ کرو، کیونکہ اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلے میں عمر پکڑا جائے گا، رات کو جب تک خلافت کا کام کرتے تھے اس وقت تک بیت المال کی شمع جلاتے تھے، اس کے بعد گل کر کے اپنا ذاتی چراغ جلاتے تھے، مرض الموت میں ایک قمیص کے علاوہ دوسری نہ تھی، ان کے سالے مسلمہ بن عبد الملک نے اپنی بہن سے کہا کہ قمیص میلی ہوگئی ہے لوگ عیادت کو آتے ہیں، دوسری بدلوا دو، وہ سن کر چپ رہیں، مسلمہ نے جب دوبارہ کہا تو بولیں خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں ہے، ایک جوڑا بھی سالم نہ ہوتا، بلکہ پیوند پر پیوند لگے ہوتے تھے، شاہ صاحب ان کے اوصاف پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز کے کارناموں کی مثال دنیا کی کوئی تاریخ کہیں پیش نہیں کر سکتی، بعض مورخین ان کو پانچواں خلیفۂ راشد مانتے ہیں، ان کی حقیقی خواہش تھی کہ یہ موروثی حکومت پھر اسلامی خلافت سے بدل جائے، لیکن یہ بنیادی تبدیلی ان کے اختیار میں نہ تھی، بنی امیہ میں موروثی حکومت اصولی حیثیت سے مسلّم ہو چکی تھی، خواہ خلیفہ بنی امیہ کی کسی شاخ سے ہو، چنانچہ سلیمان خود حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد یزید بن عبد الملک کو خلیفہ نامزد کر گیا تھا، اس لیے انتخابِ خلیفہ کا معاملہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے اختیار سے بالکل باہر تھا، جس پر وہ عمل نہ کر سکے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد یزید بن عبد الملک کا دور شروع ہوا، شاہ صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کا زمانہ ([illegible]) بہت مختصر تھا، اس لیے اہم واقعات پیش نہیں آئے، وہ طبعاً بہت

آرام طلب اور عیش پرست تھا، اس لیے تعمیری حیثیت سے اس کے دور میں عراق کے بندوبست کے علاوہ کوئی چیز قابلِ ذکر نہیں۔

ہشام بن عبدالملک کے متعلق شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ تدبیر، سیاست، بیدار مغزی، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی وغیرہ اوصافِ جہانبانی کے اعتبار سے بنی امیہ کے ممتاز خلفاء میں تھا، اس میں امیر معاویہؓ کا حلم و تدبر اور عبدالملک کی سیاست و اولوالعزمی دونوں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں، مورخین لکھتے ہیں کہ بنی امیہ میں ان تینوں پر سیاست و تدبر کا خاتمہ ہو گیا تھا، اس نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا، بیت المال میں ناجائز آمدنی کا داخلہ رکوا دیا، اس نے اپنی فوج کے لیے مناسب جگہوں پر مستحکم قلعے تعمیر کرائے، تمام سرحدی علاقوں کو مضبوط کیا، وہاں ہر طرح کا جنگی سامان بکثرت جمع کیا، شام میں رصافہ، سندھ میں منصورہ اور محفوظہ شہر آباد کرائے، حجاج کی آسائش کے لیے مکہ کے راستہ میں حوض اور تالاب بنوائے، ریشمی کپڑوں کی صنعت کو ترقی دی، خود راسخ العقیدہ تھا، مشہور قدری غیلان بن یونس نے جبر و قدر کا مسئلہ پھر سے ابھارا تو اس کو قتل کرا دیا، اسی طرح معبد بن درہم نے خلق قرآن کا مسئلہ چھیڑا تو اس کو بھی قتل کرا دیا، امام زہریؒ سے چار سو حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا، آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے پیش روؤں کے برعکس نہایت کفایت شعار تھا، اس کی کفایت شعاری بلکہ بخل کے بہت سے واقعات ملتے ہیں، لیکن ان کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہیں، البتہ یہ صحیح ہے کہ بڑا کفایت شعار تھا، ایک ایک لباس برسوں پہنتا تھا، اپنے لڑکوں کو بھی سادگی کا عادی بنایا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے بعد بے اندازہ دولت چھوڑ گیا۔

ہشام کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس کی حکومت کی مدت ایک سال دو مہینے رہی، اور وہ یزید ثالث کی حمایت میں یمنی قبائل کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا، شاہ صاحبؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی پوری زندگی رندی و سرمستی میں غرق تھی، لیکن اس میں قابلِ ذکر اوصاف بھی تھے،

اس نے حکومت کی جانب سے محتاجوں، معذوروں اور اپاہجوں کی خدمت کا انتظام کیا، شعر وسخن کا اچھا ذوق رکھتا تھا، خمریات میں بڑا کمال حاصل کیا تھا، موسیقی کا بھی بڑا قدر دان تھا، شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کا فسق وفجور مسلم ہے لیکن اس کے الحاد و دہریت کے جھوٹے افسانے بھی اس کی طرف منسوب ہیں کہ اس نے خانۂ کعبہ کی چھت پر شراب پینے کا ارادہ کیا تھا۔ یا کلام اللہ کی توہین کی، ملحدانہ مضامین لکھے لیکن ان کی حقیقت زیبِ داستان سے زیادہ نہیں، وہ بدنام تھا اس لیے بہت سی باتوں کی غلط شہرت ہوگئی۔

یزید ثالث بن ولید تخت نشین ہوا تو اس نے فوج کی تنخواہ کے اضافہ کو گھٹا دیا، اس لیے یزید ناقص کہلاتا تھا، مگر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ عابد وزاہد خلیفہ تھا، چھ مہینے کی حکومت کے بعد وفات پا گیا، یہ مختصر مدت بھی بغاوتوں اور شورشوں میں گذری، اس لیے اس کے عہد کا کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں۔

یزید نے اپنے بھائی ابراہیم کو ولیعہد بنایا تھا، لیکن اس کی خلافت تسلیم نہیں کی گئی، چند مہینوں میں ہی مروان نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، مگر مروان مشکل سے چند سال حکومت کرنے پایا تھا کہ بنو عباس کے ہاتھوں اموی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور جس طرح وہ ختم کیے گئے ہیں اس کی دردناک داستان شاہ صاحبؒ نے اس طرح لکھی ہے:

"مروان کے قتل اور اموی حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی بنی عباس کے جذبۂ انتقام کو تسکین نہ ہوئی، انھوں نے عوام کے دلوں پر اپنا رعب اور دبدبہ بٹھانے کے لیے نہایت بے دردی سے اموی خاندان کا نام ونشان مٹایا، جو اموی جنگ میں مارے گئے ان کے علاوہ نوے زندہ گرفتار ہوئے، ایک دن یہ سب عبد اللہ بن علی کے ساتھ کھانے کے لیے دسترخوان پر آئے تھے کہ ایک شخص شبل بن عبد اللہ نے بنی امیہ کے اشتعال دلانے والے چند اشعار پڑھ دیے، عبد اللہ نے اسی وقت کل امویوں کو ڈنڈوں سے پٹوا کر مروا ڈالا اور ان کی نیم بسمل لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا، اس کے نیچے سے جاں کنی کی سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں، زندوں کے بعد مردوں کی باری آئی، اور اموی خلفاء کی قبریں کھدوا کر ان کا

خاک برباد کی، ہشام بن عبدالملک کی لاش سالم نکلی، اسے سولی پر لٹکا کر جلا دیا، غرض اموی خاندان میں صغیر السن بچوں، عورتوں یا ان لوگوں کے علاوہ جو اندلس بھاگ گئے یا روپوش تھے، کوئی زندہ نہ بچا، اس میں ایک عبدالرحمٰن الداخل تھا جس نے اندلس پہونچ کر اموی حکومت قائم کی۔"

شاہ صاحبؒ نے اتنا لکھ کر اس سفاکانہ رویہ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، انتقام کا یہ نفرت انگیز نمونہ ان کی طرف سے عمل میں آیا جو نہ صرف مذہبی بلکہ خاندانی حیثیت سے بھی اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور پیرو تھے آپ کا یہ اسوہ تھا کہ جب مکہ معظمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو آپ نے اپنے جانی دشمنوں اور اسلام کی بیخ کنی کرنے والوں سے مخاطب ہو کر پوچھا: تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ لوگ اگرچہ ظالم، شقی اور بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے، اس کے بعد ارشاد ہوا تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، کفار مکہ نے جن مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، ان کو ان کے حقوق دلائے جانے کا وقت تھا، لیکن آپ نے حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دستبردار ہو جائیں، بنو عباس کو یہی نمونہ پیش کرنا چاہیے تھا، مگر وہ اپنے رسولؐ کے اسوہ پر عمل کرنے کے بجائے ان ہی بشری کمزوریوں میں مبتلا ہو گئے، جن میں ایسے مواقع پر اور قومیں ہو جایا کرتی ہیں، ان کا یہ نمونہ اسلامی تعلیم کے لحاظ سے قابل نفرین ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اموی حکومت کے زوال کا تجزیہ بہت اچھی طرح کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

اموی حکومت کا زوال اس کے قیام کے تقریباً ایک صدی کے بعد ہوا، اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسلامی خلافت کے بجائے موروثی اور شخصی بادشاہت ہو گئی، اس میں رفتہ رفتہ شخصی حکومتوں کی تمام برائیاں پیدا ہوتی گئیں، شیعیانِ علی اور خارجی ان کے مخالف رہے، ان کی وجہ سے برابر شورشیں

ہوتی رہیں جس سے حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔

دوسرا سبب ولی عہدی کا نظام تھا، ایک وقت میں یکے بادیگرے ایک سے زیادہ ولی عہدوں کی نامزدگی سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں، پہلا ولی عہد تخت نشینی کے بعد اپنے بعد کے ولی عہد کو جو بیشتر اس کا بھائی یا اور کوئی قریبی عزیز ہوتا تھا محروم کرکے اپنے لڑکے کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا، جس سے خاندان میں پھوٹ پڑ جاتی تھی، عمالِ سلطنت میں جماعت بندی ہو جاتی تھی، انھیں بہرحال مخالفت یا حمایت کرنی پڑتی تھی اس لیے بعد میں ہونے والا خلیفہ اپنے مخالف امراء سے انتقام لیتا تھا، اس سے ان میں بددلی پیدا ہوتی تھی اور اموی حکومت ان کی ہمدردی سے محروم ہو جاتی تھی۔

تیسرا سبب ان امراء اور ارکینِ سلطنت کی ناقدردانی اور بدسلوکی تھی جن کی قوت کے بل پر اموی حکومت قائم تھی، خلیفہ بڑے بڑے فاتحین اور امراء سے ناراض ہوتا تو ان کو ان کے عہدہ سے معزول یا قتل کرا دیتا، اس طرح حکومت کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری کا جذبہ باقی نہ رہتا تھا۔

چوتھا اور سب سے آخری سبب جس نے اموی حکومت کا خاتمہ کیا، عدنانی اور قحطانی یا مصری اور یمنی قبائل کا باہمی تعصب اور ان کی خانہ جنگی تھی، یہ دونوں زمانۂ جاہلیت کے پرانے حریف تھے اسلام نے ان کو متحد کر دیا تھا، مگر جب اسلامی روح کمزور پڑتی گئی تو یہ تعصب ابھرتا گیا اور اتنا بڑھا کہ بنو عباس نے ان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس حکومت ہی کو ختم کر دیا۔

اس کتاب کا آخری باب اموی دور کی علمی حالت ہے، جو بہت زیادہ طویل نہیں لیکن بہت ہی جامع ہے، اس کو شاہ صاحبؒ نے اپنی تحریر کی خوش سلیقگی سے کچھ اس طرح سمیٹا ہے کہ اس دور کی علمی سرگرمیاں نظر کے سامنے آجاتی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اموی خلفاء سخن سنج اور شاعری کے قدر دان تھے، اس لیے اس دور میں شاعری میں کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے ترقی ہوئی، بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے، خنظل، جریر، فرزدق، اعشیٰ اور نابغہ وغیرہ فحول شعراء اسی زمانہ میں تھے، جنھوں نے اسلامی دور کی

شاعری کو چمکایا۔

اس دور کی جماعت بندی سے خطابت کو بھی ترقی ہوئی اور متعدد نامور خطیب پیدا ہوئے، حجاج بن یوسف ثقفی اور طارق ابن زیاد فاتح اندلس اس دور کے بڑے ممتاز خطیب تھے، شاہ صاحب کا خیال ہے کہ حجاج کا وہ خطبہ جو اس نے حکومت پر تقرر کے وقت دیا تھا اور طارق کا اندلس کی فوج کشی کے وقت کا خطبہ عربی زبان کے بہترین خطبوں میں ہیں۔

اموی حکومت کے دفتری کاروبار پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ یہ بہت وسیع ہوگیا تھا، عبد الملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا تھا، اس لیے غیر قوموں کے لیے بھی اس کا سیکھنا ضروری ہوگیا تھا، اس سے ان کے اسلوب انشاء کی آمیزش بھی عربی میں ہوئی، ان اسباب کی بنا پر عربی انشاء میں بڑی ترقی ہوئی، اس زمانہ میں حکمرانوں سے لے کر امراء تک کاتب (میر منشی) رکھتے تھے، ان کے لیے انشاء میں مہارت ضروری تھی، بلکہ انشاء ہی ان کا سب سے بڑا وصف و کمال تھا، اس لیے اس زمانہ میں انشاء نے مستقل فن کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔

شاہ صاحبؒ کا خیال ہے اس دور میں سب سے زیادہ ترقی حدیث میں ہوئی۔ اس زمانہ میں اس کا ایک عام ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں درس حدیث کے حلقے قائم تھے، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، سالم بن عبد اللہ، طاؤس بن کیسان، امام شعبی، عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ، عطاء ابن ابی رباح، عکرمہ، نافع مولیٰ ابن عمر، علقمہ بن قیس، قتادہ بن دعامہ سدوسی، مجاہد بن جبیر، محمد بن سیرین، محمد بن مسلم زہری، محمد بن منکدر، مکحول شامی جلیل القدر محدث تھے، ان کی روایات پر امہاتِ کتبِ حدیث کا مدار ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اسی دور میں ربیعہ بن فروخ، ابراہیم نخعی، امام شعبی، امام جعفر صادق، عبد الرحمٰن بن ابی سلمیٰ اور قاضی شریح وغیرہ بہت ہی نامور فقیہ گزرے ہیں،

جن سے فقہ کا سلسلہ پھیلا۔

شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اسی دور میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا، اس کی ابتدا مغازی اور سیرت سے ہوئی، اس فن کو سب سے زیادہ فروغ محمد بن اسحاق نے دیا، افسوس ہے کہ ان کی کتابیں ناپید ہیں، سیرت ابن ہشام زیادہ تر ابن اسحاق ہی کی روایات پر مشتمل ہے، جو سیرت کا نہایت معتبر اور قدیم ماخذ ہے، اسی زمانہ میں سلاطین حمیر کے حالات کتاب الامثال کتاب الملوک واخبار الماضین، کتاب التاریخ اور سیرت معاویہ لکھی گئیں۔

شاہ صاحبؒ کی اس جلد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور کے دو بڑے امام لغت تھے، قتادہ ابن دعامہ سدوسی المتوفی ۱۱۷ھ اور ابو عمرو بن العلاء المتوفی ۱۵۴ھ ابو عمرو نے زبان و لغت کی تحصیل کے لیے برسوں صحرائے عرب کی خاک چھانی تھی اور اس کے متعلق بڑا تحریری ذخیرہ فراہم کیا، گو یہ ذخیرہ کتابی شکل میں موجود نہیں، لیکن وہ عباسی عہد کی تدوین لغت میں کام آیا۔
شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نحو پر عیسیٰ بن عمر ثقفی المتوفی ۱۴۹ھ نے الجامع اور کتاب المکمل لکھی، اسی سلسلہ میں قرآن مجید پر نقطے اور اعراب لگائے گئے۔

پھر اس کتاب سے یہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کہ یزید بن معاویہ کے لڑکے خالد کو عقلی علوم سے بڑی دلچسپی تھی، فلسفہ اور کیمیا کا خاص ذوق رکھتا تھا، اس نے کیمیا پر کئی کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے کتاب الحرارۃ، کتاب الصحیفۃ الکبیر اور کتاب الصحیفۃ الصغیر ابن ندیم کی نگاہ سے گذری تھیں، اسی دور میں ایک اسرائیلی طبیب ماسرجویہ نے اہرن القس کی قرابادین کا ترجمہ عربی میں کیا۔
یہ لکھنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ نے بنو امیہ کی تاریخ قلم بند کرنے کے سلسلہ میں بہت سی تفصیلات چھوڑ دی ہوں گی، ظاہر ہے کہ سب کو سمیٹنا ممکن بھی نہ تھا، اور اب تو ایک ایک خلیفہ پر ایک ایک کتاب علٰحدہ سے لکھی جا سکتی ہے، مگر شاہ صاحب نے جتنے واقعات سمیٹے ہیں ان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ

ن خاندان سے متعلق جتنے ضروری معلومات حاصل ہونے چاہیے تھے وہ حاصل ہو جاتے ہیں اور پھر
لڑائیوں، بغاوتوں، شورشوں اور باہمی رقابتوں کے ساتھ فتوحات کی معرکہ آرائیوں، نظم و نسق کی ترقیوں
اور علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی گوناگوں تفصیلات کو سمیٹنا کچھ آسان کام تھا بھی نہیں، لیکن شاہ صاحبؒ نے
ایک کامیاب مورخ کی طرح ان کو بڑی چابکدستی سے سمیٹا ہے، گو اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ
دوسری کتابوں میں بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے، مگر جس انداز میں شاہ صاحبؒ نے ان جانے بوجھے واقعات
کو قلمبند کیا ہے، وہ اس کی اصل خوبی ہے۔ (باقی)

سلسلۂ تاریخ اسلام

سلسلۂ سیرۃ النبیؐ اور سلسلۂ سیر الصحابہؓ کے علاوہ جو علی الترتیب سات جلدوں اور ۱۲ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے ایک اہم سلسلہ تاریخ اسلام بھی ہے جو سولہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں حسب ذیل چار جلدیں مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے قلم سے ہیں جو بہت مقبول ہیں اور ہندوستان و پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں تاریخ کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ تاریخ اسلام حصہ اول یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ۔ قیمت ...۔ ۱۷ تاریخ اسلام حصہ دوم۔ خلافت راشدہ کے بعد خلافت بنی امیہ کی صد سالہ تاریخ جس میں خلفائے بنی امیہ میں سے ہر ایک کے کردار پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں دکھائی ہیں۔ قیمت ...۔ ۱۵ تاریخ اسلام حصہ سوم، خلافت بنو عباس کی دو صدیوں کی تاریخ۔ قیمت ...۔ ۱۸ تاریخ اسلام حصۂ چہارم، خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی بہت ہی مفصل اور جامع تاریخ، قیمت ...۔ ۱۹

اسی سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کی ایک اور کتاب بھی داخل ہے، اور وہ "اسلام اور عربی تمدن" ہے، جس میں اسلام، اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا بہت مدلل جواب دیا گیا ہے۔ قیمت ...۔ ۱۷

بدایوں کے حمیدی خاندان کی علمی و ادبی روایات

از ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی،

مورخ شہیر علامہ سید سلیمان ندوی، بدایوں کی علمی عظمت کی نشان دہی اس طرح فرماتے ہیں،[۱]

"اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے، حضرت سلطان الاولیا نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیاح معرفت ہیں، جنھوں نے بدایوں اور دہلی کی منزلوں کو ملا دیا، اس زمانے میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (استاد نظام الدین اولیاؒ) قاضی جمال ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ نخشبی بدایونی وغیرہ ہیں۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ان سطور کی وضاحت اس طرح کی ہے،[۲]

"بدایوں کی علمی فضا کو جس واقعہ نے چار چاند لگادئے وہ فتنہ منگول تھا جب وسط ایشیا میں منگولوں کا طوفان کف بر دہاں امنڈ تا شروع ہوا تو وہاں کے علما اور اکابر کی کثیر تعداد ہندوستان کی طرف رجوع ہوگئی حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے دادا اور نانا جب ہندستان آئے تو بدایوں ہی کو اپنا مستقر بنایا، اسی طرح حضرت شیخ شاہی روشن ضمیر کے والد ماجد لمن سے، مولانا علاء الدین اصولی کے والد ماجد قبا سے اور شہاب الدین، مہرہ سے بدایوں میں آکر مقیم ہوئے، مولانا ضیاء الدین نخشبی اپنے وطن نخشب کو چھوڑ کر جب ہندوستان آئے تو بدایوں نے

---

[۱] حیات شبلی (مقدمہ) از علامہ سید سلیمان ندوی (اعظم گڈھ سنہ ۱۹۴۳ء) ص ۶ [۲] تاریخی مقالات از پروفیسر خلیق احمد نظامی (ندوۃ المصنفین دہلی سنہ ۱۹۶۶ء) ص ۴۶ - ۴۷

ان کے دامن دل کو پکڑ لیا، غیر ملکی علما و مشائخ کے علاوہ خود ہندوستان کے بہت سے علاقوں سے مشاہیر و بزرگ یہاں آکر قیام پذیر ہوگئے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ایک بھائی نے بدایوں کو اپنا مسکن بنایا،

حاجی جمال سہروردی اپنے سلسلہ کے مرکز ملتان کو چھوڑ کر بدایوں میں رہنے لگے شیخ احمد نہروالی اور دیگر بزرگوں نے اس زمین میں کچھ ایسی کشش محسوس کی کہ جب یہاں آگئے تو پھر کہیں جانے کا نام نہ لیا، سلاطین کی کوششوں اور علما و مشائخ کی جد و جہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ بدایوں علم و فضل اور ارشاد و تلقین کا ایک عظیم الشان مرکز بن گیا۔۔۔۔۔ چپہ چپہ پر ارشاد و تلقین کی محفلیں آراستہ ہوئیں اور ساری فضائیں روح پرور نغمات سے معمور ہوگئیں:

فتنۂ منگول اور دوسرے اسباب کی بنا پر مختلف دیار و امصار سے مسلمانوں کے اکثر عرب و قبائل بدایوں آکر متوطن ہوگئے اور ایک طرح سے شمالی ہند کا یہ شہر ترک اور پٹھانوں چھاؤنی بن گیا افسوس کہ عصری تاریخوں میں ان کے حالات محفوظ نہ ہو سکے۔

بدایوں کے قدیم خاندانوں میں سادات قبائلی، عثمانی، متولی، حمیدی، فرشوری اور دانشمندی ہیں جو بدایوں میں مسلمانوں کی اولین آبادکاری کے زمانہ میں پہنچے اور انھوں نے یہاں کے علمی، ادبی، مذہبی و ثقافتی ارتقا میں حصہ لیا۔

متولی، حمیدی، فرشوری اور دانشمندی چاروں خاندان اپنا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاتے ہیں، اور ان خاندانوں کے شجرے تقریباً بیسویں صدی کے آغاز میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آئے ہیں،

یہاں ہمیں خاندان حمیدی کے منتخب مشاہیر اور ممتاز اصحاب علم و فضل کا تعارف مقصود ہے۔

حمیدی خاندان امارت و وجاہت اور علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز رہا ہے، اس میں امرا و رؤسا و زمیندار و معافی دار بھی گزرے ہیں اور علما و فضلا و حکما و فقہا اور اربابِ شعر و ادب بھی، مسلمانوں کے عہد اقتدار میں افتا و قضا کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور دوسرے عہدوں اور مناصب پر بھی فائز رہے، جب انگریزوں کا دور آیا تو اس وقت بھی حکومت کے کارپرداز بنے، خاندانی مورخ مفتی شیخ شرف علی حمیدی بدایونی لکھتے ہیں[۱]:

"پس آغاز دورِ سلطنت سرکار کمپنی انگریزی رو نمود و بجائے محکمۂ احتساب محکمۂ ججی قائم گردید۔ افسرانِ آں، جج و صدر الصدور، و صدر امین و منصف نامزد شدند۔ بر اکثر ازیں عہدہ ہائے جلیلہ اولاد قاضی زادگان بدایوں از نسل شیوخ صدیقی حمیدی مامور شدند چنانچہ مولوی کاظم علی خلف اکبر مولوی قائم علی و مولوی مظہر حسن .... بہ منصب صدر الصدوری کہ آں را سب ججی نیز گویند، فائز گردیدند، مولوی کرامت اللہ .... بہ منصب صدر امینی مولوی فیض الرحمٰن .... مفتی غلام سید .... منشی عظمت علی .... مولوی مبارک اللہ بہ عہدۂ منصفی شدند۔"

بدایوں میں اس خاندان کی آمد کے سلسلہ میں خاندانی روایت یہ ہے کہ غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد بدایوں ہوا، یہی وہ زمانہ ہے کہ ماوراء النہر، ترکستان، ایران غرض ساری اسلامی دنیا کو منگولوں نے تباہ و برباد کر رکھا تھا، ہلاکو اور چنگیز خان کی اولاد و اعقاب کی خون آشام تلواریں مسلمانوں کا قتل عام کر رہی تھیں، کہا جاتا ہے کہ اس دودمانِ خیر کے پہلے بزرگ شیخ حمید الدین مخلص تھے کہ جو وارد بدایوں ہوئے اور ان ہی بزرگوار کی نسبت سے یہ حمیدی خاندان کہلایا۔

۱؎ تاریخ بنی حمید (فارسی) قلمی مملوکہ جناب اوج بدایونی ص ۳۰ تا ۴۱

شیخ حمید الدین مخلص گنوری المشہور بہ داداحمید ابن ملا بدرالدین از اولاد محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ وفات ۱۱۰۰ھ[1] ان کے بیٹے شیخ صدرالدین بدایوں کے قاضی ہوئے۔

اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ افضل محمد تھے جنھوں نے مشہور عالم ومفسر قاضی شہاب الدین دولت آبادی (م ۸۴۹ھ) کی تفسیر بحر مواج پر حاشیہ لکھا اور ایک رسالہ عذب البیان فی علوم القرآن بھی ان کی تالیف ہے افضل محمد کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا[2]

قاضی بدرالدین بدایونی نے صدرا پر حاشیہ لکھا جو ان کے نام کی مناسبت سے بدرا مشہور ہوا

"بدرا حاشیۂ صدرا از مشہور ترین تصانیف وے است"[3]

عہد عالمگیری میں قاضی محمد جلیس نقشبندی بدایونی مرید شیخ معصوم سرہندیؒ المتوفی ۱۱۱۶ھ اور مولانا شیخ خلیل اللہ پسر شیخ جان محمد بدایونی المتوفی ۱۱۲۲ھ کے نام بھی ممتاز ہیں[4]

روہیلہ عہد کے ایک نامور عالم مولانا علی احمد اللہ تھے جو حدیث میں بڑا درک رکھتے تھے، ان کا انتقال ۱۲۲۰ھ میں ہوا، اس دور میں شیخ خلیل الدین ابن ابواللیث بن منشی محمد منیر مولف نکات منیری بھی معروف تھے[5]

مولانا حسن علی چشتی، شاہ فخرالدین دہلوی کے خلیفہ، نامور شیخ طریقت اور صاحب درس وتصانیف تھے، سی۔ پی بہار ان کی اصلاحی کوششوں کا مرکز رہا، سیونی چھپارہ میں ۱۲۱۹ھ میں انتقال ہوا[6]

مولانا احسان اللہ واعظ بدایونی، شاہ اسحاق اور شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے شرف

---

[1] تاریخ بنی حمید کے مطابق حمید الدین کا شجرہ سیدنا صدیق اکبرؓ سے صرف گیارہ واسطوں سے متصل ہوتا ہے، عجب کہ یہ زمانہ کم وبیش پونے سات سو سال کو محیط ہے۔ [2] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۳۲ [3] ایضاً

[4] ایضاً ص، خاندانی تذکروں میں ان بزرگوں کا ذکر غیر محققانہ انداز میں لکھا گیا ہے جس میں عقیدت وارادت کو زیادہ دخل ہے [5] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۲ [6] تاریخ بنی حمید (از انشاء اللہ) امیر اقبال پریس بدایوں ۱۳۲۵ھ (آیندہ حوالہ انشاء اللہ سے دیا جائے گا) [7] ایضاً انشاء اللہ ص ۱۳

تلمذ رکھتے تھے، ۱۲۸۰ھ میں ریاست ٹونک پہنچے، نواب وزیر الدولہ نے ان کی قدر کی، زمرۂ علما و واعظین میں شامل رہے، ان کے دونوں صاحبزادے مولوی محمد حسن اور حافظ احمد حسن بلند علمی مناصب پر فائز رہے، مولوی احسان اللہ (ابن شیخ حیات اللہ ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے، ان کا انتقال ۱۱ رمضان ۱۲۹۳ھ کو ہوا، بدایوں میں یہ خاندان "ٹونک والا" مشہور ہے[1]

مولوی شیخ کرامت اللہ، منصف کے عہدہ پر فائز تھے، ان کا کتب خانہ نہایت اعلیٰ تھا، حکمت میں بھی دسترس رکھتے تھے، ۹ شعبان ۱۲۹۷ھ کو انتقال ہوا[2]

مولوی محمد حسین آخوند، نامور عالم اور صاحب درس و تدریس تھے، ۲۹ محرم ۱۳۰۰ھ کو انتقال ہوا[3]

مولوی دلدار علی مذاق ولد شیخ نثار علی (پیدائش ۱۲۳۵ھ۔ انتقال ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۱۲ھ) نامور شیخ طریقت اور شاعر تھے، پہلے دلدار و عیار تخلص تھا، جب ذوق دہلوی کے شاگرد ہوئے تو مذاق تخلص اختیار کیا، دیوان طبع ہو چکا ہے، ان کے جانشین، خلیفہ اور فرزند مولوی شاہ ایثار علی بزرگوں کی نشانی تھے[4]

شاہ عبید اللہ المتوفی ۱۶ شوال ۱۳۲۵ھ چشتی سلسلہ کے مشہور شیخ تھے[5]

قاضی علی احمد محمود اللہ شاہ مذنب مذاقی بدایونی ولد علی اسد اللہ (پیدائش ۱۲۷۰ھ انتقال ۱۰ شعبان ۱۳۲۹ھ) صاحب علم و فضل تھے، تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، انھوں نے مبین الانساب (فارسی) ان علماء و مشائخ کے بارے میں لکھی ہے، جن سے وہ ذاتی طور سے واقف تھے، اسی طرح بدایوں کی عمارت و کتبات پر ایک مختصر سا رسالہ لکھا ہے، یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ندوۃ العلماء کی تحریک میں زور شور سے حصہ لیا[6]

---

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۵۲ تاریخ بنی حمید (ارتشاد اللہ) امیرالاقبال پریس بدایوں ۱۳۲۶ھ نسخہ ص ۹۱ [2] ایضاً ص ۹۳ [3] ایضاً ص ۹۵ [4] ایضاً ص ۹۵ و ارث باشوب ۲۳ [5] ایضاً ص ۲ [6] ایضاً ص ۱۰۲

ب۔ مولانا محب احمد قادری ولد شاہ محمد علی (انتقال ۸ دسمبر ۱۹۲۲ء) مدرسہ قادریہ کے فارغ التحصیل مولانا عبدالقادر قادری (م ۱۳۱۹ھ) کے شاگرد خاص، نامور مدرس و عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، ان کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم قادری تھے جو علمائے سلف کی یادگار تھے انھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ و خطبات کا اردو میں ترجمہ کیا جو سیف دستگیر کے نام سے چار جلدوں میں بمبئی میں طبع ہوا تھا، حضرت مولانا، خاکسار راقم الحروف پر نہایت شفقت فرماتے تھے[1]

خاندان حمیدی کے دو نامور عالم مولانا لائق علی ولد مولوی قائم علی اور مولوی حشمت علی بریلی میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ مولانا لائق علی کے متعلق مؤلف عین الانسان لکھتے ہیں[2]

"عالم صوری و معنوی و صائم الدہر بود و سلسلۂ نقشبندیہ داشت ۹ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ درگذشت، مرد متقی و واعظ شیریں گفتار و قاری خوش الحان بود۔۔۔۔ مدۃ العمر در درس و تدریس بسر بردہ۔"

مولوی حشمت علی، بریلی (محلہ گڑھیا) میں رہتے تھے، مدرسہ منظر الاسلام سے فارغ التحصیل ہوئے، فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاںؒ نے مشاہیر علما و مشائخ کے جلسہ میں دستار فضیلت باندھی، تمام عمر ان کا درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا، ان کی کتاب نصرۃ الواعظین (دو جلدیں) نہایت مقبول ہوئی، علما و مشائخ کی طرح اس خاندان میں نامور اطبا بھی ہوئے۔

حکیم مجید اللہ ابن حکیم قادر بخش ۔ طبیب نامی بود، از تلامذۂ حاذق الملک حکیم شریف خاں دہلوی[3]

حکیم قدرت اللہ ولد مفتی محمد حاکم ۔ در حذاقت طب عدیلے نداشت[4]

---

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۲؎ تاریخ بنی حمید (از الشاہ اللہ امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۳۳۵ھ) ص ۴۰۔

[2] عین الانسان از علی احمد محمود اللہ (دکٹوریہ پریس بدایوں) ص ۲۰ [3] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۸۰ [4] ایضاً

حکیم وقار اللہ، حکیم سعید اللہ، حکیم وحید اللہ اور حکیم فخرالدین بھی علم طب میں ماہر و کامل تھے۔[1]

اس خاندان میں نامور مصنفین و مورخین بھی ہوئے چند ممتاز مورخین کے اسماء درج ذیل ہیں:

مولوی عبدالوالی ولد عبدالباقی (۱۲۱۰ھ سے ۱۳۰۳ھ)[2]

ملا نصیر ملتانی کی کتاب طبقات الاولیاء کی شرح فارسی زبان میں "باقیات الصالحات" کے نام سے لکھی، اس کتاب کے دو ایک خطی نسخے تقسیم ہند ۱۹۴۷ء سے قبل بدایوں میں تھے۔

مفتی شیخ شرف علی حمیدی بن شیخ بہر علی (۱۲۴۳ھ سے ۱۳۳۰ھ) ....

... مولوی عبدالوالی چشتی کی فارسی کتاب "باقیات الصالحات" کا اردو ترجمہ کیا اور اس میں مزید اضافے بھی کئے۔ مترجم مرحوم کے فرزند حکیم محمد یٰسین شوق (ف ۱۹۳۰ء) کے بھی ہاتھ کا نقل کردہ نسخہ ہمارے پیش نظر رہا ہے۔ اسی کی ناکام تلخیص مع اضافۂ جدید و اغلاط مزید "مردان خدا" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔

مفتی شرف علی مرحوم نے حمیدی خاندان کے مشاہیر کے حالات فارسی زبان میں تاریخ بنی حمید کے نام سے لکھے ہیں، یہ کتاب (۱۳۰۷ھ تا ۱۳۲۴ھ) میں مکمل ہوئی اس کا خطی نسخہ اوج بدایونی کے پاس محفوظ ہے۔

احمد رضا حمیدی (ف ۱۳۰۵ھ) نے بدایون کی تاریخ باسم تاریخی تحیّر السیر فی کوائف الخلد" ۱۲۷۹ھ میں لکھی ہے، اس کا خطی نسخہ بدایون میں محفوظ ہے، عرصہ ہوا اس کتاب کا تفصیلی تعارف ذوالقرنین بدایوں میں شائع ہوا تھا۔

حکیم وحید اللہ ولد حکیم سعید اللہ تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، انھوں نے تاریخ کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں، (۱) مختصر سیر ہندوستان (فارسی) تالیف ۱۲۶۰ھ اکابر و مشاہیر کے ذکر میں ہے۔

---

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی) صفحہ ۴۹ [2] ایضاً ص ۵۰

(۲) آئینۂ جہاں نما، بلاد و امصار کے بیان میں ہے۔ یہ دونوں کتابیں خاکسار محمد ایوب قادری کے کتب خانہ میں موجود ہیں، تاریخ روہیل کھنڈ پر حکیم صاحب کی کتاب "تذکرہ حکومت المسلمین" ہے، اس کا خطی نسخہ ہماری نظر سے کتب خانۂ رامپور میں گذرا ہے، انھوں نے ایک کتاب "تاریخ بھرت پور" کے نام سے بھی لکھی ہے، حکیم وحید اللہ اور دوسرے ارکانِ خاندان راجا بھرت پور کے یہاں ملازم تھے، اس لیے یہ خاندان بدایوں میں بھرت پور والا مشہور ہے۔[1]

قاضی فدا حسین ولد احمد حسین۔ انھوں نے حمید الدین گنوری کے مختصر سے حالات "سیرت الحمید فی احوال السعید" کے نام سے لکھے ہیں، دراصل یہ کتاب اکمل التاریخ مولفہ مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری پر ایک تنقیدی تبصرہ ہے، منشی انشاء اللہ ولد شیخ عطاء اللہ، انھوں نے تاریخ بنی حمید" کے نام سے اردو زبان میں ایک مکمل شجرہ مع مختصر حالات مرتب کیا جو ۱۳۳۵ھ میں امیر الاقبال پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ مولوی حشمت علی حمیدی بریلوی نے اپنی شاخ کا شجرہ "شجرۂ خاندانِ عالیہ مجیدیہ حلیمیہ" کے عنوان سے مرتب کرکے صفر ۱۳۴۲ھ میں یوسفی پریس بریلی سے شائع کیا۔ اسی طرح مولوی کریم عالم کی شاخ کا شجرہ شیعہ حسنین نے مرتب کیا ہے جس کا خطی نسخہ حضور عالم صاحب کے پاس ہماری نظر سے گزرا ہے،

مولوی غلام شبیر ولد مولوی غلام حیدر (۱۲۷۰ھ۔ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۶ء) نے سیرت پر ایک کتاب سکینۃ فی الاخبار سلطان مدینہ" لکھی جو امیر الاقبال پریس بدایوں سے شائع ہو چکی ہے، شاہ ابو الحسین نوری میاں مارہروی (ف ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) کے حالات دو جلدوں میں لکھے ہیں، پہلی جلد "نور مدائح حضور" کے نام سے ۱۳۴۲ھ میں امیر الاقبال پریس بدایوں سے شائع ہوئی، دوسری جلد تذکرہ نوری" کے عنوان سے راقم الحروف نے سنی دار الاشاعت" لائل پور سے شائع کرائی، اس پر پیش لفظ

---

[1] انشاء اللہ ص ۴۲،

ہوئی عبدالمجید اقبال میاں نے اور تفصیلی مقدمہ خاکسار محمد ایوب قادری نے لکھا ہے (۲)

اکرام عالم وکیل ولد کریم عالم (ف ۱۹۴۲ء) نے حقیقت و ام پوڑ کے نام سے ایک کتاب لکھی، ملا عبدالقادر بدایونی کے مختصر سے حالات بھی لکھے تھے جو شائع نہ ہو سکے، اکرام عالم مرحوم نے مسلم لیگ کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا، اس تعلق سے ملا عبدالصمد مقتدری ولد غلام حامد (ف ۱۹۶۴ء) اور مولوی شبیہہ الحسنین ولد مولوی اعجاز حسین کے نام بھی قابل ذکر ہیں، ان بزرگوں نے مسلم لیگ کے پیغام کو گاؤں گاؤں پہنچایا اور تحریک پاکستان کو مسلم عوام کے دل کی دھڑکن بنا دیا۔

شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حمیدی خاندان کے کئی بزرگوں نے نمایاں حصہ لیا اور جام شہادت نوش کیا، مولوی رضی اللہ ولد ذکی اللہ، اشرف علی نفیس ولد نجف علی اور قاضی تفضل حسین وغیرہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے دار و رسن کو لبیک کہا، قید و بند اور ضبطی جائداد سے تو نہ معلوم کتنوں کو واسطہ پڑا۔

ع۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آخر میں ہم اربابِ شعر و سخن کا ذکر کرتے ہیں۔

معین الدین ذائق ۔ عالم و فاضل، شاہ محمد غوث لاہوری کے مرید، سودا کے شاگرد، المتوفی ۱۲۱۵ھ محفل شعر و ادب میں ممتاز رہے،

"اقسام شعر از مثنوی و قصیدہ و غزل گفتہ" [۱]

ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے
کیا کیا اندوہ و غم اٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری واللہ
جیسا کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

---

[۱] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۴۰ - ۴۲

شیخ امداد اللہ ولد شیخ دین اللہ (ف ۱۲۳۳ھ)[1]، علم وفضل میں شہرۂ آفاق، شعروادب میں طاق، کلکتہ، حیدرآباد دکن اور ایران کے درباروں میں معزز رہے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں زیادہ کہا ہے، قصائد، دیوان خطی صورت میں موجود ہیں، مثنوی وامق وعذرا چھپ چکی ہے، ان کے خطوط کا مجموعہ شیخ محمد سلیمان بدایونی (ف یکم جون ۱۹۶۳ء) کے پاس راقم الحروف کی نظر سے گزرا تھا،

نواؔ ۱۷۹۹ء میں ایران پہنچے، مرزا آذرؔ کی نے خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا

بلبلِ رنگین نواؔ شیریں غزل خواں آمدہ
طوطیِ ہندوستان در شکرستاں آمدہ

نواؔ نے فی البدیہہ کہا۔

تنگ دل بیمار جاں برلب بہ ایراں آمدم
اندریں دار الشفا محتاجِ درماں آمدم

اس زمانہ میں فتح علی شاہ قاچار (۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۴ء) سریرآرائے سلطنت تھا، نواؔ نے ایک قصیدہ شاہ قاچار کی خدمت میں پیش کیا اور اس میں ہندوستان کی سیاسی بدحالی اور فرنگیوں کے استبداد کا نقشہ کھینچا ہے، ہمارے بدایونی شاعر کی یہ پہلی آواز ہے جو فرنگیوں کے خلاف اٹھی، چند شعر ملاحظہ ہوں،

در ہند از بدگوہراں آفت پدیدار آمدہ
شد سبز نخلِ فتنہ ہا ظلم و بلا بار آمدہ

مفتی ست مفتِ ناکساں قاضی بقاضے شد گراں
در عرصۂ ہندوستاں شاہی بہ سنار آمدہ

احوالِ ہندوستاں زمن کن گوش اے شاہِ زمن
در ہند و سند و ہم دکن رایت نگوں سار آمدہ

در خواب مرد بے خبر بیند فرنگی را اگر
آں را بصد عمرِ دگر مسہل نہ درکار آمدہ

یکے فوج آہن خار داں کن جانبِ ہندوستاں
بر دور گشت ایں حج خواں از بہرایں کار آمدہ

---

[1] تاریخ بنی حمید (فارسی) ص ۲۳ بدایوں ۱۸۵۰ء میں از محمد سلیمان بدایونی (کراچی ۱۹۶۰ء) ص ۱۱-۲۰

یاراں پئے ہندوستاں شاہم بہ قندھار آمدہ　　ماندوز قندش تو دہاں گوید چو منہی ناگہاں

نوآ بدایونی نے غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، معتمد الدولہ محمد آغا فضل علی حکیم مہدی
لی خاں، نقیر محمد خاں گویا، شاہ قاچار، سرجان میلکم اور راجا گربند بخش کی مدح میں قصیدے لکھے تھے
نوآ کے اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

سلماں ہو کے ہم سر آپ کے قدموں پہ رکھتے ہیں　　بتو! لو اور کیا کہتے ہو سجدہ تم کو کرتے ہیں،
س پائے حنائی پر رکھتا ہوں جو میں سر کو　　کس ناز سے وہ کہتا ہے کہ بس سر کو
نہیں کیا لطف مستی ہو جنھوں نے نازنینوں کا　　نہ چشم عشوہ زا دیکھی نہ ساقِ صندلیں پکڑی

اشرف علی نفیس ولد نجف علی ممتاز (ن ۱۲۳۰ھ ـ ۱۲۷۰ھ) تحصیلدار رہے، جنگ آزادی میں
حصہ لیا اور پھانسی پائی، شاعروں کا ایک تذکرہ باسم تاریخی "انتخابِ دہر" (۱۲۶۳ھ) لکھا، صاحبِ
دیوان تھے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

تم اگر جنبشِ ابرو کی دکھا دو گے ادا　　ایک بے جرم پہ چل جائیں گی شمشیریں دو
دونوں زلفوں میں تمہارے ہے دلِ وحشی میرا　　ایک دیوانے کی گردن میں ہیں زنجیریں دو
چاہنے والے کو رسوا کر دیا قتل کرو　　ہے گنہگار جو بھی چاہے وہ تعزیریں دو

شفاعت اللہ شفاعت ولد شیخ سخاوت اللہ (ف ۱۳۰۵ھ) وکیل عدالت شاہجہاں پور،
شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، فسانۂ عجائب کو "ترانۂ غرائب" کے نام سے منظوم کیا، دوسری کتاب
منظوم مظہر ہے، دونوں کتابیں مطبوعہ ہیں۔

محفوظ علی دردی ولد شیخ محمد اسماعیل (ف ۱۲۴۶ھ) شاگرد شاہ سلامت اللہ کشفی، [52]

"صاحب تصانیف کثیرہ بود افسوس کہ دیوانِ فارسی ناتمام گزاشت"

---

[51] تاریخ بنی حمید (فارسی)، ص ۱۹-۲۰، [52] تتمیم سخن از عبدالحیٔ صفا بدایونی ص ۱۲۳، خم خانہ جاوید جلد سوم ص ۱۵۰

نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوں میں شہیدِ نرگسِ بیمارِ یار کا | خاکِ شفا غبار ہے میرے مزار کا

شیریں دہنی تو اُس کی دیکھو | دشنام میں شانِ انگبیں ہے،

اب دورِ آخر کے چند شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے،

اکرام احمد لطیف ولد حافظ غلام جیلانی (۱۸۶۲ء - ۱۹۴۳ء)

شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے، ان کا مندرجۂ ذیل نعت کا شعر مشہور ہے۔

رخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ | نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

محمد نبی سوزؔ (۱۸۶۰ء - ۱۹۴۶ء)

فارسی کے قادر الکلام صاحبِ دیوان شاعر تھے، دو شعر ملاحظہ ہوں،

در ساغرِ زریں دہ اے صاحبِ میخانہ | دارم دلِ شاہانہ در کسوتِ رندانہ

زہے عجز و نیاز سوزِ مسکیں | کہ سنگیں دل بتاں را رام کردند

راشد علی ضیاؔ تلمیذ منیرؔ شکوہ آبادی۔ غزل، مرثیہ اور قصیدہ کہتے تھے، ۱۸۹۰ء کے قریب انتقال ہوا، دیوان اور مجموعۂ مراثی غیر مطبوعہ چھوڑے، نمونہ ملاحظہ ہو،

خیالِ روئے صنم قلبِ خاکسار میں ہے | خدا کے نور کا پتلا نہاں غبار میں ہے

ہے ترے روئے منور کا دیکھنے والا | یہ ایک وصف ضیاؔئے سیاہ کار میں ہے

افضل علی ضوؔ ولد ہادی علی (پیدائش تقریباً ۱۲۶۶ھ) تلمیذ راشد علی ضیاؔ شعر و شاعری صحافت اور تصنیف و تالیف میں عمر گزاری، موازنۂ انیس و دبیر کے جواب میں ردّ الموازنہ لکھا، نمونہ ملاحظہ

ترا احسان ہوگا اے اجل دم بھر ٹھہر جانا | وہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھ لیں عاشق کا مر جانا

تری زلفوں میں بھی انداز ہے تیری اداؤں کا | سنورنے میں بگڑ جانا بگڑنے میں سنور جانا

انصار حسین زلالی ولد مرزا حسین تلمیذ خواجہ الطاف حسین حالی (ف ۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء) نعت و منقبت خوب کہتے تھے، صاحبِ دیوان شاعر تھے، نمونۂ کلام

بڑھتے ہے چودھویں تک اُدھر ماہ کامل کا ۔۔۔ جو ابھے اور نہ ہو سکتا ہے اس رخ کے مقابل کا

ہے ہمائی رسول اللہ کی اللہ کے گھر میں ۔۔۔ خیال شاد دیں تشریف لانا قلب مضطر میں

امیر احمد امیر ولد مولوی محمد حسین (ف ۱۹۴۹ء) ٹونک والے، غالب کے رنگ میں کہتے تھے،

بیگانۂ ہوش ہو گئے ہم ۔۔۔ اتنے ہم گوش ہو گئے ہم

بیتاب سر دوش ہو گئے ہم ۔۔۔ تنہائی و غم امیر مت پوچھ

تولا حسین تولا ولد شیخ الہام اللہ (۱۸۷۰ء - ۱۹۳۶ء) شعر و سخن میں اعلیٰ دسترس رکھتے تھے، صاحبِ دیوان شاعر، سلام اور مراثی چھپ چکے ہیں، نثر میں ایک کتاب "الحجاب" لکھی، نمونۂ کلام

جب شمع چلے تو افسردہ جب پھول کھلے تو پژمردہ

یا حسن نظر کا دھوکا ہے یا حسن میں کامل کوئی نہیں

کل طوافِ ذات میں تھیں جو شاعین حسن کی

آج اسی دنیا میں ان کا نام ہم تم ہو گیا

مرتے ہو تولا بے حجت اس کے تو یہ معنی ہیں حضرت

یا زیست پرائی لائے تھے یا موت پرائی مانگی تھی،

قمرالحسن قمر ولد محسن علی (ف ۱۹۳۱ء) زبان اور فن کے استاد تھے، عبدالرحمٰن راسخ دہلوی[۱] کے تلمیذ تھے، غزل اور نظم دونوں پر عبور رکھتے تھے، نثر میں بھی کئی کتابیں ہیں، صاحبِ دیوان شاعر، حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا، نمونۂ کلام

---

[۱] دیدہ و دریافت از شمس بدایونی اردو شن پبلی کیشنز بدایوں ۱۹۸۱ء ص ۱۰۲ - ۱۱۵

یوسفِ ثانی کہا اُن کو تو وہ ناخوش ہوئے   اس کا یہ مطلب کہ سمجھا کیوں نہ لاثانی مجھے

یہ اگر سچ ہے کسی کا کوئی دنیا میں نہیں   تم عدو کے کیوں چہیتے ہیں کیوں تمہارا ہوگیا

پوچھا کہ ستمگاری، بولے، ہمیں آتی ہے   پوچھا کہ وفاداری، بولے ہمیں کیا کرنا

بابو علی خاتم آزاد ولد متقی حسن (وفات سنہ ۱۹۴۰ء) اکبر الٰہ آبادی کے رنگ میں خوب کہتے تھے طنز و مزاح میں قادر الکلام، ان کے قطعات ان کے دور کی تاریخ و ثقافت کا آئینہ ہیں، تحریک مسلم لیگ پر بھی قطعات کہے ہیں جس سے ان کی سیاسی فکر کا اندازہ ہوتا ہے[1]،

حسن فضل بہار ولد علی افضل شعر کا اعلیٰ ذوق تھا نمونہ ملاحظہ ہو،

بیمار محبت کو سنبھلتے نہیں دیکھا   آئی کو کسی کے کبھی ٹلتے نہیں دیکھا

ہم خاک نشینوں سے ہے اس درجہ کدورت   مٹی کا انھیں عطر بھی ملتے نہیں دیکھا

خاندان حمیدی کے چار شاعر جام نوائی، محبوب الحسن ارشدی، دلاور فگار اور اوج بدایونی مجلس شعر و سخن کی آبرو ہیں، اسی خاندان حمیدی کی معروف شخصیت ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ولد منشی مظہر علی بدایونی (رجسٹرار عدالت خفیفہ آگرہ) ہیں جن کے علمی و ادبی کاموں سے دنیا واقف ہے،

---

[1] دید و دریافت از شمس بدایونی (روشن پبلی کیشنز بدایوں سنہ ۱۹۸۲ء) ص ۱۱۶ - ۱۳۶۔

پروٹسٹنٹ مذہب کی تحریک پر ایک نظر

از

پروفیسر سید علی محسن حیدر آباد،

"یہ مقالہ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ اس سے اندازہ ہو کہ یورپ میں مذہبی ریشہ دوانیاں کیسی رہیں، اور سیاسی حکمران ان سے کس طرح فوائد اٹھانے کی کوشش کرتے رہے، مذہب نے سیاست کو نہیں بگاڑا، بلکہ سیاست نے مذہب میں انتشار پیدا کیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پاپائیت کس قدر مجروح رہی۔"

(معارف)

مسیحیت کی دو تلواریں
(۱) کلیسا (۲) شہنشاہیت

سولہویں صدی میں یورپ میں مذہب کی متعدد تحریکیں چلیں، یہ باہم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ میں متفق تھیں، یہ سب کی سب کلیسائے روم کی مخالف اور اس زمانہ کے رومن کیتھولک مذہب کے خلاف ایک احتجاج بھی تھیں، ایک زمانہ ایسا بھی گذرا جب کہ کلیسائے روم کی عظمت، تقدس اور طاقت کے مقابلہ میں اور تو اور بادشاہ اور شہنشاہ بھی تھراتے تھے، پوپ ہلڈی برانڈ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان جب اختلاف پیدا ہوا تو شہنشاہ کو اس سلسلہ مین سخت ذلت آمیز ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، بارہویں اور تیرہوین صدی مین کلیسا کی قوت مین روز افزون اضافہ ہوتا رہا، انوسنٹ سوم کے زمانے تک مغربی یورپ کے بادشاہون پر رومی کلیسا کی برتری قایم تھی، ابتدائی تصور یہ تھا کہ تمام یورپ ایک عظیم تر عیسائی سلطنت ہے جس کی دینی طاقت کا مظہر رومی کلیسا اور دنیاوی طاقت کا سرچشمہ مقدس شہنشاہیتِ روما ہے، یورپ کے دیگر بادشاہ نظری طور پر اس نام نہاد مرکزی ادارے کے ماتحت سمجھے جاتے تھے، کلیسائے روما کی دینی

برتری سب کے نزدیک مسلّم تھی مگر عملی طور پر دنیاوی یا سیاسی اقتدار میں یورپ کے بیشتر بادشاہ شہنشاہ روما کی سیادت ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، اس طرح یورپ ازمنۂ وسطیٰ میں سیاسی اعتبار سے مختلف وحدتوں یا سلطنتوں میں بٹا رہا، مگر دینی اقتدار کا واحد مرکز روم ہی تھا، اور یہیں سے یورپ کی دینی اور سماجی زندگی کو کنٹرول کیا جاتا تھا،

کلیسا کی خدمات | ازمنۂ وسطیٰ کی بے رحمیوں اور سفاکیوں کو بڑی حد تک نرم کرنے میں کلیسا نے بڑی خدمت انجام دی، اس کی بے اندازہ دولت رفاہ عام کے لئے صرف کیجاتی تھی، غریبوں کی امداد کیجاتی، مدرسے اور مکاتب چلائے جاتے، عوام کو ان کے علاج و معالجہ کی سہولتیں بہم پہونچائی جاتیں، اس دور کے ذہن کی تعمیر و تشکیل بھی اہل کلیسا کے ہاتھ میں تھی، کیونکہ علم کی کنجیاں صرف اُن کے پاس تھیں، عامۃ الناس عموماً جاہل اور ان پڑھ تھے، جو کچھ پادری اسقف یا پوپ کہتا اس کو ساری دنیا آنکھ بند کرکے قبول کرلیتی،

کلیسا میں پھوٹ | سولہویں صدی میں کلیسا میں پھوٹ پڑی، اس سے پہلے بھی کلیسا میں بغاوتیں ہوئیں، جن کے نتیجہ میں بعض گروہوں نے مرکزی کلیسا سے نکل کر اپنے اپنے جداگانہ کلیسا قائم کر لئے، اس اختلاف اور افتراق کو ہمیشہ ارتداد یا الحاد کا نام دیا گیا، مسیحی مذہب کی ابتدائی تاریخ میں بھی اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں، قدیم ارتداد کی ایک اچھی مثال ایریانزم[1] کی ہے، بعد کے زمانے میں آرمینیا، عراق، مصر اور حبش کے علٰحدہ علٰحدہ کلیسا اسی نوع کے اختلاف اور بغاوت کے بعد قائم ہو گئے، لیکن سب سے بڑی پھوٹ گیارہویں صدی میں پیش آئی، جس سے کلیسا "مشرق" اور "مغرب" کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، خود بازنطینی شہنشاہیت کے صدر مقام قسطنطنیہ میں ایک علٰحدہ کلیسا قائم کر لیا گیا تھا، روم کے پوپ کی روحانی سیادت مسترد کر دی گئی، اور آرتھوڈکس کلیسا کے نام سے اپنی جداگانہ مذہبی تنظیم قائم کر لی، اس کو بعض اوقات یونانی کلیسا بھی کہتے ہیں،

---

[1] یہ تحریک مصر میں پیدا ہوئی تھی، ایریس (ARIUS) نامی ایک پادری نے کلیسا کے بعض مسلمہ عقاید سے انحراف کرکے اس تحریک کو پروان چڑھایا تھا، ۳۲۵ء کی پہلی مذہبی کونسل نے اس کے خلاف ارتداد کا فیصلہ صادر کیا، اور اسکو مٹانے کی کوشش کی،

کیونکہ اسکی مذہبی زبان یونانی قرار دی گئی، جو روما کی مشرقی سلطنت کی سرکاری زبان تھی، چونکہ یہ مشرقی شہنشاہیت کا کلیسا تھا، اس لیے یہ مشرقی کلیسا بھی کہلانے لگا، اس کی وجہ سے یورپ کے مشرقی ممالک پر قدیم کلیسائے روما کا کوئی تسلط باقی نہیں رہا، لیکن یورپ کے دیگر مغربی ممالک سب کے سب کلیسائے روما کے تابع اور وفادار رہے، اور اس افتراق کے بعد اسے رومن کیتھولک کلیسا کے نام سے موسوم کیا جانے لگا[۱]، اور اس کی سرکاری زبان حسب سابق لاطینی برقرار رہی، رومن کیتھولک کلیسا نے مشرقی کے اس انحراف کو کبھی تسلیم نہیں کیا، اور اس کی پیروی کو ایک قسم کا ارتداد ہی سمجھا گیا، غرض گیارہویں صدی سے دو کلیسا "لاطینی" اور "یونانی" یورپ کے مشرق اور مغرب میں علیحدہ علیحدہ کام کرتے رہے، جہاں تک روما کے کلیسا کا تعلق ہے وہ اس تفریق اور انحراف کے بعد بھی مغربی یورپ میں طاقت ور ہوتا چلا گیا، اور پاپائے روم نہ صرف ایک عظیم مذہبی رہنما تھا، بلکہ سیاسی معاملات میں بادشاہوں اور شہنشاہوں پر بھی اس کا حکم چلتا تھا،

قید بابل چودہویں صدی کلیسائے روما کے لئے منحوس ثابت ہوئی، ایک طرف تو اس میں تنظیمی خرابیاں پیدا ہوئیں، دوسری طرف اس کے عقائد کے خلاف بغاوت اور احتجاج کی صدائیں بلند ہونے لگیں، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۳۰۵ئہ میں ایک فرانسیسی کا انتخاب پوپ کی حیثیت سے ہو گیا، اس نے فرانس میں اوی نیان کو اپنا پایۂ تخت بنالیا، رومی چرچ کا صدر مقام اب روم نہیں بلکہ اوی نیان ہو گیا، اس تبدیلی سے پاپائیت کے استحکام میں رخنے پیدا ہوئے، فرانس میں پوپ کی سکونت کی وجہ سے فرانسیسی بادشاہوں کا اثر بڑھ گیا، یہ چیز دوسروں کو کھٹکتی رہی، کلیسا کی تاریخ کے اس دور کو "قید بابل"[۲] کا نام دیا جاتا ہے، ۱۳۷۷ئہ میں یہ دور ختم ہوا اور روم دوبارہ پاپائیت

---

[۱] ابتدا میں تو دونوں کلیسا اپنے آپ کو "کیتھولک" اور "آرتھوڈکس" کہتے تھے، لیکن عرف عام میں رفتہ رفتہ ایک کو آرتھوڈکس اور دوسرے کو کیتھولک کا نام دیا جانے لگا [۲] یہ یہودیوں کی تاریخ کے اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ وہ سلطنت بابل کے اسیر تھے،

صدر مقام بن گیا، لیکن بدقسمتی سے اس تبدیلی کے بعد پاپائیت کی اور بھی رسوائی ہوئی، کیونکہ اب ایک کے بجائے دو پوپ ہوگئے، روم کے پوپ کے علاوہ فرانس میں ایک اور پوپ نے جگہ سنبھال لی[1] اس طرح مغربی یورپ کی مسیحی دنیا میں بیک وقت دو پوپ راج کرنے لگے، کلیسائے روما کی عظمت کو اس سے بہت نقصان پہونچا۔ دونوں پوپ ایک دوسرے کو بے دین، دشمن عیسائیت اور دجال کہتے تھے، اس جنگ میں یورپی ممالک دو کیمپوں میں منقسم ہوگئے، ایک فرانسیسی پوپ کا طرف دار ہوگیا اور دوسرا رومی پوپ کا حامی تھا، یہ گروہ بندی زیادہ تر سیاسی مصالح کی بنا پر تھی، پاپائیت کا یہ دور "افتراق عظیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، شہنشاہ سگسمنڈ کی کوششوں سے یہ افتراق ۱۴۱۷ء میں ختم ہوا اور یورپ کو کلیسا کے اس خلفشار سے نجات ملی۔

ان واقعات سے کلیسائے روما کی عزت کو کافی نقصان پہونچا پھر اس کو کہیں زیادہ نقصان اُس وقت ہوا جب اس صدی میں پہلے جان وکلف نے انگلستان میں اور اُس کے بعد جان ہس نے بوہیمیا میں کلیسائے روما کے مذہبی عقائد اور اُس کے دینی مسلمات پر شدید حملے اور اعتراضات کرنے شروع کیے،

جان وکلف | جان وکلف (۱۳۲۰-۱۳۸۴ء) ایک انقلابی پادری تھا، اس نے کلیسائے روم کے دینی مسلمات کے خلاف تقریر اور تحریر کے ذریعہ ایک جہاد شروع کیا، اس نے عقیدہ "تغیر لحم و دم" کے ماننے سے انکار کیا، جو رومن کلیسا کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اُس نے رہبانیت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی، پوپ کو حضرت عیسیٰؑ کا خلیفہ اور ان کا جانشین ماننے سے انکار کیا، اور

---

[1] اوی نیان سے پاپائیت کی منتقلی پوپ گریگوری یازدہم کے دور میں عمل میں آئی (۱۳۷۷ء) وہ دوسرے سال اس کا انتقال ہوگیا، اسی کے ساتھ ہی اربن ششم نے روم میں اور کلمنٹ ہفتم نے اوی نیان میں اپنے پاپا ہونے کا اعلان کیا،

اعلان کیا کہ صرف وہی لوگ اقتدار کے حامل ہو سکتے ہیں جن کی نیکی اور پارسائی ہر شبہ سے بالاتر ہو۔[1] عوام کو اس نے دعوت دی کہ بائبل کو وہ خود پڑھیں اور اس پر عمل کریں اس کے لیے وہ پادریوں کے محتاج نہ رہیں اس کے لیے اس نے بائبل کا انگریزی میں ترجمہ کیا، کلیسا کو وہ مملکت کا ایک ماتحت ادارہ بنانا چاہتا تھا،

وکلف کی یہ تحریک انگلستان کے نچلے طبقوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، اس کی یہ مقبولیت اور ہردلعزیزی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ عامۃ الناس کلیسائے روما سے بدظن اور بیزار تھے، وکلف کی زندگی تک تو اس پر کوئی آنچ نہ آسکی کیونکہ اس کو انگلستان کے بادشاہ رچرڈ دوم کی تائید حاصل تھی، لیکن بعد میں لنکاسٹری بادشاہوں نے کلیسا کی تائید حاصل کرنے کے لئے اس فرقہ کے پیرووں پر ایسے مظالم توڑے کہ انگلستان سے لولرڈوں[2] کا نام ونشان ہی مٹ گیا، کم وبیش اسی زمانے میں جان ہس نے بوہیمیا میں وکلف کی تعلیمات کو فروغ دینا شروع کیا، اس نے بھی پوپ کی سیادت اور برتری اور رومن کیتھولک مذہب کے بنیادی عقائد کو ماننے سے انکار کیا، کلیسائے روما ان حملوں کے باوجود اب بھی کافی طاقتور تھا، چنانچہ شہنشاہ سگسمنڈ نے اس موقع پر اس کی بھرپور تائید کی ہس کو کانسٹنس کی مذہبی کونسل میں مناظرے کے لئے طلب کیا گیا، "جان کی امان" کے وعدے کو بالائے طاق رکھکر کونسل کے فیصلے کے مطابق اُسے زندہ جلا دیا گیا، اس کے بعد بوہیمیا میں یہ تحریک بہت کمزور پڑ گئی،

پندرھویں صدی کے اوائل تک یہ دونوں تحریکیں مٹ گئیں، اور وقتی طور پر کلیسائے روما اس چیلنج کے مقابلے میں بظاہر کامیاب اور سرخرو ہوا، لیکن اس کو ایک عظیم تر آزمائش سے گذرنا پڑا،

---

[1] اس کا مقولہ تھا کہ "اقتدار صرف نیکوکاروں کی میراث ہے۔ [2] وکلف کے پیرو لولرڈ کہلاتے تھے،

سولھویں صدی کی اصلاحی تحریکیں

وکلف کے انتقال (۱۳۸۴ء) کے ٹھیک ایک سو سال بعد لوتھر پیدا ہوا (۱۴۸۲ء) سولھویں صدی میں اس کے احتجاج نے اس کام کو مکمل کر دیا، جس کو وکلف اور ہس نے شروع کیا تھا، کلیسائے روما کے خلاف لوتھر کی بغاوت نے پورے یورپ میں ایک ہلچل ڈالدی اور رومی کلیسا کی وحدت اور اس کا اتحاد پاش پاش ہو کر رہ گیا، لوتھر اس میدان میں تنہا نہیں رہا بعض اور مصلحین بھی اپنی اپنی تعلیمات لیکر آگے بڑھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی اصلاحی تحریکیں کم وبیش ایک ہی زمانے میں شروع ہوئیں، رفتہ رفتہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا جداگانہ کلیسا قائم کر لیا، اور کلیسائے روما سے علیحدگی اختیار کر لی،

اس وسیع انحراف کی وجہ سے کلیسائے روما کی صدیوں پرانی وحدت اور یکجہتی ختم ہو گئی، نئے کلیسا جو وجود میں آرہے تھے وہ اصلاحی کلیسا کہلانے لگے، اور ان کے پیرووں کو پروٹسٹنٹ (احتجاجی) کہا جانے لگا، کیونکہ انھوں نے قدیم کلیسا کے خلاف احتجاج کر کے اپنی علیحدہ وحدت اور تنظیم قایم کر لی تھی، پروٹسٹنٹ اور اصلاحی کلیسا اُن کا قیام سولھویں صدی کا ایک عظیم واقعہ ہے

رومی کلیسا کے زوال کے اسباب

یہ احتجاج کلیسا کی صرف مذہبی تعلیمات اور عقاید کے خلاف نہیں تھا، بلکہ اس کے متعدد معاشی اور سیاسی اسباب بھی تھے، پندرھویں صدی میں عام طور جو ذہنی بیداری پیدا ہوئی تھی اُس سے لوگوں کی آنکھیں کھلنے لگیں اور انھوں نے دیکھا کہ رومی کلیسا اور اس کے ماتحت ادارے ایثار اور خیر کے مراکز ہونے کے بجائے استحصال اور گمراہی کے اڈے بن گئے ہیں، اہل کلیسا بدعنوانیوں میں مبتلا تھے، پوپ اس کے کارڈنیل اور اس کے اساقفہ امرا کی سی زندگی بسر کرتے تھے، عوام سے اُن کا رابطہ بڑی حد تک ٹوٹ چکا تھا، اہل کلیسا قرون اولیٰ کے عیسائیوں کی سادگی اور ایثار کو بھلا چکے تھے، انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی سیدھی سادی تعلیمات کے راستہ کو ترک کر دیا تھا، اور مذہب کو عوام کے لئے ایک دھوکہ کی ٹٹی بنا رکھا تھا کلیسا کے

جاہ وحشم کی عمارت اس سرمایہ پر کھڑی کی گئی تھی، جو یورپ کے غریب اور محنت کش عوام سے کھینچا جاتا تھا، کسان اور مزدور کا لہو اس کی تعمیر کا جزو اعظم تھا، یورپ کے مختلف ممالک سے روپیہ کھینچ کھینچ کر روم جاتا تھا اور وہاں عالیشان گرجاؤں کی تعمیر اور فنون لطیفہ کی سرپرستی میں صرف ہوتا تھا، یہ بجائے خود اتنی بڑی چیز نہ سہی مگر مذہبی فرائض اور سماجی خدمات سے لاپروائی ایسے لوگوں کو کھٹکنے لگی، جو اب نئی روشنی اور نئی تعلیم سے متاثر ہو چکے تھے، اس طبقہ نے محسوس کیا کہ مذہب کو ایک ڈھکوسلہ بنا لیا گیا ہے، اس میں کسی معنویت، قلبی سکون اور روحانیت کا پتہ ڈھونڈے سے نہیں ملتا، مذہب ایک بھول بھلیاں اور بے جان رسوم اور توہم پرستیوں کا ایک طلسم تھا، عام آدمی نہ اسکو سمجھ سکتا تھا، اور نہ اس سے کوئی روحانی ادراک اور عرفان حاصل کر سکتا تھا، چونکہ صدیوں سے وہ اس کا پیرو تھا، لہذا تکمیل رسم کے طور پر اب بھی اس سے وابستہ تھا، اس کے شعور کی گہرائیوں میں فی نفسہٖ مذہب کی طرف ایک کشش ضرور موجود تھی، مگر مذہب کے نام سے جو جنس اس وقت اس کے ہاتھ فروخت کی جا رہی تھی، اس کو وہ سمجھنے سے قاصر تھا، اور اس کی جھوٹی ملمع کاری کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا،

کلیسا کی دولت پر قوم کی نظر پاپائی نظام کو یہ ساری کمزوریاں گھن کی طرح کھا رہی تھیں، سولہویں صدی میں کلیسا ایک انتہائی دولتمند ادارہ تھا، خانقاہوں اور کلیساؤں کے خزانے لبریز تھے، یورپ کی ہزاروں بلکہ لاکھوں ایکڑ زمین کے اوقاف ان کے قبضہ میں تھے، اس دولت پر یورپ کے بادشاہوں کی نئی نسل اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی، اس سے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے، تاجر طبقہ بھی اس مقصد میں اپنے بادشاہوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا، اس روپیے سے وہ اپنی قومی اور بین الاقوامی تجارت کو ترقی دے سکتا تھا، تجارت کے ذریعہ سے روپیہ بٹورنے کا اس صدی میں جو نیا راستہ نکل آیا تھا، اس سے وہ کما حقہٗ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، ان کو بین الاقوامی تجارت کیلئے

بڑے بڑے جہازوں بڑی بڑی کمپنیوں اور بڑے بڑے گوداموں کی ضرورت تھی، یہ سب اس کو حاصل ہوسکتے تھے، بشرطیکہ کسی طرح وہ دولت جو مذہبی محاصل کے طور پر ملک کے باہر جاتی ہو ملک ہی میں رہے، اور وہ دولت جو خانقاہوں اور کلیساؤں کے تہہ خانوں میں دبی پڑی ہے، اس کے ہاتھ لگ جائے، یہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب کلیسا کو قومی حکومت کے زیرنگین کرلیا جائے، اور بیرونی تسلط کی زنجیروں کو توڑ دیا جائے۔

نئی روشنی کی برکتیں | سولھویں صدی میں انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسکینڈی نیویا میں ایک قومی خودداری کا احساس بھی پیدا ہوگیا تھا، ان قوموں پر پاپائزم کی سیاست بہرحال بیرونی تھی، مذہب کتنا ہی ہی لیکن پھر بھی یہ ایک طرح کی غلامی تھی، اور اس کا احساس ان کی قومی خودداری کی روح کو مجروح کر رہا تھا، شمالی اور مغربی یورپ کی قوموں میں غیرشعوری طور پر ان خرابیوں کے خلاف ایک خاموش احتجاج کی اسپرٹ پرورش پارہی تھی، سولھویں صدی کا ذہن ازمنۂ وسطیٰ کی پابندیوں، تنگ نظریوں اور تاریکیوں سے آزاد ہوچکا تھا، علوم قدیمہ کی بازیابی اور نئی تعلیم نے دنیائے فکر و نظر میں ایک ہلچل پیدا کردی تھی، عقل انسانی ان بلندیوں کو چھونے کی فکر کر رہی تھی، جہاں اب تک اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی، اس دور کے علماء نے اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے عبرانی، یونانی اور لاطینی زبانوں کے قدیم ذخیروں کے کھنگالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یورپ کے ہر ملک کو اس نئی روشنی کی برکتوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملا، میکاولی اور "ژوالہ" اطالوی تھے، . . . .

. . . فان ہٹن، جرمن نژاد، راپیلے فرانسیسی، ٹامس مور انگریز اور اراسمس ولندیزی تھا، ان میں سے بعض تو اپنی روشن خیالی کے باوجود کلیسائے روما کے وفادار رہے اور بعض اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بعد میں انحراف کے راستہ پر چل پڑے، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اصلاح مذہب کی تحریک کو محض نشاۃ ثانیہ نے جنم دیا تھا، اور نئی تعلیم پروٹسٹنٹ تحریک کا باعث ہوئی

یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے بالکل ممیز تھیں، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ نئی تعلیم کی وجہ سے بہت سے "اوہام" اور "رسوم" اور عقائد کی قلعی کھل گئی جن پر کلیسائے روما کو بہت اصرار تھا، اب اندھی تقلید کے دن گذر چکے تھے، انسانی ذہن "کیوں" ؟ اور "کس لیے" ؟ کے بہت سے سوالات سے بے چین تھا، جن سوالات کا شافی جواب نہیں ملتا، ان کو ماننے میں تامل ہوتا تھا، ایک عام آدمی بھی بشرط ذوق و استطاعت یونانی اور عبرانی زبانیں سیکھ سکتا اور جو علمی خزانے ان میں مدفون تھے، ان پر دسترس حاصل کر سکتا تھا، اب ولگیٹ[1] پر انحصار کی ضرورت نہیں تھی، انجیل کے اس سے زیادہ پرانے اور زیادہ مقدس نسخوں تک اسکی رسائی ہو سکتی تھی، ان کے ذریعہ سے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے براہ راست واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی، اب پوپ یا کلیسا کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں رہی تھی، یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ انسان اپنے ذاتی عمل اور وجدان سے خدا تک رسائی حاصل کر سکتا ہے،

مارٹن لوتھر | سولھویں صدی میں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ - ۱۵۴۶) نے کلیسائے روما اور پاپائیت کے خلاف بغاوت کی، یہ جرمن نژاد تھا، اپنے احتجاج اور انحراف سے جرمنی میں اصلاح مذہب کا بانی ہوا، بائیس سال کی عمر میں "آگسٹینی درویشوں" کے گروہ میں داخل ہو گیا، اسی اثناء میں اُسے وٹین برگ کی یونیورسٹی میں "دینیات" کا پروفیسر مقرر کیا گیا، لوتھر علوم الٰہیہ کا ایک اچھا عالم ضرور تھا مگر کوئی متبحر عالم یا فلسفی سمجھنا غلطی ہوگی، اس میں کوئی جدت تھی اور نہ اُپج، اس کی کامیابی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے عہد کا قابل ترین یا ذہین ترین آدمی تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ جرمن قوم کا ایک سچا نمایندہ ثابت ہوا، جرمن کردار کی اُس میں تمام خوبیاں بھی تھیں اور کمزوریاں بھی، وہ انتہائی جذباتی تھا، اُس میں ملاطفت بھی تھی اور تشدد بھی، وہ اپنے نفس کے محاسبہ میں آہن سے زیادہ سخت عجز و درماندگی میں ایک طفل معصوم سے زیادہ بے بس تھا، اس کے احساس گناہ کی شدت کا

---

[1] بائبل کا ایک مستند نسخہ

نتیجہ تھا، اس میں تنگ نظری بھی پائی جاتی تھی، وہ انجیل کو سرمایۂ نجات اور مذہب کی حدتک نقطہ آخر سمجھتا تھا، یہ بات اسکی سمجھ سے باہر تھی، کہ "مذہبی تخیل" کی سرحدیں انجیل سے پرے بھی ہو سکتی ہیں، وہ اس تخیل میں کسی ارتقا کا قائل نہیں تھا، وہ سمجھتا تھا کہ کتاب مقدس میں دنیا بھر کی دانائیوں اور خردمندیوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کے نزدیک اس کے باہر کسی سچائی کا وجود نہیں تھا، اس سچائی کی جانچ کے لیے وہ کسی آزادانہ تحقیق اور جستجو کا قائل نہیں تھا: اس میں رواداری کی بو باس تک نہ تھی، اسی باعث یورپ کی آیندہ عقلیت پر مبنی لبرل تحریکات کا اس کو بانی نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جرمن قوم کلیسا کے خلاف کسی بغاوت اور انحراف کے لیے اس وقت بالکل تیار تھی یا اپنے لیے کوئی باغی کلیسا قائم کرنے پر تلی ہوئی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اگر لوتھر ابتداً الحادانہ خیالات کی ترویج کرتا تو وہلۂ اول ہی میں اسے قوم مسترد کر دیتی، اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ صرف پاپائے روما کی جانب سے معافی ناموں کے اجرا کو ہدفِ ملامت بنانا شروع کیا، معافی ناموں کے عطیوں کو پوپ کی جماعت نے روپیہ کے حصول کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا، اور اس کو اتنی وسعت دیدی گئی تھی کہ یہ ایک مرض کی طرح کلیسا کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا، لوتھر نے جب اس برائی کے خلاف اپنی آواز اٹھائی تو اس کی صدائے بازگشت ان تمام گوشوں میں سنی گئی جہاں کلیسائی بے لوثی اور پاکبازی کا خیال پایا جاتا تھا، اور کلیسائی زندگی کو بدعنوانیوں سے پاک کرنے کا جذبہ دلوں میں موجزن تھا، جرمنوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی، جو کلیسائی اخلاق کی اس ابتری اور زبوں حالی کا مشاہدہ بہ چشم نم کرتے تھے، مگر اتنی ہمت نہیں رکھتے تھے کہ کلیسا سے روما کی بدعنوانیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کر سکیں لیکن جب یہی صدائے احتجاج اس گستاخ درویش نے بلند کی تو بہت سے دردمند دلوں نے محسوس کیا کہ یہ اسکے دل کی آواز ہے،

معافی نامے | یہ بات پاپائے روم کو معافی ناموں کے عطا کرنے کا اختیار حاصل ہے ایک

نہایت ہی قدیم عقیدہ ہے، اس عقیدہ کے مطابق سینٹ پیٹر اور اس کے جانشین ایک لازوال خزانہ تقدیس کے مالک ہیں، یہ خزانہ حضرت عیسیٰؑ کی قربانی اور پشت بابشت کے مسیحیوں کی نیکیوں کی وجہ سے ہمیشہ بھرپور رہتا ہے، پاپائے روم سینٹ پیٹر کا جانشین ہونے کی وجہ سے اس خزانہ کا امین اور ٹرسٹی مانا جاتا تھا، مسیحیوں کے گناہوں کو معاف کرنے کے لیے وہ اسی لازوال خزانہ سے کام لیتا تھا، معافی نامہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس کسی کو یہ عطا کیا گیا وہ گناہ سے پاک اور مبرا ہو گیا، بلکہ تصور یہ تھا کہ اس گناہ کے لیے جو سزا اُسے اگلی زندگی میں مل سکتی تھی اس سے وہ کلیتہً یا جزواً محفوظ ہو جائے گا، لیکن قدیم زمانے میں معافی نامے کے عطا کیے جانے کی ایک شرط یہ تھی کہ معافی کا طلب گار کامل عجز و اخلاص سے نہ صرف اعتراف گناہ کرے بلکہ گناہ سے تائب ہونے کا حتمی وعدہ اور مصمم ارادہ کرے، پروانہ معافی کے حاصل کرنے کے لیے اس کو ہدایت کیجاتی تھی کہ وہ مخصوص عبادات اور دعاؤں میں اپنے آپ کو مشغول رکھے یا مقامات مقدسہ کی زیارت کا قصد کرے یا نیک اور مذہبی کاموں میں چندہ عطا کرے، کلیسا کی اصطلاح میں ان فرایض کو نیکوکاری کا نام دیا جاتا تھا،

پاپائیت نے رفتہ رفتہ اس عقیدہ کا استحصال کرنا شروع کیا، اس کے اخلاقی انحطاط کے زمانے میں یہ صرف روپیہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا، اور معافی ناموں کے حصول کے لیے شرائط کی جو سختیاں تھیں انھیں یکسر بھلا دیا گیا، پوپ جولیس دوم اور پوپ لیو دہم، روم میں ایک عظیم گرجا سینٹ پیٹر کے بنانے میں مصروف رہے، اس کے لیے ان کو روپیے کی ضرورت تھی، چنانچہ دونوں نے بلا تخصیص پروانہ جات معافی اجراء کرنے شروع کیے، پوپ لیو نے تو اعلان کیا کہ وہ نہ صرف سزا میں تخفیف کا پروانہ دے سکتا ہے، بلکہ مناسب معاوضہ دینے والے کے گناہ کو بھی سرے سے مٹا سکتا ہے، اس نے ایک ڈومینیکی درویش

ب (دمات ٹ Tetzel) کو جرمنی روانہ کیا تاکہ سینٹ پیٹر کی تعمیر کے لیے عطیے حاصل کرے، ٹٹزل کی
ریوں سے جرمنی کے سنجیدہ اور ذی علم طبقہ مین موجودہ کلیسائی تنظیم کے خلاف سخت نفرت
ہونے لگی، وہ عوام مین یہ کہتا پھرتا تھا کہ اگر اس نیک کام میں چندہ دیا جائے تو تانبے کی
م پہاڑیاں خالص چاندی کی ہو جائیں گی اور یہ کہ کسی کے ایصال ثواب کے لیے کوئی رقم دی جائے
سمجھنا چاہئے کہ ادھر روپیہ پاپا کے خزانے مین داخل ہوا ادھر اس شخص کی روح جنت الماویٰ
داخل ہو گئی، ٹٹزل کے ہاں مواعظ نے لوتھر کو غضبناک کر دیا، اس گمرہی کے خلاف اس نے
دے اعتراضات کی ایک فہرست تیار کی اور اس کو وٹن برگ کے کلیسا کے دروازے پر چسپاں
یا، جرمنی میں ان اعتراضات کا بہت اچھا خیر مقدم ہوا، ہر شخص اس کو اپنے دل کی آواز
نے لگا، لوتھر اچانک ایک قومی ہیرو بن گیا، اس واقعہ کو جرمنی مین اصلاح مذہب کا قدیم
ب سمجھنا چاہئے،

ر کا روحانی ارتقاء

لوتھر طبعاً ایک انتہائی مذہبی قسم کا آدمی تھا وہ زہد و تقویٰ میں یکتا تھا،
، ریاضت ایسی نہیں تھی، جس کا وہ عامل نہیں رہا، وظائف، عبادات، فاقے، برت،
کشی، جسمانی اذیت ان سب کو وہ آزما چکا تھا، مگر اب تک نہ اس کا قلب منور ہوا تھا، اور
نا ٹوپ اندھیرے مین اُسے روشنی کی کوئی کرن نظر آئی تھی، اس کے چاروں طرف تاریکی
، وہ اپنی نجات سے مایوس ہوتا جا رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ خدا تک اس کی رسائی
ر کیونکر ہو! ذات باری یکسر پاک اور منزہ تھی، دوسری طرف وہ اپنے کو ایک ایسا
سان سمجھتا تھا، جس کی سرشت ناپاک اور بدی سے معمور تھی اور گناہ اس کا ازلی ورثہ تھا، ان
لوں میں سنگم ہو تو کیسے ہو؟ وہ اس نور ازلی کا قرب حاصل کیسے کرے؟ اس کے لیے ترتھ

---

[1] جرمنی کا ایک شہر جہاں اس وقت ٹٹزل مقیم تھا،

یا تیارت قبور، آثار متبرکہ کی پرستش اور کلیسا کی سنائی ہوئی "نیکوکاریاں" یہ ساری چیزیں اسے فضول بے معنی اور بے کار ثابت ہورہی تھیں، اس مایوسی کے عالم میں یکایک اس پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا، جس گتھی کو سلجھانے کے لئے اس کی روح بے قرار تھی، وہ اچانک سلجھ گئی اس پر یہ بات کھلی کہ نجات صرف ایمان (....) کا ثمرہ ہے، جو دل ایمان سے خالی ہو نجات اسکے مقدر میں نہیں، "نیکوکاریاں" لاکھوں سہی مگر ایمان مستحکم نہیں تو یہ سب بے کار ہیں، پھر انسان کے گناہ کی سیاہی صرف رحمت باری کی آغوش میں دھل سکتی ہے، اس رحمت لایزال پر کامل ایقان ہی "ایمان" کی اصل بنیاد ہے، اور یہی ایمان ابدی نجات کا واحد راستہ ہے،

لوتھر اپنے مذہبی افکار کے مختلف ارتقائی منازل سے ہوکر گذر رہا تھا، جب وہ اس عقیدہ پر پہونچا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تو پھر دینی تصورات کی وہ عمارت جسے کلیسا نے کھڑا کیا تھا، اس کی نظر میں متنزلزل ہونے لگی، اب کلیساے روما پر اُسے بھروسہ نہیں رہا اس کی تعلیم کو وہ ایک ڈھکوسلہ سمجھنے لگا، روم کو وہ بابل اور سوڈام سے تشبیہ دیتا تھا پوپ کو دجال کہتا تھا، کلیساے روما سے متعلق اس کے ذہن کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے پادریوں کی شادی کی حمایت کی اور طلاق کے دینی جواز کا اعلان کیا، جب بات یہاں تک پہونچی تو کلیساے روما سے اس کی علحدگی ناگزیر ہوگئی، دہ میہود ہم (Leo ....) نے اس کو خارج از ملت کر دیا، جب پوپ کا یہ حکم اس کو ملا تو اُس نے اس کو برسرعام جلادیا

لوتھر کی تعلیمات کو کچلنے کی کوشش پوپ نے نہ صرف لوتھر کے اخراج کا حکم نامہ صادر کیا بلکہ شہنشاہ کو لکھا کہ اس کے کفر و الحاد کے فتنہ کو سختی سے کچل دیا جائے، تاکہ کلیسا اس کی شرانگیزیوں سے محفوظ شہنشاہ چارلس پنجم جس کے سر پر فوراً ہی روما کی مقدس شہنشاہیت کا تاج رکھا گیا تھا، اس زمانے میں رومی کلیسا کا سب سے بڑا حامی اور پشت پناہ تھا، ایسا معلوم ہوا کہ قدرت نے

سے اس کام کے لیے خاص طور پر پیدا کیا تھا جیسا کہ وہ ہاپسبرگ کے خاندان سے تھا، جو ہمیشہ کٹر رومن کیتھولک رہا، وہ اسپین کا بادشاہ بھی تھا، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اپنے دادا (میکسیملین) کے انتقال کے بعد وہ شہنشاہ منتخب کر لیا گیا تھا، ان رشتوں اور واسطوں سے قدرتی طور پر وہ کلیسائے روما سے ایسا وابستہ ہو گیا تھا کہ وہ عمر بھر اس کے تحفظ اور اس کی عظمت کے لیے شمشیر بکف رہا، اس کے کچھ سیاسی اغراض بھی تھے، کیونکہ رومن کیتھولک مذہب کا فروغ بہت کچھ سیاست سے بھی وابستہ تھا، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا، اس جوان شہنشاہ نے جو اس وقت مشکل سے ۲۰ سال کا تھا، کارزار حیات میں جب پہلا قدم رکھا تو اس کو سب سے پہلے لوتھر کے کفر والحاد سے نمٹنا پڑا، یہ مقابلہ جب ایک مرتبہ شروع ہوا تو تمام یورپ اس لپیٹ میں آ گیا، اور اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک پورا براعظم دو مخالف اور متحارب کیمپوں میں منقسم نہیں ہو گیا،

چارلس نے ورمس کے مقام پر اپنی پارلیمنٹ طلب کی اور وہ خود اس کا صدر نشین تھا، لوتھر کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پارلیمنٹ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے معتقدات کو بیان کرے مقصد یہ تھا کہ جبر و تخویف کے ذریعہ سے اُسے اس کے معتقدات سے روگرداں ہونے پر مجبور کیا جائے، مگر یہ تدبیر کارگر نہیں ہوئی، لوتھر اپنے عقائد پر چٹان کی طرح اٹل رہا، اس نے اپنے معتقدات بدلنے یا اُن سے روگرداں ہونے سے انکار کر دیا، اس نے اسوقت جو ہمت دکھائی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت جرمنی میں اُسے کم و بیش ملک گیر تائید حاصل تھی، اور وہ یہ جانتا تھا کہ بعض ریاستوں کے حکمران اُسے پوپ اور شہنشاہ کے امکانی حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں، لوتھر کے انکار پر ورمس کی پارلیمنٹ نے اسے باغی قرار دیا، ہرچند پوپ و شہنشاہ اس کی تعلیمات کو مٹانے کے درپے تھے، مگر ورمس کا فیصلہ روز اول سے ہی ناکام ثابت ہوا، لوتھر کی خوش نصیبی تھی کہ حالات اس کو بہت سازگار ملے، اس وقت تین بڑی طاقتیں

اس کی تحریک کو کچل سکتی تھیں، ایک رومانی شہنشاہیت دوسرے آسٹریا تیسرے فرانس، یہ تینوں کٹر رومن کیتھولک طاقتیں تھیں، اگر یہ متحد ہو کر لوتھر پر حملہ بول دیتیں تو تعجب نہیں کہ اس کی تحریک کا بھی وہی حشر ہوتا جو وکلف اور ہس کی تحریکوں کا ہوا تھا، مگر شہنشاہ کی سلطنت کی وسعت اس کی کمزوری کا سب سے بڑا باعث تھی، اسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ جرمنی میں قیام کر کے لوتھر کے اس فتنہ کا تدارک کرتا، اس کی سلطنت کے سینکڑوں مسائل اس کی توجہ اپنی جانب کھینچے رہتے تھے، اس کا بھائی فرڈیننڈ آسٹریا میں اس سے زیادہ بے بس تھا، یہاں ترکوں کا خطرہ اسکے سر پر کچھ ایسا مسلط تھا کہ وہ لوتھر کے لیے کوئی وقت نکال نہ سکتا تھا، فرانس کے رومن کیتھولک ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا، اور روما سے وفاداری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھا، لیکن اس مسئلہ کو اس نے شہنشاہ کے خلاف اپنا سیاسی حربہ بنالیا، جرمنی میں لوتھر کی تحریک کو زندہ رکھ کر فرانسیسی رہین اور شہنشاہیت دونوں کو کمزور کرنا چاہتے تھے، ہاپسبرگ خاندان کی تباہی میں فرانس کی کامیابی مضمر تھی، لہٰذا لوتھر کو فرانس کی جانب سے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ فرانس کی تائید نے لوتھر کے مذہب کو یورپ میں کامیاب بنایا،

لوتھر کے لیے جرمنی میں تائید لوتھر کی خوش قسمتی صرف یہی نہیں تھی کہ اس کے دشمن اس وقت کمزور اور غیر متحد تھے بلکہ بعض گوشوں سے اس کی تحریک کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی سے کیا گیا، یوں تو جرمنی کا متوسط طبقہ تاجر امراء اور حکمران شروع سے ہی اس کے موافق تھے مگر سکسینی کے حکمران الکٹر نے اس کی بہت مدد کی، جس کو اس نئی تحریک سے بہت دلچسپی تھی، اس نے لوتھر کو اپنی ریاست میں جائے پناہ دی اور اس کی انتہائی آزمایش کے زمانے میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑا پوپ یا شہنشاہ دونوں اس کی تائید کی وجہ سے لوتھر پر دست تعدی دراز نہ کر سکے، سکسینی کا یہ پہلا حکمراں الکٹر اس زمانے کا روشن خیال اور امن پسند حکمران تھا، اس کو اپنی چھوٹی سی

ریاست اُس کے مضبوط قلعوں اور اس کی اپنی قائم کردہ وٹن برگ یونیورسٹی پر بہت ناز تھا، جس زمانے میں پوپ اور شہنشاہ، لوتھر کو پسپا کرنے کی فکر میں تھے، وہ اس بوڑھے الکٹر کے ایک مضبوط پہاڑی قلعہ میں بیٹھا اپنی تحریروں سے پاپائی معتقدات کے نظام کی دھجیاں ادھیڑنے میں مصروف تھا، اس کے مذہبی نظریات اور معتقدات نے اسی زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کی، اور ایک نئے کلیسا کو جنم دیا جو عام طور پر "لوتھرین کلیسا" کے نام سے موسوم ہوا، فریڈرک کی مدد سے لوتھر کو شخصی تحفظ حاصل ہوا لیکن اس کے مذہب کی ترویج اور اشاعت وٹن برگ کی یونیورسٹی کی وجہ سے ہوئی، یہ یونیورسٹی لوتھر کے خیالات کی ترویج کا ایک بڑا مرکز بن گئی، یہاں سے کتابیں، پمفلٹ اور رسالے چھپ چھپ کر جرمنی کے دور دراز گوشوں تک پہونچتے رہے، اور عوام میں مذہب اور کلیسا سے متعلق ایک نئی بیداری پیدا کی، اس نئے مذہب کی ترویج اور اسکو مقبول بنانے میں فلپ میلنکتن کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، یہ یونانی زبان کا ایک عالم متبحر مانا جاتا تھا، اس نے پروٹسٹنٹ تحریک کی بڑی زبردست خدمت انجام دی، اس نے پہلی مرتبہ ایک ایسی کتاب لکھی[1] جس میں صاف اور سلیس زبان میں اس نئے "دین" کو پیش کیا گیا تھا، لوتھر کے پروٹسٹنٹ کلیسا کے لیے اس نے ایسے دینی اصول منضبط کیے جن کی بنیاد کلیۃً انجیل مقدس پر رکھی گئی تھی، ان سارے حالات کے قطع نظر لوتھر کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہ بھی تھا کہ اس نے جرمن زبان کو اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے استعمال کیا، اس کی وجہ سے اس کا پیام گلی گلی اور کوچہ کوچہ پہونچا، یورپ کی کلیسائی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے، ورنہ صدیوں سے اہل یورپ صرف لاطینی زبان کے ذریعہ ہی سے اپنے مذہب تک رسائی حاصل کر سکتے تھے، اور جو لاطینی زبان سے بے بہرہ تھے، مذہب ان کے لیے ایک چیستان تھا، ان کے نفس اور ان کی روح کو براہ راست مذہب سے مربوط

---

[1] اس کا نام "Loci Cmmunes" تھا

کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی، لوتھر اور اس کے ساتھیوں نے جرمن زبان کو استعمال کرکے اہل جرمن کے قلوب تک رسائی حاصل کرلی، یہ تحریک ابتدائی زمانے میں جس قوت سے اٹھی اور جس گرم ... جوشی سے اس کا ہر گوشہ سے خیر مقدم ہوا اس سے یہ ظاہر یہ توقع پیدا ہوگئی تھی کہ پورا جرمن اس نئے مذہب کو قبول کرلیگا، اور یہ مذہبی اتحاد آیندہ جرمن قوم کو متحد کرنے کا باعث ہوگا، مگر یہ توقعات بہت جلد خاک میں مل گئیں، لوتھر کی تحریک میں بعض کمزوریاں بھی تھیں، جو بعد میں اس کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئیں،

<u>اس تحریک کی کمزوریاں</u> لوتھر کے تشدد کی وجہ سے ان کی تحریک بعض حلقوں میں مشتبہ نظروں سے دیکھی جانے لگی، ایسے وسیع المشرب علماء اور دانشور جو ابتداً اسکی تحریک کے حامی تھے، رفتہ رفتہ اس سے روگرداں ہوگئے، جنوبی ریاستوں میں خصوصاً اس کے خلاف ناراضگی کی ایک لہر پیدا ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تحریک کو پوری قوم کی پشت پناہی حاصل نہ ہوسکی اور اس کی تحریک نے اپنا قومی اور عوامی کردار کھودیا۔ ۱۵۲۵ء تک جرمن قوم اس مسئلہ پر دو حصوں میں بٹ گئی، شمالی ریاستیں لوتھر سے وابستہ رہیں اور انھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلیا، مگر جنوبی ریاستیں اپنے آبائی مذہب پر برقرار رہیں، مذہبی بنیاد پر جرمنی کی اس تقسیم نے اس کو ایک طویل اور خونین کشمکش کی رزمگاہ بنادیا۔ ۱۵۲۴ء میں ریٹسبان کے مقام پر کیتھولک ریاستوں نے اپنی ایک لیگ قائم کرلی، اس کے جواب میں پروٹسٹنٹ ریاستوں کا اتحاد ٹارگو کے مقام پر ۱۵۲۶ء میں عمل میں آیا، اس کی مزید توسیع اسمال کالڈن میں ۱۵۳۱ء میں ہوئی، اسطرح لوتھر کی تحریک سے جرمنی دو مخالف اور مسلح کیمپوں میں منقسم ہوگیا، جرمنی میں انتشار اور لامرکزیت کی قوتیں پہلے سے کچھ کم نہیں تھیں، لوتھر کی تحریک نے اس تفرق اور انتشار کو تیز تر کردیا،

<u>کسانوں کی بغاوت</u> اسی اثنا میں جنوبی ریاستوں میں ایک عظیم بغاوت پھوٹ پڑی، یہ

کسانوں کی بغاوت کہلاتی ہے، جرمنی میں کسانوں کی حالت نہایت ابتر تھی، صدیوں سے ان کا استحصال کیا جا رہا تھا، ...... لوتھر نے جب کلیسا کی بدعنوانیوں کا پول کھولنا شروع کیا تو ان کسانوں کو امید کی ایک کرن سی نظر آنے لگی، کلیسا کے ماتحت جو جاگیریں تھیں ان پر کام کرنے والے کسانوں کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی، یہاں بھی وہی جور وظلم تھا جو امراء سے وابستہ کسانوں پر روا رکھا جاتا تھا، لوتھر نے جب یہ کہا کہ کلیسا کی تمام جائیداد کو چھین لینا چاہیے کہ پوری قوم اس جائداد کی وارث ہو تو کسانوں نے اُسے کان دھر کر سنا، وہ نہ صرف اپنے کلیسائی آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ امراء اور جاگیرداروں کے خلاف بھی علمِ بغاوت بلند کیا، جنوبی علاقہ میں یہ ایک ملک گیر بغاوت بن گئی، نظم وضبط کا سارا شیرازہ بکھرنے لگا، کسانوں نے اپنے چند بنیادی مطالبات پیش کئے تھے، وہ بیگار سے نجات اور اپنے آقاؤں کے جور وظلم سے چھٹکارا چاہتے تھے، اور معاشی اعتبار سے اپنی محنت کا معاوضہ مانگا کہ وہ سکون اور عزت کی زندگی بسر کرسکیں، مگر جب ایک مرتبہ بغاوت پھوٹ پڑی تو تشدد اور قانون شکنی کی وبا عام ہوگئی، ایسا معلوم ہونے لگا کہ بدامنی پورے ملک میں پھیل جائے گی، ایسے موقع پر لوتھر نے کسانوں کی سخت مخالفت کی، وہ زراج، بدنظمی اور لاقانونیت کو ہوا دینے کے لیے . نہیں تھا، اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ زراج کے اس طوفان خیز سمندر میں اس کی اصلاحی تحریک کی کشتی غرق ہو کر رہ جائے گی، اس لئے اس نے امراء اور جاگیرداروں ...... کو کھلی چھوٹ دیدی کہ کسانوں کو جس طرح بنے کچل کر رکھ دیا جائے، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بڑے تشدد سے کام لیا گیا، بڑی خونریزی ہوئی اور جگہ جگہ وحشتناک بربریت کے واقعات پیش آئے، جرمنی کو اس جنگ نے نیم جان کر دیا، کسانوں کی تباہی کا تو کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس بغاوت میں وہ بالکل پس گئے، اور ان کی حالت پہلے سے زیادہ بدتر ہوگئی، لوتھر کی تحریک پر اس بغاوت کے بڑے گہرے اثرات پڑے کسان اس کے بدترین دشمن ہوگئے، ان کی نظر میں وہ ایک جھوٹا اور فریبی مصلح تھا، کسان اور نچلے طبقات اس سے بدظن ہوئے تو امراء اور جاگیردار بھی اس سے

منہ موڑنے لگے، انھوں نے محسوس کیا کہ اسی کی تعلیم کی وجہ سے ملک کو اس خونریزی سے گذرنا پڑا، لوتھر کی تحریک کو بغاوت اور سرکشی کا سرچشمہ سمجھنے لگے اور اس سے دور رہنے ہی میں اپنی عافیت دیکھی، چنانچہ چند ریاستوں کے امیر حکمران، مزدور و کسان سب ہی لوتھر سے متنفر اور بیزار ہو گئے، اس طرح جنوب میں اصلاحی تحریک کا نام و نشان مٹ گیا، پاپائیت اور کلیسائے روما کا دوبارہ تسلط قائم ہو گیا،

جرمنی میں لوتھر کو جو ناکامی ہوئی اس کی تلافی کسی حد تک اسکینڈے نیویا کے ممالک میں ہوئی چند برسوں میں ڈنمارک اور ناروے کی متحدہ مملکت اور سویڈن میں رفتہ رفتہ لوتھر کے پروٹسٹنٹ کلیسا کو قبول کر لیا گیا، اور شمالی یورپ کے ممالک اس نئے پروٹسٹنٹ مذہب کے پُرجوش حامی اور پیرو بن گئے، سولہویں صدی کے اختتام تک شمالی جرمنی، ڈنمارک، ناروے، اور سویڈن میں لوتھر کا پروٹسٹنٹ مذہب پورے طور پر چھا گیا تھا،

کلیسا میں مفاہمت کی ناکام کوشش

ورمس کے فیصلہ کے بعد کا زمانہ جرمنی کے لیے بڑی آزمایش اور ابتلا کا تھا، تقریباً بیس سال تک پوری قوم آپس میں ایک مذہبی تصادم سے دوچار رہی، بہت سے مخلص اور دردمند لوگ دل سے یہ چاہتے تھے کہ اختلاف و افتراق کے بجائے کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے کلیسا کی اندرونی خرابیاں بھی دور ہو جائیں اور اس کا اتحاد بھی برقرار رہے، شہنشاہ چارلس پنجم بھی ان لوگوں میں سے تھا، جو سمجھوتے اور مفاہمت کے ذریعہ سے مذہبی امن کی بحالی کے خواہاں تھے، اس معاملہ میں اس کی نیک نیتی اور دردمندی میں کوئی شبہ نہیں، مگر شہنشاہ کو اتنی فرصت ہی نصیب نہ تھی کہ جرمنی کے اس مذہبی خلفشار کا کوئی مداوا دریافت کر سکتا، اپنی وسیع و عریض سلطنت کے مسائل میں صبح و شام مشغول رہتا، اسپین، افریقہ، اطالیہ اور بندر لینڈس میں اسکو ایسی مشکلات درپیش تھیں کہ وہاں سے غافل نہیں رہ سکتا تھا، ان وسیع ذمہ داریوں نے اُسے ایسا مصروف رکھا کہ ورمس کے فیصلہ کے بعد کم و بیش دس سال تک وہ جرمنی میں قدم نہیں رکھ سکا ۱۵۳۰ء میں اگسبرگ کے مقام پر اس نے پھر ایک پارلیمنٹ کا اجلاس

طلب کیا، اس اجلاس میں یہ کوشش کی گئی کہ مفاہمت یا سمجھوتہ کا کوئی راستہ نکالا جائے، اس موقعہ پہ پروٹسٹنٹوں نے اپنے عقائد کو ایک جامع اور واضح شکل میں پیش کیا، ان عقائد کو میلنکتن جیسے متبحر اور صلح پسند عالم نے مرتب کیا تھا، لوتھر کے جدید کلیسا کے یہ اقل ترین مطالبات تھے ان سے کم کسی بنیاد پر وہ فریق مقابل سے صلح کرنا نہیں چاہتے تھے، میلنکتن نے اس موقعہ پر پروٹسٹنٹ عقائد کو جو معین و منضبط شکل دی تھی ان کو اعترافات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور یہی عقاید بعد میں لوتھر کے کلیسا کے بنیادی عقائد بن گئے، رومن کیتھولکوں نے ان کو سرے سے مسترد کر دیا، دونوں فریقوں میں نہ صرف خلیج باقی رہی بلکہ اور وسیع تر ہوگئی، شہنشاہ ان حالات میں بے بس تھا، آگسبرگ کی یہ مجلس مشاورت ناکام رہی، ۱۵۴۱ء میں نو سال کے وقفہ کے بعد جب وہ پھر جرمنی آیا تو اس وقت تک حالات اتنے بدل چکے تھے کہ مفاہمت اور سمجھوتہ کی کوئی امید نہ تھی، شمالی جرمنی کی تمام ریاستیں لوتھر کے مذہب کو قبول کر چکی تھیں اور اس موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھیں، جب مفاہمت ناکام ہوتی نظر آئی تو پروٹسٹنٹ کلیسا کو مٹانے کی صرف ایک صورت باقی رہ گئی تھی، وہ یہ کہ اس کے خلاف طاقت استعمال کی جائے اگرچہ اسمال کالڈن لیگ کے قیام کے بعد سے بہت سی شمالی ریاستیں لوتھر کے مذہب کو قبول کر چکی تھیں، مگر پھر بھی کیتھولک طاقتوں کے مقابلہ میں وہ ایک پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں جرمنی کی لوتھرین ریاستوں کے خلاف رومن کیتھولک کی صف آرائی، پروٹسٹنٹوں کے لئے کافی مرعوب کن تھی انھیں نہ صرف جنوب کی رومن کیتھولک ریاستوں کی جانب سے خطرہ تھا، بلکہ یورپ کی تمام بڑی طاقتیں رومن کیتھولک تھیں اور اسکی حمایت میں اگر یہ سب متحد ہو جائیں تو جرمنی کے پروٹسٹنٹ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اسپین، آسٹریا، اطالیہ، فرانس اور نیدرلینڈس کی طاقتیں اگر پروٹسٹنٹ مذہب کے مٹانے کے درپے ہو جاتیں تو شاید اس تحریک کا نام و نشان ہی مٹ جاتا، مگر ایسا اتحاد کبھی قائم نہ ہو سکا۔

مذہب اور سیاست | جرمنی میں اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا، وہ مذہب کی آڑ میں سیاست بھی تھا۔ بادی النظر میں

یہ توقع کی جاتی تھی کہ مشترکہ مذہبی وفاداریوں کی بنا پر جرمنی کے رومن کیتھولک فرمانروایان ریاست اور شہنشاہ کے درمیان کامل ہم آہنگی اور اتحاد خیال ہوگا، مگر صورت حال بالکل اس کے برعکس تھی مذہبی یکرنگی کے باوجود سیاسی سطح پر وہ شہنشاہ کے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہیں تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہنشاہ زیادہ طاقتور ہو جائے یا ایک مضبوط مرکزی حکومت شہنشاہ کی سرکردگی میں قائم ہو، وہ شہنشاہیت کی کمزوری کو پسند کرتے کیونکہ وہی ان کی آزادی اور خود مختاری کی ضامن ہوتی جرمن کے اتحاد اور رومن کیتھولک مذہب کی کامرانی سے زیادہ ان کو اپنی آزادی پیاری تھی، پروٹسٹنٹ اور کیتھولک سب ہی حکمران شہنشاہ کو مشتبہ نگاہ سے دیکھتے تھے، انکو ڈر تھا کہ کہیں وہ مرکز کو طاقتور کر کے انکی آزادی اور خود مختاری کا خاتمہ نہ کر دے، کیتھولک اُس سے اس لئے بھی خوش نہ تھے کہ وہ کلیسا کی اندرونی بدعنوانیوں کو دور کرنا چاہتا تھا، لوتھری اُس کے اس لئے مخالف تھے کہ وہ پاپائے روما کی سیادت کو تسلیم کرتا تھا، غرض ان مختلف اور متضاد قوتوں کی کشمکش میں جرمنی اور شہنشاہیت روما کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا، چارلس پنجم جرمنی سے باہر سب کچھ تھا، اسپین، سدرلینڈ، اطالیہ اور نئی دنیا میں ایک طاقتور حکمران اور عظیم شخصیت سمجھا جاتا تھا لیکن جرمنی میں وہ یہاں کا شہنشاہ تھا مگر فی الحقیقت اُسکی حیثیت ایک شاہ شطرنج کی سی تھی، اس نے بہت کوشش کی کہ مقدس شہنشاہیت جن متضاد و پیچیدہ مسائل کی شکار تھی ان کا کوئی اچھا حل ڈھونڈھ نکالے مگر اسکی کوشش بار آور نہیں ہوئی، وہ کٹر رومن کیتھولک تھا اور اسی مذہب کا یورپ میں بول بالا چاہتا تھا، مگر پاپائیت کی سربلندی کا دل سے خواہشمند نہیں تھا، پوپ سے اس کے اختلافات بھی تھے، اور وہ سیاسی معاملات میں اُسے قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔

ان سیاسی مصالح کی وجہ سے وہ پروٹسٹنٹوں کے خلاف حتی الامکان کھلی اور شدید جارحیت سے ایک مدت تک گریزاں رہا، اس نے ۱۵۴۴ء تک اس نے جرمنی کے پروٹسٹنٹوں کے خلاف اپنی تلوار بے نیام نہیں کی لیکن جب لوتھر اور اس کے ساتھیوں کی کوششوں سے پروٹسٹنٹ کی ریاستوں میں پروٹسٹنٹ مذہب کو فروغ حاصل ہونے لگا تو اس نے اس کو کچلنے کے لیے جنگ کی تیاری کی، اور سب سے پہلے سکسنی اور ہیس کے حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہوا لیکن اس جنگ

مذہبی رنگ نہیں دیا بلکہ ان ریاستوں کے حکمرانوں کی سیاسی مرکزیت کو جنگ کا بہانہ بنایا، وہ جانتا تھا کہ جرمنی میں پروٹسٹنٹ کے خلاف ایک کھلی مذہبی جنگ کامیاب نہ ہو سکے گی ایک طرف تو اسمالکالڈن لیگ کی مسلح نبرد آزمائی کی تیاریوں کا اسے علم تھا، دوسری طرف جرمنی کے پروٹسٹنٹوں کو یورپ میں جو تائید حاصل تھی وہ بھی اس کے سامنے تھی نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ یہ جنگ پروٹسٹنٹوں کے خلاف ایک جہاد کی حیثیت رکھتی تھی مگر یہ صرف کیتھولک کے بل بوتے پر نہیں لڑی گئی، شہنشاہ جس کفر و الحاد کو مٹانے کے لئے رزم آرا ہونا چاہتا تھا، خود اسی کے بعض گوشوں سے اسے مدد کی بھی توقع تھی چنانچہ سیکسنی کے مارس[1] نے پروٹسٹنٹ ہوتے بھی اس جنگ میں شہنشاہ کا ساتھ دیا اور اپنے ذاتی اغراض کے لئے پروٹسٹنٹ مفادات کو نظر انداز کیا، وہ فریڈرک کے بجائے خود سیکسنی کا الیکٹر بننا چاہتا تھا، اور شہنشاہ سے اس بارے میں وعدے بھی حاصل کر لئے تھے،

پروٹسٹنٹوں کے خلاف جنگ مارس کی غداری نے پروٹسٹنٹوں کے موقف کو نقصان پہونچایا ۱۵۴۷ء تک شہنشاہ کو پروٹسٹنٹ لیگ کے خلاف فیصلہ کن کامیابی حاصل ہو گئی، جان فریڈرک اور فلپ آف ہس دونوں گرفتار ہوئے، لیکن شہنشاہ کی یہ کامیابی کچھ کام نہ آئی، وہ اس موقع پر جرمنی کی کمزور اور مفلوج شہنشاہیت کو ایک طاقتور سلطنت میں تبدیل کرنا چاہتا تھا، اور اس غرض کے لیے بعض تجاویز بھی پیش کیں مگر پروٹسٹنٹ اور کیتھولک حکمرانوں نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کیا جرمنی کے انتشار اور طوائف الملوکی ہی میں انکی بے لگام آزادی کا راز پنہاں تھا، اور وہ مرکز کو طاقتور بنا کر اپنی اس آزادی سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھے،

جنگ کا دوسرا مرحلہ اسوقت شروع ہوا جب کہ جرمنی کے پروٹسٹنٹ جرنلوں نے ہنری دوم شاہ فرانس سے معاہدہ کر کے اسکی تائید حاصل کر لی ہنری دوم اس وقت تک اس خیال کا حامی ہو چکا تھا کہ فرانس کی توسیع اطالیہ کے بجائے دریائے رائن کے کنارے ہونی چاہیے اس لیے وہ اس شرط پر پروٹسٹنٹوں کو مدد دینے کے لیے تیار ہو گیا کہ میٹز، ٹول اور ویرڈن کے علاقے اس کے حوالے کر دیے جائیں اور ان علاقوں میں وہ شہنشاہیت روما کا نائب امیر تسلیم کیا جائے، چنانچہ ۱۵۵۲ء میں ایک معاہدہ طے پایا، جو معاہدہ شامبورڈ Chambord

[1] مارس ڈیوک آف سیکسنی، جان فریڈرک الیکٹر آف سیکسنی کا قریبی عزیز تھا

کے نام [illegible] ہوا۔ اس دور میں فرانس کی مداخلت کا سلسلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے، فرانسیسی فوجوں نے اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے پیش قدمی کی اور دوسری طرف موریس نے جو اس عرصہ میں شہنشاہ سے ناراض ہو کر پروٹسٹنٹوں سے جا ملا تھا، انسبرک کے مقام پر شہنشاہ کو ایسی شکست دی کہ اس کے پاؤں اکھڑ گئے وہ بہ مشکل تمام اپنی جان بچا کر درہ برینر کے راستے جرمنی سے نکل بھاگا، اس ناکامی کے بعد جرمنی کی سیاست پر شہنشاہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔

معاہدہ آگسبرگ (۱۵۵۵ء) چارلس پنجم اپنی نیک نیتی اور اخلاص کے باوجود جرمنی کے مذہبی خلفشار کا کوئی مداوا دریافت نہیں کر سکا، یہ پیکار آزمائی ۱۵۵۵ء تک جاری رہی، خون بہتا رہا، مذہب کے نام پر لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے، اس خانہ جنگی کا خاتمہ بالآخر فرڈنینڈ کے ہاتھوں عمل میں آیا جو شہنشاہ کا بھائی اور آسٹریا کا بادشاہ تھا، ہاپسبرگ خاندان کا یہ نہایت زیرک اور دانشمند حکمران تھا، اسی کے تدبر نے جرمنی کو آئندہ کم و بیش پچاس سال تک جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھا، شہنشاہ کی کوشش یہ تھی کہ مفاہمت کے ذریعہ سے مذہبی اتحاد پیدا کیا جائے مگر یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکی، فرڈیننڈ نے مذہبی تفریق کی حقیقت کو تسلیم کر لیا، معاہدہ اگسبرگ کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی کہ پروٹسٹنٹ کلیسا کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے، کلیسائی اتحاد کے نصب العین سے دست برداری حاصل کر لی گئی، لوتھر کے کلیسا نے جرمنی میں قانونی طور پر ایک مستقل جگہ پیدا کر لی، باغی کلیسا اب ایک جائز کلیسا تسلیم کیا گیا، معاہدہ اگسبرگ ایک عہد آفریں فیصلہ تھا، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد اس سے پیدا ہونے والے ذیلی مسائل کی یکسوئی آسان تھی، یہ طے کیا گیا کہ جرمنی کی ہر ریاست اپنے مذہب کے انتخاب میں آزاد ہوگی، مگر یہ آزادی عوام کو نہیں بلکہ حکمران کو عطا کی گئی، حکمران کا مذہب ریاست کا سرکاری مذہب ہوگا، اس میں نہ شہنشاہ مداخلت کرے گا اور نہ پارلیمنٹ، اس تصفیہ نے جرمن قوم کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کر دی کہ وہ عرصہ دراز تک قومی اتحاد کی نعمت سے محروم ہو گئی، اس سے ضمنی طور پر فرانس کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ ایک متحد اور طاقتور جرمنی سے اسے جو خطرات لاحق ہو سکتے تھے ان کا کوئی امکان ہی

باقی نہیں رہا، اس معاہدہ کی رو سے یہ بھی طے کیا گیا کہ دینی امرا اساقفہ اور پادری اگر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کریں تو انکو اپنی کلیسائی جائیداد سے دست بردار ہونا پڑیگا[1]، اور یہ کہ اگر کسی ریاست کا حکمراں اسقف یا صدر اسقف ہو تو وہ اپنی رعایا پر رومن کیتھولک مذہب پر زور مسلط نہ کر سکے گا،

معاہدہ آگسبرگ سے وقتی طور پر جنگ کی لعنت ختم ہو گئی، مگر اس کی بنیاد ترقی پسند تصورات پر نہیں رکھی گئی تھی، اس سے جرمنی یا یورپ میں ترقی پسندی کے رجحانات کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوئی اور نہ اس سے مذہبی رواداری کی اسپرٹ پیدا ہو سکی، اس کے ذریعہ سے صرف لوتھر کے کلیسا کو تسلیم کیا گیا تھا، جینوا اور زیوریچ (Zurich) میں جو پروٹسٹنٹ تحریکات جنم لے چکی تھیں انھیں اکثر نظر انداز کیا گیا، ان کو تسلیم کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، یورپ ابھی اس مقام تک نہیں پہونچا تھا، جہاں مذہبی امور کے بارے میں اختلاف و انحراف کے لئے بھی کوئی باعزت جگہ نکالی جا سکتی، معاہدہ آگسبرگ اپنی محدود خوبیوں کے باوجود عصری قدامت پسندی اور تنگ نظری کا آئینہ دار تھا،

---

[1] لیکن اس کے ساتھ یہ بھی رعایت کی گئی تھی کہ جو اساقفہ ۱۵۵۲ء سے پہلے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر چکے تھے وہ اپنی کلیسائی جائداد (ریاست) پر بحال رہیں گے،

کے نام سے [illegible] اور یورپ میں فرانس کی مداخلت کا سلسلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے فرانسیسی فوجوں نے اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے پیش قدمی کی اور دوسری طرف ماریس نے جو اس عرصہ میں شہنشاہ سے ناراض ہو کر پروٹسٹنٹوں سے جا ملا تھا، انسبرک کے مقام پر شہنشاہ کو ایسی شکست دی کہ اس کے ہاتھ اکھڑ گئے وہ بہ مشکل تمام اپنی جان بچا کر درہ برینر کے راستے جرمنی سے نکل بھاگا، اس ناکامی کے بعد جرمنی کی سیاست پر شہنشاہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔

معاہدہ اگسبرگ (۱۵۵۵ء) چارلس پنجم اپنی نیک نیتی اور اخلاص کے باوجود جرمنی کے مذہبی خلفشار کا کوئی مداوا دریافت نہیں کر سکا، یہ پیکار آزمائی ۱۵۵۵ء تک جاری رہی، خون بہتا رہا، مذہب کے نام پر لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے، اس خانہ جنگی کا خاتمہ بالآخر فرڈیننڈ کے ہاتھوں عمل میں آیا جو شہنشاہ کا بھائی اور آسٹریا کا بادشاہ تھا، ہاپسبرگ خاندان کا یہ نہایت زیرک اور دانشمند حکمران تھا، اسی کے تدبر نے جرمنی کو آئندہ کم و بیش پچاس سال تک جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھا، شہنشاہ کی کوشش یہ تھی کہ مفاہمت کے ذریعہ سے مذہبی اتحاد پیدا کیا جائے مگر یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکی، فرڈیننڈ نے مذہبی تفریق کی حقیقت کو تسلیم کر لیا، معاہدہ اگسبرگ کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی کہ پروٹسٹنٹ کلیسا کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے، کلیسائی اتحاد کے نصب العین سے دست برداری حاصل کر لی گئی، لوتھر کے کلیسا نے جرمنی میں قانونی طور پر ایک مستقل جگہ پیدا کر لی، باغی کلیسا اب ایک جائز کلیسا تسلیم کیا گیا، معاہدہ اگسبرگ ایک عہد آفرین فیصلہ تھا، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد اس سے پیدا ہونے والے ذیلی مسائل کی یکسوئی آسان تھی، یہ طے کیا گیا کہ جرمنی کی ہر ریاست اپنے مذہب کے انتخاب میں آزاد ہو گی، مگر یہ آزادی عوام کو نہیں بلکہ حکمران کو عطا کی گئی، حکمران کا مذہب ریاست کا سرکاری مذہب ہو گا، اس میں نہ شہنشاہ مداخلت کرے گا اور نہ پارلیمنٹ۔ اس تصفیہ نے جرمن قوم کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کر دی کہ وہ عرصہ دراز تک قومی اتحاد کی نعمت سے محروم ہو گئی، اس سے ضمنی طور پر فرانس کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ ایک متحد اور طاقتور جرمنی سے اسے جو خطرات لاحق ہو سکتے تھے ان کا کوئی امکان ہی

نی نہیں رہا، اس معاہدہ کی رو سے یہ بھی طے کیا گیا کہ دینی امرا اساقفہ اور پادری اگر پروٹسٹنٹ مذہب اختیا
یں تو انکو اپنی کلیسائی جائیداد سے دست بردار ہونا پڑیگا، اور یہ کہ اگر کسی ریاست کا حکمراں اسقف یا صدر اسقف
تو وہ اپنی رعایا پر رومن کیتھولک مذہب پر زور مسلط نہ کر سکے گا،

معاہدہ آگسبرگ سے وقتی طور پر جنگ کی لعنت ختم ہو گئی، مگر اس کی بنیاد ترقی پسند تصورات پر نہیں
ی گئی تھی، اس سے جرمنی یا یورپ میں ترقی پسندی کے رجحانات کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوئی، اور نہ
ن سے مذہبی رواداری کی اسپرٹ پیدا ہو سکی، اس کے ذریعہ سے صرف لوتھر کے کلیسا کو تسلیم کیا گیا تھا،
یوا ا اور زیور پچ (Zurich) میں جو پروٹسٹنٹ تحریکات جنم لے چکی تھیں انھیں اکثر نظر انداز کر گیا،
ن کو تسلیم کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، یورپ ابھی اس مقام تک نہیں پہونچا تھا، جہاں مذہبی امور
ے بارے میں اختلاف و انحراف کے لئے بھی کوئی با عزت جگہ نکالی جا سکتی، معاہدہ آگسبرگ اپنی محدود خوبیوں
ے باوجود عصری قدامت پسندی اور تنگ نظری کا آئینہ دار تھا،

ے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی رعایت کی گئی تھی کہ جو اساقفہ ۱۵۵۲ء سے پہلے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر چکے تھے وہ اپنی
لیسائی جائداد (ریاست) پر بحال رہیں گے،

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سیمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"معارف" کے ذریعہ سے ہم اپنے ناظرین کو برابر مطلع کرتے رہے کہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین میں ایک بین الاقوامی سیمینار "اسلام اور مستشرقین" پر ہونے والا ہے، الحمد للہ کہ گذشتہ ماہ ان تاریخوں میں یہ بخیر و خوبی انجام پا گیا۔

اس کے شروع ہونے سے پہلے برابر یہ خیال رہا کہ اس دور انتشار و تعصب میں بیرونی ممالک کے لوگوں کو آنے میں بڑی تکلیف ہوگی، اس لیے وہ یہاں نہ آسکیں گے، لیکن جب فضل خداوندی شامل حال ہو تو پھر ہر قسم کی رکاوٹ خود بخود دور ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اپنی توقع سے زیادہ مندوبین باہر سے پہونچے، قطر سے شیخ عبداللہ یوسف القرضاوی نے اپنی تشریف آوری سے اس اجتماع کو رونق بخشی، وہ قطر یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی فیکلٹی کے صدر اور مشہور مصنف ہیں، اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی فکر صحیح اور جذبۂ اسلامی کے لیے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، وقار اور متانت کے پیکر نظر آئے، ان کے ساتھ اس یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب اور ایک دوسرے استاذ علی محمد یوسف المحمدی تھے، رابطۂ اسلامیہ مکہ معظمہ کا بھی ایک وفد آیا، اس کی قیادت اس کے

ڈائرکٹر جنرل شیخ عبدالصبور مرزوق کر رہے تھے، جن کی جاذب اور متحرک شخصیت توجہ کا مرکز بنی رہی، ان کے ایک رفیق بہت ہی بے تکلفی سے انگریزی بولتے تھے، ابوظبی سے رئیس قسم الشریعۃ بکلیۃ الحقوق والشریعۃ بجامعۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ استاذ محمود الطنطاوی اور دکتور تقی الدین الندوی المظاہری استاذ شعبۂ حدیث عین یونیورسٹی اور مشیر علمی اسلامی کورٹ آئے، مدینہ یونیورسٹی سے دینیات اور اسلامیات کے دو اساتذہ بھی شریک ہوکر اپنے ساتھ برکتیں لائے، ظہران یونیورسٹی سے ڈاکٹر ظفر اسحٰق، پروفیسر تاریخ اسلامی جامعۃ البترول والمعادن اپنی بیگم اور اپنی نیکی، بھلمنساہت اور شرافت اخلاق کے ساتھ آئے، بنکاک (تھائی لینڈ) سے جناب ابراہیم قریشی سکریٹری جمعیۃ الاسلام اپنے دو رفقاء رحیم شاہ اور سکندر خان کے ہمراہ عجز و انکسار کے تحفے لے کر آئے، جاپان سے عبدالکریم ساتو نے اس میں شرکت کرکے اسلام کی عالمگیر برادری کا ثبوت دیا، استاذی المحترم جناب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید سلمان ندوی ہمہ تن نیاز بن کر جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی سے پہونچے تو اپنے والد بزرگوار کی یادوں کی مشعل روشن کرتے رہے، کراچی سے حکیم محمد سعید دہلوی (ہمدرد فونڈیشن) اپنی بے داغ بلکہ بلوری شیشے سے زیادہ چمکدار سفید شیروانی میں دارالمصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہاں سہانی چاندنی چھٹک رہی ہے، ان کے ساتھ ڈاکٹر فریدالدین بقائی بھی تھے جو کراچی کے کامیاب ترین ڈاکٹروں میں ہیں، کراچی کے ان مہمانوں کی معیت میں حکیم نعیم الدین زبیری بھی تھے، اسلام آباد (پاکستان) سے وہاں کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ اپنے چھ رفقائے کار کے ساتھ آکر اپنے حسن خلق، پاکی طینت، عجز اور انکسار کے نقوش پیچھے چھوڑ گئے، ان کی معیت میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی بھی تھے جو بین الاقوامی المجمع الفقہی رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے رکن اور موتمر اسلامی کے اعزازی ڈائرکٹر جنرل بھی ہیں، علمی، فقہی، ادبی اور دینی معلومات کے بحر زخار ہیں، بولتے ہیں تو بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے رہیں، اس وفد میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی شریک تھے، جو اسلامک ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے بہت ہی لائق مدیر ہیں، آج کل بڑی محنت بلکہ عرق ریزی سے مولانا حمید الدین فراہی کے قرآنی علوم پر کام کر رہے ہیں، اس علمی قافلہ کے ساتھ ڈاکٹر محمد طفیل ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے دار المصنفین آکر اس ادارہ اور میری حقیر ذات سے اپنے گہرے لگاؤ اور تعلق کا ثبوت دیا، جناب محمود احمد غازی ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دار المصنفین کے ذرہ ذرہ سے محبت نہیں بلکہ ان کا عشق ہے، جس کا اظہار اسلام آباد سے اعظم گڈھ تک کی راہ نوردی میں کیا، اس علمی کاروان میں ڈاکٹر احمد خان لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو دار المصنفین کی مطبوعات اور خصوصاً رسالۂ معارف سے ایسی غیر معمولی محبت ہے کہ یہاں کی تصانیف اور معارف کے مضامین کے اسمائے معرفہ کے اوپر جو ایک ہلکی سی لکیر بنا دی جاتی تھی اور بعد میں ترک کر دی گئی تو اس سے ان کو دکھ ہوا، اور شکوہ سنج ہوئے کہ وہ اب کیوں نہیں ہوتی ہیں، وہ تو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، اسلام آباد سے اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مفتی سیاح الدین کاکاخیل بھی تشریف لائے اور اپنی قد آور شخصیت اور پاٹ دار آواز سے ہر جگہ چھائے رہتے، لاہور سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مدیر جناب شیخ نذیر حسین سفر کی بڑی صعوبتیں برداشت کر کے دو روز دیر کر کے پہونچے، مگر دار المصنفین سے اپنی غیر معمولی محبت و عقیدت کے گلدستے نذر کر گئے،

ہندوستان سے جناب حکیم عبد الحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ دہلی) اپنی پوری عظمت اور شوکت اپنے جلو میں لے کر جناب اوصاف علی ڈائرکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر تغلق آباد کے ساتھ رونق افروز ہوئے، جناب حکیم صاحب ہماری مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی ہیں، جناب اوصاف علی ان کے ساتھ آئے تو گویا انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد نگر بھی کھنچ کر دار المصنفین چلا آیا تھا، دہلی سے مفتی عتیق الرحمٰن اپنی پیرانہ سالی اور کمزوری صحت کے باوجود دار المصنفین کی محبت میں سفر کی ساری مشکلات کو طے کر کے تشریف لائے، اور دکھ ہے کہ جب واپس ہو رہے تھے تو پارہ بنکی کے پاس ریل ہی میں ان پر فالج کا اثر ہو گیا، یہ ہمارے سمینار کا ایک المناک پہلو ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو

بدصحت کو عطا فرمائے کہ وہ اپنی قوم وملت کی خدمت کرسکیں، دہلی ہی سے مولانا ابو اللیث ندوی امیر جماعت اسلامی نے تشریف لاکر اپنی اس محبت کا ثبوت دیا جو ان کے دل میں بچپن سے دارالمصنفین کے لیے جاگزیں ہے، وہاں سے مولانا سجاد حسین صدر مدرس مدرسۂ فتحپوری کا بھی یہاں آئے تو ان کی دلکش اور رعنا شخصیت دیدہ زیب بنی رہی، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی بھی آئے، جو سیمیناروں کے مرد میدان ہیں، اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (شعبۂ اردو) بھی یہاں آکر اس بزم میں شریک ہوئے، وہ اپنے مخصوص طرز نگارش سے ہر اس موضوع میں جان ڈال دیتے ہیں جس پر ان کا قلم چل نکلتا ہے، جامعہ ملیہ دہلی سے جناب ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی، ڈاکٹر حافظ محمد شعیب، ڈاکٹر عابد الحسن فاروقی اور جناب عبد اللطیف اعظمی نے یہاں آکر اپنے اس دیرینہ تعلق کا ثبوت دیا جو ان کو اس ادارہ سے ہے، جناب ضیاء الحسن فاروقی، سید شہاب الدین دسنوی اور سید انصاری صاحبان ہماری مجلس انتظامیہ کے ارکان میں سے ہیں، اس لیے یہ حضرات سمینار کے انتظام کے لیے کچھ دنوں پہلے آگئے تھے اور بڑی محنت سے ہر کام میں جناب عبد اللطیف اعظمی کے ساتھ رواں دواں رہے، جناب ضیاء الحسن فاروقی سمینار میں جب اپنے خوبصورت اور موثر انداز میں مقالہ پڑھتے ہیں تو حاضرین کو محظوظ کیے بغیر نہیں رہتے، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی ابھی جوان ہیں، ان کی مقالہ نگاری میں جوانی کی ساری امنگیں اور رنگینیں ہوتی ہیں، ڈاکٹر عابد الحسن جناب ضیاء الحسن فاروقی کے فرزند ارجمند ہیں، خدا کرے ان کو اپنے والد بزرگوار کی ساری خوبیاں عطا ہوں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب بھی تشریف لائے، اعظم گڈھ کے لوگوں اور خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے یہاں کے اولڈ بوائز نے ان کی جس طرح پذیرائی کی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ نسیم نوبہاری بن کر آئے ہیں اور جب وہ واپس ہوئے تو لوگوں کی زبان پر تھا کہ اپنے اخلاق کے گل و صنوبر کا ایک گلشن آباد کر گئے ہیں، مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہاں آکر خاص طور سے

مجھ کو نوازا، وہ اس وقت تاریخ مشائخ چشت کا سلسلہ مرتب کر کے تصوف کے تحت حادثہ پر پھینکے صاحب قرانی کر رہے ہیں،

علی گڑھ ہی سے فاضل اجل جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی اڈیٹر برہان بھی تشریف لائے جو جہاں جاتے ہیں اپنے علم فضل، قوت گویائی، یگانگت، موانست اور محبت کے شیش محل کی بنا ڈال دیتے ہیں۔

وہاں کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر محمد اقبال انصاری بھی آئے، جن کو سمینار کی تقریبوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کا بڑا ملکہ ہے، ان سے طے تھا کہ وہ یہاں آکر اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں مدد کریں گے، ان ہی کے شعبہ کے ریڈر ڈاکٹر اکمل ایوبی بھی آئے جو مختلف سمیناروں میں برابر بلائے جاتے ہیں، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر نہ آسکے تو ان کی نمائندگی اس شعبہ کے استاد جناب اجمل ایوب اصلاحی نے کی جن کا تقرر مدینہ یونیورسٹی میں ہوچکا ہے اور وہ وہاں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

میرٹھ سے جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد اپنے صاحبزادے زین الساجدین استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی کے ساتھ شریک ہوئے تو ان کی ہر گفت گو سے ان کے علم و فضل کا اظہار ہوتا تھا لکھنؤ سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے دو داماد اور بھتیجے جناب حکیم عبدالقوی دریابادی اڈیٹر "صدق جدید" اور جناب حبیب احمد قدوائی نے بھی آکر گویا اپنے فاضل اجل چچا مرحوم کی نمایندگی کی۔

لکھنؤ سے جناب علی جواد زیدی چیرمین اترپردیش اردو اکیڈمی ذاکر مجھ کو خاص طور پر رہینِ منت کیا۔

یادش بخیر جناب خلیل الرب صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر اردو سیکشن یوپی گورنمنٹ پندرہ ۱۵ روز پہلے الہ آباد سے یہاں آگئے تھے، ان کو چمن بندی کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، یہاں کے پھولوں اور پودوں کو سجا کر اپنے حسن ذوق کا ثبوت دیا، پھر اس تقریب کے ہر کام کو ایسی دل سوزی سے انجام دینے کی

کوشش میں لگے رہے، جیسے یہ ان کا اپنا ادارہ ہے، کچھ دنوں پہلے وہ اعظم گڑھ میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں رہ چکے ہیں اس لیے یہاں کے ہر طبقہ میں روشناس اور مقبول رہے، الٰہ آباد ہی سے وہاں کی یونیورسٹی کے استاذ جناب طفیل احمد مدنی نے بھی آکر شرکت کی، وہ اس موقع کے لیے ایک نظم بھی لکھ کر لائے تھے۔

بھوپال سے اپنی کرم گستری سے نواز کر کے حضرت سعید میاں سجادہ نشین خانقاہ یعقوبیہ مجددیہ سلسلہ کی تمام برکتیں ساتھ لے کر تشریف لائے، دہلی سے برادر عزیز جناب حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی اپنے فرزند ڈاکٹر محمد حسان کو ساتھ لے کر پہونچے، انھوں نے کچھ دن پہلے اپنی ایک آنکھ کا آپریشن کرایا تھا، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے معزز ترین ارکین میں ہیں، دارالمصنفین کی ہر قسم کی سرگرمیوں میں ساتھ رہے ہیں، اس اجتماع میں شریک ہونے کے لیے بے تاب تھے، اسی بے تابی میں اپنی آنکھوں کی تکلیف کی پروا کیے بغیر یہاں آکر ہماری ہمت افزائی اور دلجوئی کی، پٹنہ سے خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بھی شرکت کی، جو سیمینار میں اپنے سوالات سے ہلچل اور گرمی پیدا کر دیتے ہیں، دربھنگہ سے ڈاکٹر عبد العزیز سلفی دارالمصنفین کی محبت میں کھنچ کر پہونچے، گیا سے عزیزی سید اشہد علی ایڈووکیٹ آئے تو اپنے والد مرحوم جناب سید ریاست علی ندوی سابق رفیق دارالمصنفین کی یادوں کو تازہ کر گئے، اندور سے جناب عبد الحمید اور کالی کٹ سے ڈاکٹر سید قدرت اللہ بقائی صدر شعبۂ اردو فاروقی کالج دور دراز سفر کی زحمت گوارا کر کے اس اجتماع میں شریک ہوئے، کشمیر سے جناب عبد الرحمٰن کوندو برفستانی راستے طے کر کے دارالمصنفین کی محبت میں کشاں کشاں آئے، وہ اس ریاست کے صاحب ذوق اہل علم اور باہمت معاشرتی کارکن ہیں۔

بھڑوچ سے مولوی غلام محمد واسطی نے بھی آنے کی تکلیف گوارا کی، بمبئی سے مولانا محمد مستقیم ندوی قاسمی بھی دارالمصنفین کی بے پناہ والہانہ محبت کے ساتھ آئے، ان کی معیت میں پندرہ آدمی اور تھے، بمبئی سے ہماری مجلس انتظامیہ کے رکن رکین سیٹھ عبد العزیز انصاری دس روز پہلے اعظم گڑھ تشریف لائے،

اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ مئو سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی تشریف نہیں لاسکے کیونکہ ان ہی دنوں ان کو دل کا دورہ پڑا، جس سے ہم ان کی تشریف آوری کی برکت اور ان کی علمی فضیلت کی رونق سے محروم رہے۔ ملک کے مشہور عالم اور مصنف مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سیمنار سے پہلے برابر یہاں تشریف لاکر اپنے عالمانہ اور مخلصانہ مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد اس مذاکرہ میں شرکت کے لیے کیا بلکہ اس اہم موقع پر دارالمصنفین پر نچھاور ہونے کے لیے آئی، اس کے انعقاد سے دس روز پہلے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے محبوب بھانجے اور مولانا رابع ندوی کے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی تو اس سے دارالمصنفین کے خدمت گذاروں پر بجلی گری، خیال ہوا کہ اس المناک حادثہ کے بعد اس مذاکرہ کو ملتوی کردینا ہی بہتر ہوگا، مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا رابع ندوی دونوں نے اپنے بے مثال صبر وضبط سے کام لے کر ایسا ہونے نہیں دیا، اور ندوۃ العلماء کے پینتیس ۳۵ طلبہ کو ان کے استاد مولانا محمود الازہار، مولانا فاروق بھٹکلی، مولانا ابوسحبان کی نگرانی میں جلسہ گاہ کی زینت وآرایش کے لیے بھیجا، وہ آئے تو مندوبین کے لیے خوبصورت اور دیدہ زیب فائل، مختلف قسم کے بیج، زیب وزینت کے سامان اور موقع کے لحاظ سے ہر قسم کے لٹریچر اور پمفلٹ اپنے ساتھ لائے، جن سے مذاکرہ میں وزن، وقار اور حسن بھی بڑھا، وہ منظر بھی عجیب وغریب تھا، جب یہ طلبہ اپنے سروں اور کاندھوں پر کرسیاں، میزیں، قالین اور فرش ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے، پھر اپنی محنت اور خوش سلیقگی سے جناب محمود الازہار کی ہدایت سے کھلے اجلاس کے پنڈال اور مجلس مذاکرہ کے اسٹیج کو جنت نگاہ بنادیا، اور جب مولانا سید الاعظمی، مولانا ابوالعرفان، مولانا محبوب الٰہی، مولانا شمس الحق، مفتی محمد ظہور، مولانا محمد مرتضیٰ، مولوی سلمان، مولانا احمد، مولوی محمد رضوان وغیرہ پہونچے تو گویا دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالمصنفین کے احاطہ میں منتقل ہوگیا، ان تمام حضرات نے اپنی ہر امکانی کوشش سے

ن تقریب کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، مولانا سعید الاعظمی اور مولانا شمس کی تو کبھی جگنو، کبھی چھلاوہ اور کبھی برق جہاں کی طرح چمکتے دکھائی دیتے۔

اس شہر میں قیامگاہ کی بڑی دقت تھی، یہاں اچھے ہوٹل نہیں، اس مجبوری کی وجہ سے مہمانوں کو سائنس کالج کے خیموں میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا، ان خیموں کی فراہمی میں جناب اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے غیر معمولی مدد پہونچائی، وہ ہماری مجلس انتظامیہ کے اہم رکن بھی ہیں، وہ اگر لکھنؤ میں اپنے غیر معمولی اخلاق اور اخلاص سے اثر انداز نہ ہوتے تو اتنے خیموں کا فراہم ہونا آسان نہ تھا، اس کے لیے ہم ان کے بہت ممنون ہیں، چالیس خیموں اور پنڈال وغیرہ کے لیے ایک بڑے میدان کی ضرورت تھی، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈووکیٹ نے کالج کے میدان، اس کے کمرے، فرنیچر اور ہر چیز کو استعمال کرنے کی اجازت دے کر ارباب دارالمصنفین کو ممنون کیا، کالج کے پرنسپل جناب محمد محسن عثمانی اور ان کے پورے اسٹاف نے اس موقع پر جس طرح تعاون کیا اس کے لیے بھی ہم ان کے شکر گذار ہیں، کالج کے جناب محمد غوث عالم (وائس پرنسپل) جناب اشفاق احمد (پروکٹر) جناب حماد عباسی (شعبۂ انگریزی) جناب ڈاکٹر محمد عرفان (شعبۂ اردو) ڈاکٹر انصار بیگ (شعبۂ حیوانیات) جناب وسیم الحسن (شعبۂ نفسیات) جناب وسیم احمد (شعبۂ جغرافیہ) ڈاکٹر رحمت اللہ (شعبۂ ہندی) ڈاکٹر نیاز احمد (شعبۂ تعلیمات) ڈاکٹر محمد صفی، ڈاکٹر مسیح الرحمن (شعبۂ علم الکیمیا) جناب محمد مشتاق اور اظفر فیضان (شعبۂ ریاضیات) جناب مسعود حسن اور مختار احمد (شعبۂ معاشیات) اور ڈاکٹر محمد جلال (شعبۂ نفسیات) اور غیر تدریسی اسٹاف میں نیاز احمد اور وداد احمد نے پوری تن دہی اور دلسوزی سے اس مذاکرہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، اسی طرح شبلی انٹر کالج کے سکریٹری جناب مرزا امتیاز احمد بیگ ایڈووکیٹ نے شروع ہی سے ہمارے ہر کام میں پورا تعاون کیا، اس کے پرنسپل جناب حکیم الدین اور وہاں کے اساتذہ میں ڈاکٹر نیاز داؤدی، جناب عشرت علی، محمد اجمل انصاری کا شکریہ

محمد مسلم اور شاہد کلیم صاحبان بڑی محنت اور مشقت سے اس کے چھوٹے بڑے کاموں میں لگے رہے، خورد و نوش کے اہتمام کے ہیرو ڈاکٹر محمد طاہر (شعبۂ اردو شبلی کالج) رہے، جنھوں نے بہتر سے بہتر کھانے پکوا کر مہانوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا، ان کی خوش سلیقگی کی داد تمام بیرونی مہانوں نے بھی دی، ان کے چچا مولوی عبد الباقی اصلاحی کالج کے انفعال احمد، شفقت علاء الدین اور اسکول کے جناب شاہد احمد خان نے ان کو ہر قسم کی مدد پہونچائی، شبلی کالج کے شعبۂ اردو کے طلبہ نے اس تقریب کو اپنی تقریب سمجھ کر اس کو کامیاب بنانے میں پوری جانفشانی کا ثبوت دیا، شبلی کالج کے ڈاکٹر قمر الدین (شعبۂ نباتیات) نے بڑی فراخ دلی سے اپنا پورا امکان مہانوں کے قیام کے لیے پیش کیا، جس سے بڑی سہولت رہی۔

شہر کے معززین میں جناب امین الدین (سابق پروفیسر قانون شبلی کالج) جناب مبین الدین (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر) جناب امجد علی غزنوی وکیل (نائب صدر مجلس انتظامیہ شبلی کالج) جناب شاہ خالد وکیل، جناب محمد ایوب (بیمہ کمپنی)، مولوی عزیز الرحمن (سابق استاذ شبلی اسکول)، ڈاکٹر محمد سلیم ایم۔ ڈی شروع سے مفید مشورے دے کر حوصلہ افزائی کرتے رہے، شاہ خالد نے سمینار کی ابتدائی دو راتیں جاگ کر گذاریں، اظفر فیضان اور مشتاق احمد صاحبان (شعبۂ ریاضیات) سایہ کی طرح برابر ساتھ رہے۔

پھر ہماری مجلس انتظامیہ کے مقامی اراکین میں جناب مرزا نیاز احمد بیگ وکیل اور جناب شوکت سلطان صاحب نے وہی سارے حقوق ادا کیے جو ان کو کرنا چاہیے تھے، جناب مرزا امتیاز احمد بیگ تو ہر موقع پر میرے دوش ناتواں کو سنبھال کر میرے دل کو اپنے ہاتھوں میں لیے رہے، جناب شوکت سلطان صاحب لکھنؤ کے سفر میں برابر ساتھ رہے، انھی کی مساعی جمیلہ سے یو۔ پی حکومت کے وزیر جناب عمار رضوی اس موقع کی علمی نمائش کے افتتاح کے لیے تشریف لائے، ان ہی کی سفارش پر تین دن بجلی کی روشنی کا اچھا انتظام رہا، اس کے لیے ہم مجلس قانون ساز کے پھول پور (اعظم گڈھ) حلقہ کے ممبر جناب ابو الکلام کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے لکھنؤ میں بیٹھ کر ہر قسم کی امداد کی۔

اعظم گڈھ کے جناب راجہ اعظم خاں کے پوتے نیر اعظم بھی سایہ بن کر ساتھ رہے، مہمانوں کے ٹرانسپورٹ
...ر اچھا انتظام کیا، انھوں نے اظفر فیضان کے ساتھ مل کر میونسپلٹی اور بجلی کے محکموں کی طرف سے
...مائی ستھرائی اور روشنی کا خاطر خواہ انتظام کیا، اس کے لیے ہم اکیڈمک آفیسر کبھی چندکول اور سیکریٹری شکر
...صدیق ہاشمی کے بھی شکر گذار ہیں۔

ضلع کے حکام میں جناب کلکٹر اور کپتان صاحب نے بھی ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچائیں خیموں کے لیے
...نظادستے بھی بھیج کر ممنون کیا۔

دارالمصنفین کے خدمت گذاروں نے تو اپنی جان کی بازی لگا دی تھی، ہر فرد متحرک تھا، اس کے رفقا
... مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز، حافظ منصور نعمانی، حافظ محمد عمیر اور کتب خانہ کے
...دی عبدالباری اور محمد اسحٰق ادیب نے مل کر بہت ہی عمدہ علمی نمائش سجائی تھی، جو مہمانوں کے لیے بہترین علمی
...ثقافتی ضیافت ثابت ہوئی، ان کی مدد کے لیے جناب الحاج مولوی ابو البقا، ندوی مدعو کر لیے گئے تھے
... پہلے دارالمصنفین ہی سے منسلک تھے، اب مبارکپور میں طبابت کرتے ہیں، وہ تقریباً پندرہ روز پہلے
...لے تھے، اپنی ان تھک محنت اور ہر کام کو انجام دینے کی صلاحیت سے ہر کس و ناکس کو اپنا گرویدہ بنا
...تھا، جو کام مشکل نظر آتا اس کو وہ بہت ہی خندہ پیشانی سے انجام دے دیتے، اس موقع پر خاص طور سے
...لوی احتشام علی ندوی بلا لیے گئے تھے، جو پہلے ہمارے دفتر میں رہ چکے ہیں، انھوں نے اخراجات کے
...ساب کتاب اور دوسرے مالی امور میں دفتر کے خزانچی مشہود اویس کی بڑی مدد کی، اور دوسرے انتظامی
...موں کو بھی سلیقہ سے انجام دیتے رہے۔ ہمارے رفیق کار جناب محمد مجید زبیری صاحب اپنی علالت
...لے باوجود سارے انتظامی امور کے بار کو عمدگی سے سنبھالتے رہے، پریس کے عملہ میں منشی محمد اقبال،
...مد انوار خاں اور مولوی ابو الحسنات نے اس موقع پر اپنی خطاطی کے اچھے نمونے پیش کیے۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی کا پروگرام تھا کہ وہ سیمینار کے شروع ہونے سے تین روز پہلے ہی تشریف

لائیں گے، مگر اپنے عزیز بھانجے کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے ۲۰؍ فروری کی شام گذار کر رات کو مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا محمد رابع ندوی کے ساتھ دارالمصنفین میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ سیمنار کی تقریب کے جسم میں ایک سحر آفریں اور عطر آگیں روح منتقل ہو گئی ہے، پورا احاطہ روشنی سے ضرور جگمگا رہا تھا، لیکن ان کی تشریف آوری سے علم و فن کی کرنیں ہر طرف پھوٹتی نظر آنے لگیں، مولانا رابع ندوی کا دل اپنے عزیز بھائی کی دائمی جدائی سے سوگوار اور رنجیدہ ضرور تھا، مگر وہ اپنے پریم بیتیسی کے ساتھ آئے اور زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ یہ مذاکرہ کامیاب ہو کر رہے گا، ان حضرات کے آنے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا کہ میرے جسم کے اندر ایک بہت ہی طاقتور ڈائنمو نصب کر دیا گیا ہے، پھر تو ہر قسم کی حرکت اور سرگرمی میرا ساتھ دے رہی تھی۔

۲۱؍ فروری کو تقریباً دس بجے دن کو ایک مرصع پنڈال میں مذاکرہ کا افتتاح ہوا، اس کی صدارت قطر یونیورسٹی کے شیخ یوسف عبداللہ القرضاوی نے کی، ان کے پہلو میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے تو ظاہر ہو رہا تھا کہ علم کے آسمان پر سے برج عطارد نیچے آگیا ہے اور دوسرے سیارے اس کے اردگرد جمع ہیں، مولانا محمد رابع ندوی کو کارروائی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی جس کو انھوں نے پوری خوش سلیقگی اور مہارت سے انجام دیا۔

جلسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک انڈونیشی طالب علم فہمی زمزم کی پر اثر تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا، پھر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان بیرونی اور ملکی مندوبین کے نام پڑھ کر سنائے جو اس وقت جلسہ میں موجود تھے، اس کے بعد ابوظبی کے چیف جسٹس شیخ احمد بن عبدالعزیز المبارک کا پیام مولانا تقی الدین ندوی نے پڑھ کر سنایا، پھر مراکش یونیورسٹی کے عربک اسٹڈیز کے ڈین کا پیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مولوی سلمان ندوی نے پڑھا، آخر میں دکتور معروف الدوالیبی سابق وزیر اعظم شام و مشیر شاہ خالد سعودی عرب کے ایک خط کا متن مولانا سعید الاعظمی نے پڑھا اور اس کا اردو ترجمہ

مولانا عبدالرحمن پرواز نے سنایا۔

پھر یہ خاکسار اسٹیج پر مہمانوں کا اپنی ایک تحریر کے ذریعہ سے خیر مقدم کرنے کے لیے حاضر ہوا، علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کے جانشین استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مستشرقین کو سمجھنے کے لیے جو اہم اور بنیادی باتیں اپنی زندگی میں بتائی تھیں ان کی طرف اس تحریر میں خاص طور پر توجہ دلائی گئی، اس لیے اس کا پورا متن یہاں درج کرنا مناسب ہوگا :

"صدر محترم!

دارالمصنفین کی طرف سے اس مذاکرہ کے لیے اپنے عزیز مہمانوں کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں، ارباب علم و دانش کے اس شاندار اجتماع کو دیکھ کر جہاں ہمیں فخر ہو رہا ہے وہاں ہمارے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر اور ایک مدت کی آرزو آج پوری ہو رہی ہے، جن مقاصد کے تحت دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا اُن میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دین اسلام، سیرۃ نبویؐ اور اسلامی علوم و فنون کے متعلق جو تحقیقات ہوتی رہتی ہیں اس کا جائزہ لیا جاتا رہے، جہاں اور جو کام اچھا دکھائی دے اس کی داد دی جائے اور جہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کوئی غلطی نظر آئے اس کی نشاندہی خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں کی جائے۔

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے ان سے متعلق ہمارے اس ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے لیے رہنما اصول بتا گئے ہیں، اس موقع پر مختصر طریقے سے ان کے خیالات دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں، وہ فرماتے ہیں :

یہ مستشرقین تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں :

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے

(قا)لب میں ڈھال کر دکھائیں۔

"(۲) بعض مستشرقین عربی زبان، علم و ادب، تاریخ اور فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، (لی)کن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، وہ سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھتے، لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلامؐ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ (چا)ہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمنی کے مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی تو اس کی (و)سعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن جب وہ اسلامی امور کے متعلق باتیں (لکھ)تا ہے تو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے یا کوئی اور۔ نولدیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا میں قرآن پر جو اس کا آرٹیکل ہے، جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ (ا)ن کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

"(۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر یا مارگولیتھ سے ہم کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ جو دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

"مارگولیتھ نے مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب، افتراء، تاویل (ا)ور تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی، اس کا کمال یہ ہے کہ جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

"یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں ان کی بنا پر ہم ان کو معذور سمجھ سکتے ہیں، سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا

تمام سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحٰق، تاریخ طبری وغیرہ ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، آنحضرتؐ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیح منقول ہیں، یوروپین مصنفین اس سرمایہ سے زیادہ تر بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور اسلام کے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے، جو گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔"

یہ وہ حقائق ہیں جو ہمارے ادارہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہم کو بتا گئے ہیں، ان ہی کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے پیچھے یہ وصایا چھوڑ گئے ہیں۔

یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے لٹریچر کو نئے اسلوب میں شایع کیا، وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم و ادب کی حفاظت و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ علوم ان کے نہ تھے اس لیے وہ ہمدردی اور محبت جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہو سکتی ہے ان کو نہیں ہے، اس لیے اس تحقیق و تدقیق سے جہاں فائدہ ہوا، وہاں سخت نقصان بھی پہونچ رہا ہے جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلام

نظر ڈال کر تحقیق و ریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ بنا کر اسلام، داعی اسلامؐ، اسلامی علوم، اور اسلامی تہذیب و تمدن پر بے پناہ حملے کر رہا ہے، قرآن مجید، حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام اور فقہ سب ان کی زد میں ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر نے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہونچایا اور پہونچے گا، اگر یہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمانوں کے دماغوں میں سمیت سرایت کر جائے گی۔"

دارالمصنفین کے بانی اور ان کے جانشین ہم کو جو پیام دے گئے ہیں ہم اسی پر عمل کرتے رہے ہیں، آج کا یہ علمی مذاکرہ اسی سلسلہ کی ایک زریں کڑی ہے، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ان دونوں بزرگوں کی روحیں اس اجتماع سے خوش ہو رہی ہوں گی، وہ اور بھی خوش ہوں گی جب اس مذاکرہ میں مستشرقین کے زہر کا تریاق پورے طور پر پیش کیا جائے گا، جس سے امید ہے کہ پوری اسلامی دنیا بھی آگے چل کر مستفید ہوگی۔

آخر میں ہم ایک بار پھر اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ صمیم قلب سے ادا کرتے ہیں کہ اس دور افتادہ قصبہ میں آنے کی زحمت گوارا کر کے انھوں نے ہمارے ادارہ کو توقیر دی۔"

اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنا استقبالیہ خطبہ زبانی دیا، وہ بول رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت و طلاقت لسانی کا رس گھول رہی ہے، بلاغت چاندی کے سکوں کو کھنکھنا رہی ہے، شیرینی قلاقند کی مٹھاس سے کام و دہن کو لذت آشنا کر رہی ہے، یہ خطبہ عربی زبان میں تھا، لیکن اس کی ساری باتیں اردو میں کہی جا رہی تھیں، یہ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا، اس کا پورا متن تو آئندہ شائع ہوگا، لیکن مستشرقین سے متعلق جو باتیں کہی گئیں، وہ اس وقت ہدیۂ ناظرین ہیں، فرمایا:

"اس بات کا اعتراف ہے کہ مستشرقین میں ایک بڑی اور خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے بڑا مفید کام انجام دیا اور جہاں تک ہمارا اندازہ ہے انھوں نے اپنے علمی شغف، علم کی پیاس، علم کی قدر و قیمت کے احساس کے تحت انجام دیا اور ان کی وجہ سے ہمارے اسلاف کی بعض ایسی

ل تا ہیں ہمارے سامنے آئیں کہ جن کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی
دریں حدیث، تفسیر، علوم عربیہ، سیرت اور تاریخ کا درس دینے والے یہ حسرت لے کر اپنے ساتھ
سے چلے گئے کہ انھوں نے طبقات ابن سعد یا فلاں کتاب نہیں دیکھی تھی، تو ہمیں مستشرقین کے
احسان کو ماننا چاہیے، اور یہی نہیں اگر خاص مستشرقین کا کوئی اجتہاد تھا تو میں ایک مسلمان
ب علم، شمع علم کے ایک پروانہ اور چمن علم کے ایک ادنیٰ خوشہ چیں کی حیثیت سے اسی جرأت،
وضاحت، بلکہ اسی خود اعتمادی کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا جیسا میں اپنے عزیز بھائیوں
مہمانوں کے سامنے اس وقت کر رہا ہوں، لیکن اسی کے ساتھ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے قرآن
یث، سیرت، تمدن اسلام، اسلامی معاشرہ اور پھر اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ ایک خاص
قصد کے ماتحت کیا، ان کی خوردبین نگاہ وہ چیزیں تلاش کرتی رہی جن کو جمع کر دینے سے وہ قرآن،
ریعت اسلامی، سیرت نبویؐ، قانون اسلامی، تمدن اسلامی اور سیاست اسلامی کی ایک ایسی تصویر
ش کر سکیں جس کو دیکھ کر لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں اور ان کو اس سے گھن آئے، یہاں بڑے بڑے
ضلا، موجود ہیں، ہماری بہت سی یونیورسٹیوں کے شعبۂ تاریخ کے صدر اور ذمہ دار موجود ہیں، وہ
انتے ہیں کہ تاریخ و ادب میں اس بات کی کتنی صلاحیت ہے کہ آپ اس سے جو کام لینا چاہیں، لے
سکتے ہیں، دنیا کے بہت کم علوم ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو، یہ مواد خام ہے، آپ اگر اس سے شاہی
حل تعمیر کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں، آپ اگر اس سے غریب کا جھونپڑا بنانا چاہتے ہیں تو بنا سکتے ہیں آپ
گر اس سے شاطرانہ سازش کا مرکز بنانا چاہتے ہیں تو بنا سکتے ہیں، اور اگر بے ادبی نہ ہو تو اگر آپ
ں سے کسی نجاست کی جگہ بنانا چاہتے ہوں تو آپ کو اسی میں یہ سامان بھی مل جائے گا، یہ آپ کی نیت
پر موقوف ہے اور آپ کی محنت پر بھی اور آپ کے سلیقہ و ذہانت پر بھی، اور ظاہر ہے کہ اس سلیقہ اور ذہانت
ہت سے اسباب ہو... جن میں کچھ طبعی، کچھ تاریخی، کچھ مذہبی، کچھ اخلاقی ہیں، کچھ کا تعلق یورپ کی

ریاست اندلس کی آویزش اور پھر آخر میں جنگ صلیبی سے ہے، اس کو تخریبی اور صلیبی ذہانت کہ
بہتر ہوگا، یہ صلیبی ذہانت ہمارے مستشرق فضلاء میں بدرجۂ تمام پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنی
پر خوردبین لگا کر تاریخ اسلام اور تمدن اسلامی اور پھر آگے بڑھ کر نعالکم بدہن قرآن مجید احادیث
میں وہ ذرے اور ریزے تلاش کرنے شروع کیے کہ جن سے کوئی ... جماعت اور کوئی شخص
خالی نہیں ہوسکتی، ان کو جمع کرکے انھوں نے ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہا کہ جو ایک نہایت تاریک
ہی نہیں بلکہ تاریک تاثر اور تاریک جذبہ پیش کرے، ان کی مثال بالکل سینٹری انسپکٹر کی سی ہے
سینٹری انسپکٹر کسی گلزار سے گلزار شہر میں، خواہ اسلامی عہد کا قرطبہ ہو، غرناطہ ہو، بغداد ہو
ہو، یا پھر دلی ہو، احمد آباد ہو، مغلوں کے زمانہ کا لکھنؤ ہو، یا پھر اس وقت کا لندن اور نیویارک
سینٹری انسپکٹر کا کام یہ ہے کہ وہ ان جگہوں کو دیکھے، خاص طور پر جہاں پانی مر رہا ہے، جہاں سڑ
پھیل رہی ہے، جہاں نالیوں کا انتظام صحیح طور پر نہیں ہے، جہاں دلدلیں ہوگئی ہیں اور پھر وہ
پیش کرتا ہے اور اس رپورٹ میں اس کی بے انصافی یا بدنیتی کو دخل نہیں ہوتا، اس کے فرض منصبی
کا تقاضا ہے کہ جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ میں صرف ان
نالیوں، سنڈاسوں اور دلدلوں کا ذکر کرے جو اس گلزار شہر میں مجبوری پائے جاتے ہیں، اس کا
یہ نہیں ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس شہر میں کتنے خوشنما پارک، کیسے کیسے لہلہاتے باغ، کیسی کیسی
کیاریاں ہیں، کیسے کیسے کھلتے ہوئے پھول ہیں اور وہاں پر کیا قدرتی حسن پایا جاتا ہے، وہاں
کیسے کتب خانے ہیں، اگر کوئی سینٹری انسپکٹر اس قسم کی رپورٹ دے تو شاید ہمیشہ کے لیے اسے
چھٹی دے دی جائے، حالانکہ یہ کوئی بری بات نہیں، اگر وہ کتب خانوں اور باغات کا ذکر کرے
لیکن اس کو پیشہ ورانہ اصطلاح میں فضولی ایک دم فضول سمجھا جائے گا، یہ اس کے فرض میں داخل نہیں
افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے مستشرقین نے سینٹری انسپکٹر کا فرض انجام دینا طے کر لیا

وں نے خوردبین ہی سے نہیں بلکہ اپنی قوت شامہ کو بھی صرف تعفن کا ادراک کرنے کے استعمال
، تاریخ اسلامی اور بعثت نبوی سے لے کر زوال خلافت عثمانیہ اور اس کے بعد تک کا مطالعہ
ینٹری انسپکٹر کی حیثیت ہی سے کیا اور انھوں نے صرف گندگی کی رپورٹ پیش کی، ہمیں اپنے مستشرق
بھائیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ہمارے شریک سفر ہیں، ہم اور وہ دونوں بادیۂ علم کے رہ نورد ہیں اور
ہمارا ان سے ایک رشتہ ہے، کاش میری یہ آواز جو یہاں آپ تک گونج کر رہ جائے گی ان تک پہونچ
سکتی تو میں ان سے کہتا کہ خدا نے آپ کو وہ صلاحیتیں عنایت فرمائی تھیں کہ اگر آپ ان سے اچھا
کام لیتے، حسن بیں اور عیب چیں دونوں آنکھوں کو کھلا رکھتے، اپنی قوت شامہ کو آزاد چھوڑ دیتے
اس کو اس کا پابند نہ کرتے کہ آپ صرف تعفن کو سونگھیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو حاسۂ جمال اور ذوق جمال
عطا فرمایا تھا اس کو آپ مسیحیت یا پاپائیت کی تاریخ اور سائنس کی ترقی اور جنگ صلیبی کی داستان لکھنے کیلیے
ہی مخصوص نہ کر دیتے تو آپ یہاں سب کچھ پا سکتے تھے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

یہاں تو کلیوں کو دیکھا ہی نہیں گیا، یہاں تو صرف کانٹوں کو تلاش کیا گیا اور میں دعویٰ نہیں کرتا، علم کا تقاضا
ہے کہ کوئی کلیہ کے طور پر کسی بات کا دعویٰ نہ کرے، لیکن یہ کہنا صحیح ہے کہ مستشرقین کی ایک بیشتر تعداد نے اور
کم سے کم اس تعداد نے جو ہمارے سامنے ہے اور عالم اسلام کے سامنے جس کا تعارف ہوا، اپنی خوردبین سے
تاریخ اسلام، حدیث اور علوم اسلامیہ، تمدن اسلامی اور اسلامی حکومتوں میں صرف عیب ہی عیب دیکھا،
اسلام میں جمال بھی ہے، کمال بھی ہے اور زوال بھی ہے، مستشرقین نے تینوں چیزوں کو نظرانداز
کر کے صرف معائب، صرف کمزور پہلو پیش کیے۔ میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا
اور نہ آپ اس کے لیے تیار ہوں گے، لیکن مستشرقین حضرات میں کئی بڑے نام ابھی
علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اقتباس میں آ چکے ہیں، اور میرے خطبہ میں

اس کا پورا جائزہ لیا گیا ہے۔ استشراق اور مستشرقین پر ایک عام نگاہ ڈالی گئی ہے
تمام مغربی ممالک میں ان کے رویہ ان کے ایٹی چوڈ کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی جو
چیزیں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم اپنے
اصل سرچشموں سے واقف نہیں ہے اور اس کو خدا کی رہنمائی، تائید الٰہی اور
توفیق الٰہی شامل نہیں ہے تو وہ ان مستشرقین کی کتابوں کو پڑھ کر صرف ایک
خیال قائم کرے گا، جیسا کہ علامہ شبلیؒ نے کہیں لکھا ہے کہ اسلام قصائیوں کی ایک
دوکان ہے، جس میں ہر وقت چھریاں چلا کرتی ہیں، یا ایک میدان جنگ ہے،
جس میں انسانوں کو شکار کیا جاتا ہے، یا ایک عشرت گاہ ہے، جس میں صرف
حرم سرا نظر آتی ہے، حرم کے لفظ کو مستشرقین نے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا
خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے، میرے فاضل اور محقق دوست علامہ بہجت البیطار نے کہا
کہ جب میں امریکہ گیا تو ہر پڑھا لکھا امریکن۔۔۔۔ دو باتیں پوچھتا تھا، تمہارے
حرم سرا میں بیویاں کتنی ہیں اور تمہارے گھر میں اونٹ کتنے پلے ہیں؟ گویا مسلمان کا تخیل
یہ ہے کہ اس کی متعدد منکوحات کا ایک حرم سرا ہونا ضروری ہے، اور دوسری بات یہ کہ
اونٹ نہایت مقدس جانور ہے، قرآن شریف میں اس کا بار بار نام آیا ہے اور آنحضرتؐ نے
اس پر سفر کیے ہیں، اور مکہ سے مدینہ اسی پر ہجرت ہوئی ہے اس لیے اونٹ پالنا ایک مقدس
کام ہے، اس لیے ہر مسلمان جس طرح حج کرتا ہے اور تسبیح پڑھتا ہے، اسی طرح وہ اونٹ
بھی پالتا ہے، آپ خیال فرمائیے کہ ان مستشرقین نے کیا معلومات دیں، یہ اپنے کو حقیقت پسند
اور صداقت کا جویا کہتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی زندگی کا کیا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

مجمع الشعرای جہانگیر شاہی تالیف ملا قاطعی ہروی، تصحیح تعلیق و مقدمہ ڈاکٹر

تر سائز ۲۲×۱۸، صفحات ۴۰۴، طباعت ٹائپ، قیمت ۲۰۰ روپے پاکستانی ناشر انسٹی ٹیوٹ

ا اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی، کراچی،

ہروی (م ۱۰۲۴ھ)، عہد مغلیہ کا صاحب کمال شخص تھا، وہ تین مغل فرمانرواؤں ہمایوں، دربار وں سے متوسل تھا، تذکرہ مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی اسکی اہم علمی یادگار ہے، مگر یہ اس کی نگاروں کی طرح ابھی تک دسترس سے باہر تھی، اتفاق سے فیڈرل اسٹریلیا یونیورسٹی کینبرا کے شعبہ سے منسلک ڈاکٹر محمد سلیم اختر کو اپنے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں اس کا سراغ لگا تو ل لاہور میں اس پر ایک تعارفی مقالہ سپرد قلم کیا، اس سے قدر دانوں کا اشتیاق بڑھا تو کراچی ٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز نے ان کے تعاون سے یہ تذکرہ شائع کیا ہے ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ، تعلیقات اور حواشی پر بھی مشتمل ہے، یہ کتاب تین دفتروں پر مشتمل تھی متداد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ گئے، ڈاکٹر محمد سلیم کو آخری اور تیسرا دفتر آکسفورڈ یونیورسٹی کے ذلی کے ذخیرۂ مخطوطات میں دستیاب ہوا، زیر نظر کتاب میں اسی حصہ کا متن درج ہے، اس میں ہ ہے پہلا تذکرہ جہانگیر کا اور آخری خود مصنف کا ہے گو قاطعی نے قدیم تذکرہ نگاروں کی طرح لات فضل و کمال اور نمونہ کلام دینے پر اکتفا کیا ہے، مگر اس سے بھی تحقیق کرنے والوں کے لیے ہ میں ایران اور پاکستان کے علمی روابط، قاطعی کے دور کے علمی حالات، اس کی تذکرہ نگاری

فروگذاشتوں اور ترتیب کی خامی وغیرہ کی نشاندہی بھی ہے، فاضل مستشرق اسٹوری کو اس کے بارہ میں نام سے دھوکہ ہوا، ان کے خیال میں یہ صرف جہانگیر کی مدح کرنے والے شعراء کا تذکرہ ہے، لیکن لائق مقدمہ نگار نے اسکی اس طرح تردید کی ہے کہ یہ نام عہد جہانگیری میں مرتب کئے جانے کی وجہ سے رکھا گیا ہے، ورنہ اس میں جہانگیری دور سے قبل کے شعراء کا بھی ذکر ہے، آخر میں قاطعی کے حالات، شاعری کا انتخاب، اس پر مختصر تبصرہ اور بعض شہروں کے ان اہل کمال کا ذکر ہے جن سے وہ ملا یا مستفید ہوا تھا، لیکن یہ حصہ اس وجہ سے مختصر ہے کہ قاطعی کے حالات نہیں ملتے، متن کے بعد تعلیقات درج ہیں، ان میں اس کے مجمل، ناکافی اور وضاحت طلب امور کی وضاحت اور ان مراجع کی نشاندہی کی ہے جن میں مزید معلومات تحریر ہیں، حواشی میں دوسری کتابوں کی مراجعت کرکے متن کی تصحیح اور فرق و اختلاف کی صراحت کی ہے، پھر کئی فہرستیں، مستدرکات و اضافات اور اغلاط کا صحت نامہ دیا گیا ہے اور آخر میں مقدمہ کا مختصر خلاصہ انگریزی میں بھی تحریر ہے، مقدمہ و تعلیقات سے مصنف کی محنت، جستجو کے علاوہ فارسی زبان و تحریر پر اچھی قدرت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اس کتاب کی دریافت و اشاعت پر مرتب اور ناشر دونوں اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں،

تفسیر بسم اللہ و سورہ فاتحہ — از مولانا حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۰ ۸، قیمت دو روپے پچاس پیسے، پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ (یوپی)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر نظر رسالہ کا شگفتہ اردو ترجمہ عرصہ ہوا ان کے لائق شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نے کیا تھا، اب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، آیت بسم اللہ کی تفسیر میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورتوں سے اس کا تعلق دکھانے کے بعد اس کے عظمت، برکت اور سند پر مشتمل ہونے کی وضاحت کی ہے کہ وہ آغاز قرآن کے لیے موزوں ترین کلام ہے، جو اللہ کی یاد کے دین کی بنیاد ہونے اور تمام فضل و احسان اور کل قرآن مجید کے خدا کی جانب سے ہونے کا ثبوت بھی ہے، رحمان رحیم اور اللہ کے الفاظ کی وضاحت میں یہود

و نصاریٰ کی بعض بے اعتدالیوں کا ذکر ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر دو فصلوں میں کی ہے، پہلی فصل میں اس کے یہ تین رخ بیان ہوئے ہیں (۱) قرآن کے نرگانہ علوم کی جامع اور تکمیل نماز کی سورہ ہے۔ (۲) نظم قرآن کا نمونہ ہے، اس کے اندر قرآن کا پورا عالم جھلک رہا ہے۔ (۳) سورۂ فاتحہ کا سارے قرآن پر مقدم ہونا نماز کے تمام احکام میں اہم ہونے کی دلیل ہے، دوسری فصل میں مسلمانوں کی فاتحہ اور نصاریٰ کی فاتحہ کا مقابلہ کر کے دونوں کی بلحاظ معانی اور قرآن کے اسلوب کی برتری دکھائی ہے مولانا کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ بھی حقائق، معارف، نکات اور دقیق علمی و فکری استنباطات سے معمور اور ان کی قرآن میں غواصی کا ثبوت ہے اسلئے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

(۱) حقوق و معاملات (۲) نماز کے احکام و مسائل (۳) احوال قیامت } مرتبہ جناب مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری کاغذ کتابت و طباعت بہتر تقطیع متوسط و خورد صفحات بالترتیب ۲۶۴، ۱۸۳، ۶۲، قیمت بالترتیب دس، تین، اور ایک روپیہ ۲۵ پیسے اول الذکر دونوں کتابیں مصنف پوسٹ مقام بڑھنی بازار، ضلع بستی سے اور تیسری تبلیغی کمیٹی شاہ گنج، شرپور، پٹنہ سے ملیگی۔

مولانا عبدالرؤف رحمانی ایک ممتاز عالم دین ہیں، دین اور علم دین کی ترویج و اشاعت ان کا مشغلہ ہے مدرسہ سراج العلوم عرصہ سے انکے زیر نگرانی دینی و تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، وہ مختلف رسالوں اور اخبارات میں دینی و تبلیغی قسم کے مضامین بھی برابر لکھتے رہتے ہیں اور ان کی کئی مفید کتابیں بھی چھپ گئی ہیں، یہ تینوں کتابیں اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، پہلی کتاب میں حقوق و معاملات پر مفید بحث اور دین میں اخلاق حسنہ اور معاملات میں صفائی کی اہمیت و ضرورت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں شریعت کی ہدایات رسول اکرمؐ صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین کے معمولات کا ذکر بھی ہے، نیز قرابتداروں، یتیموں، مہمانوں، علماء، عادل سلاطین، غلاموں، غیر مسلموں، جانوروں، پڑوسیوں، والدین، اولاد اور زوجین کے حقوق پر مستقل عنوانات کے تحت علیحدہ گفتگو کی گئی ہے، لائق مصنف نے جہاں قرآن و احادیث کے احکام، صحابہ و تابعین کے آثار، ائمہ دین کے زریں اقوال نقل کیے ہیں وہاں مختلف موثر واقعات بھی تحریر کیے ہیں جن سے حقوق و معاملات کی دینی اہمیت کے علاوہ پڑھنے والے کو انہیں ادا کرنے کا شوق و داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے، غالباً اسی بنا پر بعض روایات و واقعات کے انتخاب میں

تساہل سے کام لیا گیا ہے مثلاً ص ۳۰ پر حدیث طیر درج ہوگئی ہے جو ایک موضوع روایت ہے ص ۱۰۰ کے بعد آٹھ صفحے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور ص ۲۰۰ کے بعد کے آٹھ صفحے مکرر شامل ہوگئے ہیں، دوسری کتاب میں نماز اور اسکے متعلقات وضو، اذان، جماعت، امامت اور مسجد کے مسائل و احکام درج ہیں، اس میں پنجوقتہ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل، تراویح، وتر، جمعہ، عیدین، جنازہ، استسقاء، مریض اور مسافر کی نمازوں کا بیان بھی ہے، نماز کے ضروری آداب، ارکان، اعتدال، خشوع و خضوع کے علاوہ فرض نمازوں اور جماعت ترک کرنے والے کے احکام لکھے ہیں اور صحابہ و تابعین، محدثین اور ائمہ کے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے اور نوافل کا اہتمام کرنے کا حال بھی دیا ہے، اس مختصر رسالہ سے نماز اور اسکے سلسلہ کے اکثر اہم اور ضروری مسائل معلوم ہو جاتے ہیں مگر جن نمازوں کو پڑھنے کا کم اتفاق ہوتا ہے اگر انکی دعائیں اور طریقے واضح انداز میں لکھ دئے گئے ہوتے تو اسکا فائدہ اور بڑھ جاتا، ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے، اگر مختلف فیہ مسائل میں انکے مسلک کا ذکر بھی آجاتا تو بہتر ہوتا، تیسری کتاب میں قیامت کے احوال، نظام عالم کے تہ و بالا ہونے، حشر و نشر، جنت و دوزخ، اور اہل جنت و اہل جہنم کے انجام اور قیامت کی ہولناکی وغیرہ کا ذکر ہے، یہ تینوں رسالے عام فہم انداز اور دلنشین پیرایہ میں لکھے گئے ہیں، عام مسلمانوں کیلئے انکا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ،

نام مقام اشاعت :- دار المصنفین اعظم گڈھ۔

نوعیت اشاعت :- ماہانہ

نام پرنٹر :- اقبال احمد

قومیت   ہندوستانی

پتہ   دار المصنفین اعظم گڈھ

نام پبلیشر   "   "   "

اڈیٹر   سید صباح الدین عبد الرحمن

قومیت   ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ   دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں،   اقبال احمد

جلد ۱۲۹ . ماہ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۲ء . عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل ہماری پارلیمنٹ میں منظور کر لیا گیا، اخباروں میں اس کی تفصیل شایع نہیں ہوئی صرف اتنا معلوم ہوا کہ حزب مخالف اس سے خوش نہیں تھا، اور بعض مسلمان ارکین کو اس سے مایوسی ہوئی۔

اس بل کو صحیح طور سے ماہرین قانون ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر اس سے خوشی ہوئی کہ اس میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کو مسلمانوں نے قائم کیا، یہ ان کی مرضی کا تعلیمی ادارہ ہے اور یہ ان کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے ہے، مگر اس کی بھی صراحت ہے کہ اس کا دروازہ ہر مذہب و فرقہ کے لیے کھلا رہے گا، اور ایسا ہونا بھی چاہیے، اس بل میں کہیں اقلیتی کردار (مائی نوریٹی کیرکٹر) جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے، جو مسلمانوں کا اصلی مطالبہ تھا، ریاستی حکومتوں کی طرف سے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے اقلیتی کردار کو تسلیم کر لیا گیا ہے، لیکن معلوم نہیں ہماری مرکزی حکومت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرنے میں کیوں حساس اور محتاط واقع ہوئی ہے، اس سے اس بل سے متعلق بعض حلقوں میں اب بھی سوء ظن ہے، اقلیتی کردار ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا جا رہا ہے، ماہرین قانون اپنی ماہرانہ تعبیر سے اس کے مفہوم کو جیسے کچھ بھی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس بل میں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو صاف اور واضح الفاظ میں تسلیم نہیں کیا گیا ہے، تو مستقبل میں اس کی تعبیر کس طرح کی جائے [illegible] [illegible]

اس بل کا خوش آیند پہلو یہ ہے کہ یونیورسٹی کا کورٹ [illegible] یونیورسٹی کے تعلیمی شعبوں کے صدر، پروفیسروں، پرنسپلوں، ریڈروں، لکچروں، غیر تدریسی [illegible] طلبائے قدیم [illegible] صنعت، تجارت، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، پارلیمنٹ، مسلمانوں کے ثقافتی اور علمی اداروں، اردو زبان کے اداروں، وقف بورڈ اور طلبہ کے نمایندوں وغیرہ کو ملا کر ایک سو چھیاسٹھ (۱۶۶) کر دی گئی ہے، ان میں کچھ کو وزیٹر، ریکٹر اور چانسلر نامزد کریں گے، پارلیمنٹ کے ارکین کا انتخاب خود پارلیمنٹ میں ہوگا، طلبائے قدیم اور عطیہ دہندگان اپنے اپنے نمایندے منتخب

کریں گے۔ طلبہ کی یونین [illegible] منتخب [illegible] جن کی وجہ سے ان کے [illegible] ہو جائیں گے۔ یونین کی مجلس انتظامیہ نامزد کرنے کی بجائے گویا اب طلبہ کا انتخاب بالواسطہ ووٹوں سے کریں گے، اساتذہ اور دیگر عملے کے نمائندے بھی اپنے اپنے حلقوں کے ووٹوں سے منتخب کیے جائیں گے، بقیہ اراکین کا انتخاب کورٹ کی طرف سے ہوگا۔

اس طرح یہ کورٹ یونیورسٹی کی باضابطہ منتخب شدہ [illegible] کی ایک جمہوری پارلیمنٹ میں تبدیل ہو گیا ہے، خدا نہ کرے کہ اس کے اراکین کے انتخاب میں وہی کشمکش اور کشاکش نہ پیدا ہو جائے جو جمہوری طرز کے انتخاب میں ہوا کرتی ہے، تجربہ یہی ہے کہ جمہوری طریقہ انتخاب سے اچھے افراد کم آتے ہیں، اس لیے انتخاب کے بعد ایسے جمہوری ادارے بھڑوں کے چھتے بن جاتے ہیں جس کے اندر سے گروپ بندی، نفاق پروری، مفاد پرستی اور باہمی آویزش کی آتشیں پھوٹ کر باہر نکلتی رہتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے جمہوری انتخاب میں ان لوگوں کی بھی نمائندگی ہوتی ہے جن کو مسلمانوں کے تعلیمی مفاد، ان کے علوم و فنون کے فروغ اور یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد اور نصب العین سے مطلق دلچسپی نہ ہو، خدا کرے یہ احتمالات غلط ثابت ہوں۔

یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ میں طلبہ کے یونین کا صدر، دو پوسٹ گریجویٹ طلبہ، ایک ریسرچ اسٹوڈنٹ اور ایک انڈر گریجویٹ بھی اس کے ارکان ہوں گے جن کا انتخاب طلبہ خود کریں گے، یونیورسٹی کی کورٹ اور مجلس انتظامیہ میں طلبہ کو جو قانونی نمائندگی دی گئی ہے اس سے امید ہے کہ وہ مطمئن ہو کر اچھی تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتے رہیں گے، طلبہ [illegible] آنے پائے گا۔

[illegible] نہیں ہے کہ یہ [illegible] سرسید مرحوم [illegible] کی مانند [illegible] دیں اور گرم کے منہ میں ہاتھ دے دیا، ان کا خیال ان ہی کے الفاظ میں یہ [illegible] بچے [illegible] آسمان کے تارے توڑ لائیں مگر مسلمان نہ رہیں تو ہم کو کیا؟ امید کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اس ایک فقرے کے پیچھے اپنے اس ادارہ کے بانی کی نصیحت کی ایمانی روح [illegible] بل یونین کی بھی [illegible] ہے کہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کو اچھی تعلیم [illegible] سرگرمیوں کو فروغ دینے کا حق ہے کیا یہاں کے

طلبا کی تعلیم [illegible] سرگرمیاں ہم آہنگ نہیں ہو سکتی ہیں کیا یہاں سے طلبہ کو علوم طبیعیات، ریاضیات، سائنس، نفسیات، معاشیات، تاریخ، فلسفہ اور جغرافیہ کی تعلیم [illegible] نہیں دی جا سکتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے ہر قسم کے تغیرات سے متمتع ہوں اور دین کی بنیادی [illegible] پہونچے، اس کی ذمہ داری یہاں کے اساتذہ پر آتی ہے، اسلامی [illegible] اور موجودہ دور کے مادی تقاضوں کے درمیان ایک کشاکش جاری ہے جس کو مسلمان طلبہ ایک [illegible] ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں وہ مسلمان بنا چاہتے ہیں لیکن دنیا سے منہ موڑ کر زندگی بھی بسر کرنا پسند نہیں کرتے

ان طلبہ کے جذبات اور احساسات کا صحیح اندازہ ان کے اساتذہ ہی کر سکتے ہیں ذہنی، فکری اور عملی کاوشوں کو [illegible] کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی [illegible] سے آشنا کرنا چاہیں اگر اس یونیورسٹی میں ایسی تعلیم نہیں ہوتی جہاں کے مسلمان طلبہ خالصتاً اپنے نقطۂ نظر کو اپنے حال [illegible] تو پھر اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کیا فرق رہیگا، یہ موجودہ دور کے ذریعے ہر قسم کی سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کا [illegible] ایک بڑے [illegible] کے بے شمار افراد کی درسگاہ سمجھی جائیگی یہاں کے اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ کی بے راہ روی پر ان کو مطعون کرنے کے بجائے ان میں افکار کی بلندی اور کردار کی خوبی ایسی پیدا کریں کہ وہ جو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین حیات طیبہ اسلامیہ کے حامل اور رحمۃ للعالمین کے نام لیوا ہیں اپنے وطن اور اہل وطن کیلئے مثال اور رحمت کا کام دیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک قومیت اور اسلامیت میں کوئی تناقض نہیں ہے [illegible] دونوں میں تناقض [illegible] دونوں [illegible]

موجودہ وائس چانسلر جناب سید حامد کا دور کچھ زیادہ ہنگامہ خیز نہیں رہا لیکن ان کا زمانہ بھی یاد کیا جائیگا کہ ان کے عہد میں مسلم یونیورسٹی [illegible] بل منظور ہوا جس سے [illegible] حیثیت سے مسلمان زیادہ خوش نہیں، جناب سید حامد صاحب ایک چھوٹی سی مملکت کے حکمراں [illegible] حکمراں کو آج [illegible] [illegible] ایک شفیق [illegible] [illegible] شکر [illegible] اور [illegible] ہے اس کی حفاظت کرتا ہے اور [illegible] حکمراں [illegible] قانون کی پاسداری کا [illegible] رکھنے کے ساتھ ہر حال میں [illegible]

ان سطروں کے لکھتے وقت جناب نواب صاحب چھتاری کی رحلت کی خبر ملی، ان کی [illegible] شرافت، رتبہ، متانت، وقار، دینداری، وضعداری، فراخدلی، رواداری، سیرچشمی اور ہر دلعزیزی کا ایک صحیفہ ختم ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی تمام نعمتوں سے سرفراز رکھا، دعا ہے کہ آخرت میں بھی وہ برکت خداوندی کے کوثر و تسنیم سے سیراب ہوتے رہیں، آمین

۲۱، ۲۲، ۲۳ فروری [illegible] کو دارالمصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" پر جو بین الاقوامی سمینار ہونے والا ہے اس کی تیاریاں جاری ہیں، امید یہی ہے کہ یہ ہر طرح کامیاب ہوگا۔ آمین۔

مقالات

"زندہ رود"

ڈاکٹر محمد اقبال پر ایک دلآویز کتاب

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے فرزند ارجمند کی کتاب "زندہ رود" کی پہلی جلد پر راقم نے جون سنہ ۱۹۸۱ء کے معارف میں بہت ہی لطف و لذت کے ساتھ ایک تبصرہ لکھا تھا، اس کی دوسری جلد موصول ہوئی تو اس کو کئی بار شوق سے پڑھا، اور ہر بار پڑھنے میں یہ محسوس ہوا کہ یہ روایتی قسم کی سوانح نگاری نہیں، یا شعر و ادب پر ایک رسمی تبصرہ بھی نہیں، بلکہ حقیقت و واقعیت کا ایک تختۂ بہار ہے، جس پر رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں، یہ اس کتاب کے لائق مرتب کے انداز بیان اور تصنیفی خوش سلیقگی کی خوبی ہے۔

اب تک ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے سوانح حیات اور کلام پر معلوم نہیں کتنی کتابیں نکل چکی ہیں، زیر نظر کتاب کا بھی یہی موضوع ہے، اس میں بہت سی باتیں تو ایسی ہیں جو اور کتابوں سے لی گئی ہیں، لیکن اسی پرانی شراب میں اس کے مصنف نے اپنے خیالات کی مے ارغوانی سے دو آتشہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے، اس میں اجمال اور تفصیل کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ یہ پُر از معلومات بھی ہے، پُر کیف بھی، دلچسپ بھی اور لائق غور و فکر بھی، اس کا وصف یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے جزوی واقعات، ان کے ذاتی خیالات اور ان کے اشعار کے نظری و فکری افکار کے ساتھ اس زمانہ کے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے سیاسی واقعات کے

اس طرح سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ کتاب روایتی اور رسمی انداز کی نہیں، اس لیے اس پر تبصرہ بھی اس انداز کا نہیں ہونا چاہیے، اس کے خاص خاص واقعات کو پڑھنے میں ایسی لذت محسوس ہوئی کہ ان کو معارف کے ناظرین تک پہونچانے میں قلم بے اختیار ہوگیا ہے، اس لیے یہ تبصرہ کے بجائے مستقل ایک مقالہ بن گیا ہے، راقم اس طرح اپنے کاوہ کاٹنے اور اپنے قلم کے چھلاوہ پن کے لیے معذرت خواہ ہے۔

پہلی جلد ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ابتدائی دور پر مشتمل تھی، اس دوسری جلد میں ان کی حیات کے وسطی دور کی تفصیلات ہیں، اس کے ابواب کا تسلسل پہلی جلد کے ساتھ رکھا گیا ہے، جو ساتویں باب پر ختم ہو گئی تھی، اس لیے زیر نظر کتاب کا آغاز آٹھویں باب سے کیا گیا ہے، جس کا عنوان "فکر معاش" ہے، ڈاکٹر صاحب جب یورپ سے واپس آئے تو بیرسٹری شروع کی، مگر اپنے اس پیشہ کی آمدنی سے مطمئن نہ تھے، گو ان کا خود بیان ہے کہ ان کو اپنے لیے مالی نقطۂ نظر سے غور کرنے میں دلی کراہت ہوتی رہی، وہ چاہتے تو ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ یا گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہو سکتے تھے، مگر ان کا خیال رہا کہ سرکاری ملازمت سے قوت عمل کے سلب ہونے کا احتمال تھا ان کی نظر حیدرآباد کی مسلم ریاست کی طرف اٹھی، جہاں رہ کر مالی فارغ البالی اس لیے چاہتے تھے کہ وہ اپنی قوت فکر کا رخ موڑ سکیں، ان کی روح کی گہرائیوں میں یہ احساس مضطرب تھا کہ ان کا اصل مقدر شعر کے ذریعہ ایک نیا پیغام عالم اسلام تک پہونچانا ہے، اس کے لیے انھوں نے حیدرآباد دکن کا سفر بھی کیا، گو وہاں ان کے پیش نظر کوئی خاص ملازمت نہ تھی، مہاراجہ سرکشن پرشاد کی نوازش کریمانہ اور وسعتِ اخلاق، سر اکبر حیدری اور دوسرے اکابر کی پذیرائی کے باوجود وہاں یہ صورت ممکن نہ ہو سکی، مصنف کا خیال ہے کہ اگر نظام اس وقت کوئی مناسب منصب پیش کرتے تو وہ قبول کر لیتے، اگر ان کو وہاں وہ مالی اطمینان حاصل ہو جاتا جس کی ان کو ضرورت تھی تو شاید صنعت شاعری اس سے زیادہ مالا مال ہوتی جتنی کہ ہو سکی، اس زمانہ میں فکر معاش کے سلسلہ میں انھوں نے جو ذہنی کرب و اضطراب کا دور گذارا، اس کا بڑا اچھا تجزیہ اس باب میں ہے، لائق مصنف نے اس کی خشکی میں ڈاکٹر صاحب کی

ش طبعی، دوست نوازی، مجلس آرائی، معاصر اکابر کے تعلقات کی رنگا رنگی، قومی کاموں سے دلچسپی، انجمن
ایت اسلام لاہور کے جلسوں میں نغمہ سرائی اور شعر و ادب سے ہم آغوشی کی پُر از لطف تفصیلات سے
لینی پیدا کر دی ہے۔ ان کے کردار کا یہ بھی روشن پہلو ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد ان کے ایسے
ردیدہ ہوئے کہ انھیں فکر معاش سے نجات دلانے کے لیے ان کے شایان شان وظیفے کی پیش کش کی،
گر انھوں نے اس لیے اس کو منظور نہیں کیا کہ ان کے خیال میں یہ بات مروت اور دیانت کے خلاف ہوتی
کہ وہ ایک بیش قرار تنخواہ پائیں اور اس کے عوض وہ کوئی ایسی خدمت نہ کر سکیں جس کی اہمیت بقدر اس
مشاہرہ کے ہو (ص ۱۹۸) حیدر آباد کے سفر میں معتدد شخصیتوں کے علاوہ نظم طباطبائی، غلام قادر
گرامی، جلیل حسن جلیل مانک پوری اور ظہیر دہلوی سے ان کی جو ملاقاتیں ہوئیں وہ شعر و ادب کی بڑی
دلچسپ کہانی ہے جس کو قلمبند کرنے میں مصنف نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

حیدر آباد ہی کے سفر میں انھوں نے گولکنڈہ کے قعب شاہی بادشاہوں کے مقبروں کو جا کر دیکھا
تو اپنی وہ نظم لکھی جو "گورستانِ شاہی" کی سرخی کے ساتھ "بانگ درا" میں ہے، مہاراجہ سرکشن پرشاد کی تعریف
میں ایک قصیدۂ "شکریہ" کے عنوان سے تحریر کیا لیکن ان کے کسی مجموعہ میں یہ نظم نہیں آیا، اسی باب میں
ان کی نظموں میں سے "پیام عشق"، "بلاد اسلامیہ"، "فلسفۂ غم"، "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر"
"... کی گود میں بلی دیکھ کر" "شکوہ"، "ترانۂ ملی حضور رسالتمآب میں"، "شمع اور شاعر" اور "جواب شکوہ" کا ذکر کر کے
یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کن حالات میں یہ نظمیں لکھی گئیں، جن سے ان کے پڑھنے میں اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے
پھر "بانگ درا" کی ہر نظم سے متعلق یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کے متعلق بھی اس کی وضاحت ہو جاتی
کہ اس کے لکھنے میں کیا عوامل کارفرما ہے، مصنف نے اپنے آئندہ ابواب میں بہت کی نظموں سے
متعلق ایسی وضاحت کر دی ہے۔

اس باب میں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی ملی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی سرگرمیوں کی بھی تفصیل ہے،

جس کا [illegible] اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سرگرمیوں کی نوعیت ایسی رہی جیسے بھرے ہوئے دودھ کے پیالے کے اوپر گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی رہتی ہیں، ایسے کاموں سے ان کو دلچسپی ضرور رہی، لیکن جہاں اور جب ان کا دامن کانٹوں سے الجھتا ہوا نظر آیا، فوراً اس کو سمیٹ لیا، وہ کسی سے متصادم یا برسرپیکار نہیں ہوئے، یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت برابر قائم رہی، ۱۹۱۱ء آتے آتے وہ مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر چکے تھے۔

اس باب سے پہلی دفعہ راقم کے ساتھ دارالمصنفین والوں کو معلوم ہوا کہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہوا تو یہ طے ہوا کہ اس میں ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے مولانا شبلیؒ ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالنے کی رسم ادا کریں، اس کی تفصیل مصنف نے جس خوش سلیقگی سے لکھی ہے، اس کے مطالعہ سے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ اس زمانہ کے اکابر کی عزت و توقیر کا بھی نقش دل میں بیٹھ جاتا ہے، اس موقع پر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، سر آغا خان، سید حسین بلگرامی، خواجہ کمال الدین، سید سجاد حیدر اور ملک کی دوسری شخصیتیں موجود تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اس اجلاس کی تیسری نشست کی صدارت کی، خواجہ کمال الدین نے اپنی ایک تقریر "اسلام اور علوم جدیدہ" کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"کہاں ہے تو ڈاکٹر اقبال! خدائے تعالیٰ تجھے دین و دنیا میں با اقبال کرے، تیرے نادر قوائے ذہنیہ کی دنیا کی نظر سے چھپے ہوئے ہیں، وہ ذہنی قابلیتیں اور استعدادیں ہیں کہ ان کا ٹھیک استعمال بقائے دوام کا تاج تیرے سر پر رکھ سکتا ہے، لیکن یہ خاص اخاص قویٰ تجھے اس لیے عطا نہیں ہوئے کہ تو فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ کا مصداق ہو کر ایک بے ثمر باغ میں جس کا نام شاعری ہے گلگشت کرے، اب وقت ہے، اٹھ! اور حقیقی تلمیذ الرحمٰن بن! عالم سفلی کو چھوڑ اور طائر قدس ہو جا .... وہ ہار جو قوم تیرے گلے میں ڈال رہی ہے اور تو اس کا حقیقی طور پر مستحق ہے وہ ان گلہائے فردوس بریں کے مقابل کیا حقیقت رکھتے ہیں جو خدمت قرآن

تیز سے تیز وقت کر سکتی ہے، قوم تجھے ملک الشعراء بنانا چاہتی ہے اور وہ ایسا کرنے میں غلطی پر نہ ہوگی۔ تو پست ہمت ہوگا اگر اس پر قانع ہوا۔ میں تجھ میں رازی اور غزالی کا پیوند دیکھنا چاہتا ہوں"

اگر خواجہ کمال الدین لمبی عمر پاتے تو وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات سے ان کی جو امیدیں تھیں، وہ پوری ہوئیں، جس نشست میں علامہ شبلیؒ نے ان کے گلے میں ہار پہنایا، اس کی صدارت شاہ سلیمان پھلواروی نے کی، جنھوں نے اس تقریب کے سلسلہ میں فرمایا:

"اقبال صاحب کے لیے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے، اور ہمیں بھی بڑی مسرت ہے کہ اس جلسہ میں انھوں نے علامہ شبلیؒ کے مقدس ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے۔ نام بھی مبارک، کام بھی مبارک، پھولوں کا ہار بھی مبارک، اور ہار ڈالنے والے کا دست کرم بھی مبارک۔"

خود علامہ شبلیؒ نے ہار پہنانے سے پہلے یہ فرمایا:

"یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں، اس کو محض تفریح نہ تصور کرنی چاہیے، ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی...... یہ عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے، ان کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے، اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔"

یہ واقعہ حیات شبلیؒ میں درج نہیں، شاید اس کے مصنف استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذہن سے اتر گیا ہو، لائق مصنف نے اس کی تفصیل لکھ کر علامہ شبلی کے پرستاروں کو اپنا ممنون کرم بنایا۔ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے ساتھ دارالمصنفین والوں کو ڈاکٹر صاحبؒ سے جو والہانہ محبت رہی وہ غالباً غیر شعوری طور پر اسی عقیدت کی کڑی ہے جو علامہ شبلیؒ سے شروع ہوئی۔

اس موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے جو تقریریں کیں وہ اس لیے اہم ہیں کہ ان کے بنیادی خیالات و افکار معلوم ہوں گے جو اس وقت سے ان کی آخری زندگی تک ان پر حاوی رہے، ان تقریروں کو یکجا کر کے مصنف نے ڈاکٹر صاحب کی

سمجھنے اور سمجھانے میں مفید خدمت انجام دی ہے۔ "اسلام اور علوم جدیدہ" پر خواجہ کمال الدین کی تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے جو کچھ کہا اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام اصولوں کا سرچشمہ ہے، لیکن ڈی کارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں، جن کے فلسفہ کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے۔ لیکن ڈی کارٹ کا میتھڈ امام غزالی کی 'احیاء العلوم' میں موجود ہے۔ ان دونوں میں اس قدر تطابق ہے کہ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈی کارٹ عربی جانتا تو ہم ضرور اعتراف کرتے کہ وہ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے، راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا، جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے بعینہ وہی اعتراض امام فخرالدین رازی نے بھی کیا تھا، مل کے فلسفہ کے تمام بنیادی اصول شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب 'شفا' میں موجود ہیں، غرض کہ تمام وہ اصول جن پر علم جدیدہ کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں، بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو"

ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے ان ہی خیالات کو اپنی کتاب 'اسلام کی تشکیل جدید' (Reconstruction of Islam) میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس کے بعد ایسے اہل قلم کے اس دعویٰ کی تردید ہوگئی جو یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے افکار اس اور اُس یورپی فلسفی سے مستعار ہیں۔ جب علامہ شبلیؒ نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا تو انھوں نے یعنی ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑی بلند آہنگی سے فرمایا:

"میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے، اور جو مشن اسلام اور ہماری قوم کا ہے، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا، شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی، اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی، اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے، اپنی نظموں کے ذریعہ سے قوم کو پہونچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی۔"

یہ تقریر [illegible] کی ہے، اس میں جس خواہش کا اظہار ڈاکٹر صاحبؒ نے کیا تھا، وہ الحمد للہ پوری ہوئی، یورپ میں تعلیم پانے کے باوجود خالص سلفی بن کر اپنی شاعری میں اسلامی روح کی ترجمانی پوری کامیابی کے ساتھ کی، اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بیسویں صدی میں مسلمانوں کو جن مصلحین نے نشأۃ ثانیہ عطا کی ان میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے، اس کی تفصیل ڈاکٹر جاوید اقبالؒ نے زیرِ نظر کتاب میں بڑی خوش سلیقگی سے پیش کی ہے.

اس موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ کہنا بھی غور طلب ہے:

"جب کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات پر بھی ہمیشہ ہوا کرتا ہوں"

اس طرح بعض لوگوں کی نظر میں یہ شاعرِ مشرق اور فلسفیِ اسلام بدعتی بھی رہا.

دوسرا باب 'ازدواجی زندگی کے بحران' کے عنوان سے ہے، ڈاکٹر صاحبؒ کی زندگی کے پاؤں کے چھالوں میں بہت سے کانٹے پڑے، ان کو ان کے فرزند ارجمند جناب جاوید اقبال نے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں، اس باب میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں جن پر مصنف مشرقی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے پردہ ڈال سکتے تھے، لیکن انھوں نے مغربی طرز کی معروضیت اختیار کر کے ایسی تمام باتوں کو زیرِ بحث لا کر ایک بڑی اچھی ذہنی ضیافت کا سامان مہیا کر دیا ہے، اپنے والد بزرگوار کی ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ان کی پہلی شادی ناکامی اور تلخی میں ختم ہوئی، اس کی اصل وجہ یہ بتائی ہے کہ زوجین کے طبائع کی عدم مناسبت تھی، شادی کے وقت ڈاکٹر صاحبؒ کی عمر سولہ[۱۶] برس اور ان کی بیوی کی عمر انیس[۱۹] برس تھی، ان کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کا خاندان ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا، لیکن ان کی بیوی نے ایسی حویلی میں پرورش پائی جو کسی محل سے کم نہ تھی، ان کی بیوی کے والد ڈاکٹر تھے جن کے یہاں دولت کی فراوانی تھی. گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے ملازمت کی تو ان کی تنخواہ بہتر[۷۲] روپیے چودہ[۱۴] آنے مقرر ہوئی جو چار سال کے بعد دو سو پچاس[۲۵۰] روپیے ماہوار تک پہونچی، اس کے بعد وہ یورپ چلے گئے، واپس آئے تو ان کے لیے بڑا مسئلہ

خوانی روزگار کا تھا، ایسی حالت میں متمول گھرانے کی یہ بیوی ان سے قریب تر نہ ہو سکیں، ان کا انداز طبیعت کچھ ایسا تھا کہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آگئی، لیکن ان کے کردار کا یہ روشن پہلو ہے کہ انھوں نے طلاق لینا گوارا نہیں کیا۔ کفاف لے کر مطمئن ہو گئیں، ڈاکٹر صاحبؒ ایک مقررہ رقم ان کو ہر مہینہ آخر وقت تک بھیجتے رہے، ان سے ایک لڑکی معراج بیگم اور ایک لڑکا آفتاب اقبال ہوا، معراج بیگم کو اپنے والد بزرگوار سے بڑی محبت رہی، گو وہ ماں باپ کے کشیدہ تعلقات پر اندر اندر کڑھتی رہیں ان کی وفات انیس ۱۹ برس کی عمر میں ہوگئی، آفتاب اقبال کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ وہ اپنے دادا کے منظور نظر رہے، لیکن باپ سے قریب تر نہیں ہوئے، ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کی ماں کے ساتھ ان کے باپ نے ناانصافی کی۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی ازدواجی زندگی کو سنوارنے کے لیے ایک دوسرا نکاح کیا، اس سلسلہ میں مصنف نے یہ لکھ کر دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں کہ وہ یعنی ڈاکٹر صاحب روشن خیال ہونے کے باوجود بعض معاملات میں قدامت پسندی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ سے شادی کر سکتے تھے، مگر ان کو ایسی خاتون کی تلاش تھی جو ان کی بیوی کی حیثیت سے ان کے خاندان کے افراد سے گہرا تعلق اور وابستگی قائم رکھ سکے، اس باب سے یہ معلوم ہوا کہ عطیہ فیضی ان سے شادی کرنے کی خواہشمند تھیں، مگر ڈاکٹر صاحبؒ نے کبھی ان کا نوٹس نہیں لیا، وہ انھیں ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کر سکتے تھے، لیکن بیوی کے روپ میں وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ (ص ۱۶۹)

ڈاکٹر صاحبؒ کا دوسرا نکاح سردار بیگم سے ہوا، جو ڈاکٹر جاوید اقبال کی ماں ہوئیں، اس نکاح کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے تین سال تک رخصتی نہیں کرائی، اس کی جو وجہ مصنف نے لکھی ہے وہ ان کے انداز بیان کی معروضیت کی انتہا ہے، وہ اس کو آسانی سے حذف کر سکتے تھے، مگر بڑی صاف گوئی سے لکھا ہے کہ رخصتی کا معاملہ اس لیے التواء میں پڑ گیا کہ نکاح کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کو دو ایک گمنام خطوط موصول ہوئے،

ن میں سردار بیگم کے چال چلن پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک متمول کشمیری خاندان
لڑکی مختار بیگم سے شادی کر لی اور سردار بیگم کو طلاق دے دینے کا ارادہ کر لیا، مگر پھر ان کو یہ معلوم کر کے
ڑا دکھ ہوا کہ گمنام خطوط لکھنے والا ایک وکیل تھا، جو سردار بیگم سے اپنے بیٹے کی شادی کرانا چاہتا تھا، یہ
ہوا تو اس نے گمنام خطوط میں یہ بہتان رکھ دیا، پھر سردار بیگم نے خود جرأت کر کے ایک خط ڈاکٹر صاحب
لکھا کہ اس بہتان پر ان کو یقین نہ کرنا چاہیے تھا، میرا نکاح تو آپ سے ہو چکا ہے، اب میں دوسرے
نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اسی حالت میں پوری زندگی بسر کر دوں گی اور روزِ قیامت میں آپ کی دامنگیر
ہوں گی، یہ خط پڑھ کر ڈاکٹر صاحب اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوئے، اور جب اپنی بیوی مختار بیگم کو بتلایا
تو وہ رونے لگیں، ڈاکٹر صاحب سردار بیگم کو گھر لانے کے لیے تیار ہو گئے، مگر ان کی یہ احتیاط قابلِ ذکر ہے کہ
ایک مرحلہ پر وہ ان کو طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے، اس لیے ان سے دوبارہ نکاح پڑھوایا، یہ واقعہ
سنہ ۱۹۱۳ء کا ہے، دونوں بیویاں اپنی نیک نفسی کی وجہ سے پیار اور محبت سے رہنے لگیں، ڈاکٹر صاحبؒ کا
یہ فیصلہ مبارک ثابت ہوا، اس لیے کہ اس کے بعد ان کے گھر میں چہل پہل رہنے لگی، وہ اپنی دونوں بیویوں
کے ساتھ تاش اور لوڈو کھیلتے، یا کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑاتے، سردار بیگم ہی سے اللہ تعالیٰ نے انھیں جاوید اقبال
جیسا خوش رو، خوش خصال اور خوش عقیدہ فرزندِ ارجمند عطا کیا۔ جنھوں نے اپنی خداداد لیاقت سے نہ صرف
اپنی زندگی کامیاب بنائی، بلکہ اپنے قابلِ فخر باپ کی حیات اور کلام کو سمجھنے میں ایسی دلآویزی پیدا کی
جو ان سے پہلے کوئی اور نہ کر سکا تھا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے مخالفین نے ان کی کردارکشی اور سطوت شکنی کی جو مہم چلائی اس کی بھی پوری تفصیل
اس باب میں ہے، مصنف نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اپنے والد بزرگوار کے متعلق یہ لکھا ہوگا:

"ان کی زندگی میں ان پر شراب نوشی کا الزام لگا، انھیں عیاش ظاہر کیا گیا، اور یہ من گھڑت قصہ بھی
مشہور کیا گیا کہ ایامِ جوانی میں وہ ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے۔" (ص ۱۶۹)

ان باتوں کا ذکر اس کتاب میں نہ ہوتا تو اس کی خوبی پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ مگر ان کی تردید سے کچھ لگ گیا ہے اس میں باپ کی طرف سے بیٹے کی مدافعت یا حسن تاویل مطلق نظر نہیں آتا، بلکہ اس بحث میں مستند شواہد و بیانات کا ڈھیر لگا کر معروضیت اور حقیقت پسندی کی شان پیدا کر دی گئی ہے، جس کے بعد مصنف کے اس نتیجہ سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ الزامات کم علم ملاؤں، جدید تر دل کی شاعری کے پرستاروں، احمدیوں، سوشلسٹوں، ترقی پسند مصنفوں اور خام صوفیوں نے رکھ کر مشتہر کیا، اور ان کو اس سے بھی مدد ملی کہ ڈاکٹر صاحبؒ اپنی ظرافت طبعی سے ہنسی مذاق میں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالتے جن کو ان کی پارسائی کے بجائے ان کی رندی پر محمول کیا جاتا، مصنف نے اس کی طرف کھل کر اشارہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتے، اس لیے کہ ان کو موسیقی سے شغف رہا، لیکن ان کی یہ زندگی سنہ ۱۹۱۳ء میں ختم ہو چکی تھی، پھر وہ پورے وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ایسی کوئی موثر شہادت موجود نہیں جس سے ان کی مے نوشی ثابت ہو، پھر وہ ایسے مستند بیانات بھی نقل کرتے ہیں جن سے اس الزام کی پوری تردید ہو جاتی ہے، مثلاً خود عطیہ فیضی کا بیان ہے کہ انھوں نے یورپ میں کسی موقع پر ان کو شراب پیتے نہیں دیکھا، پھر یہ واقعہ بھی درج کیا گیا ہے کہ کیمبل پور میں ان کے ایک وکیل دوست نے ایک دعوت میں شراب کا جام پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جس شے کو میں نے یورپ میں رہ کر کبھی منہ نہیں لگایا اسے اب کیا پیوں گا، اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میکلوڈ روڈ پر ان کی دو بھتیجیاں ساتھ رہتی تھیں ان میں ایک کا حلفیہ بیان ہے کہ انھوں نے کبھی شراب سے شغف نہیں رکھا، اسی طرح ان کے بے تکلف دوستوں میں مرزا جلال الدین، سردار امراؤ سنگھ اور خواجہ عبدالوحید کے بیانات ہیں کہ انھوں نے کبھی ان کے سامنے شراب نہیں پی، اور نہ انھوں نے کسی سے سنا کہ انھوں نے شراب کو ہاتھ لگایا، خود ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے بچپن میں کبھی ان کو شراب پیتے نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب پر جو یہ الزام ہے کہ وہ ایام جوانی میں ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے اس کے متعلق

اکثر مادہ پرست رقم طراز ہیں کہ یہ ایک اختراع ہے، ان کا کلام خنجر و شمشیر، تیر و تفنگ کے ذکر سے ضرور بھرا ہوا ہے، لیکن وہ حیدرآباد کے موقع پر بکرے کو ذبح ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، ایسا شخص قتل کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ کہنا ہے کہ ان کی خوش طبعی سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ وہ اپنی ظرافت میں زمنظرد رہے، لیکن یہ ذہنی خیالی اونشکلی تھی جسے ان کی رندی کہا جا سکتا ہے۔ وہ سب اسرار خودی سے پہلے کے لطائف ہیں جن کو بقول محمد دین تاثیر سر شادی لال نے ان کو ہائی کورٹ کی ججی سے روکنے کے لیے اور چند ان کے ہم پیشہ مسلمان مشاہیر نے اپنے مطالب کی خاطر خوب بڑھا چڑھا کر شہرت دی، ورنہ ایسا تہجد خواں، عاشق رسولؐ، اولیاء کا خادم اور عقیدت مند، خوش عقیدہ اور گداز قلب مسلمان انگریزی دانوں میں کم دیکھا گیا۔ (ص ۱۸۱)

سنہ ۱۹۳۳-۳۲ء میں راقم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا تو وہاں کے نوجوان طلبہ اپنی نجی گفتگو میں ڈاکٹر صاحب سے متعلق بعض ایسی باتیں بیان کر جاتے جن کو یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، زیر نظر کتاب کے اس باب کو پڑھ کر یہ خیال ہوا کہ میرا یقین نہ کرنا کتنا صحیح تھا، آئندہ جب کوئی ڈاکٹر صاحبؒ کے کلام کے ساتھ ان کی نجی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہے گا تو اس کے لیے یہ باب پڑھنا ناگزیر ہوگا جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محض بدباطنی اور خباثت نفس سے ایک محبوب اور جلیل القدر شخصیت کو کس طرح مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس کتاب کے تیسرے باب میں ڈاکٹر صاحبؒ کے ذہنی ارتقاء کو ان کے ان نثری مضامین سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو انھوں نے سنہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۵ء تک اردو اور انگریزی میں لکھے، اب تک یہ جائزہ زیادہ تر ان کی شاعری کے ذریعہ سے لیا جاتا رہا ہے لیکن اس باب میں ان کی نثری تحریروں میں جو مباحث ہیں ان سے ان کے افکار و خیالات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، ان سے ہم اپنے ناظرین کو بھی مختصر طریقہ پر روشناس کراتے ہیں:

سنہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے "قومی زندگی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، ان کے مردوں کی عشرت پسندی، ان کی عورتوں میں تعلیم کے فقدان، ان کی بے جا نام و نمود کی خواہش، ان کے شادی بیاہ میں بعض قبیح رسوم اور فضول خرچی، اور صنعت و حرفت سیکھنے میں ان کی عدم توجہ پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے فرد اور قوم کے تعلق پر بحث کی، اور آخر میں اس پر زور دیا کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصولوں کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے، مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں، اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لیے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے، اس طرح ان کا خیال تھا کہ قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرایہ میں مرتب و منظم کر سکے، بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے ہندوستان ریویو میں ایک انگریزی مضمون "اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین" کے عنوان سے لکھا جس میں یہ تحریر فرمایا کہ اسلام میں نیکی سے مراد طاقت، قوت اور مضبوطی ہے، بدی سے مراد کمزوری ہے، ایک مضبوط جسم میں ایک مضبوط قوت ارادی اسلام کا اخلاقی نصب العین ہے، تاکہ مسلمان ان تمام طاقتوں کا مقابلہ کر سکیں جو ان کے معاشرتی نظام کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں، حیات کی تگ و دو میں افراد کی کثرتِ تعداد ہی وہ عنصر نہیں جو کسی معاشرتی نظام کی بقا کا ضامن ہے، بلکہ افراد کی اجتماعی قوت کردار اس کی بقا کے لیے ایک قطعی لازمہ ہے، ان کی تعلیم محض ذہنی تربیت کے لیے نہ ہو، بلکہ ان کا نظام تعلیم ایسا ہو کہ جو ان کی معاشرتی اور تاریخی روایات کو زندہ کرے اور ان میں خالصتہً اسلامی کردار پیدا کرے، اس کے علاوہ اسلام صرف مذہب ہی نہیں، بلکہ ملت یا قوم بھی ہے، اس میں مذہب اور ملت ایک دوسرے سے الگ نہیں، اس میں قومیت ایک نظریہ ہے جس کی بنیاد علاقائی یا جغرافیائی اصول پر استوار نہیں کی گئی،

قوم کے مفاد پر ملت کے مفاد کو ہمیشہ فوقیت حاصل ہے کہ ملت اسلام کی ملی تشکیل ہے، اس کے سیاسی دستور کے دو بنیادی اصول ہیں، اول قانون الٰہی کی حاکمیت اور دوم ملت کے تمام افراد میں مساوات، اس کا سیاسی نصب العین ملت اسلامیہ کے اتحاد کا ذریعہ صحیح معنوں میں جمہوریت کا قیام ہے، یہ تمام مسلمانوں کی برابری کا اصول تھا جس نے انھیں دنیا کی عظیم ترین سیاسی طاقت بنا دیا، اس میں ذات پات کے امتیازات کی گنجائش نہیں، یہ ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔

'افکار پریشان' ڈاکٹر صاحب کی ذاتی ڈائری تھی، جس میں سنہ ۱۹۱۰ء سے وقتاً فوقتاً اپنے کچھ خیالات درج کرتے رہے، اس میں آرٹ، فلسفہ، ادب، سائنس، سیاست اور مذہب سے متعلق ان کے کچھ خیالات کا اظہار ہے، جو ان کے کلام اور تصانیف میں واضح طور پر پیش کیے گئے ہیں، اس میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ سیاسی اقتدار کا زوال قومی کردار کے حق میں تباہ کن ثابت ہوتا ہے، اس میں انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمارے ملی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہماری گرفت مذہبی اصول پر مضبوط ہو، اگر یہ ڈھیلی پڑی تو ہم کہیں کے بھی نہیں رہیں گے، اور یہیں ممکن ہے کہ ہمارا انجام وہی ہو جو یہودیوں کا ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے وطنیت کو بت پرستی کی ایک لطیف صورت قرار دیا ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۱۰ء میں 'مسلم کمیونٹی' کے عنوان سے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں ایک مضمون پڑھا، اس میں بھی قومیت کا اسلامی تصور پیش کیا گیا، ان کے خیال میں اس کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن اور نہ اشتراکِ اقتصادی اغراض ہیں، بلکہ وہ اس برادری پر مشتمل ہے جو پیغمبر اسلام نے قائم کی تھی، اسلام صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ایک خاص تہذیبی، قومی اور وطنی تصور ہے، اس کی عصبیت سے صرف قومی اور ملی پاسداری مراد ہوتی ہے، دوسری قوموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا نہیں سکھاتا۔ انھوں نے اس مضمون میں اس پر بھی زور دیا کہ مسلم قوم کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایک مرکزی اسلامی دارالعلوم کا ہونا ضروری ہے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں، بلکہ

تہذیب کا وہ اصول یا سانچہ تیار کیا جا سکے، جس میں موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالا جا سکتا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۰ء اور جنوری ۱۹۱۱ء کے ہندوستان ریویو میں ان کا ایک انگریزی مضمون "اسلام میں سیاسی فکر" کے عنوان سے شائع ہوا، اس میں ایک مسلم کامن ویلتھ کا تخیل پیش کیا، جس میں سیاسی انحصار دین پر ہو، کیونکہ اسلام کے نزدیک مذہب اور ریاست ایک وحدت ہے، اس سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھ گئے کہ قرآن مجید میں تو ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے، اگرچہ حکومت کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں اس کی تفصیل بیان کرنے کا معاملہ اولوالامر پر چھوڑا گیا ہے، مگر بدقسمتی سے انتخاب کے بنیادی اصول کی نشوونما خالص جمہوری خطوط پر نہیں ہوئی، سیاسی آزادی کے جو نظریات مسلمان یورپ سے مستعار لے رہے ہیں وہ دراصل اسلام ہی کے اپنے تصورات ہیں، اور ان کا عملی نفاذ آزاد مسلم ضمیر کا جائز مطالبہ ہے۔

۱۹۲۴ء میں "اسلام میں اجتہاد" کے عنوان سے اسلامیہ کالج لاہور میں سر عبدالقادر کی صدارت میں ایک مقالہ پڑھا جو محفوظ نہیں رکھا گیا، لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے کہ یہی مقالہ اضافہ کے ساتھ غالباً ۱۹۳۰ء میں جنوبی ہند کے دورہ میں حیدرآباد میں پڑھا گیا۔

۱۹۲۹ء میں ایک انگریزی نوٹ ایم۔ اے۔ او کالج کے صاحبزادہ آفتاب احمد خان کو اس وقت لکھ بھیجا جب وہ علوم اسلامیہ کے مطالعہ کے لیے ایک نیا شعبہ وہاں قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت غور سے اب بھی پڑھنے کے لائق ہے، پہلے وہ علوم اسلامیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یورپ مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوا، یہاں جذبۂ انسانیت یعنی ہیومنزم کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں، یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں کہ جدید یورپین جذبۂ انسانیت کا جو ثمر سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے، اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے، مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک

ندن سے بر آمد ہوا ہے، وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ
ان کے نظریے سے ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث و مباحثے
ے، تو آئن اسٹائن کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی نہ معلوم ہو، اسی طرح ان کو جدید استقرائی منطق
گی ہے، وہ بہت کم ہو جائے اگر ان کو یہ علم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے اُن مشہور معروف
ات سے وجود میں آیا جو انھوں نے ارسطو کے استخراجی منطق پر عائد کیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ
ی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے لیے ایسے اساتذہ کا تیار کرنا از بس ضروری ہے جو اسلامی فلسفہ کے ساتھ
فہ پر عبور رکھیں، ایسے ہی لوگ جدید علوم کے اخذ و جذب کرنے میں مدد کر سکتے ہیں، اسی طرح
م تیار کرنا بھی نہایت ضروری ہے جو اسلامی تاریخ، آرٹ اور علم تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں
ا ہوں، اسی کے ساتھ فقہ میں تحقیق و تدقیق کے لیے موزوں ہوں، اور جو اسلامی افکار و ادبیات
ن شعبوں میں اپنی تحقیقات سے اسلامی تمدن اور جدید علوم کے درمیان حیات ذہنی کی نشو و نمو
ریں۔ دینیات کی تعلیم کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم
اب بے سود ہے، آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کی ایک نئی وادی کی طرف پھیر دیا جائے،
ب نئی دینیات اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو بر سر کار لایا جائے، اسی خط میں یہ بھی تحریر فرمایا
بند اور ندوہ سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کیے جائیں جو قانون محمدی کی از سر نو تشکیل میں
ہوں، کیونکہ قدیم اور جدید اصول تعلیم کے مابین اور روحانی آزادی اور مادی اقتدار کے
دنیائے اسلام میں ایک کشاکش شروع ہو گئی ہے، جس کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحبؒ مسلم معاشرہ کی تعمیر نو کے خواہاں تھے،
کے نزدیک صرف مذہب کی روایتی تعبیر کے فروغ سے ممکن نہیں، وہ وقت کے جدید تقاضوں اور علوم کی
تہا ترقی کے پیش نظر علم کلام اور فقہ کی از سر نو تدوین کے آرزو مند تھے، مگر ان کی زندگی کے کسی گوشہ میں

نہ تو علم کلام اور نہ فقہ کی جدید تدوین بروئے کار آئی، اور یہ حسرت لے کر وہ اللہ کو پیارے ہوئے، اور جب تک ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اب تک حسرت ہے،

البتہ مسلم قومیت کو جو ترویج ڈاکٹر صاحب نے کی تھی اُن کے زمانہ میں ضرور ابھری اور پاکستان کی تحریک اساس کے قیام پر ختم ہوگئی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہ مسلم قومیت مشرقی بنگال میں بوڑھی گنگا اور برہم پتر میں جا کر غرقاب ہوئی، اور سندھ میں غول بیابانی بن کر منڈلا رہی ہے، بلوچستان کی پہاڑیوں سے بھی ٹکرا رہی ہے، اور سرحد کی سرزمین میں خاک آلود ہو رہی ہے، ان کی آرزو تھی کہ ایک مرکزی اسلامی دارالعلوم ضروری ہے، یہ آرزو بڑی حد تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پوری ہوئی، لیکن اس سے وہ چیز پیدا نہ ہوئی اور نہ ہو رہی ہے جس کے وہ خواہاں تھے، اس کے طلبہ کا اب تک آئیڈیل محض سرکاری ملازمت کا حصول ہے، جو بقول ڈاکٹر صاحبؒ حکومت کی محتاجی کا مترادف ہے، اور انسانی انفرادیت کے احساس کی نشوونما کے لیے زہر قاتل ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے حوالے سے مصنف نے یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے (ص ۱۹۱) مگر ص ۱۹۲ پر ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے لیے کسی حتمی کانسٹی ٹیوشن یا حکومت کی قسم کی تفصیل موجود نہیں ہے، کیونکہ ایسے ادارے ملت اپنے ضمیر کی روشنی میں قائم کر سکتی تھی، اور بہر صورت وہ دائمی قرار نہ دیے جا سکتے تھے، کیونکہ ملت کی بدلتی ہوئی سیاسی ضروریات کے تحت وہ قانون کے تغیر کے پابند تھے، (ص ۱۹۲) جب قرآن مجید اور احادیث میں کوئی حتمی کانسٹی ٹیوشن نہیں تو یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ قرآن مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے، اور اگر انتخاب اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے تو اس انتخاب کے طرز کی کہیں وضاحت نہیں، خود خلافت راشدہ میں اس کا کوئی خاص طرز مقرر نہیں رہا، جب جیسی ضرورت ہوئی اسی لحاظ سے انتخاب کا اصول طے کر لیا گیا، اور اگر ملت کو یہ حق رہا کہ وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں زمانہ کے اقتضا کے مطابق حکومت قائم کریں تو خلافت راشدہ

بعد جو موروثی ملوکیت قائم ہوتی رہی تو کیا وہ ملت کے ضمیر کی روشنی اور زمانہ کے تقاضے کے خلاف تھی، تو
کے خلاف بغاوت کیوں نہیں ہوتی رہی اور کیوں تیرہ سو ستر سال تک قائم ہوتی چلی آئی، اور آج بھی خود حجاز
اندر موروثی ملوکیت قائم ہے، اگر ملت کا ضمیر اس کو گوارا کرتا رہا کر رہا ہے تو پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ
سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام میں موروثی ملوکیت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں' (ص ۱۹۴)

اس باب میں خلافت اور سلطنت پر لائق مصنف نے بڑی اچھی بحث کی ہے، جو آج کل کے سیاسی
ماضے کے لحاظ سے بہت مفید ہے، بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ کلام پاک میں مَلِک (بادشاہ) کا ذکر تو آیا ہے
لیکن جمہوریت کا کہیں ذکر نہیں، (انٹروڈکشن ٹو اسلام، از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۱۰۹، ۱۹۷۴ء ایڈیشن) اور
جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے کسی حتمی دستور یا حکومت کی ہیئت کی تفصیل موجود
نہیں تو جمہوریت اسلامی ملک کے سیاسی نظام کے لیے ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کے سیاسی
نظام کے ذریعہ قانون شریعت کا نفاذ ہوتا رہے، اسی اور صرف اسی سے ملت کے ضمیر کی روشنی کی عکاسی
ہو سکتی ہے، خواہ اس کا نفاذ رائے بالغان کے ذریعہ پارلیمانی یا صدارتی نظام حکومت سے ہو، یا ڈکٹیٹر شپ
ہی کے ذریعہ سے کیوں نہ ہو، اگر ایک بادشاہ یا ڈکٹیٹر شرعی قوانین کا پابند ہو، یا کم از کم ان کے نفاذ کے لیے کوشاں
ہو تو کیا وہ اس لیے پسند نہیں کیا جائے گا کہ وہ رائے بالغان کے ذریعہ سے منتخب نہیں ہوا ہے۔

اس باب میں لائق مصنف کی تحریر میں "علماء کی موقع پرستی" اور "صوفیہ کی شعبدہ بازی" (ص ۲۰۲)
جیسے فقروں سے گرانی ہوئی، اس قسم کے الفاظ انداز بیان کے خارستان کے لیے تو ناموزوں نہیں، لیکن اسلوب بیان
کے سنبلستان میں گراں گذرتے ہیں، دنیا دار یا علمائے سوء کی موقع پرستی، یا خام اور صاحب فضول صوفیہ کی
شعبدہ بازی کہی جاتی تو کوئی مضایقہ نہ تھا۔

ایک باب "تخلیقی کرشمہ" کی سرخی سے شروع ہوا ہے، لفظ "تخلیقی" کھٹکتا ہے، تخلیقی کرشمہ سے شرک کی بو
آتی ہے، خالق، مخلوق اور تخلیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تصور آتا ہے، اگر ملحدوں اور ترقی پسندوں نے یہ لکھنا

شروع کیا کہ فلاں صاحب چار پانچ تخلیقات کے خالق ہیں، جن سے "تحقیقات" اور "خیالات" میں تضحیک کا پہلو نکلتا ہے، اس کا لکھنا کچھ ایسا واضح پایا گیا ہے کہ اس میں جو طنزیہ رنگ ہے اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا، ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے محتاط مصنف کی بھی اس کی طرف نظر نہیں گئی۔

اس باب میں "ڈاکٹر صاحبؒ نے "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" جن عوامل کے ماتحت لکھیں، ان کی تفصیلات کے سلسلہ میں پہلی جنگ عظیم، مولانا شیخ عبدالقادر گرامی کے لطائف، ڈاکٹر صاحبؒ کی والدہ کی وفات پر ان کے غمناک جذبات، سر علی امام کا عشق رسولؐ، نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ کی آرزو، فکر معاش میں ان کی پریشانی، اسی کے ساتھ کبوتروں سے ان کے انس، مسلم لیگ کی پرانی قیادت سے نوجوانوں کی بداعتقادی، میثاق لکھنؤ کا رد عمل وغیرہ کا ذکر کرکے اس باب کو نہ صرف پُر از معلومات، بلکہ دلچسپ بنا دیا ہے، اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو ان معلومات کے خزانے میں یہ بھی ملے گا کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے انگریزی میں فقہ اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، ۱۹۱۹ء میں تاریخ تصوف لکھنی شروع کی، لیکن مواد نہ ملنے کے سبب دو ایک باب لکھ کر رہ گئے، اسی سال رامائن کو اردو قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا، پھر ۱۹۲۱ء میں بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو میں کرنے کا خیال کیا، ۱۹۲۵ء میں "اسلام میرے نقطۂ نظر سے" لکھنا چاہا، لیکن ان میں سے کسی کی تکمیل نہیں ہو سکی، اور خدا جانے ان کے سینے میں اور کتنے افکار ہوں گے جو سفینے تک منتقل کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن بیرسٹری کے پیشے میں ان کو اتنی فرصت نہیں ملی، وہ اپنے علمی عزائم کو پورا کرنے کے لیے حیدر آباد کا گوشۂ عافیت چاہتے تھے، ان کو وہاں کی ہائی کورٹ کی ججی مل جاتی تو اس کو قبول کر لیتے، اور پھر فکرِ معاش کی الجھنوں سے آزاد ہو کر اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھتے، مگر شاید انگریز ان کو ایک خطرہ سمجھ کر وہاں ان کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اس باب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحبؒ "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" لکھنے سے پہلے پہلی جنگ عظیم کی ہولناکی کی وجہ سے نئے یوروپی تمدن کے حیوان سے آزردہ تھے، وہ ایسے مردِ فرد کی تلاش میں تھے

ں کے ذریعے سے مسلم معاشرہ از سرِ نو وجود میں آئے۔ انھوں نے اسی جذبے سے اسرارِ خودی لکھنی شروع کی، جس کے لیے ع بو علی قلندرؒ کی مثنوی کی بحر کو سامنے رکھا۔ ان کا بیان ہے کہ یہ مثنوی لکھتے وقت ان کو احساس ہوا کہ وہ از خود نہیں رہے ہیں بلکہ اس کے لکھنے کی ہدایت ہو رہی ہے (ص ۲۰۲) یہ شایع ہوئی تو وہ لکھتے ہیں:

"اسرارِ خودی شایع ہوئی تو عبدالرحمٰن بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیشِ نظر ملت کا وجود نہیں، حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔ بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموزِ بےخودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموزِ بےخودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی۔ یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بےخودی لکھا جانا بےحد ضروری ہے" (ص ۲۱۱)

رموزِ بےخودی کے بعد ایک اور مثنوی "حیاتِ مستقبلۂ اسلامیہ" لکھنا چاہتے تھے، مگر نہ لکھ سکے۔ اوپر کی سطروں کو پڑھ کر یہ خیال کس قدر باطل ہو جاتا ہے کہ ان کی ان مثنویوں میں یوروپی فلسفیوں کی روح کارفرما ہے، وہ تو یہ بھی لکھ گئے ہیں:

"یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول فقط صرف اسلام ہی نے بنائے ہیں جس کی پختگی اور پائداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔" (ص ۲۱۱)

یہ دونوں مثنویاں شایع ہوئیں تو ایک خیال یہ تھا کہ اقبالؒ مسیحا بن کر نمودار ہوئے ہیں۔ انھوں نے مردہ دلوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے ہیں، جب یہ مثنویاں حقیقی معنوں میں سمجھی جائیں گی تو دنیائے اسلام میں وہ لہر اٹھے گی جس کے نتائج نہایت شاندار ہوں گے۔ (ص ۲۳۹) مگر کچھ حلقوں میں اسرارِ خودی کی سخت مخالفت بھی ہوئی، اس لیے کہ اس میں حافظ شیرازی کو مطعون کیا گیا تھا، اور توحیدِ وجودی کی مذمت تھی،

حافظ کو صہبا گسار، نقیہ ملت سے خوارگان، امام امت بے چارگان اور گوسفند وغیرہ قرار دیا گیا تھا، اسی کے ساتھ ان کا خیال تھا کہ وجودی تصوف کے سحر ہی کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنی قوت عمل کو شل کر کے رکھ دیا ہے، اس کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کی وجہ سے وہ ذوق عمل سے محروم ہو گئے ہیں، (ص ۲۲۰)

اسرار خودی کے خلاف جو قلمی ہنگامہ ہوا اس کی تفصیل اس باب میں ہے، یہ اقبالیات کے سلسلہ کا ایک مفید لٹریچر ہے، مخالفت کرنے والوں میں نمایاں نام ڈاکٹر صاحبؒ کے دوست خواجہ حسن نظامی کا تھا، اکبر الٰہ آبادی نے بھی تھوڑا سا اختلاف کیا، ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے مخالفوں کو جو جوابات نثری مضامین میں دیے وہ اس زمانہ کے مشہور اخبار وکیل میں چھپتے رہے، ان کی نشاندہی تاریخ وار اس باب میں کر دی گئی ہے، اس قلمی ہنگامہ سے انھوں نے اپنی شرافت طبع سے اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن میں حافظ شیرازی سے متعلق اشعار اور اس کا دیباچہ نکال دیا، لیکن اس دار وگیر میں انھوں نے تصوف اور توحید وجودی پر جو اپنے خیالات ظاہر کیے، اس کا مطالعہ بہت ہی مفید ہے، وہ بگڑے ہوئے تصوف کو ضرور ناپسند کرتے تھے، خود صوفیائے کرام نے بھی غلط قسم کے تصوف کی مخالفت کی ہے، حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب اسلامی تصوف کی انجیل ہے، اس میں وہ رقمطراز ہیں کہ ایک صوفی تو صاحب وصول یعنی وصل کرنے والا ہوتا ہے اور ایک صوفی صاحب اصول یعنی صوفی کے اصول پر چلنے والا ہوتا ہے، مگر ایک صوفی متصوف یعنی صاحب فضول ہوتا ہے، جو محض مال ومنال اور جاہ وحشمت کے لیے اپنے کو شل صوفی کے بنا لیتا ہے، ڈاکٹر صاحبؒ ایسے ہی متصوفین کے مخالف رہے، اور تصوف میں جو غیر اسلامی عنصر آ گیا، اس کو بھی پسند نہ کرتے تھے، وہ ان صوفیہ کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو آنحضورؐ کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دیتے ہیں جو دین اسلام سے غیر متعلق ہیں، لیکن ان کا بیان ہے کہ:

"جو صوفیہ آنحضورؐ کی راہ پر قائم ہیں، اقبال ان کی خاک پا ہے، اور ان کی محبت کو سعادت دارین سمجھتا ہے۔" (ص ۲۲۶)

ان کی ایک دوسری تحریر ہے:

"تصوف کے مقاصد سے مجھ کو کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے، کون مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا کہے جن کا نصب العین محبت رسول اللہ ہے، اور جو اس ذریعہ سے ذات باری تعالیٰ سے تعلق پیدا کرکے رہے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں، اگر میں تمام صوفیہ کا مخالف ہوتا تو مثنوی (یعنی اسرار خودی) میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔" (ص ۲۲۸)

لائق مصنف نے بھی اپنے والد بزرگوار کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ تصوف اسلامیہ کے حامی تھے، اور آخر دم تک حامی رہے۔ (ص ۲۴۱)

تصوف کا ایک اہم مسئلہ وحدت الوجود بھی ہے، مصنف لکھتے ہیں کہ مثنوی اسرار خودی سے ظاہر ہے کہ وہ تصوف وجودیہ سے متنفر ہو گئے تھے، (ص ۲۴۱) ان کی نفرت کی وجہ یہ تھی کہ بقول ان کے مسئلہ وحدت الوجود نے تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا، (ص ۲۴۰) اس پر اس حیثیت سے بحث کی جا سکتی ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ تو سیر و سلوک کی منزلوں میں ذوقی، تجرباتی، وجدانی اور مشاہداتی ہے، خود ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق یہ ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے، (ص ۲۴۰) یہ ماورائے عقل بھی ہے، ہر شخص اس کو سمجھنے کا اہل نہیں، (ص ۲۴۲) کسی زمانہ میں بھی مسلمانوں کا یہ اجتماعی یا قومی یا سیاسی مسلک نہیں بنا، جس پر ان کو عمل کرنے کی باضابطہ قانونی ہدایت دی گئی ہو، پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ ذوق عمل سے محروم ہو گئے، یہ تو سالکین راہ تصوف تک محدود رہا، اس پر خانقاہوں یا صوفیہ اور علماء کی مجلسوں میں بحثیں ہوتی رہیں، جو زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ یا عارفانہ رہیں، یہ عوام بلکہ بڑی حد تک خواص کی عقل سے ماورا رہیں، اور آج تک وہ وحدت الوجود صحیح طور پر نہ سمجھ سکے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ ان کے دائرۂ فکر سے باہر ہے، اور صرف صوفیہ اور علماء کے سمجھنے کی چیز ہے، رہا فارسی یا اردو شعراء کے یہاں وحدت الوجود کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیاں تو ایک تو یہ

.اے شعر گفتن خوب است، اور پھر یہ ایک طرزِ فکر کی ترجمانی ہے جس کو ماننا یا نہ ماننا ضروری نہیں، ہاں بعض صوفیائے کرام نے اس کو اپنا ضروری مسلک قرار دیا ہے، مگر بقول شاہ سلیمان پھلواروی اسلامی پیر وسلوک اور مشاہدۂ انوار و تجلیات سے اس کا تعلق ضرور رہا، مگر نجات سے اس کا ایسا کوئی واسطہ ہیں، (ص ۲۲۶) یعنی اس کے ماننے اور نہ ماننے پر ثواب و عذاب کا سوال نہیں اٹھتا، بعض علماء نے .حدت الوجود کے بعض حامیوں پر تکفیر بلکہ موت کا فتویٰ ضرور دیا، مگر یہ دراصل وحدت الوجود کے سئلہ پر نہ تھا، بلکہ وحدت الوجود کی ایسی عارفانہ موشگافی اور فلسفیانہ نکتہ وری، یا عشق الٰہی میں مجنونانہ سرشاری اور بے راہ روی پر تھا جس سے شریعت کی خلاف ورزی ہوتی رہی، جس طرح تصوف اور سلامی تصوف کی تفریق کی گئی ہے، اسی طرح وحدت الوجود اور اسلامی وحدت الوجود کی تفریق کی جائے، بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں، اسلامی وحدت الوجود دراصل عشق الٰہی کی سرشاری کا دوسرا نام ہے ور اسی عشق الٰہی کی لازمی شرط یہ ہے کہ شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو، مگر جب اس میں غیر شرعی عناصر آ گئے ز اس کے ماننے والوں کے خلاف وہی ردعمل ہوا جو راہ سلوک کے صاحب فضول صوفیوں کے خلاف ہوا، رنہ بہت سے ایسے علماء اور صوفیہ گذرے ہیں جو وحدت الوجود کے حامی رہے لیکن کسی حال میں شریعت کا .امن نہیں چھوڑا، ان ہی میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت عبد القدوس نگوہیؒ، حضرت خواجہ باقی باللہؒ، حضرت شاہ عبد الرحیمؒ، شاہ ابوالرضاؒ (حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ور چچا) اور مولانا شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ تھے، اگر ان بزرگان دین پر زندیقیت کا الزام اس لیے لگا جائے کہ وہ وحدت الوجود کے قائل اور حامی تھے تو پھر ہم کو اپنے روحانی ورثہ کے بہت ہی قیمتی سرمایے سے محروم ہونا پڑے گا، خود حضرت مجدد الف ثانیؒ وحدت الوجود کے مسئلے سے نہیں، بلکہ اس کے ن مدارج سے اختلاف کرتے ہیں جن میں شریعت کا دامن چھوٹ جانے کا خطرہ یا احتمال پیدا ہوتا ہے، نھوں نے علماء کو یہ سمجھایا کہ اگر وحدت الوجود کی تصریح صحیح طور پر کی جائے تو یہ گمراہی نہیں، وہ شیخ ابن عربیؒ سے

اختلاف ضرور کرتے ہیں، لیکن وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان کی مراد کو نہیں سمجھتے وہی لوگ ان پر طعن و ملامت کرتے ہیں، لیکن وہ اپنی اکثر تحقیقات میں حق پر ہیں، اور ان پر طعنہ کرنے والے دور از صواب ہیں، (مکتوبات حصہ سوم نمبر ۸۸) وحدت الوجود کے مسئلہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی ضرور پیدا ہوئی، حضرت مجددؒ نے اس کا ازالہ وحدت الشہود سے کیا، لیکن شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود محض نزاع لفظی ہے، ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں، (ماخوذ از مکتوب مدنیہ شایع کردہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور) مولانا امداد اللہ مہاجر کیؒ تو سراسر وحدت الوجود کے قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ اس مسئلہ کو جس وضاحت کے ساتھ شیخ ابن عربی قدس اللہ سرہٗ نے سمجھایا، اس کا احسان موحدوں پر قیامت تک رہے گا، لیکن انھوں نے اس کی بھی تنبیہ کی کہ ان کو سمجھنے میں خطرات بھی لاحق ہوتے ہیں، وہ ولی اور واصل بحق ضرور تھے، لیکن جذبہ قوی رکھتے تھے، آخر زمانہ میں مجذوب ہو گئے، ان کی زبان افشائے اسرار میں بے اختیار ہو گئی تھی، جس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے، (رسالہ دربیان وحدت الوجود، از مولانا امداد اللہ فاروقی چشتی صابری، ص ۲) مولانا شبلیؒ سوانح مولانا رومؒ میں رقمطراز ہیں کہ وحدت وجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے، اور اہل ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے جو منصور کو دار پر ملا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں ...... عالم قدیم ہے، لیکن وہ ذات باری سے علٰحدہ نہیں، بلکہ ذات باری ہی کے مظاہر کا نام عالم ہے، حضرات صوفیہ کا یہی مذہب ہے، اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، بلکہ تمام مشکلات کی بنیاد اس پر ہے کہ عالم اور اس کا خالق دو جدا گانہ چیزیں ہیں اور ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں، غرض فلسفہ کی رو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں، البتہ یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف ہیں، لیکن یہ شبہہ بھی صحیح نہیں، قرآن مجید میں بکثرت اس قسم کی آیتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن، اول و آخر جو کچھ ہے خدا ہی ہے، ھو الاول ھو الآخر

ھو الظاہر، ھو الباطن، اس کے بعد مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں کہ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں، ان کے نزدیک تمام عالم اسی ہستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں، اس بنا پر صرف ایک ذات واحد موجود ہے، اور تعدد جو محسوس ہوتا ہے محض اعتباری ہے۔ (سوانح مولانا روم ص ۱۸۲)

ان اکابر علماء کے ان خیالات کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ کہنا کہ

"مسئلۂ وحدت الوجود کے متعلق تو علماء کا اجماع ہے کہ یہ قطعاً غیر اسلامی ہے۔" (ص ۲۳۲)

"علمائے اسلام ابتداء سے آج تک تصوف وجودی کے خلاف رہے ہیں۔" (ص ۲۳۳)

ذرا بحث طلب ہے، شاید وہ کسی وقتی جذبہ کی بنا پر یہ لکھ گئے، یا کسی ذہنی الجھن کی وجہ سے ان کی یہ رائے تھی، ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود کی پہلی جلد میں ان کی ایسی ذہنی الجھن کی طرف اشارہ کیا ہے (ص ۱۸) ان کی اسی ذہنی الجھن کی وجہ سے توحید وجودی سے متعلق ان کے خیالات کو سمجھنے میں ایسی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، کہ یہ متنازعہ فیہ بن کر رہ گئے ہیں، ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی زیر نظر کتاب میں اس سلسلہ میں ان کی جو تحریریں نقل کی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے:

"فلسفۂ یورپ بہ حیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے، اگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی، اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا، اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔" (ص ۲۳۰)

آخری سطروں سے تو ظاہر ہے کہ وہ پہلے وحدت الوجود کے قائل تھے، لیکن اس خیال کو ترک کرنے میں ان کو ایک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا، ابتدائی دور میں ان کے وحدت الوجود کے قائل ہونے کی تائید خلیفہ عبدالحکیم کی تحریر سے بھی ہوتی ہے، وہ اپنی کتاب 'فکر اقبال' میں لکھتے ہیں کہ 'اسرار خودی' کے شائع ہونے کے بعد ان کے کیمبرج کے استاد میک ٹیگرٹ نے انھیں لکھا کہ طالب علمی کے زمانہ میں تو تم زیادہ تر ہمہ اوستی

لوم ہوتے تھے، اب معلوم ہوتا ہے کہ ادھر سے ہٹ گئے ہو، (فکر اقبال ص ۴۳۵) خلیفہ عبدالحکیم یہ بھی
تے ہیں کہ بانگ درا کی "شمع"، "جگنو" اور "سوامی رام تیرتھ" میں وحدت الوجود کا تصور جھلکتا ہے (ص
۴۳۴) گو انھوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے اس بیان کو بھی نقل کر دیا ہے کہ جگنو میں مظاہر فطرت کی اساسی وحدت
صوفیہ کے ہمہ اوست کے نظریے سے الگ چیز ہے، مگر خلیفہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ سوامی رام تیرتھ
ر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بہتر وحدت وجود پر اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ (ص ۴۳۸) اس بحث میں خلیفہ صاحب
یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اقبال کی توحید توحید قرآنی ہے، جو فلسفیانہ اور متصوفانہ وحدت الوجود سے متمائز
ہے۔ (ص ۴۳۵)

آج کل پروفیسر جگن ناتھ اقبالیات کے بڑے ماہر ہو رہے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب "اقبال اور اس کے عہد میں" اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، ان کی رائے سے اختلاف ہو لیکن یہ پڑھنے کے لائق ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

علامہ اقبال کا سفر جادۂ تصوف چالیس برس کا ہے، اس کی ابتدا اس مقام سے ہوتی ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہا جاتا ہے، اس منزل میں انھوں نے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کی تفریق نہیں کی ہے۔ اس دور میں ان کی نظموں میں سے "گل پژمردہ"، "زہد اور رندی"، "بوئے گل" "تصویر درد" اور "شمع" میں ایسے اشعار ہیں جو وحدت الوجود کے اثر سے کہے گئے، "شمع" تو ویدانت یا وحدت الوجود کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظم ہے، اس انداز کی نظمیں ۱۹۱۰ء تک کے کلام میں ملتی ہیں، اسرار خودی اور رموز بے خودی ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں لکھی گئیں، جن میں وحدت الوجود کے عام نظریہ کی صریح مخالفت موجود ہے، ان میں وحدت الوجود کو غیر اسلامی قرار دیا ہے، مگر ان دو مثنویوں کے بعد ان کی جو کتابیں شایع ہوئیں ان میں وہ وحدت الوجود کی قرآنی تعبیر کے قائل ہو گئے، اس میں کوئی تضاد نہیں، ایک بالغ نظر مفکر کی تحقیق و تلاش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، فکر کی تبدیلی کا یہ دور ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا، 'پیام مشرق' میں اس فکر کے ماتحت بہت سے اشعار ہیں، زبور عجم ۱۹۲۷ء میں

شایع ہوئی، تو اس کی اکثر غزلوں میں اول سے آخر تک وحدت الوجود کی تلقین ہے، ان کی کلیات ابد میں اس نظریہ کی اشاعت بہت عمدہ طریقہ سے کی گئی ہے، لیکن ایک بنیادی فرق شیخ اکبرؒ اور علامہ اقبالؒ کی تعلیم میں آخر تک رہا، اور وہ فرق عقیدے کا نہیں، بلکہ طریق کار کا ہے، شیخ اکبرؒ انائے مطلق کو اصل قرار دے کر انائے مقید کو اس کی ایک شان قرار دیتے ہیں، لیکن اقبال انائے مطلق کے عوض انائے مقید کو اپنی فکر کا اساسی نقطہ بتاتے ہیں، یعنی وہ خودی سے خدا تک پہونچتے ہیں، یہی چیز ان کی جا بجا "بال جبریل"، "ضرب کلیم"، "پس چہ باید کرد" اور "ارمغان حجاز" میں نظر آتی ہے (ص ۸۵ ـ ۹۸)

جناب سید نذیر نیازی ایک عرصہ تک ڈاکٹر صاحب کے ضمیر بردار بلکہ محرم راز رہے، وہ اپنی کتاب دانائے راز میں لکھتے ہیں کہ اقبال وحدت الوجودی کبھی نہیں تھے، نہ آخر الامر ہو گئے (ص ۱۵) اس کو ثابت کرنے میں خاصی لمبی بحث کی، جس کے دلائل میں ڈاکٹر صاحبؒ کے بجائے ان کے ذاتی خیالات زیادہ نمایاں ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک اور غلط فہمی جو دور اول کی بعض نظموں یا آگے چل کر بعض تحریروں کی بنا پر پیدا ہوئی یا پیدا کر دی گئی، یہ تھی اور شاید اب تک ہے کہ محمد اقبال ایک زمانے میں ہندی قومیت کی طرح وجودی تصوف کے گرداب میں پھنس گئے تھے، حالانکہ ان کی تعلیم و تربیت جس گھر اور جس استاد کی نظر کیمیا اثر سے ہوئی اس کا لحاظ رکھ لیا جاتا تو ایسی کسی غلط فہمی کی گنجایش نہیں تھی۔" (ص ۴۲۸)

لیکن وہ آگے چل کر یہ بھی تحریر کرتے ہیں:

"ان کے والد ماجد کو ابن عربیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت تھی، جو بعض صورتوں میں غلو کا رنگ اختیار کر لیتی۔"

یہ تحریر کر کے ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی نقل کرتے ہیں:

"برسوں تک فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا درس ہمارے گھر میں رہا، بچپن میں ان مسائل کی سمجھ

نہیں تھا..... جب میں نے عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا، جوں جوں علم اور بڑھتا گیا، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔" (ص ۴۳۴)

پھر یہ لکھنا کہاں تک صحیح ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت جس گھر میں ہوئی اس میں اس غلط فہمی کی گنجائش ہیں، جناب نذیر نیازی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں:

"وہ تکمیل تعلیم سے بہت پہلے وحدت الوجود کی بحث پورے طور پر ان کے ذہن میں تھی لیکن بطور ایک نظریے کے اس زمانہ میں انھوں نے اس کی موافقت یا مخالفت میں کوئی رائے قائم نہیں کی، وہ سمجھتے تھے یہی تصوف کا ایک نظریہ ہے۔" (ص ۴۳۳)

آگے چل کر رقمطراز ہیں:

"انھوں نے ہر خیال اور ہر عقیدہ پر نظر رکھی، کسی خیال یا عقیدہ کو صحیح سمجھا تو عارضی طور پر، ان کے غور و تفکر کا سلسلہ ابھی جاری تھا، انھوں نے ان مسائل اور ان عقائد سے تعرض نہیں کیا جن کے بارے میں ایک زمانے تک یہ سمجھتے رہے کہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں گے، ان میں ایک عقیدۂ وحدۃ الوجود بھی تھا۔" (ص ۴۳۵)

اس تحریر سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ کسی زمانے میں یہ سمجھتے رہے کہ عقیدۂ وحدۃ الوجود اپنی جگہ پر ٹھیک ہوگا، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کی جو ایک تحریر اوپر نقل کی گئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ نہ صرف اس کو ٹھیک سمجھتے تھے بلکہ وحدت الوجود سے بھی متاثر ہوگئے تھے، لیکن محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا، اور اس کو ترک کرنے میں ان کو خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا، پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ وہ وحدت الوجودی کبھی نہیں تھے، اور جو اہل نظر ڈاکٹر صاحبؒ کے آخری دور کے اشعار سے ان کے مسلکِ توحید وجودی کو ثابت کرتے ہیں ان کے متعلق جناب سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں کہ یہ محض مشابہتیں ہیں جو بظاہر وجودی تصورات نظر آتے ہیں، (ص ۴۳۴) پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

وہ جذبات اور کیفیات جن کا اظہار ایسے اشعار میں ہوتا ہے وہ وجودی ذہن سے مختص نہیں، شہودی ذہن سے ان کا ویسا ہی تعلق ہے، (ص ۴۵۴)

اس سلسلہ میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا بھی تجزیہ ملاحظہ ہو، وہ اپنی زیر نظر کتاب کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں:

"ذہنی ارتقا کے ..... مرحلے میں اقبال کو تصور وحدت الوجود ہی نے عالم تشکیک سے نکالا...
اس دور میں وجودی فلسفہ کے زیر اثر بعض اشعار تصوف کے روایتی نظریۂ فنا کی ترجمانی کرتے ہیں،
گویا اقبال کے نزدیک نفس کی انفرادیت ایک فریب ہے جو نمود حق کے بعد خود بخود مٹ جاتا ہے، اور
پھر وہی ازلی حقیقت "خدا" رہ جاتی ہے، اس عہد میں اقبال نے وجودی فلسفہ کی روشنی میں
اپنے سیاسی تصورات کی بنیاد رکھی۔" (ص ۸۴)

ڈاکٹر جاوید اقبال یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"اقبال پر یورپ آنے سے کئی برس قبل لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپی فلسفۂ عقلیت کا کھوکھلا پن ظاہر ہو چکا تھا، اس وقت انھوں نے اس کا قابل فہم جواب وجودی تصوف میں پایا تھا، (ص ۱۳۵)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی پہلی جلد میں یہ بھی لکھا کہ ایک دور ایسا بھی آیا جب

"فلسفہ ان کے نزدیک ایک بیکار ذہنی مشق کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا اور وجودی تصوف کی تعلیمات کو وہ افیون کا نشہ سمجھنے لگے تھے۔" (ص ۱۲۵)

اپنی زیر نظر کتاب یعنی زندہ رود کی دوسری جلد میں بھی یہ لکھتے ہیں کہ

"مثنوی اسرار خودی سے متعلق بحث سے ظاہر ہے کہ اقبال تصوف وجودیہ سے متنفر ہو گئے تھے، لیکن وہ تصوف اسلامی کے حامی تھے۔" (ص ۱۳۵)

ان کی اس رائے کو پڑھنے کے بعد راقم نے ایک خط میں ان سے دریافت کیا کہ کیا وجودی تصوف سے

ڈاکٹر صاحبؒ کی نفرت آخر وقت تک رہی؟ اور کیا اس کی بحث تیسری جلد میں آئے گی؟ اسکا جواب حسب ذیل دیا:

"جی ہاں! تیسری اور آخری جلد میں بھی اقبال اور وحدت الوجود کی بحث ہوگی، بلکہ ان کے فلسفہ کے مختلف معروف پہلوؤں کی ارتقائی منازل پر بھی لکھا جائے گا، اس تیسری جلد میں اس بحث کی تائید تو نہیں البتہ اس کی نوعیت مختلف ہوگی اور نتیجہ بھی مختلف نکالا جائے گا، میری ذاتی رائے میں وہ آخری دور میں وحدت الوجود کے قائل تو نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ایک تیسرے راستہ کی رہبری کی ہے، جس کا تصوف نے ابھی تک کوئی خاص نام نہیں رکھا، یا جس کے لیے خاص اصطلاح وضع نہیں کی، بات یہ ہے کہ ارتقائی منازل سے گذرنے کے بعد ان کے تصوف کا راستہ نہ تو وحدت الوجود کا تھا، نہ وحدت الشہود کا، وحدت الوجود میں تو قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے اور وحدت الشہود میں خدا کی ذات ان اللہ ثمہ ورا ء ثمہ ورا ء والی صورت ہے، لیکن اقبالؒ کے مطابق خودی مطلق اور خودی محدود میں فراق بھی برقرار رہتا ہے اور ساتھ ساتھ بھی ہیں، جیسے آفتاب کی ضیا، میں موم تک کی روشنی یا سمندر کے پانی میں موتی، یہ وحدت الوجود کی کیفیت نہیں، گو کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مشابہ صورت ہے، مگر میرے خیال میں یہ تیسری صورت ہے، کیونکہ وجودی تصوف کے برعکس یہ تو کثرت بغار کی صورت ہے، لیکن اقبال ہم پر واضح کرتے ہیں کہ وحدت کی ضد کثرت ہے، توحید کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے، اس لیے اقبالی فکر کو توحید ہی کی روشنی اور ضیاء میں واضح کیا جا سکتا ہے

خیر، میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ بحث تیسری جلد میں بھی آئے گی، جہاں وضاحت سے اپنا نقطۂ نگاہ بیان کروں گا، شاید اس خط میں واضح نہ کر سکا ہوں۔"

اب زندہ رود کی تیسری جلد کا انتظار بے چینی سے ہے کہ اس مسئلہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کا نظریہ کہاں تک بدلا، مگر یہ باتیں نوک قلم پر آ رہی ہیں کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے یہاں عشق کا جو تخیل ہے، وہ آخر کس کا

...ہے، وہ عشق تو نہیں جو اسلامی وحدت الوجود کے حامیوں میں ہوتا ہے، عشق ڈاکٹر صاحب
ان ان کے استاد معنوی پیر رومیؒ کی طرح "اصطرلاب اسرار خدا" ہے، اور جب وہ یہ کہتے ہیں
...ت کی پتیوں اور لالہ میں عشق ہی کا رنگ موجود ہے' ہماری روح عشق کی طلب میں گرفتار ہے، اگر
...دنیا کو چیر کر دیکھا جائے تو اس کے اندر عشق کی خوں ریزی دکھائی دے گی، عشق کے آفتاب کی شعا...
...ندر کو چیر کر رکھ دیتا ہے، مچھلیاں سمندر کی تاریکی میں عشق کی آنکھ سے راہ پاتی ہیں، یہ آسمان کی گردش
...تی کی موجیں ہیں، اگر عشق نہ ہو تو دنیا ٹھٹھر کر رہ جائے، اگر عشق نہ ہو تو جمادات سے نباتات نہ پیدا
...ں، اور اگر عشق نہ ہو تو نامیات یعنی سبزہ زار اپنی نوعیت سے معدوم ہو جائے، عشق ہی زندگی کی شریعت
...ر آئین ہے، تہذیب کی اساس دین ہے اور دین دراصل عشق ہے، عشق ظاہر میں سوزناک اور تلخ
...رآتا ہے، لیکن باطن میں یہ نور رب العالمین ہے، اور جب وہ یہ کہتے ہیں:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی   نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم   بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

...قل و دل و نگہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

ان اشعار میں اسلامی وحدت الوجود تو نہیں لیکن وحدت الوجود کے پرستاروں کے شطحیات
...کی جھلکیاں ہیں، اور جب اقبالؒ انسان کے متعلق یہ کہتے ہیں ؏

ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است

یا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی کو کھو دیا ہے، اور وہ کائنات کی ہر چیز میں آدمی کو تلاش
...ر رہا ہے، آدمی کو لالہ اور نرگس کی دلآویزیوں، پرندوں کے سینوں، پھولوں کی خوشبوؤں، دنیا کی
ہر چیز کی رنگینیوں، محلوں، وادیوں اور ماہتاب کی کرنوں میں ڈھونڈتا ہے' زندگی کا موتی انسان کے
جسم خاکی میں گم ہو کر رہ گیا ہے، اور اب یہی فیصلہ کرتا ہے کہ یہ دنیا خود آدمی ہے یا خداوند تعالیٰ ہے'

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است		این گوہرے کہ گم شدہ مائیم کہ اوست

آخر یہ کیا ہے؟ اسلامی وحدت الوجود کا حامی اپنے عشقِ الٰہی کی سرشاری میں پھولوں کی رنگینی، سبزہ کی شادابی حسن کی رعنائی، نغمہ کی دلآویزی، سمندر کی طغیانی، سیلاب کی تباہ کاری، زلزلہ کی غارتگری اور انسانوں کی تباہی و بربادی میں سب چیزوں میں خدا ہی خدا یا اس کے جمال و جلال کو دیکھتا ہے۔ ان دونوں میں بلا کا فرق ہے اس کا تعلق زیادہ تر لفظی ہے، ان میں اگر بظاہر پوری مطابقت نہیں تو پوری مخالفت بھی نہیں ہے۔

کتاب کا تیرھواں باب خانہ نشینی کے عنوان سے ہے جو اور ابواب کی طرح دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اس میں اس زمانہ کی ہندوستانی اور بین الاقوامی سیاست کا بڑا عمدہ تجزیہ اور تبصرہ ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹ کر لکھنے کی بڑی مہارت ہے، اس کا اظہار ان کی پہلی جلد کے ابواب میں بھی ہو چکا ہے، وہ اپنے اجمال میں تفصیل اور ایجاز میں اطناب کا رنگ پیدا کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، ان سیاسی سرگرمیوں میں ڈاکٹر صاحب کا حصہ زیادہ نہیں رہا، شاید اس لیے کہ انھوں نے کبھی سیاسی لیڈر بننا پسند نہیں کیا، پھر وہ سیاسی رائے اگر رکھتے تو اس کو تسلیم کرانے میں محاذ آرائی کرنا بھی ان کی فطرتِ سلیم کے خلاف تھا، اس کے علاوہ سیاست میں ان کی نفسیات کا اندازہ اس لطیفہ سے بھی ہوگا کہ مولانا محمد علی چار سال کی نظر بندی کاٹ کر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو تحریکِ خلافت کے قائد کی حیثیت سے لاہور پہونچے، ڈاکٹر صاحبؒ سے ملنے کے لیے ان کے انارکلی والے مکان میں پہونچے، ڈاکٹر صاحبؒ اپنی بیٹھک میں دھسا اوڑھے بیٹھے حقہ کے کش لگا رہے تھے، مولانا محمد علی سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی، ڈاکٹر صاحبؒ کو دیکھتے ہی بولے: ظالم! ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقہ کے کش لگا رہا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں، ڈاکٹر صاحبؒ نے برجستہ جواب دیا: مولانا! میں تو قوم کا قوال ہوں، اگر قوال خود ہی وجد و حال میں شریک ہو کر ہو حق میں تہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے (ص ۲۴)

مگر وہ گرد و پیش کے سیاسی واقعات سے متاثر ہوتے رہے، اور اپنے تاثرات کا اظہار اپنی نظموں میں کرتے رہے، اس کی بھی تفصیل ذکر کر کے مصنف نے اپنے ناظرین کو محظوظ کیا ہے، مثلاً جلیانوالہ باغ کے المناک حادثے پر یہ اشعار کہے:

ہر ذرہ اس چمن سے کہتی ہے خاک یاس — غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم — تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مولانا محمد علی گرفتار ہو کر قید کیے گئے، تو ایک نظم اسیری کے عنوان سے لکھی، اس کا آخری شعر یہ ہے:

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست — ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ است

مولانا محمد علی خلافت کا وفد لے کر لندن گئے تھے، وہاں سے یہ وفد ناکام واپس آیا تو لکھا:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے — مگر آج ہے وقت خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خرید یں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چنیں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی

ترک موالات اور تحریک خلافت کے زمانے میں آغا خاں نے محمد علی جناح کے ذریعہ سے مسلم لیگ کے احیاء کی کوشش کی، جس سے عام خیال ہوا کہ اس کے ذریعہ سے ملوکانہ سیاسی حکمت عملی پیش کی جائے گی، اس وقت ڈاکٹر صاحبؒ نے اشعار لکھ کر آغا خان اور محمد علی جناح دونوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا:

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر — اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں — اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے — مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب — اس دین میں ہے ترک سواد حرم مباح

بُشریٰ لکم کہ منتظر ا رسیدہ است یعنی حجاب "غیبتِ کبریٰ" دریدہ است

جنگِ عظیم کے بعد فاتح اقوام کی دھاندلی، ان کی ابلیسانہ سیاست، سرمایہ داروں کی عیاری سے زوروں کی بیداری، ترکانِ آلِ عثمان کی بے بسی اور بے دست پائی سے متاثر ہوئے تو ایک نظم لکھی جو خضرِ راہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے تیس [30] ہزار کے مجمع میں پڑھا، اور اس کا جب یہ شعر پڑھا تو رو پڑے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ ؛ خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہونچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا مجمع بھی اشکبار تھا:

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو ؛ مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا، مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی بننی چاہیے، یہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا، مسلمانوں نے مندر کے پاس ایک قطعۂ اراضی لے کر نمازِ عشاء کے بعد اس کی بنیاد ڈالی اور صبح تک مسجد کی عمارت مکمل کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کے اس جذبۂ دینی سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی جس کا ایک چبھتا ہوا شعر یہ ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے ؛ من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب عملی سیاست میں تو زیادہ پیش پیش نہیں رہے لیکن وہ ہر سیاسی معاملہ میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے، مثلاً وہ خلافتِ عثمانیہ کا کوئی مستقبل نہیں دیکھ رہے تھے اس کے بجائے وہ برٹش کامن ویلتھ کی طرح مسلم کامن ویلتھ چاہتے تھے۔ ان کی زندگی میں ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا، مگر آج کل اسلامی ممالک کے سربراہوں کی اجتماعی کوششوں میں اس خواب کی تعبیر نظر آتی ہے، مسئلہ خلافت پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدمِ تعاون کی تحریک میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف رہے، اس لیے کہ انھیں خدشہ تھا کہ کہیں ایسے اشتراک اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قومیت متحدہ کے داعی ان کی علاحدہ

لی حیثیت کو ختم نہ کر دیں، (ص ۲۴۸) جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو گاندھی جی نے ان کو لکھا کہ وہ اس کا چارج لیں لیکن اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ ہندوستانی مسلمان دوسرے قوموں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں، بنیادی طور پر انھیں ادب اور فلسفہ کی نہیں بلکہ تکنیکاتی تعلیم کی ضرورت ہے (ص ۲۹۲) وہ مسلم ممالک میں مغربی طرز کی نیشنلزم کے فروغ سے بھی خوش نہ تھے۔ (ص ۲۹۳) لیکن ان کا عقیدہ رہا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا، اور جس قوم نے آج تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے، اس کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا، (ص ۲۶۵) اور پھر ۸ ر دسمبر ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی عمر یورپ کے فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی، خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغ بہت اچھے عطا فرمائے تھے، اگر یہ قویٰ دینی علوم پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسولؐ کی کوئی خدمت کر سکتا ...... بہر حال جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا، اور زندگی تمام و کمال نبی کریمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔ (ص ۲۶۵)

اسی باب میں کشمیر کے ایک پیرزادہ کا ذکر ہے جس نے اپنے ایک خواب میں دیکھا کہ نماز کی ایک صف میں ڈاکٹر صاحبؒ حضور سرور کائناتؐ کے دائیں جانب کھڑے ہیں (ص ۲۶۷) کیا عجب کہ روز محشر میں ڈاکٹر صاحبؒ اپنے پاک اور مطہر اسلامی جذبات کی بنا پر حضور سرور کائنات صلعم کے دائیں جانب کھڑے نظر آئیں۔

اس کتاب کا آخری باب ہندو مسلم تصادم کا ماحول کے عنوان سے ہے جس میں ہندوستان کے اندر اس زمانہ میں جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان کی تفصیل بیان کر کے ان کے اسباب کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے، ان اسباب سے ناظرین کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ان کا مطالعہ ہر لحاظ سے مفید ہوگا، اسی کے ساتھ مسلم لیگ کے احیاء اور ڈاکٹر صاحبؒ کے خلاف لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال کا تعصب اور ان کی کردار شکنی کی بھی تفصیل ہے، آخر میں جب ڈاکٹر صاحبؒ نے نجد کے سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دیا تو اس پر بعض علماء نے ان پر جو کفر کا فتویٰ دیا اس کا بھی ذکر ہے، مگر اس باب میں ڈاکٹر صاحبؒ کے ذاتی اور خانگی حالات

میں ہے یا اس زمانہ میں ان سے جو شعری کمالات کا اظہار ہوا اس سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے لاہور
ورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لعل نے ڈاکٹر صاحبؒ کے لیے خان صاحب کے خطاب کی سفارش کرنے کا
ہ کیا، مگر ان ہی دنوں گورنر پنجاب کی سفارش سے ان کو سر کا خطاب ملا تو بعض اخبارات کے کالموں میں
پر طنز آمیز چوٹیں کی گئیں اور ان کے ایک پرانے دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے ان کو ایک خط میں
ریہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اب وہ شاید آزادئ رائے کا اظہار نہ کر سکیں، انھوں نے اس کا جو جواب دیا اس سے
آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں، لکھتے ہیں:

"وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں
میری جان اور آبرو ہے، اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا
اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی، ان شاء اللہ اقبال کی زندگی
مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔" (ص ۲۶۹)

یہ خطاب ان کو جنوری ۱۹۲۳ء میں ملا، اور اوپر انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا، اس کا ثبوت مارچ ۱۹۲۳ء
میں طلوع اسلام لکھ کر دیا، جب ترک مجاہدین نے سمرنا سے یونانیوں کو نکال کر اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے اپنی ہستی
بہ نوک شمشیر تسلیم کرا یا، اس نظم کے متعلق اہل الرائے کا خیال ہے کہ اس نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا
سہارا دیا، ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراط مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا۔

اسی سال یعنی مئی ۱۹۲۳ء میں ان کی مشہور مثنوی پیام مشرق شائع ہوئی تو بعض حلقوں سے
یہ آواز اٹھی کہ وہ انتہائی خیالات رکھنے والے بولشویک اور اشتراکی ہو گئے، انھوں نے اس کی تردید
۲۴؍ جون کے زمیندار میں یہ لکھ کر کی:

"بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے ..... میں
مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی

اس نظام کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے، لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث، حرمت ربوٰ، اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے، اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے......
مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہے، اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے...... مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے، یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے، موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی، ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں.. مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔" (ص ۲۷۹)

یہ تحریر ۵۰ سال پہلے لکھی گئی تھی، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کے اس پیام میں اب بھی تازگی ہے، جو مسلمانوں کے لیے قابلِ غور اور لایقِ فکر ہے،

اس باب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی پیدائش کی جو تفصیل لکھی ہے، وہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اقبالؒ کی دونوں بیویاں سردار بیگم اور مختار بیگم ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک اولاد سے محروم رہیں، مگر عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں دونوں قریباً ایک ہی وقت امید سے ہوئیں دونوں

ختمنا آپس میں بے حد محبت تھی، اس لیے طے پایا کہ دونوں اپنی اپنی اولاد کا تبادلہ کر لیں گی، اور ایک کی اولاد دوسری پالے گی، اقبال کو جب معلوم ہوا کہ ان کی دونوں بیگمات امید سے ہیں تو ۱۹۲۴ء کی گرمیوں میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر سرہند شریف پہونچے اور دعا کی کہ اگر خدائے تعالیٰ انھیں اولاد نرینہ سے نوازے تو پھر اسے احیائے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اسی طرح انجام دینے کی توفیق عطا کرے جس طرح احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کو عطا کی تھی۔" (ص ۲۸۲)

مختار بیگم کی وفات تو بچے کی پیدائش سے پہلے ہوگئی، لیکن سردار بیگم سے جاوید اقبال کی ولادت باسعادت سیالکوٹ میں ۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ہوئی۔ اس لحاظ سے وہ ستاون سال کے ہو چکے ہیں یہ وہ عمر ہے جس میں وہ اپنے والد بزرگوار کی خواہش کے مطابق احیائے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں کوشاں ہو سکتے ہیں۔ خدا کرے یہ صورت کسی طرح عمل میں آجائے۔ آمین۔

ان کی والدہ کے کردار کا یہ بہت ہی روشن پہلو ہے کہ مختار بیگم کی وفات کے بعد ان کی جدائی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی، گھر میں تنہا بیٹھی رویا کرتی تھیں، ڈاکٹر صاحبؒ نے انھیں صبر کرنے کی تلقین کی، مگر وہ یہی کہتیں کہ مرحومہ کی گیارہ سالہ رفاقت کے بعد وہ شدید تنہائی محسوس کرتی ہیں، انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مرحومہ کی کسی خالہ زاد بہن سے ڈاکٹر صاحبؒ عقد کر لیں، تاکہ مختار بیگم کی بجائے ان کی بہن کی رفاقت میسر آجائے، لیکن یہ صورت ممکن نہ ہو سکی، مگر سردار بیگم کا یہ کردار ان عورتوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو سوکنوں کو کسی حال میں پسند نہیں کرتی ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان سب واقعات کو کچھ ایسے انداز میں لکھا ہے کہ اس زندہ رود شاعر کی سوانح حیات کو پڑھتے وقت کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک جلیل القدر شاعر کی سوانح عمری پڑھ رہے ہیں جس کی حقیقت اور معروضیت ایسی ہے کہ ان کے داغوں اور پھوڑوں کے آبگینے سامنے آجاتے ہیں، کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم شعر و ادب کے ایک ناقدانہ تبصرہ سے محظوظ ہو رہے ہیں، کبھی

لا اور بین الاقوامی سیاست کی محفلوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے
ہم کوئی رومانی ناول پڑھ رہے ہیں، اور جب یہ کتاب ختم ہوئی تو یہ اثر طاری ہوا کہ ایک
یذ اور شیریں کہانی ختم ہو گئی، جو ابھی ختم نہ ہونی چاہیے تھی، اب اس کی تیسری جلد کا انتظار
بے چینی سے رہے گا، اس کتاب کے مطالعہ کے زمانہ میں جناب سید نذیر نیازی کی کتاب
انائے راز' بھی تبصرہ کے لیے پہونچی، دونوں میں بڑا فرق محسوس ہوا، زندہ رود کے پڑھنے
سے جو لذت محسوس ہوئی وہ 'دانائے راز' میں محسوس نہیں ہوئی، خیال ہوا کہ 'دانائے راز' کے
مصنف کی طرح 'زندہ رود' کے مصنف کو بھی کافی عرصہ تک علامہ کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کے ضمیر بردار ہونے کا
موقع ملتا تو پھر معلوم نہیں 'زندہ رود' اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کیا چیز اور ہو جاتی، اس کے
پڑھنے میں لذت اس لیے بھی ملتی ہے کہ یہ ایک باپ کی کہانی ایک بیٹے کی زبانی ہے، مگر اس کا
طرزِ بیان کچھ ایسا ہے کہ شروع سے آخر تک یہ ایک بیٹے کے بجائے ایک غیر جانبدار اور
حقیقت پسند مصنف کی قلمی گل کاری معلوم ہوتی ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحبؒ نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے جلسہ میں چند
از معلومات اور محققانہ خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، ان میں انھوں نے عربی مآخذ کی روشنی
میں ثابت کیا ہے کہ اسلامی فتوحات سے بہت پہلے مسلمان عربوں کی آمد و رفت جنوبی ہندوستان
شروع ہو چکی تھی، جہاں ان کی نو آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، جن میں ان کا اپنا دینی نظام، دار القضا
دار الافتاء وغیرہ تھا، مقامی راجاؤں سے انھوں نے بڑے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے تھے۔

طبع دوم عکسی

قیمت — ۱۲ روپیے
" مجلد "

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنجشکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات "راحت القلوب" کا مطالعہ

از

مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۳)

روایت (۶) | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ قطب الاسلام خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ایک دن میں اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ ملتان میں تھے، اس زمانہ میں قباچہ[۱] ملتان کا حاکم تھا، وہ آیا اور اس نے کہا کہ مغل (تاتاری) شہر کے نزدیک پہونچ گئے ہیں آپ کا کیا حکم ہے؟ حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ کے پاس ایک تیر تھا آپ نے وہ اسے دیا اور فرمایا کہ جاؤ! اسے ان کی طرف چلا دو، اس نے ایسا ہی کیا، چنانچہ ایک بھی نہ رہا، سب ہی بھاگ گئے۔ (راحت القلوب ص ۱۹)

یہ روایت خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، میں ان دونوں کتابوں سے اس روایت کے آخری جملے نقل کرتا ہوں، تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے:

---

[۱] ناصر الدین قباچہ سلطان قطب الدین ایبک کا داماد تھا، جو قطب الدین ایبک کی وفات سنہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء کے بعد ملتان، اُچ اور سندھ کا خود مختار حاکم بن گیا تھا، سنہ ۶۲۲ھ/۱۲۲۶ء میں شمس الدین التمش نے اسے شکست دی، وہ کشتی میں بیٹھ کر بھاگا، کشتی ڈوب گئی، قباچہ بھی مر گیا، اس کا عہد حکومت سنہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تا ۶۲۲ھ/۱۲۲۶ء ہے، پندرہ برس حکمراں رہا۔

"بحکم اشارت خواجہ پنہاں کرد، یک نفر مغل
نماندہ بود، ہمہ رو بگریز نہادند۔"

(راحت القلوب ۱۸-۱۹)

"تا چہ پنہاں کرد، چوں روز شد یک تن از
کافر نماندہ، ہمہ رفتہ بودند۔"

(فوائد الفواد ص ۱۰۰)

غور طلب یہ ہے کہ ابہام مغل میں ہے یا کافر میں ہے، رو بگریز نہادن روزمرہ بھی ہے اور محاورہ بھی ہے، کیا ہمہ رفتہ بودند پر ترجیح نہیں ہے، العاقل تکفیہ الاشارۃ یہ واحد مثال ہی اسلوب کی جزالت اور بیان کی جامعیت کی اور روایت کے حسن ترتیب کی بین دلیل ہے۔

روایت (۷) | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ جب برادرم شیخ بہاء الدین زکریا قدس اللہ سرہ العزیز کا وقت آخر قریب آیا تو آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ صدر الدینؒ دروازے پر کھڑے ہوئے تھے، ایک شخص آیا اور ایک ملفوف خط انہیں دیا، اور کہا: اسے کھولنا نہیں، بند کا بند ہی اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر دینا مجھے یہی حکم ہے کہ یہ خط میں آپ کو دوں اور آپ اسے شیخ بہاء الدین زکریا کو پہونچا دیں، تاکہ وہی اسے پڑھیں، شیخ صدر الدینؒ نے سرنامہ پڑھا تو زار و قطار رونے لگے، اور کہا: یہ طلب دوست کیا ہے، ملک الموت ہے جو اس روپ میں آیا ہے، اس نے کہا: ہاں، یہی بات ہے، شیخ صدر الدین نے کہا: تم خود ہی کیوں نہیں چلے جاتے، اس نے کہا: مجھے حکم یہی ہے کہ میں تمھیں دوں اور تم خدمت شیخ میں پیش کرو، جب شیخ صدر الدین خط لے کر حاضر ہوئے تو شیخ بہاء الدینؒ مشغول تھے جب فارغ ہوئے تو شیخ صدر الدینؒ نے بڑے ادب سے خط پیش کیا، شیخ بہاء الدینؒ نے خط لیا، کھولا اور پڑھا، صاحبزادے سے کہا: تم چلے جاؤ، پھر سجدہ کیا اور جان بحق تسلیم کی، اندر سے آواز آئی کہ شیخ بہاء الدینؒ دوست سے جا ملے[1]۔۔۔۔ (راحت القلوب ص ۲۰-۲۱)

خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، اگرچہ مختلف اشخاص کے بیان میں

---

[1] شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وفات بروئے تحقیق ۶۶۶ھ ہجری ہے، جنھوں نے ۶۶۱ھ لکھا ہے غلط لکھا ہے۔

میز فرق ہوتا ہے، لیکن موازنہ میں دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک ہی مضمون یا ایک ہی خیال کو کس نے زیادہ خوبی سے ادا کیا ہے، اس روایت کے آخری جملے دونوں کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں جو خود منہ سے بولیں گے اور بتائیں گے کہ کس کا کیا مقام ہے:

این مکتوب بدست شیخ داد، چون شیخ این مکتوب
را بستد باز کرد و بشرف مطالعہ مشرف گشت
ز مرد و در شور، آنگاہ سر بسجدہ نہاد و جان
بداد، آواز درون نعرہ برآمد کہ شیخ بہاءالدین
بدوست پیوست۔ (راحت القلوب ص ۲۰-۲۱)

آن نامہ را بدست شیخ بہاءالدین داد
رحمۃ اللہ علیہ، شیخ چون آن نامہ را بخواند
بپچید و نعرہا خاست، و شب را
واقعۂ شیخ شد
(فوائد الفواد ص ۲۲۱)

دونوں بیان پیش نظر ہیں، جو منہ سے پڑھے بول رہے ہیں کہ واقعہ کی صحیح عکاسی کس میں ہے، پوری کیفیت کا ترجمان کون سا بیان ہے، اور تشنہ و ناتمام کون سا ہے، "نعرہا خاست" کیا ہے، اگر مبہم نہیں ہے تو اس کا مفہوم کیا یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں جو خلاف واقعہ ہے۔ اس سے کب یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اندر سے آواز آئی کہ شیخ بہاءالدینؒ اللہ سے جا ملے۔ یہ کیا پیارا اسلوب ہے، مرزا غالب کو شاید ایسوں ہی سے واسطہ پڑا تھا جو انھوں نے کہا تھا ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ   پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

مختصر یہ ہے کہ راحت القلوب کی روایت کو زبان و بیان اور حسن ترتیب کے اعتبار سے پوری پوری فوقیت ہے، جو اس کے معتبر ہونے کی بین دلیل ہے۔

روایت (۸) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیر شیخ نجم الدین کبریؒ کو خواب میں دیکھا کہ یہ فرماتے ہیں کہ تمھارا بہت اشتیاق ہے، تم آجاؤ، شیخ سیف الدینؒ اس ہفتے متواتر وعظ کہتے رہے، اور ان مواعظ میں جدائی اور فراق کا ذکر فرماتے رہے، سب وعظ سننے والے

چونکہ یہ فراق و جدائی کے مضامین متواتر کیوں بیان کر رہے ہیں، آخر ایک دن جب آپ نے وعظ ختم کیا تو حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے مسلمانو! یہ بات جان لو کہ میرے پیر نے مجھے بلایا ہے اور خواب میں کہا ہے کہ اب چلے آؤ، لہٰذا اب میں جاتا ہوں، فراق و جدائی کے مضامین بیان کرنے کا مدعا یہی تھا منبر سے اتر آئے اور گھر چلے گئے، جس رات آپ کا انتقال ہونے والا تھا، سب دوست بیٹھے تھے، مشعل روشن کر رکھی تھی اور شیخ سیف الدینؒ پر فراق کی کیفیت طاری تھی، کوئی تین گھنٹے رات گذری تھی کہ ایک بزرگ آئے، جو اون کا لباس پہنے اور ہاتھ میں ایک سیب لیے ہوئے تھے آئے، زمین بوس ہوئے اور وہ سیب شیخ سیف الدینؒ کو دیا، جیسے ہی آپ نے اسے سونگھا جان بحق تسلیم کی۔ (راحت القلوب ص ۲۱)

یہ روایت خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ نے بھی نقل کی ہے، اختلافِ بیان تو فطری شے ہے، لیکن سیب حاصل ہونا یا نہ ہونا امر دیگر ہے۔ اس روایت کے بھی آخری جملے بالمقابل نقل کیے جاتے ہیں، تاکہ موازنہ کی ترازو میں تول کر فیصلہ کیا جا سکے:

تذکیر تمام آورد، روے سوے جمع آوردہ
گفت کہ اے مسلمانان بدانید کہ پیر من مرا در
خواب می خواند من می روم خیرباد این بوکہ
گفتم، فرود آمد در خانہ رفت، ہماں شب کہ
نقل خواہند کرد جملہ اصحاب نشستہ بودند مشعل
می سوختند و شیخ سیف الدینؒ در فراق، پاسے
از شب گذشتہ کہ بزرگے صوف پوشیدہ سیب
در دست گرفتہ بیامد، روئے بر زمین آورد،
و آں سیب بدست وے داد، بوی کردن ہماں

چوں تسمیہ تمام کرد، بعد ازاں روے
سوئے جمع کرد و گفت اے مسلمانان
بدانید و آگاہ باشید کہ پیر من مرا در
خواب گفتہ است کہ بیا، من می روم،
خیرباد، این بگفت و از منبر فرود
آمد، ہمدراں نزدیکی نقل فرمود،
(فوائد الفواد ص ۲۳۲)

بردہ وجاں تحفہ تسلیم کردن ہائی۔

(راحت القلوب ص ۲۱)

غور طلب، بلکہ تصفیہ طلب یہ ہے کہ تکمیل کے سر و سامان سے کون سا بیان آراستہ ہے، اور کس سے طلب اور تشنگی رفع ہوتی ہے۔ نگارش کے ایجاز سے کس میں سقم پیدا ہو گیا ہے اور کس میں نہیں، کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اطناب کے وصف نے مفہوم کو خبط کر دیا ہے اور مقصود و معنی بدل گئے ہیں، یا اسے نقل میں بے احتیاطی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور کیا اس سے وضع و تحریف کی نشان دہی ہوتی ہے؟ نہیں! یہ سب وساوس ہیں، اور علمی و ادبی قدروں سے کم آگاہی کی علامت ہے، راحت القلوب کی عبارت نہایت سنجیدہ و برجستہ، روزمرہ و محاورہ کے مطابق، استقام، اطناب و ایجاز سے پاک سادہ و دلآویز ہے، آخری جملہ کہ یوں کردن ہماں بردہ وجاں تحفہ تسلیم کردن ہماں پورے بیان کی جان ہے جو کسی اہل زبان صاحب کمال ہی کے قلم سے نکل سکتا ہے، اس کے سامنے اس جملے کی کیا حیثیت ہے کہ ہماں نزدیکی نقل فرمود، حق یہ ہے کہ راحت القلوب میں جا بجا حضرت بابا صاحبؒ کے بے مثل اسلوب کا پر تو اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے کمال علمیت کی آب و تاب جلوہ فرما ہے، جو آج بھی اہل دل کو مسخر کیے لیتی ہے، حالانکہ مدت مدید سے راحت القلوب کس مپرسی کے عالم میں ہے اور جواب اوراق منتشرہ کا مجموعہ ہے، جب اچھا وقت ہوگا تو کیا عالم ہوگا، راحت القلوب زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔

روایت (۹) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ رمضان کا مبارک مہینہ آ ہی گیا ہے، کوئی ہے کہ میں تراویح میں قرآن پاک ختم کیا کروں، (حضرت محبوب الٰہیؒ لکھتے ہیں کہ) سب ہی آمادہ ہو گئے، زہے نصیب ہوئے اور عرض کیا کہ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی، پھر حضرت بابا صاحبؒ ہر شب تراویح میں دو قرآن پاک ختم فرماتے، ہر رکعت میں اکثر دس پارے پڑھتے، اور ابھی کوئی تین گھنٹے رات رہتی کہ تراویح سے فارغ ہو جاتے تھے (حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ) اس مہینہ میں بھی تراویح میں شریک رہا، (راحت القلوب ص

نسخہ شیخ سیف الدین باخرزی کا نسخۂ رقات بروئے تحقیق ۱۰۹۳ھ ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق ہے۔

یہ روایت بہت پُرلطف اور سبق آموز ہے، زبان و بیان کی جامع بھی ہے، اس لیے جو [illegible] اس سے کما حقہٗ آگاہی نہیں رکھتے وہ غلط سمجھتے اور الجھ کر رہ جاتے ہیں، مثلاً حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا: "اینک ماہِ مبارک رمضان است" جو صاحب اس کے معنی یہ سمجھے کہ "یہ رمضان کا مہینہ ہے" وہ غلط سمجھے اور غلط تاریخی اندراجات کا ارتکاب کر بیٹھے، مگر اینک نے اس کارستانی کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے۔

اینک مرکب ہے حرف اشارہ "این" قریب اور کاف تصغیر سے۔ مدعا یہ ہے کہ جس طرف اشارہ ہے وہ قریب تر تو ہے، مگر ہلکا سا فصل بھی ہے، یہ ایسا ہی اسلوب ہے جیسا کہتے ہیں کہ اب تو رمضان آ ہی گیا ہے کل نہیں تو پرسوں پہلا روزہ ہے، جس طرح "آ ہی گیا ہے" کا مدعا یہ نہیں کہ ماہ رمضان میں یہ جملہ کہا گیا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ آنے والا ہی ہے اور قریب تر ہے، اسی طرح حضرت بابا صاحبؒ کے اس ارشاد کا تعلق انتیس ۲۹ یا تیس ۳۰ شعبان سے ہے، لہٰذا مجلس کے آغاز میں ۵ رمضان کا اندراج غلط اور بالکل غلط ہے، اسے وہی صحیح جانے گا اور اس پر اعتماد کرے گا جو اسالیب بیان کی نزاکتوں سے بے بہرہ ہوگا، اگر یہ کہنا ہوتا کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے تو کہہ دیا جاتا "این ماہ مبارک رمضان است" کاف تصغیر کی ضرورت ہی کب تھی۔

جنھوں نے تدریس کی تربیت پائی ہے اور مجموعی سوالات کی اہمیت سے آگاہ ہیں وہ اس رمز سے بھی آگاہ ہیں کہ بعض اوقات مجمل سوال مفصل سے افضل ہوتا ہے، جو سب ہی کو متاثر کرتا ہے، زباں داں بھی ایماء و اشارہ کو صراحت پر ترجیح دیتے ہیں، ان نکات کا تعلق علم بیان و معانی سے ہے، حضرت بابا صاحبؒ کا یہ ارشاد کہ "کسے باشد کہ در نماز تراویح ختم قرآن کند" انہی اوصاف کا جامع ہے، جو نفسیات کے ماہر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عمومی حالات میں تحریص و ترغیب زیادہ کارآمد ہوتی ہے بمقابلہ تحکیم کے، لہٰذا حضرت بابا صاحبؒ کا مذکورہ جملہ علمی و ادبی اوصاف کا ایسا دلپذیر مرقع ہے جو تعریف و توصیف سے بالاتر ہے، اگر کوئی نہ سمجھے تو یہ اس کے فہم کا قصور ہے، عہد حاضر کے کم علم یک پاس کے معنی بھی خال خال ہی

جانتے ہیں، اس کے معنی ہیں تین گھنٹے کا وقفہ، ڈیڑھ گھنٹہ قرار دینا مضحکہ خیز ہے، اس روایت میں ایک جملہ یہ بھی ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کا نوشتہ ہے کہ در ہر رکعت دہ سیپارہ اکثر خواندے۔ اس میں اکثر صفت ہے، جو موصوف کی افزونی کو بتاتی ہے، اور جو بطور استثنا اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے، موصوف کبھی اسم ہوتا ہے اور کبھی فعل، اردو فارسی میں یکساں مروج ہے، مذکورہ جملے میں اکثر صفت خواندے کی ہے اس کو دہ سیپارہ کی صفت قرار دینا اور دہ سیپارہ اکثر کے یہ معنی بیان کرنا کہ دس سیپاروں سے کچھ زیادہ غلط ہے، اگر وہ سیپارہ کی صفت ہوتی تو دہ سیپارہ کو پیشتر ہوتی، لہٰذا اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ حضرت باباصاحبؒ اکثر و بیشتر ہر رکعت میں دس پارے پڑھتے تھے، یہ نہیں ہے کہ دس سے زیادہ پڑھتے تھے، یہ غلط معنی بیان کرنا علم صرف و نحو سے بے بہرہ ہونے کی دلیل ہے، اگر دس سے زیادہ بتانا مقصود ہوتا تو کہتے دہ سیپارہ اکثر خواندے و تعدد دیگر خواندے۔

اب رہا یہ بات کہ حضرت باباصاحبؒ ہر شب تراویح میں دو قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے، اور تین گھنٹے رات باقی رہتی تھی کہ آپ فارغ ہو جاتے تھے، یہ حیرت انگیز ضرور ہے، مگر اولیاء اللہ کو اس کا وقوع ناممکن نہیں ہے ع کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ اس تعداد سے کہیں زیادہ تلاوت کرنا بعض اولیاء اللہ سے ثابت ہے، فوائد الفواد اور سیرالاولیاء کو نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل بتایا جاتا ہے، اور اس میں کلام بھی نہیں، اور یہ بھی مانا جاتا ہے کہ ان کتابوں میں جو حصہ کرامات وغیرہ سے متعلق ہے، وہ غیر محتاط بیانوں سے پاک ہے، لہٰذا اگر فوائد الفواد اور سیرالاولیاء میں ایسا ہی کچھ ملتا ہے تو پھر مذکورہ وقفے میں دو قرآن پاک پڑھ لینے میں شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے:

"پیر گفت من روزے ہفت صد بار ختم قرآن می کنم .... و گفت ملفوظاً لا مو وماً"

(فوائد الفواد ص ۷)

اور یہ بھی ہے:

"یکے از مریدان خاص بود، سوال کرد کہ ایں گر کرامت باشد، خواجہ فرمود آرے، کرامت باشد"

(فوائد الفواد ص ۶)

یہ بھی فرمایا:

"شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ شبے روئے بسوئے حاضراں کردہ گفت کسے باشد از شما کہ شب دو رکعت نماز کند، و در یک رکعت ختم قرآن کند، از حاضراں کسے ایں معنی متکفل نہ گشت، شیخ بہاء الدین پیش رفت و در یک رکعت ختم قرآن کرد، چہار سپارہ دیگر بخواند، و در رکعت دوم سورۂ اخلاص خواندہ نماز تمام کرد۔" (فوائد الفواد ص ۶)

خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ مزید لکھتے ہیں:

"ملائم ایں معنی حکایت دیگر فرمود کہ شیخ بہاء الدین علیہ الرحمۃ گفتے کہ ہر چہ بمن رسید از نماز داد و اوراد مشائخ از ہمہ بکردم، مگر یک چیز نتوانستم کرد، آں چناں بود کہ بمن رسانیدند کہ فلاں بزرگ ابتدا از صبح تا طلوع آفتاب ختم قرآن می کند، ہر چند کہ بخواستم نتوانستم۔" (فوائد الفواد ص ۶)

حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشادات سے یہ واضح ہے کہ ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں جو روزانہ سات سو مرتبہ قرآن پاک ختم کر لیتے تھے، شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ایک رکعت میں ایک قرآن پاک ختم کیا، اور چار سپارے مزید پڑھ لیے، شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے بقول ان کے معاصرین میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو آغاز صبح سے طلوع آفتاب تک ختم قرآن فرمالیا کرتے تھے، شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اس امر کو ناممکن قرار نہیں دیا، بلکہ اتباع کی کوشش فرمائی، یہ اپنی جگہ ایک بات ہے کہ ان کی مشق و مہارت نے ساتھ نہیں دیا، مگر وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ یہ ممکن ہے، اور ظن غالب یہ ہے کہ انجام کار وہ اپنی سعی میں کامیاب بھی ہو گئے رہوں گے۔

ے کسے باشد کا محلِ استعمال ذہن نشین رہنا چاہیے اور دیگر بخواندے کا بھی۔

امیر خورد کرمانی بھی اس نقطۂ نظر سے متفق و متحد ہیں، چنانچہ ناصر الملۃ والدین حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کے مبارک ذکر میں لکھتے ہیں:

"تمامی کلام اللہ خواجہ ابو یوسف را محفوظ شد، چنانکہ ہر روز پنج ختم کردے گفت" (سیر الاولیا ص ۴۲)

امیر خورد کرمانی کے اس بیان کی تصدیق فوائد السالکین سے بھی ہوتی ہے، قطب الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی نے حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی کے مبارک ذکر میں فرمایا:

"در آخر عمر کار بجائے رسید کہ ہر روز پنج بار ختم قرآن کردے، بعد ازاں در تلاوت دیگر شدے"

(فوائد السالکین مجلس پنجم ص ۲۷)

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ سیر الاولیاء کا ماخذ فوائد السالکین ہی ہے، البتہ فوائد السالکین کے بیان میں سیر الاولیاء کے بیان سے زیادہ جامعیت ہے، جب پانچ پانچ قرآن پاک ہر روز ختم کیے جا سکتے ہیں تو آٹھ سات گھنٹے میں دو قرآن پاک ختم کر لینے میں کیا کلام ہو سکتا ہے، اب کوئی جوشِ عقیدت سے کنارہ کش ہو کر گنتی گنے اور حساب لگاتا رہے، لیکن ہرگز حقیقت تک رسائی نہ ہو گی، کیونکہ ان واقعات کا تعلق حضرت محبوب الٰہی کے ارشاد (آں سے کرامت باشد) کے مطابق کرامت سے ہے، جو حساب لگانے اور گنتی گنتے رہنے سے گرفت میں نہیں آ سکتے، حقیقت حال یہ ہے کہ جو قومیں آمادۂ زوال ہوتی ہیں یا ہو چکی ہوتی ہیں، ان اقوام کے بعض تعلیم یافتہ اشخاص کا ذہن لطیف حقایق کے ادراک کی صلاحیت سے عاری ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے انھیں اپنے اکابر کے کارناموں سے انکار کرتے ہی بن پڑتی ہے، یہ قوم کی بدحالی کی علامت ہے، فالِ نیک نہیں ہے۔

الغرض ان تشریحات سے وہ عقدے حل ہو جاتے ہیں جن تک سطحی اذہان کی رسائی نہیں ہے اور اس روایت کا اس طرح نقشہ عمل بنتا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ عشاء کی نماز کے بعد تراویح میں قرآن پاک اس طرح تلاوت فرماتے کہ چار رکعت میں دس دس پارے پڑھتے اور چھ رکعت میں بیس پارے پڑھ لیتے

باقی دس رکعات میں سورۂ اخلاص پڑھتے اور تین گھنٹے رات رہے فارغ ہوجاتے تھے، اس صورت حال میں
"در ہر رکعت دہ سیپارہ اکثر خواندے" اور سورۂ اخلاص کی مواظبت برقرار رہتی ہے جس کا ذکر حضرت محبوب الٰہی
کی مبارک زبان پر آیا ہے، آپ نے فرمایا؛

"پیش شیخ من در تراویح سورۂ اخلاص می خوانند" (سیر الاولیاء ص ۳۶۹ ج)

ان تشریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ روایت اکابر صوفیہ کرام کے احوال و اعمال کے عین مطابق ہے
اور کسی دانشور کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے، الحمد للہ وہ جملہ شبہات رفع ہوگئے جو فارسی زبان سے کم آگاہی
اور اصول تصوف سے عدم واقفیت اور احوال و اعمال صوفیہ سے بے خبر ہونے کی بنا پر لاحق تھے، یا ہوسکتے
یا ہوسکتے ہیں، وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

روایت (۱۰) | حضرت محبوب الٰہیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت بابا صاحبؒ شیخ جمال الدین اوچیؒ کا ذکر فرما رہے تھے
کہ اتنے میں ایک بوڑھا جوگی کہیں دور سے آیا جس نے مجاہدے بھی بہت کیے تھے، اور حضرت بابا صاحبؒ
کی خدمت میں زمیں بوس ہوا، اور خاصی دیر زمین پر سر دھرے رہا، حضرت بابا صاحبؒ نے للکار کر کہا: سر
اٹھاؤ، اس نے سر اٹھایا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا، حضرت بابا صاحبؒ نے دریافت کیا: کیسے ہو؟ کہاں سے
آئے ہو؟ اچھے ہو، خوش ہو؟ کئی بار دریافت کیا تو اس نے دبی دبی زبان سے کہا، خوف کے مارے مجھ سے
بولا نہیں جاتا۔

حضرت بابا صاحبؒ نے مجھ سے (حضرت محبوب الٰہیؒ سے) کہا کہ یہ جوگی بڑے دعوے سے آیا تھا
جیسے ہی اس نے سر زمین پر رکھا تو میرے جی میں آیا کہ یہ یوں ہی زمین پہ سر رکھے رہے، ایسا ہی ہوا، اس
کئی بار سر اٹھانے کی کوشش کی، مگر اٹھا نہ سکا، اگر توبہ نہ کرتا تو قیامت تک یوں ہی رہتا۔

پھر حضرت بابا صاحبؒ نے جوگی سے دریافت کیا کہ تم نے کیا کمال حاصل کیا ہے؟ تو اس نے کہا
جوگیوں کے ہاں کمالیت یہ ہے کہ جوگی ہوا میں اڑنے لگے، آپ نے فرمایا: اچھا تو ہمیں بھی دکھاؤ، جوگی

دا میں پرواز کی تو حضرت بابا صاحبؒ نے اپنی نعلین مبارک کو تیر کی طرح چلتا کیا، اللہ کے حکم سے وہ نعلین جوگی کے سر پر جا پہنچی، جوگی جدھر کا رخ کرتا نعلین اس کے سر پر پڑتی، فوراً اتر آیا، اور کہا کہ جس کی نعلین کا یہ مقام ہے، وہ خود کیسا ہوگا، پھر ایمان لایا اور واصلانِ حق میں سے ہوگیا۔ (راحت القلوب ص ۲۷-۲۸)

یہ روایت بہت سے اوصافِ درویشی کی جامع ہے، شاذ و نادر ہی ایسی روایات ہیں، تاوقتیکہ اوصافِ درویشی سے متعلق بعض مبادیات سے آگاہی نہ ہو، ذہن اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اس لئے صوفیۂ کرام کے اسلوبِ اصلاح کو ذہن نشین رکھنا مقدم ہے، اور اگرچہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے، مگر تفصیل کا محل نہیں ہے، مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم وسیع المطالعہ، وسیع المشرب اور نفسیاتِ انسانی سے کمال آگاہی رکھتے تھے، صوفیۂ کرام کے طریق اصلاح کے بارے میں ان کے مطالعہ کا ماحصل یہ ہے:

"صوفی ہر ایک کے مزاج طبیعت کو دیکھتا ہے اور جیسی جس کی طبیعت کی افتاد ہوتی ہے اسی ڈھنگ سے اس کی تربیت کرتا ہے اور اسی میں بعض اوقات وہ شریعت سے تجاوز کرنے یا ارکان و اصول کو ترک کرنے میں بھی مضائقہ نہیں کرتا، اس کی نظر انجام پر رہتی ہے .... اصل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے۔ .... وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے اور دلوں کو ٹٹولتا ہے، اور اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ دلوں کی تہ تک پہونچتا ہے، جہاں انسان کے اصلی اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں جن سے ہم خود بھی اکثر واقف نہیں ہوتے .... اس میں صوفی کی جیت ہے، اس کے بعد وہ نفس کی چوریاں اس آسانی، خوش اسلوبی اور لطف سے پکڑتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے کہ بعض اوقات مرید کو خبر بھی نہیں ہوتی۔" (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیۂ کرام کا کام، ص ۲)

یہ تو اسلوبِ اصلاح ہے، اوصافِ درویشی سے متعلق بھی جو کچھ عرض کرنا مناسب ہے وہ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی ابتدائی ملاقات کا واقعہ شاہد ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کی مبارک نظر

آنے والے کے قلب پر پڑ رہی تھی، آپ ان کی طلب سے آگاہ ہوتے اور اس خوبی سے تدارک فرماتے کہ وہ حضرت باباصاحبؒ کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ اور ہدایت کی راہ اختیار کر لیتے تھے، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت باباصاحبؒ کے اس وصف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"از ضمیر آئندہ حکایت می کند، و دل از دست می برد"	آنے والے کی دل کی بات بیان فرماتے اور دل کو لُبھا لیتے تھے۔

(سیر الاولیار ص ۷۰ ا ج)

حضرت باباصاحبؒ کے اوصاف میں ایک وصف یہ بھی تھا کہ آپ ادنیٰ سی توجہ سے یہ بھی معلوم کر لیتے تھے کہ سبیلِ کار کیا ہے، کس طرح یہ بیل منڈھے چڑھ سکتی ہے، میر شکار اور روغن فروش کی بیوی کے واقعات سے اس وصف کا سراغ ملتا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے روغن فروش کی بیوی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"زہے ولایت خدمت شیخ الاسلام فریدالدین در دل خود سیرے کرد کہ غرض او از کجا حاصل شود، ہم چناں فرمود" (خیر المجالس ص ۲۳۸)	حضرت باباصاحبؒ کی ولایت سبحان اللہ! سبحان اللہ! ذرا قلب کی طرف توجہ فرمائی، مراقبہ کیا اور جان لیا کہ اس کا مقصد کہاں سے حاصل ہوگا، اور اسی کے مطابق اسے بتا دیا۔

اس روایت کے ضمن میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ آپ شمشیر برہنہ لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے، مگر توفیق الٰہی رہنما ہوئی قبولِ اسلام کا جذبہ مستولی ہوا، آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، قدم اندر رکھا ہی تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے دامن یا گریبان پکڑا، اور نبوت کی پُر رعب

---

۱ خیر المجالس ص ۱۴۷ - ۱۴۸ ۔ ۲ ایضاً ص ۲۳۶ - ۲۳۸ ۔

آواز میں فرمایا، عمر! کیوں آیا ہے؟ کس ارادے سے آیا ہے؟ حضرت عمرؓ نبوت کی پُر رعب آواز سے کانپ گئے اور عاجزی و انکساری سے عرض کیا کہ مسلمان ہونے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ فاتح اعظم کہے گا کہ یہ کہاں کا اخلاق ہے؟ مگر یہ ہے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ کا کرشمہ، جس سے اصلاح حال کی راہیں کھلتی ہیں، صوفیہ کرام کا وہ اسلوبِ اصلاح جس کی طرف بابا سے اردو نے ایما فرمایا ہے، وہ بھی اسی کا ہلکا سا پرتو ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپ بیتی خود بیان فرمائی ہے، جو عوارف کے سبق کے دوران پیش آئی تھی (فوائد الفواد، ص ۲۶ - ۲۷) جس کے بعد حضرت بابا صاحبؒ نے راز سربستہ کا انکشاف ان الفاظ میں فرمایا تھا:

"ایں ہمہ برائے کمال حال تو می کردم..... کہ پیر مشاطۂ مرید باشد" (فوائد ص ۲۷)

یہ جو کچھ کیا ہے، تمھاری فلاح و بہبود کے لیے کیا ہے، پیر مرید کا ایسا ہی بناؤ سنگار کرتا ہے جیسے دلھن بنانے والی کسی کو دلھن بناتی ہے۔ اس حکایت میں جوگی کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے، وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

الغرض مذکورہ مبادیات کی روشنی میں اس روایت کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ اس وصف سے متصف تھے کہ آنے والے کی قلبی کیفیت آپ پر منعکس ہو جاتی تھی (سیر الاولیا، ص ۱۰۷) جوگی جس دعویٰ سے آیا تھا اس سے آپ کو آگاہی تھی، آپ ادنیٰ سی توجہ سے یہ بھی جان لیتے تھے کہ سبیل کار کیا ہونی چاہیے (خیر المجالس ص ۲۳۰) لہٰذا آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے واقعہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کی (الفاروق) اور صوفیہ کرام کے طریق کار کو بلا خوف لومۃ لائم اپنایا، دل میں یہ خیال گذرا کہ جوگی زمین سے سر نہ اٹھا سکے، چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا[1]

---

[1] شارحین کے بیان کے مطابق اس عمل سے مقصود یہ تھا کہ قلب کی تہ میں جو دنیاوی آلودگی پیوست ہے، وہ نکل جائے اور قلب صاف ستھرا ہو جائے، یہ بھی طریق اصلاح ہے۔

آپ نے چاہا تھا، (فوائد الفواد ص ۲۴۱) اس عمل سے جوگی کے زعم باطل کو شکست ہوئی، اب جو پیوستگی رہ گئی تھی اسے عمل نعلین سے رفع فرمایا، جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نبوت کے پُر رعب لہجے میں کلام فرمایا تھا، جس سے حضرت عمرؓ جیسے بطل عظیم تھرتھرا اٹھے تھے، نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اخلاق و شریعت کے منافی تھا اور نہ حضرت باباصاحبؒ کا عمل نعلین منافی تھا، بلکہ صوفیۂ کرام کے اسلوب اصلاح اور اسوۂ حسنہ اور بالخصوص وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کے عین مطابق تھا، اگر اس پر کسی کو کلام ہے تو وہ رموز شریعت و طریقت سے ناواقف اور جاہل ہے۔

بہرحال حضرت باباصاحبؒ کے اس کامیاب طریق کار کا ثمرہ یہ ہے کہ جوگی نے راہ ہدایت اختیار کی اور واصلانِ حق میں سے ہو گیا، یہ وسوسہ بھی گمراہ کن ہے کہ جوگی کا ذکر تذکروں میں کیوں نہیں ہے، جن کا مطالعہ وسیع ہے ان کے علم میں ہے کہ کتب سیر و تاریخ میں اور کتب ملفوظات میں بے شمار واصلانِ حق کے نام ملتے ہیں، مگر تذکرے ان کے باب میں خاموش ہیں، تذکروں میں معدودے چند چیدہ چیدہ و منتخب حضرات کا ذکر ہے، خصوصًا ان کا جنھیں عروج کمال نصیب ہوا، اور مخلوق کی عظیم خدمات ان سے سرانجام ہوئیں، وہ بھی سیر حاصل نہیں، بلکہ نہایت تشنہ اور مختصر، واصلانِ حق میں سے ہر ایک کے ذکر کی تذکروں میں تلاش و طلب حدود تذکرہ نویسی سے عدم واقفیت کی علامت ہے، جوگی بلاشبہ واصلانِ حق میں تھا، مگر ہر واصل حق کا ذکر کسی تذکرہ میں ملنا لازم نہیں، اس اعتبار سے اس روایت کا شمار شاہکار میں ہے جس کی امثلہ کم ہی دستیاب ہوسکتی ہیں، اس روایت کے شمول سے راحت القلوب کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

روایت (۱۱) حضرت محبوب الٰہیؒ رقمطراز ہیں کہ ایک جوگی حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں آیا، میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمھارا طریق کار کیا ہے؟ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے تمھارا مقصد و مدعا کیا ہے، جو حاصل کار ہے، جوگی نے کہا، مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ انسان دو کیفیتوں یا دو عالموں سے مرکب ہے،

ب عالم عُلوی (اوصاف اعلیٰ) ہے، اور دوسرا عالم سفلی (اوصاف ادنیٰ) سر سے ناف تک
عالم علوی ہے، اور ناف سے پیروں تک عالم سفلی ہے، دینقطۂ نظر ہے۔ اسی سے اصلاح حال کی
دبیر کرتے ہیں، جوگی نے اتنا ہی بتایا تھا کہ) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے جیسا اس نے
بیان کیا ہے، لیکن اتنا اور بھی ہے کہ عالم عُلوی سے متعلق صدق و صفا اخلاق پسندیدہ اور حسن معاملہ ہے
اور عالم سفلی سے متعلق پاکی و پارسائی اور پرہیز گاری کی نگاہداشت ہے، حضرت بابا صاحبؒ نے
آبدیدہ ہوکر یہ بھی فرمایا کہ مجھے جوگی کی یہ بات بہت اچھی لگی، (راحت القلوب ص ۲۹)

اس روایت میں تو کوئی پیچیدگی ہے نہیں، البتہ یہ روایت خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، جو محض قوت حافظہ سے کام لیتے تھے، غالباً انھیں سہو ہوا ہے اور انھوں نے حضرت باباجیؒ کے ارشاد کو کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ جوگی کا بیان لگنے لگا ہے، سہو و خطا تو انسان کی فطرت میں ہے، الانسان مرکب من الخطأ و النسیان، خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے اس طرح نقل فرمایا ہے:

"در نفس آدمی دو عالم است. یکے عالم علوی، دوم عالم سفلی، از تارک تا ناف عالم علوی است، و از ناف تا قدم عالم سفلی است، سبیل کار آنست کہ در عالم علوی ہمہ صدق و صفا و اخلاق خوب و حسن معاملہ باشد، و در عالم سفلی نگاہ داشت پاکی و پارسائی خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بر لفظ مبارک اند کہ مرا ایں سخن او خوش آمد" (فوائد الفواد ص ۸۵)

یہ حقیقت واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کے ارشاد کو ہرگز جوگی سے منسوب نہیں فرما سکتے تھے، اور نہ اپنے سے، بیان خود منھ سے پڑا بول رہا ہے کہ وہ کسی برگزیدہ اور جہاندیدہ بزرگ ہی کا ہو سکتا ہے، کسی نوخیز و نوعمر کا نہیں ہو سکتا۔ بابا کا مقصود یہ تھا کہ اس راہ سے مسلمان درویش بھی آگاہ ہیں بلکہ اس کے نکات و جزئیات سے بھی آگاہ ہیں، انھیں تم ناآشنا نہ سمجھو کسی طالب کے سوال کا

نشاندہی ہے کہ اس کے رہرو راہنما اس سے آگاہ نہیں کہ تمھارے ہاں اصل کار کیا ہے؟ اور تم کس راہ پر گامزن ہو، تاہم جوگی کو اشتباہ لاحق ہوا تھا جس کی تصحیح کے لیے حضرت بابا صاحبؒ نے یہ روش اختیار کی تھی۔ رسالہ کی یہی نزاکتیں عام نہیں ہیں، اس لیے ہر کسی ذہن کی رسائی ان تک نہیں ہوتی، یہ کلیہ ہے، بعض چیزیں فی نفسہٖ اچھی اور پسندیدہ ہوتی ہیں، لیکن جب وہ اپنے سے بہتر کے مقابلہ میں آتی ہیں تو ان کی آب و تاب وہ نہیں رہتی جو انفرادی حالت میں محسوس کی جاتی ہے، اونٹ جب پہاڑ تلے آتا ہے تو اس کی بلند قامتی کے چہرے سے نقاب اٹھ جاتا ہے، فوائد الفؤاد فی نفسہٖ بہت خوب ہے، مگر جب راحت القلوب کے مقابلہ میں آئے گی جو حضرت بابا صاحبؒ کے ارشادات پر مشتمل اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے اخلاص عمل کا ثمرہ ہے تو اس کی وہ آب و تاب ماند پڑ جائے گی جو انفرادی حالت میں ہو سکتی ہے، البتہ اس احساس کے لیے وجدان صحیح اور ذوق سلیم کا وصف درکار ہے۔

اسے کرامت سے تعبیر کیا جائے یا نہیں، مگر راحت القلوب کا یہ حیرت انگیز وصف ہے کہ وہ دیرینہ روزی کے اثرات سے سخت متاثر اور اوراق منتشر کا مجموعہ ہونے کے باوجود اسے ندرت بیان اور قدامت روایات کے اعتبار سے مابعد کی کتب ملفوظات پر بہمہ وجوہ فوقیت ہے، جو موازنہ سے واضح ہے۔

راحت القلوب کی اس مجلس کے شرکاء میں شیخ بدر الدین غزنویؒ بھی ہیں، جو قطب الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کے خلیفہ اور حضرت بابا صاحبؒ کے ہم خرقہ اور ہم عصر تھے، شیخ بدر الدین غزنویؒ نماز درازی عمر بھی پڑھا کرتے تھے، انھوں نے نہایت طویل عمر پائی تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ سے ملاقات بھی ثابت ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے:

”حضرت سلطان المشائخ می فرمود کہ شیخ بدر الدین بسیار معمر شدہ بود .... و می فرمود کہ وقتے شیخ بدر الدین غزنوی مرا گفت بیا ست ترا اجازت نامہ سماع نویسم، من گفتم مرا ایں مقدار قابلیت نیست“

(سیر الاولیاء ص ۵۰۵ ج ۱)

(خ)ورد کرمانی نے شیخ بدرالدین غزنوی سے حضرت محبوب الٰہی کی ملاقات کے کئی واقعات اور مکالمے نقل کیے ہیں (سیر الاولیا ص ۴۳ - ۱۹۶ ۱۹۶) اور اگرچہ ان کا خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سجزیؒ کے حصۂ حیات میں ہونا (ثابت) ہی ہے، تاہم ان کا شمار طبقۂ اولیٰ میں نہیں، بلکہ ان کا شمار حضرت باباصاحبؒ کے معاصرین میں ہے اور اگرچہ (ح)ضرت باباصاحبؒ کو خواجۂ بزرگؒ سے شرف ملاقات حاصل تھا لیکن طبقۂ اولیٰ میں آپ کا بھی شمار نہیں کیا جا سکتا، (اس)لیے شیخ بدرالدین غزنویؒ کو طبقۂ اولیٰ میں سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور ان کی شرکت حضرت باباصاحبؒ کی مجا(لس) میں صحیح اور بالکل صحیح ہے، شبہہ کی گنجائش نہیں ہے، بہرحال راحت القلوب مستند ہے، اس کی قدامت ثابت ہے، اور اس کی روایات مصدقہ ہیں؛

روایت (۱۲) | حضرت محبوب الٰہیؒ رقمطراز ہیں کہ چھ یا سات درویش حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ جوان و نوعمر اور صاحبِ نعمت تھے، شاید ان کا تعلق خانوادۂ خواجگانِ چشت سے تھا، انھوں نے حضرت باباصاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم میں ہر ایک کی کچھ سرگذشت ہے، آپ کسی دوست کو حکم فرمائیں تاکہ وہ ہماری سرگذشت سن لے، حضرت باباصاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ تم جاؤ اور ان کی سرگذشت سنو اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے بھی فرمایا، مختصر یہ کہ وہ ایک دوسرے سے نہایت نرمی اور مہربانی سے گفتگو کرنے لگے اس طرح کہ اس دن آپ نے یہ فرمایا تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا، انھوں نے، ہم اس طرح گفتگو کی کہ ہم دونوں لطفِ تقریر سے ایسے متاثر ہوئے کہ رونے لگے، اور دل ہی دل میں کہنے لگے کہ یہ فرشتے ہیں جنھیں اللہ نے ہماری تعلیم کے لیے بھیجا ہے کہ اس طرح ماجرا بیان کرنا چاہیے، یہ واقعہ حضرت باباصاحبؒ نے سنا تو آبدیدہ ہوئے اور فرمایا کہ سرگذشت اسی طرح بیان کرنی چاہیے کہ رگِ گردن ابھرنے نہ پائے، یعنی غصہ کا اثر کسی لفظ سے یا کسی حرکت سے ظاہر نہ ہو۔ (راحت القلوب ص ۲۹ - ۳۰)

یہ روایت صاف و سادہ ہے، بیان میں کوئی ایسی گنجلک نہیں جو تفہیم میں حائل ہو، یہ روایت خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، مگر نقل قول کی تازگی سے محروم سی لگتی ہے، دونوں کے دو دو جملے

نقل کیے دیتا ہوں:

	راحت القلوب	فوائد الفواد
(۱)	خداوندیارے را فرمان دہد تا اجرا بشنود۔	خداوند آدمی با فرمان دہد تا بچشمے ما بشنود۔
(۲)	اینہا فرستگان حق اند برائے تعلیم ما فرستادہ اند	اینہا فرشتگان حق اند برائے تعلیم ما آمدہ اند۔
	(راحت القلوب ص ۳۰)	(فوائد الفواد ص ۸۶)

دیگر امور سے قطع نظر صرف اتنا عرض کر دینا مناسب ہے کہ اگر آدمی را اور آمدہ اند فصیح ہیں تو ظاہر ہے کہ یارے را اور فرستادہ اند فصیح تر ہیں، اور اس سے واضح ہے کہ جامع راحت القلوب کو قدرت بیان اور انتخاب الفاظ میں جامع فوائد الفواد پر فوقیت ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے راحت القلوب کو ترجیح ہے۔ آدمی را کو کیا محل فصاحت نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیا آمدہ اند میں وہی وصف ہے جو فرستادہ اند میں ہے۔

روایت (۱۳) حضرت محبوب الٰہیؒ رقمطراز ہیں کہ ایک دن شمس دبیر نسخۂ مطول لائے اور پڑھنے کے لیے اجازت چاہی، حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا بیٹھو، پڑھو! جس طرح شمس دبیر پڑھتے تھے، حضرت بابا صاحبؒ اسی طرح بار بار معنی بیان فرماتے اور بعض بعض جگہ اشعار میں اصلاح کرتے اور تعریف فرماتے جس سے شمس دبیر کا دل خوش ہوتا اور حوصلہ بڑھتا، اسی کے ساتھ حضرت بابا صاحبؒ نے یہ بھی دریافت فرمایا: تمھیں مطلوب کیا ہے، کیا چاہتے ہو؟ شمس دبیر نے عرض کیا کہ والدہ ضعیفہ ہیں، میں ہی انکی خدمت کرتا ہوں، تنگ دست ہوں (لونڈی خریدنے اور رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا: جاؤ! شکرانہ لاؤ، شمس دبیر گئے، کچھ بگانی جیتل (اس عہد کا معمولی سکہ) لائے، جن پر تیر کا نشان تھا، جو پچاس[۵۰] کے لگ بھگ تھے، حضرت بابا صاحبؒ نے تقسیم کرنے کا حکم فرمایا، ہر ایک کو اس کے لائق ملے۔ مجھے آپ نے اپنے دست مبارک سے چار جیتل عنایت فرمائے پھر حضرت بابا صاحبؒ نے دعائے خیر فرمائی، جس کی برکت سے تنگ دستی جاتی رہی، اور ان ہی ایام میں شمس دبیر سلطان غیاث الدین (بلبن) کے عملے میں منشی مقرر ہو گئے۔ اور ان کا کام بن گیا۔ (راحت القلوب ص ۳۱)

یہ صاف اور سادہ سی روایت ہے، البتہ اس میں نسخۂ مطول تشریح طلب ہے جس سے کم علم شخص کو غلط فہمی ہوسکتی ہے، نسخہ کہتے ہیں لکھے ہوئے کاغذ کو، اور کاغذ کے اس پرزے یا ٹکڑے کو جس پر اطبا دوا لکھ کر دیتے ہیں، لغوی معنی ہیں نوشتہ یا لکھا ہوا، مجازاً کتاب کو بھی نسخہ کہتے ہیں۔

مطول، باب تفعیل سے مفعول ہے، اس کے معنی ہیں طویل کیا ہوا۔ نسخۂ مطول مرکب توصیفی ہے، جس کے معنی ہیں لکھا ہوا بڑا سا کاغذ، اور اس روایت میں غالباً وہ بڑا سا کاغذ ہی مراد ہے جس پر شمس دبیرؔ اشعار لکھ کر لائے تھے، حکایت مطول اور شعر مطول بھی مثل نسخۂ مطول مرکب توصیفی ہیں۔

مولانا حمید قلندرؔ نے حکایتِ مطول لکھا ہے[1]، اور خواجہ امیر حسن علاء سجزیؔ نے شعرے مطول لکھا ہے اور قدرے تشریح کے ساتھ لکھا ہے "شعرے آوردہ بود ہم در مدح شیخ شعرے مطول"[2] پھر بھی یہ وضاحت نہیں کہ شعرے مطول کا ذخیرہ نوشتہ تھا یا نہیں، مگر نسخۂ مطول میں یہ وضاحت موجود ہے۔

مطول: سعد الدین علامہ تفتازانی (شافعی وخراسانی المتوفی ۷۹۲ھ) کی کتاب النحو کا نام بھی ہے، مگر نسخۂ مطول سے یہ مفہوم مراد لینا کہ شمس دبیرؔ علامہ تفتازانی کی تصنیف کتاب النحو اٹھا لائے تھے معقولیت سے بعید ہے، مطول تو مطول، مطول کے مصنف بھی اس وقت عالم وجود میں نہیں آئے تھے، ان کا سنہ وفات ۷۹۲ھ ہے، اور یہ واقعہ ہے ۶۶۵ھ تا ۶۶۹ھ کے درمیان کا، اس زمانہ کے اہل علم اس کتاب کے نام سے بھی واقف نہیں تھے، اس وقت نسخۂ مطول کا مفہوم وہی تھا جو مرکب توصیفی کا ہونا چاہیے، یہ تاویل کہ مطول نحو کی ایک کتاب کا نام ہے اور اس کے مجلس میں پڑھنے کی اجازت طلب کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا، اسی وقت مناسب ہوسکتی ہے جب کتاب کا وجود متیقن ہو، جب کتاب کا وجود ہی نہیں تو یہ تاویل مبنی بر جہل ہوگی۔

بہرحال اس بحث سے وہ خلفشار رفع ہوجاتا ہے جو کسی کم علم کو لاحق ہوسکتا ہے، اور یہ واضح

---

[1] خیر المجالس ص ۹۔ [2] فوائد الفواد ص ۱۲۷ - ۱۲۸

ہوجاتا ہے کہ شمس دبیر جو مجموعۂ اشعار لائے تھے وہ کثیر تھا، خواہ وہ بصورت بیاض تھا اور خواہ کسی طویل نوشتہ تھا، نیز یہ جملہ کہ "بعضے جا اصلاح در سخنان می نمود" سے اس لا یعنی تصور کی نفی ہوجاتی ہے کہ وہ گو تھی، کیونکہ عرف عام میں سخن شعر کو اور سخن گو شاعر کو کہتے ہیں۔

یہ ذکر سنہ ۶۶۵ھ تا سنہ ۶۶۹ھ کا ہے، تو یہ عہد بلبن ہے، اسی عہد میں شمس دبیر بلبن کے کسی محکمہ کے عہدے پر فائز ہوگئے تھے، اس عہد میں منشی کو، کاتب کو، نویسندہ کو اور انشاء پرداز و مضمون نگار دبیر ہی کہتے تھے، مگر اسے اتالیق کا مرادف تصور نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ بروئے لغت اتالیق کہتے ہیں ادب سکھانے والے کو اور تربیت دینے والے کو، اس لیے ہر دبیر کا اتالیق ہونا یا ہر اتالیق کا لازم نہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان فرمایا ہے:

مشایخ شعر کم شنوند، خاصۃً در مدح خویش	مشائخ شعر نہیں سنتے، یا کم سنتے ہیں اور خاص
کمالیت شیخ بیں کہ بشنید و استحسان	طور سے اپنی تعریف میں (تو سنتے ہی نہیں)
فرمود۔	حضرت باباصاحبؒ کی کمالیت دیکھو کہ اپنے
(فوائد الفواد ص ۱۲۷)	شعر سنے اور تعریف بھی کی۔

بتانا مقصود یہ ہے کہ کامل اکمال بزرگوں میں خودستائی اور خودنمائی کا جذبہ فنا ہوچکا ہوتا ہے طالبوں کی رہنمائی کے لیے آپ بیتی بیان کرتے ہیں یا اپنی کرامات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مدعا رہنمائی ہوتا ہے، خودستائی اور خودنمائی نہیں ہوتا، کسی نے خوب کہا ہے ؎

تنقیص سے خفا نہ ستایش پسند تھے ۔۔۔ یہ دونوں پستیاں ہیں اور وہ ان سے بلند تھے

آخر میں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ نقل روایت میں ناقل و کاتب کا سہو بھی ہے جو تقابل سے رفع ہوسکتا ہے، بہر نوع یہ روایت مستند ہے، اور یہی فوائد الفواد کا ماخذ ہے اد

کیونکہ راحت القلوب حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کا مستند مجموعہ ہے، اور اس کے جامع حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں تو راحت القلوب کی روایات کو حضرت محبوب الٰہیؒ کا بکثرت بیان فرمانا قرین قیاس ہے بلکہ اس کی بین دلیل ہے کہ راحت القلوب کے جامع حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں، اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

روایت (۱۴) | بزرگان دین میں سے ایک بزرگ پانی پر مصلے بچھائے نماز پڑھ رہے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اے اللہ حضرت خضرؑ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں، انھیں توفیق توبہ عنایت فرمایئے۔ اتنے میں حضرت خضرؑ بھی تشریف لائے اور دریافت کیا کہ میرے بھائی! میں کس گناہ و جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں، مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سے توبہ کر لوں، انھوں نے فرمایا کہ آپ نے جنگل میں ایک درخت لگایا ہے آپ اس کے سایہ میں بیٹھتے اور آرام کرتے ہیں، اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ میں نے فی سبیل اللہ لگایا ہے، (گویا کہ آپ اپنے کو خدا قرار دیتے ہیں) حضرت خضرؑ نے فوراً ہی توبہ کی۔

پھر ان بزرگ نے ترک دنیا سے متعلق گفتگو فرمائی، اور ترک دنیا کی حقیقت بیان کی، اور کہا کیا آپ ایسے ہی ہیں؟ پھر آپ کیسے رہتے ہیں؟ پھر فرمایا: میں ایسا ہوں کہ اگر تمام دنیا مجھے دی جائے اور یہ بھی کہا جائے کہ اس کا حساب بھی تم سے نہ لیا جائے گا، اور یہ بھی کہیں کہ اگر قبول نہ کروگے تو تمھیں دوزخ میں ڈال دیں گے تو میں دوزخ میں پڑنا قبول کر لوں گا، دنیا کو قبول نہ کروں گا۔ حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ یہ کیوں؟ انھوں نے بتایا کہ یہ اس لیے کہ دنیا خدا کی مبغوض ہے، خداوند عالم اس سے ناراض ہیں، میں بھی اس سے خوش نہیں، لہٰذا مجھے دوزخ قبول مگر دنیا قبول نہیں۔ (راحت القلوب ص ۲۴۔۲۵

یہ روایت فوائد الفواد (ص ۲۰۲۔۲۰۳ نولکشوری) میں بھی ہے، اور اسرار الاولیاء ص ۴۴ میں بھی ہے، اور حق یہ ہے کہ اسرار الاولیاء کا بیان فوائد الفواد اور راحت القلوب سے زیادہ بہتر ہے، راحت القلوب میں ہے:

"مصلّٰی بر روئے آب انداختہ بود و نماز می گذارد و می گفت :"

فوائد الفؤاد میں ہے :

"مصلّٰی بر روئے آب انداختہ بود و نماز می کرد و می گفت :"

جملے دونوں یکساں ہیں، البتہ ایک فعل بدلا ہوا ہے، اور اس میں کچھ مضایقہ نہیں، گویا کہ فوائد الفؤاد حضرت محبوب الٰہیؒ ہی کی آواز بازگشت ہے، اسرار الاولیاء میں ہے :

"مصلّٰی بر روئے آب انداختہ نماز می گذارد، چون از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد، در مناجات می گفت ....."

نماز می گذارد و می گفت اور نماز می کرد و می گفت کے مقابلہ میں یہ کہنا کہ چون از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد و در مناجات گفت کہنا کہیں افضل ہے، کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہی دعا کی جاتی ہے، اور یہی صورت حال زیادہ مناسب ہے، تاہم اس سے یہ واضح ہے کہ فوائد الفؤاد کا ماخذ راحت القلوب ہی ہے، جس کی قدامت شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء (۷۳۲ھ) سے ثابت ہے، اور یہ مہمل ہے کہ راحت القلوب میں فوائد الفؤاد سے روایات منقول ہیں کیونکہ فوائد الفؤاد تو اس عہد (۶۵۵ھ تا ۶۶۹ھ) میں وجود ہی میں نہیں آئی تھی، فوائد الفؤاد کی تالیف کا سنہ آغاز ۷۰۷ھ ہے۔

بہرحال یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ راحت القلوب حضرت بابا صاحب شیخ شیوخ العالم شیخ کبیر فرید الدین مسعود گنجشکر اجودھنی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہی کے مبارک ملفوظات کا مجموعہ ہے اور اس کے جامع حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہٗ العزیز ہیں اور تواتر سے اس کی قدامت اور اس کا مستند ہونا ثابت ہے، البتہ اس کی اشد ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ کر کے مرتب کر کے اسے از سر نو منظر عام پر لایا جائے، تاکہ معاشرہ میں سدھار آئے اور نیکی و نکوکاری کا جذبہ فروغ پائے، یہی وقت کا تقاضا ہے، اگر ایسا کیا گیا تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوگی، اور

بے پناہ اجر ملے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۲۰) راحت القلوب کے قدیم قلمی نسخے

راحت القلوب کے قدیم قلمی نسخوں سے متعلق ہندوستان کی مشہور مشہور لائبریریوں سے جو معلومات مجھے فراہم ہوئی ہیں لائبریریوں کے ان ذمہ دار اصحاب کے شکریے کے ساتھ پیش کرتا ہوں جنھوں نے ازراہ علم نوازی زحمت گوارا کی اور اس ذرۂ بے مقدار کو نوازا۔ مدعا اس سے یہ ہے کہ صحت و مقابلہ سے راحت القلوب کا کوئی نسخہ مرتب ہو سکے، اگر توفیق الٰہی سازگار ہوئی تو میں خود اس خدمت کو انجام دوں گا اور اگر خدائے پاک نے کسی اور کو یہ توفیق دی تو یہ میرے لیے مزید باعث مسرت ہوگا، میں جو تعاون کر سکتا ہوں اس میں دریغ نہ کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۱) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں سنہ ۱۰۸۰ھ کا مکتوبہ ایک نسخہ ہے۔

(۲) مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پانچ نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۰۹۰ھ کا مکتوبہ ہے، دوسرا سنہ ۱۱۹۴ھ کا مکتوبہ ہے، اور تین ۳ نسخے ناقص ہیں۔

(۳) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں ایک نسخہ ہے جو سنہ ۱۱۸۱ھ کا مکتوبہ ہے اکثیلاگ جو میرے پاس ہے وہ کرم خوردہ اور از کار رفتہ ہے۔ ممکن ہے کوئی اور بھی ہو، میں نے کئی جوابی خط بھیجے مگر جواب سے محروم رہا۔

(۴) آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد میں تین ۳ نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۱۵۸ھ کا مکتوبہ ہے، دوسرا سنہ ۱۲۸۱ھ کا اور تیسرا ۵ جلوس عالمگیری (سنہ ۱۰۷۳ھ) کا مکتوبہ ہے، جو معلوم نسخوں میں قدیم ترین ہے،

(۵) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں تین ۳ نسخے ہیں۔ ایک سنہ ۱۲۷۶ھ کا مکتوبہ ہے، دوسرا بارہویں صدی ہجری کا، اور تیسرا تیرہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

(۶) عربی فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹونک (راجستھان) میں ایک نسخہ ہے جس میں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

(۷) رضا لائبریری رام پور میں تین ۳ نسخے ہیں جن میں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

[illegible] ایک نسخہ جس میں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

حضرت مسیحؑ کے بعد نصرانیت کا نیا قالب

از ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

دراصل حلول و تثلیث اور حضرت مسیحؑ کی الوہیت و ابنیت کا سارا افسانہ محض ابن و اب کے الفاظ کی بنیاد پر تراشا گیا ہے، اس لیے ان لفظوں کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں:

" ابن کا لفظ عبرانی زبان میں دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، پہلے معنی میں وہ کسی کی طرف منسوب و متصف ہو کر استعمال ہوتا ہے جیسے ابن السبیل، ابن اللیل، ابن صبح، ابن حول، ابن سنۃ، دوسرے عبد کے معنی میں، اس دوسرے معنی میں وہ رجل، فتی اور غلام وغیرہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لیے ابن کا لفظ ولد کی طرح ابنیت کے مفہوم میں صریح نہیں ہے، اسی لیے قرآن میں اللہ کے لیے لفظ ولد کے استعمال پر اظہار شناعت کیا گیا ہے، لیکن کفر سے اشتباہ کی بنا پر اس نے ابن کے لفظ سے بھی اجتناب کی تعلیم کی ہے، اب کے لفظ کی نوعیت بھی یہی ہے، جو معبود کے مشابہ ہوگیا ہے نصاریٰ نے ان دونوں لفظوں کے سلسلہ میں غلو و افراط سے کام لیا ہے، انجیل میں ابن کا لفظ عبد اللہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح ابونا و ابوکم (ہمارا اور تمہارا باپ) ربنا و ربکم (ہمارا اور تمہارا خداوند) کے مفہوم میں آیا ہے، اس کا ترجمہ قرآن مجید نے اسی کے مطابق کیا ہے، اور حضرت مسیحؑ نے

لیتے بارہ میں لفظ رب کے استعمال سے منع کیا ہے: "ہمارا رب (خداوند) ایک ہی ہے" اور وہ اللہ ہے اور مسیح اور تم بھائی ہو۔" مگر نصاریٰ نے ان کی اس واضح تعلیم کو بدل دیا۔ ان کا جوش کھلا ہوا ہے۔ اسی طرح انھوں نے فرمایا: "تم لوگ ربی نہ کہو، کیونکہ تمھارا رب ایک ہے مسیح اور تم سب کے سب بھائی ہو، اور تم لوگ زمین پر اپنے لیے رب کو نہ پکارو، کیونکہ تمھارا رب وہی ایک ہے جو آسمانوں میں ہے اور تم معلم بھی نہ کہو، کیونکہ تمھارا معلم ایک ہے، یعنی مسیح۔" (مفردات القرآن ص ۱۶ و ۱۷)

صاحبِ 'الفارق بین المخلوق والخالق' تحریر فرماتے ہیں:

"تورات سے ظاہر ہے کہ اس میں فرماں بردار مومن کو ابن اللہ کہا گیا ہے، اسی طرح ابنا اللہ سے فرماں بردار مومنین مراد ہوتے ہیں، اور اَب کا لفظ موجدِ حقیقی کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مقصود اللہ کی ذات ہوتی ہے، اس بنا پر حضرت مسیحؑ کے لیے ابن اللہ کا لفظ مطلقاً بولے جانے پر کوئی اشتباہ و اشکال وارد نہیں ہوتا۔" (ص ۴۲ و ۴۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"یوحنا کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اب کا لفظ معلم و مرشد کے معنی میں آتا ہے، تم جانتے ہو کہ گھر کے مالک کو ربّ البیت اور اونٹ والے کو ربّ الابل کہا جاتا ہے، حضرت مسیحؑ یعقوبؑ کے گھرانے کے رئیس و مربی تھے، اس لیے ان کو اس معنی میں رب کہنا جائز ہے، یہ شرک نہیں ہے، لیکن خالق کے معنی میں رب کا استعمال شرک اور انجیل کی تکذیب ہے۔ اس وقت اناجیل محرف ہونے کے باوجود اس پر شاہد ہیں کہ مسیحؑ اللہ کے عبد تھے، اور خالق کے معنی میں وہ اپنے کو رب کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔"

(الفارق بین المخلوق والخالق ص ۳۲)

انجیل کا یہ عام اور معروف اسلوب ہے کہ اس میں نیکوکاروں کے لیے 'خدا کے بیٹے' اور خدا کے لیے 'باپ' کے الفاظ جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"مبارک ہیں وہ جو صلح کرنے والے ہیں، کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔" (متی ۵ : ۹)

"اور جو تمہیں دکھ دیں اور ستاویں ان کے لیے دعا کرو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔" (ایضاً : ص ۴۴ و ۴۵)

"پس تم کامل ہو، جیسا تمھارا باپ جو آسمان پر ہے کامل ہے۔" (ایضاً : ۴۸)

ان مثالوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہونا حضرت مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں تھی بلکہ اس خصوصیت میں خدا کے تمام صالح بندے شریک ہیں، اسی طرح خدا کا صرف حضرت مسیحؑ کا باپ ہونا ہی ثابت نہیں ہے بلکہ اس کو تمام صلحاء و اخیار کا باپ کہا گیا ہے، نیز تورات و انجیل میں ابن کا لفظ حضرت مسیحؑ کی طرح بہتوں کے لیے استعمال ہوا ہے، چنانچہ تورات کے باب پیدایش (۶ : ۲ و ۴) میں فرشتوں کے لیے باب استثناء (۱۴ : ۱) میں حضرت یعقوبؑ کے لیے لوقا کی انجیل (۳ : ۳۸) میں حضرت آدمؑ کے لیے اور یوحنا (۱ : ۱۱ - ۱۲) میں خود نصاریٰ کے لیے استعمال ہوا ہے، اب اگر کسی کو الٰہ ماننے کے لیے یہی لفظ کافی ہے تو حضرت عیسیٰؑ ہی پر منحصر نہیں ہے، یہاں تو معبودوں کی ایک پوری جماعت موجود ہے۔

ان مثالوں سے یہ بھی واضح ہوا کہ نصاریٰ کو انجیل کے الفاظ، اصطلاحات اور تعبیروں کو سمجھنے یا تو غلط فہمی ہوئی یا انھوں نے دیدہ و دانستہ تحریف اور رد و بدل سے کام لیا، حقیقت صرف یہ ہے کہ عبرانی میں ابن کا لفظ عبد اور بیٹے کے مفہوم میں اور اب کا لفظ باپ اور رب کے معنی میں مشترک تھا، پال نے ان مشترک الفاظ سے ایک نیا عقیدہ گھڑا، وہ عبرانی زبان سے ناواقف تھا، اس کا ماخذ یونانی انجیلیں تھیں، اور یونانی میں آکر اَب اور ابن کے الفاظ اس مفہوم سے بالکل الگ ہو گئے جن کیلئے وہ عبرانی میں مستعمل تھے، اور صریحاً باپ اور بیٹے کے مفہوم میں ہو گئے۔

کلمۃ اللہ کا مفہوم | کلمہ کے لفظ نے بھی نصاریٰ کے لیے شرک کا دروازہ وا کیا، اور پال نے اس کو بنیاد

بنا کر یہ فلسفہ وضع کیا کہ کلمہ ایک برتر تخلیقی روح کائنات ہے، اور حضرت مسیحؑ اس کے مظہر ہیں، اسی بنا پر عیسائی ان کو خدا کا کلام مانتے ہیں، علامہ شہرستانیؒ لکھتے ہیں:

"نصاریٰ خدا کو جن تین صفات سے مرکب مانتے ہیں، اور جن کو اقانیم ثلاثہ کہا جاتا ہے، ان میں کے اقنوم علم کو وہ خدا کا کلام کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہی کلام حضرت مسیحؑ کے جسم سے متحد ہو گیا"

(الملل والنحل ج)

نصاریٰ قرآن مجید کا بھی سہارا لیتے ہیں، کیونکہ اس نے بھی حضرت مسیحؑ کو کلمۃ اللہ کہا ہے:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ۔ (نساء: ۱۷۱)

مسیح عیسیٰ بن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریمؑ کی طرف القا فرمایا۔

دوسری جگہ فرمایا:

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ (آل عمران: ۴۵)

یاد کرو جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تمھیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے، اس کا نام مسیحؑ بن مریمؑ ہوگا۔

ہم پہلے ان آیتوں کا مطلب بیان کر چکے ہیں، دراصل قرآن مجید نے کلمہ کا لفظ سرے سے اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے جو نصاریٰ نے لیا ہے، اس نے حضرت مسیحؑ کو کلمۃ اللہ اس لیے نہیں کہا ہے کہ وہ خدا کی صفت کلام ہیں، جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، یا فی نفسہ وہ خود اس کی ذات ہیں، بلکہ چونکہ ان کی پیدائش حضرت مریمؑ کے بطن سے ایک خاص صورت میں ہوئی تھی جو عام لوگوں کی پیدائش سے مختلف تھی، اس لیے ان کے بارہ میں خاص طور پر کہا کہ ان کی پیدائش خدا کے کلمہ کُن سے ہوئی یا پھر ان کی پیدائش خدا کا طے شدہ امر و فیصلہ تھا، جس کا ظہور اس کے حکم سے ہوا، یہ صحیح ہے کہ یہ پوری کائنا

خدا کے حکم اور کلمۂ کُن سے وجود میں آیا ہے، جیسا کہ فرمایا:

اللہ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو	إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن
کہتا ہے ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔	فَيَكُونُ۔ (آل عمران: ۴۷)

لیکن حضرت مسیحؑ کو خصوصیت سے کلمۃ اللہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کی خارق عادت ولادت ہے اور دوسری وجہ یہود کے الزام کی تردید ہے، جو نعوذ باللہ ان کو ولد الزنا اور ان کی والدۂ محترمہ کو حرام کاری کا مرتکب کہتے تھے، قرآن مجید نے دونوں کی عفت و پاکدامنی کی شہادت دیتے ہوئے یہ بتایا کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش خدا کے امر مقدر کے مطابق اس کی جانب سے بخشی ہوئی روحِ زندگی کے مطابق ہوئی:

اور عمران کی بیٹی مریمؑ نے اپنی شرمگاہ کی	وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ
محافظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی،	فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا
اور اس نے اپنے خداوند کی باتوں اور کتابوں	وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ
کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں تھی،	مِنَ الْقَانِتِينَ (تحریم: ۱۲)

خود بائبل میں بھی کلمہ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

"خدا کے کلمہ سے آسمان بنے۔" (مزمور ۲۳: ۶)

"خدا کا کلمہ یوحنا ابن زکریا کے پاس پہونچا۔" (لوقا ۳: ۲)

روح القدس کی حقیقت | آب، ابن اور کلمۃ کی طرح روح القدس کا مطلب سمجھنے میں بھی نصاریٰ کو غلطی ہوئی، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اقانیم ثلاثہ کا ایک جزو روح القدس بھی ہے، نصاریٰ کے خیال میں یہ اقنوم حیات ہے، اس لیے وہ اسے بھی الٰہ، خالق، رازق اور معبود قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں بھی اس کی صراحت موجود ہے، جیسا کہ فرمایا:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ (نساء: ۱۷۱)

مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریمؑ کی طرف القاء فرمایا، اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ (مریم: ۱۷)

پس ہم نے اس (مریمؑ) کی طرف اپنی روح کو بھیجا تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا۔

نیز متعدد آیتوں میں ہے:

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (بقرہ: ۲۵۳)

اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔

لیکن ان آیتوں سے حضرت مسیحؑ یا روح القدس کی الوہیت ثابت کرنا سراسر غلط اندازی ہے۔ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ نصاریٰ کو خدائی کتابوں کے الفاظ سمجھنے میں سخت دھوکہ ہوا ہے، ان میں نہایت صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ مسیحؑ صرف خدا کے رسول ہیں، وہ معبود، خدا یا مظہر خدا ہرگز نہیں ہیں، اللہ نے ان کو اپنی روح اور زندگی بخشی تھی، وہ اسی کے زندہ کیے اور بنائے ہوئے تھے، جو ظاہری اور عادی سبب کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن میں مجسم ہو گئے، اور خدا کی جانب روح کا انتساب محض شرف و عظمت ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا ہے، جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ وغیرہ کہا جاتا ہے، اور حضرت مسیحؑ اس خصوصیت میں منفرد نہیں ہیں، کیونکہ دوسروں کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے، حضرت آدمؑ کے بارہ میں فرمایا:

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي۔

اور جب اس میں اپنی روح میں سے روح

(تحریم : ۲۹)   پھونک دوں۔

بلکہ عام مومنین تک کے بارہ میں ارشاد ہے :

اُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ۔ (مجادلہ : ۲۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان تحریر کر دیا ہے، اور اپنی روح سے ان کی تائید کی ہے۔

علمائے اسلام میں حافظ ابن تیمیہؒ نے نصاریٰ کے اس باطل عقیدہ و نظریہ کی نہایت مدلل اور پُرزور تردید کی ہے، فرماتے ہیں :

"قرآن مجید میں حضرت مسیحؑ کے سلسلہ میں جس روح کا ذکر آیا ہے، فحوائے کلام سے ظاہر ہے کہ یہ کسی غیر کی صفت نہیں ہے، بلکہ خود ایک مستقل بالذات چیز ہے، اور یہ خدا کا فرستادہ ہے، نہ کہ اس کی کوئی صفت، اسی لیے جمہور علماء نے اس سے حضرت جبریلؑ کو مراد لیا ہے، جن کو خدا نے روح الامین روح القدس اور جبریل کے نام سے موسوم کیا ہے، اہل کتاب کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ، حضرت مریمؑ اور روح القدس سے مجسم ہوئے تھے، لیکن ان کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ وہ روح القدس کو خدا کی حیات خیال کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ وہ بھی الٰہ ہے جو پیدا کرتا، روزی دیتا اور قابلِ پرستش ہے، حالانکہ خدا کی کتابوں اور انبیاءؑ کے کلام میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ خدا نے اپنی ذات کے ساتھ قائم صفت کو روح القدس کے نام سے موسوم کیا ہے، اور اپنے کلام یا اپنی کسی صفت کو ابن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہی نصاریٰ کی کھلی ہوئی گمراہی ہے کہ انھوں نے انبیاءؑ کے کلام میں تحریف کر ڈالی اور اس کی ایسی تاویل کی جو اس کی مراد و منشا کے خلاف تھی، ان کے عقیدۂ تثلیث کی بنیاد جیسا کہ انجیل میں ہے، اس پر ہے کہ حضرت مسیحؑ نے خود لوگوں کو آب، ابن اور روح القدس کے ناموں کی تلقین کی ہے، اگر یہ واقعی حضرت مسیحؑ کا قول ثابت ہو جائے تو اس کا جواب یہ

دیا جائے گا کہ حضرت مسیحؑ تو کیا کسی نبی کے کلام میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس صفت کو جو اس کے ساتھ قائم ہے روح القدس کا نام دیتے ہوں اور نہ اس کے کلمہ یا اس کی نفسِ ذات کو ابن کے نام سے موسوم کرتے ہوں۔ البتہ ان کے یہاں اس کی مثالیں ضرور ملتی ہیں کہ وہ منتخب اور برگزیدہ اشخاص کو ابن کہتے ہیں اور یہ چیز حضرت مسیحؑ کی طرح دوسروں کے لیے بھی ثابت ہے جیسا کہ ان سے منقول ہے کہ اللہ نے اسرائیل سے کہا کہ تو میرا پلوٹھی کا بیٹا ہے' اور روح القدس سے وہ روح مراد ہے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی تھی، جیسا کہ حضرت داؤدؑ وغیرہ پر بھی نازل ہوئی تھی کیونکہ ان کی کتابوں میں ہے' روح القدس داؤد اور دوسروں میں بھی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روح اللہ سے اللہ کی حیات مراد نہیں ہے بلکہ یا تو وہ وحی مراد ہے جو حضرت مسیحؑ پر نازل کی گئی تھی یا وہ فرشتہ مراد ہے جو وحی لے کر نازل ہوتا تھا، غرض اس سے حضرت مسیحؑ کی نہ تو کوئی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر لاہوت کی کوئی چیز شامل تھی، بلکہ ان میں اللہ کا نور، اس کا کلام اور اس کی روح اسی طرح ظاہر ہوئی تھی جس طرح ان کے سوا دوسرے انبیاء میں ظاہر ہوئی تھی، جیسا کہ حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسرے انبیاءؑ کے متعلق بھی یہ منقول ہے کہ انھیں ابن کہا گیا ہے اور روح القدس کا ان میں حلول ہوا تھا" (الجواب الصحیح ج ۱، ص ۲۴۹-۲۵۰)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اللہ کی طرف جن چیزوں کی نسبت و اضافت کی گئی ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں اللہ کی کسی خاص صفت کو اس کی طرف نسبت دی گئی ہے، فرمایا:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (انعام: ۱۱۵)

اور تمھارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ۔

اسی طرح فرمایا:

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ۔

یہ خدا کا حکم ہے جس کو اس نے تم پر

(الطلاق : ۵)　　اٹھاتا ہے۔

دوسری قسم میں کوئی خاص چیز اس کی طرف منسوب ہوتی ہے، جیسے

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ (حج : ۲۶)　　طواف کرنیوالوں کیلئے میرے گھر کو صاف کرو۔

نیز فرمایا:

نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا (شمس : ۱۳)　　خدا کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کے معاملے میں

پہلی قسم میں اللہ کی ایسی صفتوں کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے جو اس کے ساتھ قائم ہیں مگر اس کی مخلوق نہیں ہیں، اور دوسری قسم میں اللہ کی ایسی مخلوق و مملوک اشیاء کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے جو اس سے جدا ہیں لیکن وہ اپنی جنس کی دوسری چیزوں سے افضل واشرف اور ایسی خوبیوں اور خصوصیات سے متصف ہیں جو اس کی متقضی ہوئیں کہ ان کو اللہ کی جانب منسوب کیا جائے، جیسے اس نے تمام اونٹنیوں میں صرف حضرت صالحؑ کی اونٹنی اور تمام گھروں میں صرف کعبہ معظمہ کے گھر کو خصوصیت بخشی کہ انھیں اپنی جانب منسوب کیا اسی طرح وہ تمام لوگوں میں اپنے صالح بندوں ہی کو خصوصیت عطا کرتا ہے کہ ان کی اپنی جانب اضافت ونسبت کرتا ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا (مریم : ۱۷)　　پس ہم نے اس (مریمؑ) کی طرف اپنی روح بھیجی۔

یہاں روح کی نسبت اپنی جانب کی ہے، اور اس کے متعلق آگے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک بھلے چنگے آدمی کی شکل میں حضرت مریمؑ کے پاس آئی، اسے دیکھ کر انھوں نے اللہ کی پناہ مانگی، تب اس نے ان کو بتایا کہ وہ اُن کے خداوند کا رسول ہے، یہ ساری چیزیں اس امر کی دلیل ہیں کہ روح ایک مستقل بالذات شے تھی جو مجسم ہوگئی تھی اور جس کو منطقیوں کی اصطلاح میں جوہر کہا جاتا ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی جانب منسوب روح ان صفات سے تعلق نہیں رکھتی جن کا وجود دوسری اشیاء سے قائم ہوتا ہے، بلکہ یہ مستقل بالذات قائم رہنے والی چیزوں کی قسم سے تعلق رکھتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ

روح اللہ کی مخلوق و مملوک ہے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت اس کی خصوصیت و امتیاز اور شرف و فضیلت [illegible]

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"حضرت مسیحؑ کی اللہ نے جس روح القدس سے تائید فرمائی تھی اس کے متعلق قرآن، انجیل اور دوسری آسمانی کتابوں میں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ وہ اللہ کی ایسی صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے اور وہ اس کی حیات ہو اور نہ یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ خالق و رازق ہے، پس روح القدس نہ تو اللہ کی ذات ہے اور نہ اس کی صفت ہے، انبیاءؑ کے کلام میں اس کا ذکر بھی نہیں ہے کہ اللہ کی وہ صفت جو اس کے ساتھ قائم ہے 'ابن' اور 'روح القدس' کہلاتی ہے، پس نصاریٰ کی یہ تاویل کہ 'ابن' سے اللہ کی صفت علم اور روح القدس سے اس کی صفت حیات مراد ہے، حضرت مسیحؑ پر نہایت صریح اور واضح بہتان ہے۔" (الجواب الصحیح ج ۱ ص ۲۹۶ و ۲۹۷)

الفاظ، اصطلاحات اور تعبیرات ہی کی غلطی سے نصاریٰ غلو فی الدین کے بھی مرتکب ہوئے جس کے نتیجہ میں انھوں نے الوہیت و نبوت کے فرق کو نظر انداز کر دیا اور خالق و مخلوق میں کوئی امتیاز باقی نہ رکھا، اس مسئلہ پر [illegible] امام ابن تیمیہؒ نے روشنی ڈالی ہے:

"نصاریٰ نے مسیحؑ کو خالق کے اوصاف و کمالات سے متصف کر دیا، چنانچہ وہ حضرت مسیحؑ کو ہر چیز پر قادر، آسمانوں اور زمین کا خالق، قدیم، ازلی اور علام الغیوب مانتے ہیں، قرآن مجید میں ہے کہ انھوں نے اپنے علماء و فقہاء کو اللہ کے بجائے معبود بنا لیا۔" (ایضاً ص ۳۰۳) ..... نصاریٰ مخلوق کو خالق کے مشابہ اور ایسی صفات کمال سے متصف مانتے ہیں جن کا مستحق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، چنانچہ بت پرستوں کی طرح وہ مخلوق کو رب العالمین، ہر چیز کا مالک، ہر چیز سے باخبر اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا مانتے ہیں، مخلوقات کی تصویریں بنا کر انھیں شفیع اور اللہ کے یہاں سفارشی سمجھتے ہیں ..... حضرت مسیحؑ کو اللہ اور ابن اللہ کہتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مکمل الٰہ بھی ہیں اور مکمل انسان بھی ہیں۔" (ایضاً ص ۲۴۱ تا ۲۴۳)

ادبیات

نعت

از جناب وارث ریاضی صاحب، مغربی چمپارن

امام الانبیاء، خیر الوریٰ، محبوبِ ربانی
خدا شاہد، دو عالم میں نہیں ان کا کوئی ثانی

وہ پیکر حسن کا، جس کے فروغِ روئے تاباں سے
ستاروں کی چمک، شمس و قمر کی نور افشانی

وہ محبوبِ خدا جس کے تبسم ہائے پنہاں سے
بہارِ لالہ و گل، قطرۂ شبنم کی تابانی

بنایا حق نے جس کو مہرِ تاباں برجِ رحمت کا
قیامت تک رہے گی جس کے جلووں کی درخشانی

وہ چھیڑا جس نے سازِ معرفت پر نغمۂ وحدت
وہ کھولے جس نے انساں پر رموزِ بزمِ عرفانی

وہ ہادی جس کے انوارِ ہدایت سے ہوئی روشن
جہالت کی شبِ تاریک میں قندیلِ ایمانی

وہ رہبر جس نے گمراہوں کو سیدھی راہ دکھلائی
وہ داعی جس کی دعوت امتثالِ امرِ ربانی

وہ پیغمبر خدا کا جس نے بخشا نور انساں کو
دلِ درد آشنا، پُرنم نگاہیں، سوزِ ایمانی

وہ ختم المرسلینؐ فخرِ دو عالمؐ، جس کا اسوہ تھا
قیامِ شب، فغانِ صبح گاہی، ذکرِ ربانی

وہ سلطان الامم، جس کے فرامینِ ہدایت میں
امان و امنِ عالم، احترامِ نوعِ انسانی

گلِ رحمت سے جس نے گلشنِ عالم کو مہکایا
وہ جس کے نور سے روشن ہوئی ہے بزمِ امکانی

وہ مصلح جس نے طرحِ صلحِ کل ڈالی زمانے میں
وہ محسن جس کی ممنونِ کرم ہے نوعِ انسانی

خدا کا آخری پیغامبر، وہ رحمتِ عالم
مٹا دی جس نے آکر سارے عالم کی پریشانی

تمنا ہے بروزِ حشر وارث بس یہی اپنی
لپٹ کر ان کے دامن سے رہوں گرمِ ثنا خوانی

مطبوعاتِ جدیدہ

نقشہائے رنگ رنگ: مرتبہ جناب سید رضی الدین احمد صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۱۴، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۳۰ روپے، پتہ:۔ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴

جناب سید رضی الدین احمد ایک صاحب ذوق اہل قلم ہیں، انھوں نے سرکاری ملازمت سے وابستہ رہنے کے باوجود علم وادب سے برابر اشتغال رکھا اور وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہے، اب ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنے مضامین کا پہلا مجموعہ شایع کیا ہے، اس کی حیثیت حسین گلدستہ کے رنگ برنگے پھولوں کی ہے، اس میں چار عنوانات کے تحت "گیارہ" مضامین درج ہیں، حصۂ اول "تاریخ و تحقیق" میں دو مضامین درج ہیں، پہلا عظیم آباد (پٹنہ) کی تاریخی علمی سیر" بہت سیر حاصل اور معلومات سے پُر مضمون ہے اور دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے، اس میں پٹنہ کی قدامت، اس کے مختلف ناموں اور اس کی چھ سو برس قبل مسیحؑ سے اب تک کی علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں کی سرگذشت بیان کی ہے، قدیم ہندو راجاؤں، ترکوں، افغانوں، مغلوں اور انگریزوں کے عہد کا علحدہ علحدہ ذکر ہے، انگریزوں کے دور کے ضمن میں قومی و سیاسی جد وجہد کی داستان بھی تحریر کی ہے، آخر میں پٹنہ کی اہم عمارتوں، قدیم مسجدوں، مندروں، خانقاہوں، امام باڑوں، علمی و ادبی مرکزوں، انجمنوں، درسگاہوں، کتب خانوں اور پٹنہ کے مختلف طبقوں کے اہل کمال علما و صوفیہ، شعرا و مصنفین، وکلاء، سیاسی رہنما، انجینیر، اصحابِ ثروت اور علم دوست امراء و رؤسا کا ذکر کیا ہے، اور علمی و ادبی تصانیف، انگریزی و اردو اخبار و رسائل کے بارہ میں معلومات بھی قلمبند کی ہیں، اس مضمون سے پٹنہ کی مختلف سرگرمیوں اور زندگی کے مختلف شعبوں کا مرقع سامنے آجاتا ہے

دوسرے مضمون میں یہاں کی دو قدیم کتابوں کا مختصر تعارف ہے، پھر سائنس اور معاشیات پر ایک ایک مفید مضمون ہے، تیسرے حصہ میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد دریابادی، جمیل مظہری اور پٹنہ کے بعض اصحاب علم و کمال کا ماتم ہے، ان مختصر مضامین سے سب کی سیرت و شخصیت اور کمالات کے مختلف پہلو سامنے آگئے ہیں، آخری حصہ میں سفر حجاز کے تاثرات، حج و زیارت کعبہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کی روداد والہانہ انداز میں لکھی ہے، اس کو پڑھ کر حج و زیارت کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے، ان مضامین سے مصنف کے ذوق کے تنوع اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ مجموعہ تحریر کی سلاست و شگفتگی کے لحاظ سے بھی دلکش ہے۔

(۱) **الامام البخاری** مرتبہ الدکتور تقی الدین الندوی المظاہری، تقطیع خورد، طباعت عمدہ

(۲) **و ابوداؤد** (عربی) صفحہ ۱۶۸ و ۱۱۲، قیمت ۹۰۰ و ۴۰۰ ق۔ ل، پتہ: دمشق

دار القلم، حلبونی، ص۔ ب ۲۳۔ ہاتف ۲۲۹۱۷۷۔

مولانا تقی الدین ندوی کو علم حدیث سے برابر اشتغال رہا ہے، پہلے وہ نامور ائمہ حدیث اور اسماء الرجال پر اردو میں مفید کتابیں لکھ چکے ہیں، اب کئی برس سے ابوظبی میں مقیم ہیں، لیکن سرکاری مصروفیتیں علمی اشتغال میں مانع نہیں ہوئی ہیں، اس لیے وقتاً فوقتاً ان کے علمی نتائج بھی سامنے آتے رہتے ہیں، جو اردو کے بجائے عربی میں ہوتے ہیں، ۱۹۷۶ء میں امام بخاریؒ کے حالات اور کارناموں پر ان کا عربی رسالہ شائع ہوا تھا، اس پر اسی زمانہ میں معارف میں تبصرہ کیا گیا تھا، اب اس کا نیا ایڈیشن چھپا ہے، دوسرا رسالہ امام ابوداؤد سجستانیؒ کے حالات اور ان کی شہرۂ آفاق کتاب السنن کے تعارف پر مشتمل ہے، پہلی دفعہ شائع ہوا ہے، اس میں امام صاحبؒ کے حالات و واقعات زندگی، فضل و کمال اور کتاب السنن کے متعلق تحقیق و محنت سے معلومات قلمبند کیے گئے ہیں، مصنف نے شروع میں امام ابوداؤدؒ کے عہد کے علمی و سیاسی حالات کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے، اور آخر میں سنن کے بعض ابواب کی منتخب حدیثیں

نمونہ کے طور پر نقل کی ہیں، سنن کے متعلق گوناگوں قسم کے معلومات بیان کیے ہیں، جیسے اس کا موضوع، متعدد تالیف، مرویات کی تعداد، کتبِ صحاح میں اس کا درجہ، اس کی شرطیں اور اہم خصوصیات، اس کی حدیثوں کے مختلف طبقے اور ہر طبقہ کی روایتوں کی نوعیت، اس کے متداول نسخوں، رواۃ اور شروح و تعلیقات وغیرہ، سنن ابی داؤد کی جن حدیثوں پر نقد کیا گیا ہے اُن پر متوازن انداز میں بحث کی ہے، ان دونوں رسالوں سے دو جلیل القدر اساطین حدیث و روایت اور ان کی مہتم بالشان تصنیفات کے متعلق اکثر اہم اور ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، لیکن امام ابو داؤد کے عہد کے ذکر میں اس کی وضاحت نہیں ہو سکی ہے کہ خود ان کا اپنے دور کے حالات کے بارہ میں کیا رویہ اور ردِ عمل تھا۔

تاریخ اقلیم ادب مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،
(پہلا حصہ) صفحات ۲۴۳ مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۲ روپیہ۔ پتہ: یوپی اردو اکاڈمی ۱۲ آر، کے، ٹنڈن روڈ، لکھنؤ، (یوپی)

اردو زبان و ادب کی مبسوط و مختصر متعدد تاریخیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، یہ طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے، پوری کتاب دو یا اور زیادہ حصوں میں مکمل ہوگی، یہ پہلا حصہ ہے، اس میں چودھویں سے سترہویں صدی عیسوی تک مختلف علاقوں میں اردو یا ہندوی زبان کے نشو و نما اور تدریجی ارتقار کا ذکر ہے، شروع میں اس زبان کے آغاز و ابتدار پر اجمالی بحث ہے، چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں زبان کا بالکل ابتدائی دور تھا، اسی لیے اس کا حال بہت مختصر ہے، مگر سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں اردو کے نشو و نما پانے اور اس کے ارباب کمال کا کسی قدر مفصل تذکرہ ہے، ان صدیوں کی اہم اردو تصنیفات کے تعارف کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے حکمرانوں کی ادبی دلچسپی کا حال بھی تحریر کیا ہے، کتاب محنت سے مرتب کی گئی ہے، اور اس سے لائق مصنف کی اردو ادبیات پر اچھی نظر کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے جدید مآخذ اور

تحقیقات سے بھی خاطر خواہ مدد ملی ہے، لیکن اردو زبان کا ابتداء اور بعض دوسرے مختلف فیہ مسائل میں وہ کوئی متعین فیصلہ نہیں کر سکے ہیں، وہ اردو کے ہونہار اہل قلم ہیں اور ان کا ادبی و تحقیقی ذوق عالی ہے ان سے توقع تھی کہ اس قسم کی بحثوں میں کوئی قطعی اور فیصلہ کن رائے تحریر کریں گے، اگر آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کر دی گئی تو کتاب کا وزن محسوس کیا جائے گا۔

(۱) **القادیانیۃ بین الاسلام والاستعمار** از ڈاکٹر محمد حسان خاں، تقطیع خورد

(۲) **ایران کا اسلامی دستور ایک جائزہ**۔ متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر

صفحات ۶۷، ۴۹، قیمت ۶ و ۴ روپے، پتہ:- ۱ مکتبۂ دین و دانش ۱۳ شارع مسجد شکور خاں، بھوپال و ۲ بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال۔

ڈاکٹر مولوی محمد حسان خاں، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی بھوپالی کے فرزند ہیں، ان کو دینی غیرت وحمیت اپنے والد بزرگوار سے وراثۃً ملی ہے، یہ دونوں کتابچے اسی کا ثمرہ ہیں، پہلے میں برطانوی استعمار کا قادیانیت کا سرپرست اور پشت پناہ ہونا دلائل سے ثابت کیا گیا ہے، رد قادیانیت پر بہت لکھا گیا ہے، اور ضمناً اس پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ قادیانیت انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھی ہے، زیر نظر رسالہ کا خاص اور اصل موضوع یہی ہے، اس میں وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جو انگریزوں کی قادیانیت کی سرپرستی و تائید کا باعث ہوئے تھے، دوسرے رسالہ میں جسٹس فیصل مولوی خلیل کا موجودہ ایرانی دستور پر تبصرہ درج ہے، یہ بیروت کے اخبار الامان میں بالاقساط شائع ہوا تھا، تبصرہ نگار نے ایرانی دستور کی جن فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلائی ہے ان میں اکثر باتیں قابل غور ہیں، لیکن بعض محل نظر بھی ہیں، پہلا رسالہ عربی میں ہے، اور دوسرا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے شروع میں مترجم نے ایرانی انقلاب کے متعلق جو اچھی توقعات قائم کی ہیں خدا کرے وہ پوری ہوں، یہ دونوں رسالے ہونہار مصنف کی اولین کوشش ہے اس لیے ان میں جو کمی رہ گئی ہے وہ ان شاء اللہ آئندہ درست ہو جائے گی۔

"ض"

جلد ۱۲۹ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۸۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

شروع اپریل میں پاکستان ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی کہ جناب سید حسام الدین راشدی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ خبر راقم حروف کے لیے بڑی جانکاہ تھی۔

وہ دارالمصنفین کے بڑے قدردان اور پرستار رہے، انھوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ ان کا شمار کرنا آسان نہیں، مگر کہتے کہ خدا کی قسم میں نے دارالمصنفین کی کتابوں ہی سے لکھنا سیکھا، وہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے مداح تھے، دارالمصنفین سے جو بھی کتاب شائع ہوتی اس کو ضرور منگواتے اور اپنی الماری میں نمایاں جگہ دیتے، اس ادارہ سے غیر معمولی محبت کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی میں اس کے لیے زمین کا ایک بڑا پلاٹ خرید لیا تھا کہ وہ اس کو وہاں منتقل کرالیں، لیکن یہ وہاں کیوں منتقل ہوتا، آخر میں وہ برابر کہتے رہتے کہ یہ ہندوستان ہی میں رہ کر بہتر کام کرسکتا ہے، اور اس کو اسی سرزمین میں رہنا چاہیے جہاں قائم ہوا ہے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے ناشرین نے اس ادارہ کی مطبوعات کو چھاپ کر جو نقصان پہونچایا اس سے وہ بہت رنجیدہ رہے، ان کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے ایک کمیٹی بنائی، جب یہ موثر نہ ہوسکی تو وہاں کے تمام انگریزی اور اردو کے اہم اخبارات میں مضامین لکھے کہ حکومت پاکستان اس ادارہ کی مطبوعات کا حق طباعت واشاعت خرید کر اس کو گراں قدر معاوضہ دے، یہ اخباری مہم ایسی مفید ثابت ہوئی کہ اس خاکسار کو حکومت پاکستان نے اسلام آباد بلایا اور ایک طویل مدت کی دفتری کارروائی کے بعد پندرہ لاکھ روپیے دارالمصنفین کو دے کر اس کی مطبوعات کا حق طباعت واشاعت اپنے ایک ادارہ نیشنل بک فونڈیشن کے سپرد کردیا۔

اس کے لیے دارالمصنفین زیادہ تر جناب سید حسام الدین راشدی کا شکر گذار رہا، اس سلسلہ میں اس عاجز راقم کو جب جب کراچی جانا پڑا تو ان کی صحبت کی صبح حسین، شام رنگین اور رات

عنبر زمیں بنا دیتے، وہ اپنے بے پایاں کرم و محبت کی بنا پر کراچی کے اہل علم کو اپنی آراستہ و پیراستہ کوٹھی میں پرتکلف کھانے پر مدعو کرتے اور اس دعوت کو اپنی بذلہ سنجیوں، علمی پھلجھڑیوں اور پرکیف قہقہوں سے زعفران زار بنا دیتے، کبھی تنہائی میں ان کی نوشت و خواند کے پرسکون گوشۂ عافیت میں جا بیٹھتا تو پھر اس میں علم و فن کی مہتابی چھٹکی نظر آتی، ہم دونوں محسوس کرتے کہ ہماری زندگی کے بہترین لمحات گذر رہے ہیں، کراچی سے واپس آکر معارف کے صفحات پر لطف و لذت کے ساتھ ان کا ذکر کرنے میں قلم بالکل نہیں تھکتا۔

وہ فرماتے کہ اگر وہ دارالمصنفین کی زیارت اپنی زندگی میں کرلیں گے تو پھر چین کی ابدی نیند سوئیں گے، یہاں کے بین الاقوامی سیمینار میں ان کو مدعو کیا تو فوراً جواب دیا کہ اس میں ان کی شرکت اس لیے ہوگی کہ وہ اپنے ذہنی قبلہ کا طواف کرلیں گے، مگر ان کے بعض خطرناک آپریشن ہونے والے تھے، جس کی کامیابی کی امید خود ان کو نہ تھی، وہ یہاں آنے کے بجائے وہاں پہونچ گئے جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، ان چند تعزیتی سطروں کو لکھ کر مجھ پر ان کا جو حق ہے وہ ادا نہ ہوسکے گا، میرا بس چلتا تو ان پر ایک ضخیم کتاب لکھتا، ان شاء اللہ معارف کی کسی اشاعت میں ان پر ایک طویل مضمون ہوگا، ان کی وفات علمی تحقیق، علمی محنت، علمی ریاضت، علمی موشگافی، علمی نکتہ پروری کے ساتھ علم دوستی، دوست پروری، اخلاق کی رعنائی، اخلاص کی دلآویزی اور پرانی قدروں کی دلربائی کی بھی موت ہے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنی آغوش رحمت میں لے کر کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کرے، آمین۔

ان کی وفات کے ساتھ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی کی رحلت کی بھی خبر ملی، وہ ہندوستان کے مشہور بزرگ عالم، واعظ اور ندوۃ العلماء کے مربی مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے فرزند ارجمند تھے، ندوہ سے سند حاصل کرکے کچھ دن پھلواری کی جامع مسجد کے امام ہوئے تو اسی امامت سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا اور جب

پاکستان بنا تو ایک جید عالم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ اور منفرد مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے، بہت دنوں تک لاہور کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ رہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہوئے جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں آئین مصطفوی، ریاض السنۃ، پیغمبر انسانیت، ازدواجی زندگی کے لیے قانونی تجاویز، مسئلۂ تعدد ازدواج، تحدید نسل، اجتہادی مسائل، زیر دستوں کی آقائی، ترجمہ الغزی وغیرہ، وہ قدیم و جدید طرز فکر کے امتزاج کے خواہاں تھے، اس کی تردید کرتے رہے کہ شریعت کو غیر متبدل نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں جو توسع اور تیسیر رکھا گیا ہے اسے آج بھی باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ان کی بعض تحریروں سے دینی حلقوں میں ہلچل پیدا ہوتی رہی، مگر وہ جہاں پہونچ جاتے اپنی شیریں بیانی سے اپنے ہم نشینوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے، اچھے مقرر اور واعظ بھی تھے، کلام پاک کی آیتیں خوش الحانی اور اشعار ترنم سے پڑھ کر بڑی کیفیت پیدا کر دیتے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرماتے رہیں، آمین۔

پاکستان ہی میں اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کی وفات ہوئی، انھوں نے اردو شاعری کی صنف نظم گوئی کو بڑی ترقی دی، غزل گو کے بجائے نظم گو کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئے، ان کے مداح ان کے فن اور شاعرانہ عبارت کے بڑے قدرداں ہیں، مگر ان کے کچھ ناقد ایسے بھی ہیں جو ان کی شاعری میں خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کے بجائے صرف گھن گرج اور چیخ و پکار زیادہ پاتے ہیں، دینی حلقوں میں تو اپنے ملحدانہ اور رندانہ طرز فکر کی وجہ سے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے، مگر جب کبھی اردو شاعری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ان کے شاعرانہ فن کی وجہ سے ان کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔

آج کل رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پر بھی ماتم بپا ہے، وہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ اردو شاعری کی بہت سی رعنائیاں اور جلوہ سامانیاں بھی ساتھ لیتے گئے، فانی، اصغر، جگر اور حسرت کے بعد اردو شاعری کے لال قلعہ کے تخت طاؤس پر بیٹھ کر وہی شاہجہانی کرتے رہے، زبان کی زور آوری، فن کی ہمہ گیری، احساسِ جمال کی رقم آرائی، رومانیت اور کلاسیکیت کی ہم آہنگی، غزل گوئی کی آیندہ ساخت و پرداخت میں رہبری، کیفیت و حلاوت کی رنگ آمیزی اور اردو زبان کی بے پناہ محبت کی فراوانی میں وہ یگانۂ روزگار رہے، وہ خود کہہ گئے ہیں

کچھ درد دے گیا ہوں زمانے کو اے فراق ؎ یہ سوچ کر کہ بعد میں یہ کام آئیں گے

کیا عجب کہ یہ صحیح ثابت ہو۔

مقالات

مستشرقین اور طبِ اسلامی

از

جناب حکیم محمد سعید دہلوی ۔ ہمدرد فونڈیشن ۔ کراچی (پاکستان)

ہمارے اسلاف نے قرآن کریم کی روشنی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے فیض سے عالم انسانیت کو جو تہذیب عطا کی اور علوم وفنون کے میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے وہ تاریخ عالم کا بیش بہا ذخیرہ ہیں، لیکن مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مسلمانوں میں سیاسی انحطاط کے ساتھ علمی لگن میں بھی کمی ہوئی تو وہ علمی پیش رفت تو رہی ایک طرف، اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی بیگانہ ہونے لگے اور ان کو مسلمان مشاہیر علم وادب کی خدمات کا علم و اندازہ بھی نہیں رہا۔

اقوامِ مغرب نے سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ علم و دانش میں بھی برتری حاصل کرنے کی سعیِ پیہم کی، اس کیلئے ایک طرف تو مغربی اہل علم نے مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں، دوسری طرف وہ خود علمی تلاش وتحقیق و کدوکاوش میں مصروف ہوگئے، اپنی علمی برتری اور اپنے اخلاقی تفوق کو ظاہر وثابت کرنے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ بھی نکالا کہ مسلمان اکابر ومشاہیر کے کارناموں پر تحقیق شروع کی اور اپنی تحقیق کے نتائج کو انکشافات کے انداز میں خود مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کیا،

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد کے مصداق ان کے اس طرزِ فکر و عمل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ خود مسلمان اہل علم کو بھی اپنے اسلاف کی عظمت پر توجہ ہوئی اور ان کو احساس ہوا کہ ان کے بزرگوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کو مستشرقین نے تسلیم کرنے میں کتمانِ حق سے خوب خوب کام لیا ہے۔ عالمِ اسلام میں بیداری اور احساسِ زیاں کی موجودہ لہر نے ہمیں ایک بار پھر موقع دیا ہے کہ ہم مستشرقین کے کارناموں کا بامعانِ نظر مطالعہ کرنے کے بعد حقائق کو تجزیہ و تحلیل کی چھلنی میں چھاننے کی کوشش کریں اور توازنِ فکر کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ 'اسلام اور مستشرقین' پر یہ بین الاسلامی موتمر مسلمان اہل علم کو ایک زریں موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے باب میں ایک جامع لائحۂ عمل تیار کریں۔

میرا موضوع 'مستشرقین اور اسلامی طب' ہے، میں نے اس میں اختصار کے ساتھ مستشرقین کے کام کا دیانتدارانہ اور فراخ دلانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اور کیڑے نکالنے کی ذہنیت اختیار نہیں کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی طب کی ایک مبسوط اور جامع تاریخ مرتب کریں اور اس میں مسلمان اطباء و حکماء کے کاموں کو صحیح علمی و تاریخی پس منظر میں پیش کریں، صرف اسی طرح ہم اس کوتاہی کی تلافی کر سکیں گے جو ہم نے اپنی علمی تاریخ کی تدوین سے غافل و بے نیاز ہو کر کی ہے، ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے میرا انداز فکر یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی کوتاہیوں، گمراہیوں اور جانب داریوں کی تنقید پر عطفِ توجہ سے زیادہ مثبت انداز میں خود علمی پیش رفت کی جانب مائل ہونا چاہیے، صرف اسی طرح ہم بعض مستشرقین کے بہکاووں اور ان کے مضر اثرات کا بھی ازالہ کر سکیں گے جو انھوں نے اپنے مخصوص مصالح اور مفادات کی بنا پر ہماری علمی تاریخ پر مرتب کیے ہیں۔

"لیگیسی آف اسلام" کے ایک مستند مجموعہ مضامین مستشرق الفریڈ گیوم نے اسے مختلف مذہبی اور بڑی دینی زبان سے دستاویزات کا ترجمہ کیا ہے کہ گیارہویں صدی میں یورپ میں قائم کی جانیوالی یونیورسٹیوں اور دوسری تعلیم گاہوں کے طرز تعلیم ہی نہیں بلکہ طرز تعمیر کا خاکہ بھی اسلامی جامعات کی نقل تھا۔ "گب" نے اسی کتاب میں شامل اپنے مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ انگلستان میں چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی وہ ایک مصری عالم مبشر ابن فاتک کی تالیف "ملفوظات فلاسفہ" کا انگریزی ترجمہ تھی، اس کتاب کو ارل ریورز نے ہسپانوی ترجمے کے واسطے The Dictates and Sayings of the Philosophers سے کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔

اس طرح قائم ہونے والی یورپی درسگاہوں اور ان کے اطراف کی آبادی پر پڑنے والے اثرات نیز عربی سے مغربی زبانوں میں منتقل ہونے والی کتابوں اور پھر صلیبی جنگوں اور ان کے اثرات مابعد نے اسلامی اور عربی علوم وفنون کے یورپ میں داخل اور دخیل ہونے کی راہیں ہموار کیں، ان علوم میں متعدد اسباب کی بنا پر طب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ای۔ جی۔ براؤن نے لکھا ہے کہ "صلیبی جنگیں مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کی محرک کہی جا سکتی ہیں، لیکن یہ محض ایک سیاسی پس منظر ہے، مترجمین کی ایک خاص تعداد حروب صلیبیہ سے پہلے ہی طبی سرمایے کو لاطینی میں منتقل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو چکی تھی"۔ سائنسی علوم کے ممتاز مورخ جارج سارٹن کا بھی خیال یہی ہے کہ صلیبی جنگوں سے صرف نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو اندلس میں مسلم حکومت کا قیام اور یورپ میں اس زمانہ میں قائم ہونے والی طبی درسگاہیں سرزمین مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کا اہم ترین سبب معلوم ہوتی ہیں۔

اطالیہ کے شہر سلرنو کے مدرسۂ طبیہ اور مونٹ پیلیر میں واقع طبی درسگاہ کو طب عربی کی

تعلیم و تدریس اور تالیف و ترجمہ کے لیے تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ یورپ کے حکمرانوں کے علاج معالجہ کے لیے جایا کرتے تھے۔

سلرنو کی درسگاہ کا ایک فرد قسطنطین الافریقی بھی تھا جو سب سے پہلے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلامی طب کے سرمایہ کو لاطینی میں منتقل کرنے کی طرف متوجہ ہوا، اور اس نے رازی کی الکیمیا، کا ترجمہ لاطینی میں کیا، اگرچہ طبی اصطلاحات کے تراجم میں اس سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، تاہم یہ فخر اس کو حاصل ہے کہ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے رازی کو مغرب سے روشناس کرایا، اسی طرح اس کی دلچسپی نے مغرب میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم کی تحریک پیدا کی، سلرنو کے مستشرقین میں ایک اہم شخصیت کریمونا کے جیرارڈ کی ہے جو ۱۱۱۴ء میں اٹلی میں پیدا ہوا، اس نے بطلیموس کی 'المجسطی' اور جالینوس اور بقراط کی کتابوں کے ترجمے کے علاوہ القانون کو لاطینی زبان میں منتقل کرکے اہم خدمت انجام دی، اس ترجمے کے بعد ہی اہل مغرب شیخ الرئیس سے کما حقہ متعارف ہوئے اور ان کے ہاں ایک نئے طبی دور کا آغاز ہوا، براؤن نے ایک اور مستشرق کا ذکر بھی کیا ہے، جو یورپ میں ابن سینا کے افکار کی اشاعت کا سبب بنا، ان کے علاوہ ایک یہودی طبیب فرج بن سالم نے ۱۲۷۹ء میں رازی کی کتاب الحاوی کا ترجمہ کیا۔

ایڈے لارڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلامی علوم اور عربی زبان کی باقاعدہ تحصیل کے بعد انگلستان جاکر متعدد عربی کتابوں کے ترجمے کیے، اس طرح رفتہ رفتہ اسلامی عربی علوم کو یورپ میں فروغ حاصل ہوتا گیا، ہسپانیہ کا شہر طلیطلہ اسلامی علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز تھا، ہسپانیہ میں پیرس کے ایک انگریز طالب علم ڈنیل مارلے نے عربی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے، اس کے سارے ترجمے بارہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک یہودی طبیب ابراہیم نے ڈاکٹر میکس مایرہاف کے اشتراک سے زہراوی کی کتاب کا ترجمہ کیا، الفانسو نیز بونا کوسا نے ابن رشد کی کتاب الافعال

اور کلیات کا ترجمہ کیا،

اسلامی علوم سے مستشرقین کے شغف کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ بیشتر اہم کتابوں کے ایک سے زیادہ ترجمے کیے گئے۔

تیرھویں صدی میں اسٹیفن نے الجوسی کا ترجمہ دینس سے ۱۴۹۵ء میں شایع کیا، رابرٹ اور ڈراگن کی کوششوں سے اور نیز دوسرے مترجمین کی محنت اور توجہ سے ۱۵ویں صدی میں کندی، رازی اور بعض دیگر اطبائے اسلام کی کتابیں بھی لاطینی میں منتقل ہو گئیں اور تسلسل کے ساتھ ٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپی زبانوں میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم اور ان کی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا، عہد بہ عہد مستشرقین کا ذوق تحقیق ترقی کرتا رہا، انھوں نے طبی ذخائر کی تلاش و جستجو شروع کی، نایاب نسخوں کی دریافت اور ان کی نشان دہی اور ان پر تحقیق کے ساتھ ان کی تہذیب و ترتیب ان کے اہم کارناموں کی حیثیت رکھتی ہے، انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی لائبریریوں کے علاوہ شخصی اور ذاتی کتب خانوں میں جا کر بعض اہم نسخوں کا مطالعہ کیا، پروفیسر براؤن نے بعض ایسی طبی کتابوں کے قابل اعتماد نسخوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی نقلیں شخصی کوششوں سے حاصل ہوئیں اطباء کی تاریخ میں قفطی کی تاریخ الحکماء خاص اہمیت رکھتی ہے، ڈاکٹر جولیس لیپرٹ نے خاصے حزم و احتیاط کے ساتھ ۱۹۰۳ء میں اس کو اڈیٹ کر کے شایع کیا۔

پروفیسر براؤن نے الحاوی کے بارہ میں لکھا ہے کہ "اس کا مکمل ترین نسخہ بوڈلین لائبریری میں ہے، اس کے بعض حصص کے فوٹو میں نے پروفیسر مارگولیتھ کی مہربانی سے حاصل کر لیے ہیں "

طب اسلامی پر تحقیق کا کام جس کے لیے صرف طبی کتابوں کے ذخیرے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ان وسائل کا اہتمام بھی ضروری تھا جن کی مدد سے ان تصانیف اور کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو، ان میں قلمی نسخے بھی شامل ہیں، اس سلسلہ کا پہلا کام ان مخطوطات کا تحفظ تھا، پھر بعض

برٹش میوزیم لندن اور اسی طرح برلن کے مشرقی علوم کے کتب خانے اور کتب خانۂ پیرس کے علاوہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے شعبۂ علوم شرقیہ نے انجام دیا۔

تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کتب و مخطوطات کی محققانہ فہرست سازی بھی افادی نوعیت کا ایک اہم کارنامہ ہے، اور انہی فہارس کے ذریعہ خود مشرقی دنیا کو اپنے بعض گوہرہائے نایاب کی اطلاع ملی۔

یہ فہرستیں صرف کتابوں کے ناموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ مصنفین اور مباحثِ کتاب کا ممکن حد تک تعارف بھی ان فہرستوں میں موجود ہے جس سے اہل علم ہر دور میں مستفید ہوتے رہے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے لیکرک، بروکلمان کا تذکرہ اپنے لکچرز میں جا بجا کیا ہے، ایسی فہرستیں اربابِ ذوق کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں، ان فہرستوں اور طبی ذخیروں کی موجودگی اور عربی زبان و ادب سے مستشرقین کی دلچسپی نے ان کو اہم خدمات کا موقع عطا کیا۔

پروفیسر براؤن کی صراحت کے مطابق بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد طبی کتابوں کے انگریزی تراجم کے علاوہ ابن الندیم کی الفہرست (۳۷۷ھ)، قفطی کی تاریخ الحکماء (۶۲۴ھ) ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء (۶۴۰ھ) اور اسی نوع کی بعض دیگر کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن منظر عام پر آچکے تھے، اور یہ قابل قدر خدمات مستشرقین ہی نے انجام دی تھیں۔

طب عربی کی عمومی خصوصیتوں پر نیوبرگر، ہیچل، وستنگٹن، گیریسن وغیرہ نے قابل قدر کام کیا۔

طب اسلامی پر ناقدانہ بحث و نظر کے سلسلہ میں ڈاکٹر کونک اور ڈاکٹر سائمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان محققین کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اطبائے اسلام کی طبی اصطلاحات کو صحت کے ساتھ درج کیا اور یونانی اصطلاحات سے ان کا مقابلہ و موازنہ بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی میں طب اسلامی سے مستشرقین کے شغف نے جو ارتقائی شکل اختیار کی، اس کے بعض پہلو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، انیسویں صدی سے ان کی تحقیقات کا دائرہ ترجمے اور یونانی کتب سے تقابل سے آگے بڑھ کر سائنٹفک بنیادوں پر قدیم طبی حقایق کی تلاش و جستجو شروع ہوئی، اس کو ہم ان کے علمی ذوق و شعور کی ترقی بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کی اپنی ضرورت بھی۔

فاضل مستشرق مارٹن لیوی نے الکندی پر اپنی فاضلانہ تحقیق پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے "یہ امر مسلّم ہے کہ جدید طب نے خصوصیت کے ساتھ طب اسلامی کے علم دوا سازی اور قرابادینوں سے استفادہ کیا ہے، جدید فن دوا سازی کو اساس و بنیاد طب اسلامی ہی نے فراہم کی" یہی خیال دراصل ان کے ذوق تحقیق کے لیے تازیانہ بنا، چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ صدی میں مستشرقین کی توجہ طب اسلامی کے ذخائر کی طرف روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہے، انھوں نے طب کی فنی کتب ہی نہیں بلکہ مسلمان اطبار کی سوانح اور ان کے علمی کمالات کی تفصیلات پر دقیق نظر ڈالی، طب اسلامی کے اولین مآخذ کی تلاش و جستجو کی، مسلمان اطبار کے افکار کے سائنسی عناصر کا تجزیہ کیا، اور دانش حاضر کے سرمایے میں ان کے اثرات کی کارفرمائیوں کا جائزہ بڑے تعمق کے ساتھ لیا، نہایت سلیقہ سے علم اور علمار کی تاریخ کے اہم مآخذ کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا اور ان سارے وسائل و ذرایع سے کام لے کر اطبائے اسلام کے کارناموں پر شرح و بسط اور نقد و نظر کے ساتھ روشنی ڈالی۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ اطبائے اسلام کے کارناموں پر مستشرقین کے مضامین و مقالات اور ان کی تصانیف سرسری نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ قدیم تذکرہ نگاروں کی روش سے ہٹ کر تفصیل و تجزیہ اور تعیین مقام و مرتبہ کی کوشش بھی ان کی ممتاز خصوصیت ہے، لیکن ان کے ہمہ گیر ذوق تحقیق یا ان کی خدمات کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ اہم ہے، اور وہ ہے اطبائے اسلام کی

تصانیف کو تصحیح و تہذیب کے ساتھ مرتب کر کے پیش کرنا، اور حق یہ ہے کہ اس سوا ان تمام کی محنت وکاوش، وقت نظر اور بصیرت کی داد نہ دینا ناانصافی ہے، اس آخر الذکر کارنامے کا منفرد پہلو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے بعض قیمتی کارنامے ہم تک انہی کوششوں سے پہونچے، اور مستشرقین نے اسلاف کے بعض ایسے علمی کارنامے طشت از بام کیے ہیں جن کی خبر ہمارے بیشتر اہل علم کو اب تک نہیں ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ادارت اور پیش کش ایسے سائنٹفک اصولوں پر ہوتی ہے جن سے تصنیف و مصنف دونوں کی عظمت و افادیت کے سارے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی ادارت وتحقیق کی انفرادیت کے ضمن میں قدما کی فنی تصانیف کے بھی چند خصائص کا ذکر ضروری ہے، جو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت اہم ہیں، اطبائے اسلام کی فنی تصانیف مثلاً رازی کی الحاوی، ابن سینا کی القانون اور سمرقندی کی القرابادین کی زبان و ہیئت آج کی زبان و ہیئت سے بہت مختلف ہے، وضاحت اور تفصیل جو عصر حاضر کی تحریروں کی خصوصیات ہے وہ بظاہر ان کتابوں میں نظر نہیں آتی، بعض رسائل و کتب پر از اول تا آخر ایک مسلسل پیراگراف کا گمان ہوتا ہے، جو رموز اوقاف سے خالی ہو، یوں اس قلزم میں سارے گہر موجود ہیں، لیکن قاری کے لیے گہر چینی دشوار ہوتی ہے۔

معنوی خصوصیت میں ابہام اور اصطلاحات کا بکثرت استعمال اور مختصر اشارات خاص طور پر لائق ذکر ہیں، کتابوں کے متون بعض ناقلوں کی غفلت کی وجہ سے خلط ملط بھی ہوئے ہیں، ان مشکلات کی موجودگی میں تہ رسی اور غواصی کی مہم بہ آسانی سر نہیں کی جاسکتی تھی، مستشرقین بلاشبہ قابل تبریک ہیں کہ ان دشواریوں کے باوجود انھوں نے طبی کتابوں کے مضامین اور نکات کا ادراک کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

قدما کے طرز تصنیف اور زبان کی پیچیدگی، اصطلاحات کی کثرت، عبارتوں کی صحت ... ذکر برادن نے بھی کیا ہے، قدیم مصنفین کے نزدیک فنی کتابوں میں تفصیل و تشریح کو غیر علمی اسلوب ... سمجھا جاتا تھا، حاشیے اور شرحیں اسی لیے وجود میں آئیں، قدیم مصنفین کا خیال تھا کہ کتاب کے مضامین ... ترتیب، حوالے اور مآخذ کی جستجو، اشارات کی مدد سے مباحث کا مکمل ادراک مطالعہ کرنے والے ... کا کام ہے، مطالعہ کرنے والوں پر ساری تفاصیل کے دروازے کھولنے کی کوشش کو وہ علم اور اہل علم ... ذہنوں کی توہین اور حق تلفی سمجھتے تھے، لیکن جدید دنیا میں اختصار، اغماض اور ابہام کے برخلاف ... قاری کو ساری سہولتیں بہم پہونچانے کی ذمہ داری مصنف کی سمجھی جاتی ہے، اور جو فنی کتابیں ان ... خصوصیات سے خالی ہوتی ہیں وہ اپنی وسیع افادیت کے باوجود علمی استفادہ میں مشکلات پیدا ... کرتی ہیں۔

مستشرقین کی یہ کوشش بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جدید طرز تحریر و تصنیف کے تمام تقاضوں ... کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے قدیم طبی سرمایے کو اس قدر پرکشش اور استفادہ کے لیے زیادہ آسان ... بنا دیا ہے، مشکل مقامات پر توضیحی نوٹ اور کتاب کے مندرجات کی ابجدی فہارس مرتب کر کے ... انھوں نے کتابوں کی افادیت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

میں اس جگہ طبی اہمیت کے دو کارناموں کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرانا چاہتا ہوں، جو ... مستشرقین کی مساعی سے ہم تک بڑے مناسب انداز میں پہونچے ہیں، یہ کارنامے الکندی ... اور سمرقندی کی قرابادین ہیں، جنھیں مارٹن لیوی نے ترتیب نو اور تہذیب نو کے بعد انگریزی ... ترجمے کے ساتھ شایع کیا۔

تذکرہ نگاروں نے الکندی کی دو سو پینسٹھ (۲۶۵) کتابوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر ... ناپید بتائی گئی ہیں، امراض و علاج پر اس نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کا صرف لاطینی ترجمہ موجود ہے جس کے

متعلق میکس مائرہوف نے لکھا ہے کہ راجر بیکن اور دوسرے مغربی علماء نے بصراحت اس سے استفادہ کیا ہے، میرے علم کی حد تک کسی مشرقی زبان میں الکندی کی یہ کتاب موجود نہیں، اسی طرح مسلمان تذکرہ نگاروں نے الکندی کی تصانیف میں سے بعض کتابوں کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، ابن ندیم کی الفہرست میں اس کتاب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ترکی کے کتب خانہ ایا صوفیہ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا لیکن تا حال تک یہ غیر معروف رہا، ایک ترک عالم کی نشاندہی پر مارٹن لیوی نے اسے اصل مخطوطے کے فوٹو اور اس کے انگریزی ترجمے کے ساتھ مہذب اور منقح کر کے شائع کیا ہے، لیوی نے کتاب میں جو اضافی ابواب تحریر کیے ہیں ان میں الکندی کی شخصیت اور اس کے علمی اور خاص طور پر طبی کارناموں کا مفصل ذکر کیا ہے، طب اسلامی میں دواسازی اور علم الادویہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، قرابادین میں جو مرکبات کا ذکر ہے ان کے مفرد اجزاء کے سائنٹفک مترادفات (نباتاتی اور کیمیائی نام) دیے ہیں، طبی دواسازی کی اصطلاحات اور اعمال دواسازی کی تشریح و توضیح کی ہے اور جگہ جگہ تاریخی اور طبی اہمیت کے وضاحتی نوٹ لگائے ہیں، کتابیات کے ضمن میں ان جدید و قدیم مصادر کا ذکر کیا ہے جن سے طبی علوم اور تاریخ طب کے ضمن میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، کتاب کے آخر میں دواؤں کی فرہنگ اور اشاریے لگائے ہیں۔ اس طرح اس مستشرق نے تاریخ طب اسلامی کا ایک نیا باب داخل تحقیق کے لیے وا کیا ہے، اور ہمارے گم شدہ گوہر کو مجلی کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اس مستشرق نے بالکل اسی انداز پر فخر الدین رازی کے ہم عصر معروف طبیب نجیب الدین سمرقندی کی قرابادین بھی ایڈیٹ کر کے شائع کی ہے، لیوی کے ان دونوں کارناموں کا مفصل تذکرہ اس جگہ بے محل ہوگا، یہ دونوں کام میں نے محض نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اس جگہ چند ان مستشرقین کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے ایسی ہی بصیرت اور تحقیقی ندرت کے ساتھ خالص سائنٹفک انداز سے اطبائے اسلام کے کارناموں پر مورخانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

اور مستند ادبی نام ایڈورڈ جی براؤن کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے نامور پروفیسر اور وسیع النظر مستشرق کی حیثیت سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۰ء میں رائل کالج آف فزیشنز لندن کی دعوت پر انھوں نے طب اسلامی پر چار فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں کتابی صورت میں Arabian Medicine کے نام سے شائع ہوئے، سنہ ۱۹۳۳ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، یہ کتاب بظاہر طب عرب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف تاریخ نہیں ہے، بلکہ اس میں طب اسلامی کے اساسی تصورات، اس کے ارتقاء اور عالمی تہذیب پر اس کے اثرات، موجودہ طبی سائنس کی ترقی میں اس کے حصے، اکابر اطبائے اسلام کے مقام و مرتبہ، ان کے منفرد طبی اکتشافات، طب کی امہات کتب، ان کے مستند نسخے اور ان کی فنی افادیت کی فاضلانہ توضیح و تشریح پر مشتمل ایک بہترین کتاب ہے، اس کتاب میں طب اسلامی کے تصنیفی سرمایے کی طرف اشارہ ہی نہیں بلکہ پوری صراحت اور تحقیق کے ساتھ ہر ایک کے مضامین پر تبصرہ کیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر میکس نیوبرگر کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ میرے لیے بہت مفید ثابت ہوئی اگرچہ اس میں طب عرب کا ذکر کل ۴۶ صفحات میں ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتاب حقائق اور مستند تفصیلات سے پُر ہے"۔

پروفیسر براؤن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی میں طب اسلامی کی مستند تاریخیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اسی دور میں پروفیسر مارگولیتھ جیسے لوگ موجود تھے، جو تشریح قدیم کے سمجھنے میں براؤن کی رہنمائی کرتے تھے، اس طرح میکس نیوبرگر بھی اہم مستشرق سمجھا جاتا ہے، لیکن طب اسلامی کی عظمت کی پرشکوہ عمارت جن علمی اور سائنسی زاویوں سے مورخانہ صداقت کے ساتھ پروفیسر براؤن نے مغربی دنیا کو دکھائی اس نے دیگر مستشرقین کے لیے ایک مستقل مکتبہ فکر کی صورت اختیار کرلی۔

ان کے ٹھیک ۵۰ برس کے بعد ۱۹۳۱ء میں Legacy of Islam کے نام سے ایک اور اہم کتاب وجود میں آئی، یہ متعدد فضلاء کی کاوش علمی کی اور آرنلڈ کی مرتب ہوئی، اس کتاب میں مسلمانوں کی تمدنی، تہذیبی اور علمی میراث اور اس کی عالمی افادیت بالخصوص مغربی فکر و ثقافت پر اس کے اثرات کا ہمہ گیر جائزہ لیا گیا ہے، مختلف شعبہ ہائے علم و فنون میں خصوصی مہارت اور شہرت رکھنے والے ماہرین کے مقالات جمع کیے گئے ہیں، اس کتاب میں اسلام کے متعلق جو مختلف فیہ امور آئے ہیں وہ میرا موضوع نہیں ہیں، ان کے بارے میں تنقیدی حوالوں سے آپ حضرات واقف ہیں، اس کتاب کا ایک عنوان اسلامی طب و سائنس بھی ہے، مشہور مستشرق مائرہوف نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جس تاریخی ترتیب سے طب اسلامی کے ارتقاء اور مشرق و مغرب پر اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے وہ ترتیب Arabian Medicine (E. G. Browne) میں بھی نظر نہیں آتی، طبی کتابوں کے یورپین تراجم اور وہاں کی درسگاہوں کے نصاب میں ان کی شمولیت کی جو تفصیلات اس مستشرق نے پیش کی ہیں ان سے یورپ پر دانش اسلامی کے اثرات کا اندازہ کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بعض مستشرقین نے اطبائے اسلام کے فنی کمالات تصانیف اور ان کی اہمیت، مستند مآخذ اور دیگر تفصیلات پر جو مقالات پیش کیے ہیں وہ بھی منفرد نوعیت کے کارنامے کہے جاسکتے ہیں، میں اجازت چاہوں گا کہ اس کتاب کے مختلف فیہ مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی گفتگو صرف طب اور سائنسی علوم تک محدود رکھوں، الغرض اس دائرۃ المعارف میں الکندی، رازی، ابن رشد، ابن سینا، فارابی، سمرقندی، زہراوی اور دیگر اطبائے اسلام سے متعلق جو مستند اور مفصل معلومات یکجا کر دی گئی ہیں، وہ اگر ایک طرف اکابر کے کمالات کا مرقع ہیں تو دوسری طرف مستشرقین کے اہم کارناموں کی بھی حیثیت رکھتی ہیں، بیسویں صدی کے وسط اول ہی میں ایک ممتاز مستشرق جارج سارٹن جو پہلے ہی سے تاریخ علوم پر مستند مضامین و مقالات لکھ چکا تھا، ان اہم

کی حکومت ترکیہ نے اس سلسلہ میں ثقافت کی بنیادیں سائنس کے عنوان سے [illegible]

مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح ۱۹۷۶ء میں انڈونیشیا [illegible] سائنس کے نام سے [illegible]

پر مشتمل ایک کتاب وجود میں آئی جس میں دانش قدیم و جدید کا امتزاج بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا۔

جارج سارٹن نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میرا دعویٰ ہے کہ عصر حاضر کے علوم و فنون کی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی اساس و بنیاد ماضی میں موجود نہ ہو"۔

یہی خیال اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے ماضی میں انسانی تہذیب و ثقافت کی انتہائی گہرائیوں میں جا کر اساس و بنیاد کی جستجو کی اور اپنے مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔

چنانچہ قرون وسطیٰ کی تاریخ علم و ثقافت میں اسلام اور اہل اسلام کے علمی ذخیرہ کا ایسا کوئی گوشہ اس نے تشنہ نہیں چھوڑا۔ اطباء اسلام نے جس عظیم فلسفہ و سائنس کی بنیاد پر تمدن کی منزلیں طے کیں ان پر خصوصیت سے توجہ کی، اس سے نہ صرف ماضی و حال مربوط و ہم رشتہ ہو گئے ہیں بلکہ سارے اکابر کے کارناموں کے منفرد پہلو بھی پوری صراحت کے ساتھ سامنے آ گئے ہیں۔

اس کتاب کی یہ خصوصیت ساری علمی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس میں اسلامی طب و سائنس کا تذکرہ عالمی سائنس کے پس منظر میں کیا گیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی طبی دانش کی [illegible] کو حقیقی جمال و کمال کے ساتھ پیش کر کے سارٹن نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک تازہ کوشش ایڈنبرگ یونیورسٹی کا ایک سلسلہ کتب اسلامک سروے ہے جس کی گیارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں کی وجہ سے جہاں اہل مغرب میں اسلامی علوم کے تحقیقی مطالعہ کا ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے وہیں ان کی یہ خدمات ہمیں بھی یہ احساس دلاتی ہیں کہ ہمارے اسلاف نے [illegible] سائنسی تحقیقات [illegible] کیا ہے۔

جناب شاہ معین الدین احمد ندویؒ
کی
تاریخ اسلام جلد سوم و چہارم پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی تیسری جلد ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی، جو بنو عباس کے ابتدائی دور کے خلفاء کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

شروع زمانہ کے زیادہ تر عباسی خلفاء عالی دماغ اور کامیاب حکمراں گذرے ہیں، اس لیے شاہ صاحبؒ نے انکی بڑی مدح سرائی کی ہے، وہ ابو العباس عبداللہ بن محمد الموسوم بہ سفاح (۱۳۲ھ/۷۴۹ء - ۱۳۶ھ/۷۵۴ء) سے اس لیے خوش ہیں کہ وہ حلیم، باوقار، بہترین فیاض، خلیق اور سیر چشم حکمراں تھا اور ابوجعفر عبداللہ بن محمد الملقب بہ منصور (۱۳۶ھ/۷۵۴ء - ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) کے گوناگوں اوصاف کی تعریف دل کھول کر کرتے ہیں، جن میں سے کچھ انکی زبانی سننے کے لائق ہے، لکھتے ہیں کہ وہ اپنے حزم، عقل، علم، اصابت رائے، حسن تدبیر، وقار اور تمکنت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں تھا، اسی نے عباسی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کیا، اس کا سارا وقت امور مملکت پر غور و فکر اور اس کے انتظام میں صرف ہوتا تھا، باغیوں کے لیے وہ نرمی روا نہ رکھتا تھا، مگر عام رعایا کے لیے منصف اور عادل تھا، اس نے رعایا کو اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ معمولی معمولی آدمی اسے علانیہ ٹوک دیتے تھے، اس نے بغداد آباد کرکے اس کو دارالخلافہ بنایا، جو آگے چل کر دنیا کا عظیم الشان شہر بن گیا، اس کے درمیان قصر الخلد

نے اپنے لیے ایک محل تعمیر کرایا، جو اپنی خوبصورتی، زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کے لحاظ سے خلد کا نمونہ تھا، شہر کے ہر قبیلہ اور ہر طبقہ کے محلے الگ الگ اور مختلف چیزوں کے بازار جدا جدا ان کے ناموں سے موسوم تھے، اپنے ولی عہد مہدی کے لیے بغداد کے مشرقی جانب ایک دوسرا محل رصافہ کے نام سے بنوایا، جہاں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا، اسی کے زمانہ میں امام مالکؒ نے مؤطا لکھی، امام ابوحنیفہؒ نے فقہ مدون کی، ابن اسحاق نے مغازی مرتب کیے، اس کے درباری منجم ابراہیم فزاری نے علم ہیئت پر کئی کتابیں لکھی تھیں، جن میں ایک تسطیح کرہ پر تھی، منصور نے ابراہیم منجم کے لڑکے محمد سے سنسکرت کی کتاب سدھانت کا ترجمہ کرایا، محمد نے ہیئت کی ایک اور کتاب سند ہند کبیر کے نام سے تالیف کی، جو مدتوں علمائے ہیئت کا مرجع رہی۔ جارجیس نے منصور کے لیے طبی کتابوں کے ترجمے کیے، ایک اور درباری طبیب بطریق نے بقراط اور جالینوس کی کتابوں کے ترجمے کیے، منصور کے میر منشی عبداللہ بن مقفع نے جو بڑا نامور ادیب اور فلسفی تھا، ارسطاطالیس کی کتاب قاطیغوریاس، باری ارمیناس اور انولوطیقا اور منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی کا ترجمہ کیا، کلیلہ دمنہ کو بھی سب سے پہلے اسی نے عربی کا جامہ پہنایا، ہندی سے، پارسی علم الاخلاق کی کتاب کا ترجمہ الادب الکبیر اور الادب الصغیر بھی ابن مقفع کی یادگار ہے، ان کے علاوہ اس نے اور منصور کے دوسرے مترجموں نے ایران کے بانیان مذاہب مانی ابن دیصان اور مرقون کی کتابوں کے ترجمے کیے۔

شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ اپنی فیاضی کے باوصف بسا اوقات پیوند لگے کپڑے بھی پہنتا، اور کہتا کہ مرد آدمی اس حالت میں عز و شرف حاصل کر لیتا ہے کہ اس کی چادر پرانی ہوتی ہے اور اس کی قمیص کی جیب پیوند لگی ہوتی ہے، مگر خزانۂ عامرہ میں اتنی دولت چھوڑ گیا کہ اپنے ولی عہد کو وصیت کر گیا اگر تم کو دس سال تک بھی خراج نہ ملے تو تم کو اخراجات کی تنگی کی شکایت نہ ہوگی۔ (ص ۶۷)

شاہ صاحبؒ نے محمد بن منصور الملقب بہ مہدی کی بھی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں کہ نہایت خوش اخلاق

[illegible] کا کام تک : تھا۔ اس نے حرم کعبہ کی بڑی خدمت کی، [illegible]
[illegible] کے چاروں طرف مسقف [illegible] تعمیر کرائے، ان میں سنگ رخام کے ستون لگوائے،
کعبہ کے [illegible] غلاف کو اتروا کر کعبہ کی دیواروں پر مشک و عنبر ملوایا، قباطی، خز اور دیبا کے تین غلاف
چڑھائے، مسجد نبوی کی توسیع کرائی، شامی سمت پر عمارت میں سو ہاتھ کا اضافہ کیا، سنگ رخام کے
[illegible] ستون لگوائے اور پوری عمارت کو نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ مہدی مسلک میں بہت پختہ اور
مذہب کے معاملہ میں بڑا متشدد تھا۔ ملحدوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرتا، ان کی کتابیں جلا دیں،
الحاد اور زندقہ کے تدارک کے لیے علما کو مناظرانہ کتابوں کی تالیف کا حکم دیا، جس سے علم کلام کی بنیاد
پڑی۔ ملک میں جہاد کا سہرا اسی کے سر ہے، نماز با جماعت کا بڑا اہتمام کرتا۔ اس کا دل خشیت الٰہی سے
معمور تھا۔ ایک مرتبہ ہوا کا سخت طوفان آیا تو رخساروں کو فرش خاک پر رکھ کر دعا کی کہ خدایا امت
محمدیہ کی حفاظت کر، خدایا! ہمارے دشمنوں کو ہماری تباہی پر ہنسنے کا موقع نہ دے، اگر میرے گناہوں
کی پاداش میں تو نے عالم کو پکڑا ہے تو یہ پیشانی تیرے حضور میں حاضر ہے۔ اس کے باپ منصور نے
جس قدر مال زیادتی سے حاصل کیا تھا سب واپس کر دیا اور اپنے اعزہ و اقربا اور دوسرے مستحقین
میں دولت تقسیم کر دی۔ ایک ایک شاعر کو اس نے پچاس پچاس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں، آخر
میں اس کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔

[illegible] شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان خوبیوں کے ساتھ [illegible] بہت رنگین مزاج تھا
[illegible] تھا، [illegible]
سے [illegible]۔ اس کے لیے [illegible]
[illegible]
[illegible]

موسیٰ بن مہدی الملقب بہ ہادی نے ایک سال تین۳ مہینے حکومت کی، ۲۶ سال کی عمر میں وفات
یا، شاہ صاحبؒ نے اس کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ باپ ہی کی طرح جملہ اوصافِ جہانبانی سے
صف تھا، مذہب میں متشدد اور ملحدوں اور زندیقوں کا سخت دشمن تھا، ذات پاک نبویؐ کے
ملق کوئی گستاخی سنتا تو سر قلم کرا دیتا۔

ہارون رشید کا عہد دولت عباسیہ کا عہد شباب تھا، اس کی تفصیل لکھنے میں شاہ صاحبؒ کا قلم بہت
ںاں رواں ہوا، لکھتے ہیں: اس کے زمانہ میں دولت عباسیہ علمی، تمدنی اور سیاسی حیثیت سے اوجِ کمال
پہونچ گئی، بیت الحکمت اسی کے زمانہ میں قائم ہوا جس سے علوم و فنون کا دروازہ کھلا، اس کے دربار
ں جتنے علماء، شعراء، فقہا، قضاۃ، کاتب، ندیم اور گویے جمع ہوئے کسی خلیفہ کے دربار میں نہ تھے،
د بھی بڑا فاضل، شاعر، اخبار و آثار کا راوی اور صحیح المذاق تھا، خواص اور عوام سب کے دلوں میں
ں کی ہیبت تھی، اس کے پاس جیسا نورتن جمع تھا وہ کسی فرماں روا کو میسر نہیں آیا، اس کے وزیر برامکہ تھے،
ں کے قاضی امام ابو یوسف تھے، اس کا درباری شاعر مروان بن ابی حفصہ جیسا قادر الکلام تھا، جو اپنے
انہ کا جریر شمار کیا جاتا تھا، اس کا ندیم عباس بن محمد تھا، اس کا حاجب فضل بن عباس جیسا مرجع خلائق تھا،
س کا مغنی ابراہیم موصلی جیسا یگانۂ روزگار تھا، اس کی بیوی ام جعفر (زبیدہ) جیسی مخیر خاتون تھی جس نے
لی اور رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے، اس کی پرشکوہ زندگی میں رنگینی اور عیش پرستی بھی تھی لیکن
ں کے ساتھ وہ بڑا دیندار اور پابند شریعت بھی تھا، روزانہ سو رکعت نفلیں پڑھتا، روزانہ ایک ہزار درہم
یرات کرتا، اکثر حج کو جاتا، حج میں بڑے الحاح وزاری سے دعائیں مانگتا، جہاد کا شوق اور شہادت
کا بڑا ولولہ رکھتا، اسی کے ساتھ اس کی سلطنت نہایت مضبوط، ملک شاد آباد اور خزانہ معمور رہا،
اس کی سلطنت کا رقبہ بڑا وسیع تھا، دنیا کے بڑے حصہ سے خراج آتا تھا، والی مصر اس کا ایک عامل تھا
ہارون الرشید کے فضل و کمال، اس کے عہد کی علمی ترقیاں، رعایا کی خبر گیری، عدل پروری، حلم و عفو،

قرآن، مسئلہ خلق، فیاضی وہ اس کے مذہبی عقائد وغیرہ کے دکھانے میں شاہ صاحبؒ کے قلم میں بڑی روانی پیدا ہوگئی ہے، انھوں نے اس کے عہد کی بغاوتوں، شورشوں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد اس کے اوصاف اور محاسن بیان کیے ہیں، اس کو پڑھنے کے بعد یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ وہ تدبیر سیاست، عقل، دانش، فہم، فراست، فضل، کمال، عدل، انصاف، شجاعت، شہامت، فیاضی، دریادلی، حلم، عفو، سادگی، تواضع جملہ اوصاف میں کامل تھا، وہ اپنی بلند اور شریف ہمت اور اپنے نفس فاضل کی قوت سے علوم کو ان کے خزانوں اور معدنوں سے نکالنے پر آمادہ ہوا، اس نے ارسطا طالیس، سقراط، جالینوس اور اقلیدس وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور ان کے پڑھنے کا شوق دلایا، اس کے عہد میں شام، عراق اور فارس کے مترجمین بغداد میں جمع ہو گئے تھے جن میں نسطوری، یعقوبی، صابی، مجوسی، رومی اور براہمہ سب ہی تھے! یہ سب یونانی، فارسی، سریانی، سنسکرت، نبطی، لاطینی وغیرہ کے ترجمے کرتے تھے، بغداد اس وقت علم وفن کا مرکز بن گیا تھا، علم وفن کی خدمت میں اس کا زمانہ ہارون کے عہد سے بڑھ گیا تھا، اس نے عدل کے قیام اور جور وظلم کے انسداد میں بڑا اہتمام کر رکھا تھا، اتوار کے دن صبح سے ظہر تک رعایا کی شکایتیں سننے کے لیے خود بیٹھتا، وہ حد سے زیادہ حلیم وبردبار تھا، اپنے دشمنوں تک سے عفو ودرگذر سے کام لیتا، نوکروں کی باتیں سن کر چشم پوشی کر جاتا تھا، اس میں خودی اور تمکنت نام کو نہ تھی، اس کے نزدیک دولت کا مصرف یہی تھا کہ اس کو لٹا یا جائے، شعراء، ادباء، اہل کمال اور حاجت مند اس کی فیاضیوں سے مالامال تھے، اس کا اصولِ زندگی یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے اہل حاجت کی ضروریات پوری کی جائیں، اس کی فیاضی کے لیے اس کے خزانہ کی آمدنی ناکافی ہوئی، گذشتہ دور میں علویوں پر حکومت کے عہدوں کے دروازے بند تھے، اس نے انھیں بڑے بڑے عہدوں پر یہ کہکر مقرر کیا کہ وہ گذشتہ خلفاء کی فروگذاشتوں کی تلافی کر رہا ہے، عقائد میں مجموعۂ اضداد تھا، فلسفہ کے مطالعہ اور غیر قوموں کے علماء کی صحبت کے اثر سے وہ خلق قرآن کا قائل تھا، اور جن علماء نے اس کی مخالفت کی ان کو سخت سزائیں دیں، اس کے بعض عقائد شیعی تھے، بعض

اہل سنت کے اور بعض فلسفیانہ، وہ خود کہتا تھا کہ معاویہ کی قوت عمرو بن العاص کے بل پر تھی، عبدالملک کا سہارا حجاج تھا، لیکن میری قوت وعظمت خود میری ذات سے ہے، اسی لیے مورخین اس کو عباسی سلسلہ کا درمیانی گوہر کہتے ہیں، افتتاحی سفاح، اختتامی معتضد اور درمیانی مامون، اس کی عالی ظرفی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ صاحب اولاد تھا، لیکن اپنی اولاد میں سے کسی کو حکومت کا اہل نہیں سمجھا اس لیے اپنے سوتیلے بھائی معتصم کو اپنے مرض الموت میں ولی عہد بنا کر اس کا اعلان کر دیا، شاہ صاحبؒ نے معتصم کے بھی بہت سے اوصاف کی تعریف کی ہے، لکھا ہے کہ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا، لیکن اس میں جسمانی قوت غیر معمولی تھی، توانا سے توانا آدمی کا بازو دبا دیتا تھا تو ہڈیاں پچک جاتی تھیں اسی لیے اس کو بزم کے بجائے رزم سے دلچسپی تھی، بڑی بڑی مہموں میں خود نکلتا تھا۔ اس کو صرف دو چیزوں کا ذوق تھا، حکومت کی شان و شکوہ اور میدان کارزار کے مناظر، اس کا روپیہ ان ہی چیزوں میں صرف ہوتا، اس کا سب سے بڑا بجٹ جنگی تھا، اس نے اپنی آٹھ سالہ مدت خلافت میں تمام اندرونی و بیرونی طاقتوں کا قلع قمع کر دیا جس طاقت نے سر اٹھایا، کچل کر رکھ دیا، اس نے آٹھ ملک فتح کیے اور آٹھ دشمنوں کو مغلوب کیا، اس کے زمانہ میں آٹھ فرماں روا اسیر ہوئے، جس کی مثال کسی خلیفہ کے زمانہ میں نہیں ملتی، مگر شاہ صاحبؒ کی رائے میں اس کی بہت بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے ایرانیوں کا زور توڑنے کے لیے ترکوں کو آگے بڑھانے کی پالیسی اختیار کی، جس طرح ہارون اور مامون کے زمانہ میں ایرانیوں کا عروج تھا، اسی طرح اس کے زمانہ میں ترکوں کا ستارہ چمکا، اس سے حکومت کی شان تو ضرور بڑھ گئی اور فتوحات کو بھی فائدہ پہونچا لیکن آیندہ چل کر جب حکومت کمزور پڑی تو ترکوں کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ خلفا کا وقار جاتا رہا اور وہ ان کے ہاتھوں میں تماشا بن کر رہ گئے، ترک جسے چاہتے تھے تخت پر قائم رکھتے تھے، اور جسے چاہتے اتار دیتے۔

شاہ صاحبؒ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ عباسی دور کے عروج کا زمانہ معتصم باللہ تک رہا، اس کی

مدت پچانوے سال تھی، اس کے بعد چار سو برس کچھ زیادہ تک ان کی حکومت ضرور رہی مگر ان پر ترک اور آل بویہ حاوی رہے، معتصم کے بعد دو سو سال تک گویا ترکوں کی حکومت تھی، بقیہ دو سو سال آل بویہ و سلاجقہ اور ترکوں کے اقتدار کے زمانہ میں خلفاء کے بہت کچھ اختیارات باقی تھے، حکومت کا نظام ان ہی کے نام اور حکم سے چلتا تھا، اس دور میں بعض ایسے اولوالعزم اور حوصلہ مند خلفاء بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ترکوں کی قوت کو توڑنے اور ان کا اقتدار گھٹانے کی کوشش کی اور اس میں ان کو عارضی کامیابی بھی ہوئی، لیکن مستکفی باللہ کے عہد میں جب بنی بویہ نے ترکوں کی جگہ لی تو انھوں نے گو خلفاء کا ظاہری احترام قائم رکھا لیکن عملاً ان کو عضو معطل بنا دیا، حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور خلفاء کا وظیفہ مقرر کر دیا اور ان کا محض نام باقی رہ گیا۔

اس خاندان کے فرماں روا راضی باللہ کے زمانہ میں دولت عباسیہ کے پرزے اڑ گئے، مغرب میں شمالی افریقہ کا علاقہ عرصہ سے عباسیوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، یہاں علویوں کی حکومت قائم تھی، مصر و شام کے ایک حصہ میں محمد بن طغج کی نیم آزاد حکومت قائم تھی، مشرقی صوبوں میں خود سر امراء نے آزاد اور نیم آزاد حکومتیں قائم کر لی تھیں، ماوراء النہر میں سامانی حکمراں تھے، موصل، دیار ربیعہ اور دیار مضر میں آل حمدان کی حکومت تھی، طبرستان اور جرجان میں دیلمی حکومت قائم ہو چکی تھی، فارس کا علاقہ اور خوزستان کا ایک حصہ عماد الدولہ کے قبضہ میں تھا، اس کے بڑے حصہ پر ابو عبداللہ بریدی مسلط تھا، عراق عجم کے لیے رکن الدولہ اور وشمگیر میں رسا کشی تھی، کرمان ابو علی محمد بن الیاس کے تصرف میں تھا، بحرین اور یمامہ پر قرامطہ مسلط تھے، بصرہ اور واسط ابن رائق کے پاس تھے، غرض عراق سے لے کر سندھ تک دولت عباسیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی، راضی باللہ محض زرنگار تخت پر بیٹھ کر اس ادبار کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

تاریخ اسلام جلد چہارم | اسی قسم کی تفصیلات کے ساتھ شاہ صاحب کی تاریخ اسلام کی تیسری جلد مقتدر کے کچھ حالات کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اس کی چوتھی جلد ۱۹۴۵ء میں شایع ہوئی، پہلے ذکر آیا ہے کہ اس کی پہلی جلد

۱۹۳۹ء میں نکلی تھی جب ان کی آخری جلد ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تو اس سے ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کی تکمیل چھ سال میں ہوئی، مگر ظاہر ہے کہ پہلی جلد لکھنے میں کم از کم ایک سال صرف ہوا ہوگا، اس طرح شاہ صاحبؒ نے ان چار جلدوں کے لکھنے میں تقریباً سات سال سے زیادہ صرف کیے۔

اس چوتھی جلد میں خلافت بغداد کی ۳۱۳ سال کی تاریخ ہے، آخر میں مصر میں جو خلافت عباسیہ قائم ہوئی اس کی بھی تاریخ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء سے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء تک کی ہے، مگر اس کے لکھنے میں شاہ صاحبؒ کا قلم زیادہ رواں نہیں ہو سکا ہے، صرف سنین وار ان کے مختصر حالات قلمبند کر دیے گئے ہیں۔

بغداد کے خلفاء کی تاریخ اس جلد میں مستکفی باللہ (۳۳۳ھ/۹۴۵ء) سے معتصم باللہ (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) تک ہے، اس میں زیادہ تر شورشوں، بغاوتوں، اقتدار کی خاطر زور آزمائیوں کا ذکر ہے، خلفاء کی معزولی اور مقتدر شخصیتوں کے قتل کی ہولناک تفصیلات بھی ہیں، ان واقعات کے لکھنے میں شاہ صاحبؒ کی تحریر میں درد کی پیدا ہو گئی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلافات سے حکومت اور مملکت کو جو نقصانات پہونچے رہے ان کا بھی ذکر ہے، اور دکھ بھری بات تو یہ ہے کہ بعض عباسی حکمرانوں کے رعب اور دبدبہ سے رومن امپائر کے فرماں روا بھی کانپ جاتے تھے، اور جب تک اس خاندان کی حکومت میں مرکزیت رہی اور سارے علاقے اس کے سامنے جھکتے رہے تو دنیا بھی اس کے آگے جھکتی رہی، مگر جب یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تو راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی، باہمی نفاق کی وجہ سے اتنی حکومتیں علٰحدہ علٰحدہ قائم ہو گئیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے، کچھ کے نام یہ ہیں: صفاریہ، اغلبیہ، طاہریہ، سامانیہ، طولونیہ، دیلمیہ، شاہنیہ، حسنیہ، غزنویہ، سلجوقیہ، اتابکیہ، ایوبیہ وغیرہ، اس علٰحدگی پسندی سے وہ خود برباد ہو کر رہیں، اور ایک عظیم الشان حکومت کو برباد کر گئیں، مگر یہ درس دے گئی ہیں کہ اتحاد اور یگانگت ہو تو مسلمان دنیا کو اپنے سامنے خم کر سکتے ہیں لیکن باہمی نفاق اور منافقت ہو تو خون کی ہولی کھیل کر ساری دنیا کے سامنے رسوا ہو سکتے ہیں۔

جب مستعصم باللہ کے زمانہ میں اس کے شیعہ وزیر ابن علقمی کی بے وفائی اور غداری سے تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے عباسی حکومت کو ختم کیا تو شاہ صاحبؒ اس طرح نوحہ کناں ہوتے ہیں:

"وحشی تاتاریوں نے بغداد جیسے عظیم الشان شہر کو ویران کر ڈالا، ابن خلدون کا بیان ہے کہ صرف شاہی محلات سے انھوں نے جتنی دولت اور جس قدر ساز وسامان لوٹا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ عباسی کتب خانہ کی تمام کتابوں کو جو صدیوں کا سرمایہ تھیں، دجلہ میں ڈبو دیا، مقتولین کی تعداد کا اندازہ سولہ لاکھ تھا۔"

عباسیوں کے زمانہ کی تاریخ کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان کی سلطنت سے کٹ کر سلجوقیوں، اتابکیوں اور ایوبیوں کی جو حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے بعض حکمرانوں کی سیرت وکردار پر مسلمانوں کو اب تک فخر ہے، اور ان کے کارناموں کو پڑھ کر ان کا سر ابھی تک اونچا ہوتا ہے، سلجوقی حکمراں طغرل کے بارہ میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"طغرل کے کمالات اور اوصاف جہانبانی اس کی زندگی کے واقعات سے ظاہر ہیں، اس نے اپنی قوت بازو سے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی، مخالف طاقتوں کو مغلوب کر کے اس کو اس قدر مضبوط کر گیا کہ اس کے جانشینوں نے اس کی بنیاد پر سلجوقی حکومت کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، خلافت بغداد کو دیالمہ کے پنجے سے آزاد کرایا...... وہ ایک راسخ العقیدہ اور دیندار مسلمان اور پاکباز وتقی فرماں روا تھا، نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا تھا، تہجد کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، ہر جمعہ اور دوشنبہ کو روزہ رکھتا تھا، صدقات وخیرات کرتا تھا، مسجدوں کے بنوانے سے شغف رکھتا تھا، کہا کرتا تھا کہ مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عمارت بنواؤں اور اس کے پہلو میں مسجد نہ ہو۔"

پھر اسی خاندان کے حکمراں الپ ارسلان کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ابن اثیر اس کے ذکر میں لکھتا ہے کہ وہ فیاض، عادل، عاقل اور فرزانہ تھا، اس کی حکومت کے

حدود بہت وسیع ہو گئے تھے ایک عالم اس کے سامنے جھک گیا تھا، اور اس کو سلطان العالم بالکل بجا کہا جاتا ہے ۔ ...... اس کے حدود حکومت میں جرائم مفقود ہو گئے تھے ......
بڑے سے بڑا عہدہ دار ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے مال کی جانب نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا ..... وہ طبعاً نہایت رقیق القلب اور غریب پرور تھا، غربا پر بکثرت خیرات کرتا تھا، رمضان میں پندرہ[۱۵] ہزار اشرفیاں تقسیم کرتا تھا، خاص پایۂ تخت کے محتاجوں کے لیے مطبخ شاہی میں روزانہ پچاس[۵۰] بکرے ذبح ہوتے تھے، علم و فن کا قدر دان اور سرپرست تھا، بغداد میں بصرف کثیر ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، جو مدرسۂ نظامیہ کے علاوہ تھا۔"

ملک شاہ کے اوصاف کی مرقع آرائی جس طرح کی ہے اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہ ہیں:

"ملک شاہ اپنے اوصاف، خصوصیات، ملک گیری اور ملک داری میں نہ صرف سلجوقی سلاطین، بلکہ دنیا کے ممتاز ترین حکمرانوں میں تھا، وہ سلطان عادل کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، سلجوقی سلاطین میں اس کا زمانہ ہار کے درمیانی بڑے موتی کی طرح ممتاز و نمایاں تھا اس کے آغاز اور انجام دونوں میں ایک تناسب تھا، جس اقلیم کا رخ کیا اس کو تسخیر کیا اور جس دشمن کا قصد کیا اسے زیر کیا، راوندی کا بیان ہے کہ ملک شاہ کے اسلاف نے جہانگیری کی اور اس نے جہانداری، انھوں نے حکومت کا پودا نصب کیا، اس نے پھل کھایا، انھوں نے تخت سلطنت بچھایا، اس کے زمانہ میں برگ و بار لایا، اس کے خوف سے سلجوقی فوجوں کو ظلم و زیادتی کی جرأت نہیں ہوئی، عوام بے خوف و خطر اس کی فوج میں گھومتے پھرتے تھے، اپنے حدود سلطنت میں ہر قسم کے تجارتی ٹیکس موقوف کر دیے، سارے ممالک محروسہ میں سڑکیں نکلوائیں، گذرگاہوں پر سرائیں اور دریاؤں میں پل بنوائے، مکہ معظمہ کے راستہ میں جا بجا پانی کے ذخیرے کے لیے حوض و تالاب بنوائے، خود بھی صاحب علم اور اس سے زیادہ علم و فن، اہل علم اور ارباب کمال کا قدر دان تھا، اس نے سلجوقی حکومت کے جغرافیہ پر خود ایک رسالہ لکھا، اس کے دور کے علمی خدمات کے

سلسلہ میں سب سے اہم اور قابل ذکر زیچ ملک شاہی ہے، جسے اس کے نام پر حکیم عمر خیام نے ترتیب دیا تھا، عمارتوں کی تعمیر کا بھی بڑا ذوق رکھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

ملک شاہ کے وزیر نظام الملک کے کارنامے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ جس پایہ کا وزیر تھا تاریخ اسلام میں برامکہ کے علاوہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی، اس نے تیس۳۰ سال تک اس شان و شکوہ کی وزارت کی اور ایسے کارنامے انجام دیے کہ اس کے سامنے برامکہ کی داستانیں ماند پڑ گئیں، ملک شاہی دور کی ساری درخشانی جو سلجوقیوں کا دور زریں شمار کیا جاتا ہے، نظام الملک ہی کی ضو پاشیوں کا نتیجہ تھی۔

عماد الدین زنگی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ صلیبی جنگ کے مقدس جہاد کا ہیرو اور اس قافلہ کا پہلا قافلہ سالار عماد الدین ہی تھا، اس پہلو سے قطع نظر وہ ذاتی اوصاف و محامد اور جہانبانی و حکمرانی کے لحاظ سے بھی ایک بہترین فرمانروا تھا، شجاعت، شہامت، تدبر، سیاست، عدل، انصاف اور دینداری تمام اوصاف میں کامل تھا۔

نور الدین زنگی کے اوصاف بیان کرنے میں ان کا قلم بالکل نہیں تھکا، اس کی تعریف میں ابن اثیر کا ایک طویل اقتباس دینے سے پہلے وہ خود لکھتے ہیں کہ اس نے اسلامی حکومت کا جو نمونہ پیش کیا اس کی نظیر خلفائے راشدین کے سوا تاریخ اسلام میں مشکل سے مل سکتی ہے اس کی ساری زندگی میدان جہاد میں گذری اور اس نے صلیبی جنگ میں جو معرکے سر کیے اس کی تفصیل شاہ صاحب نے کچھ ایسے ولولہ انگیز طریقہ سے لکھی ہے کہ اس کو پڑھنے میں لطف حاصل ہوگا۔

پھر صلیبی جنگ میں صلاح الدین ایوبی کی نیزہ آزمائی، پامردی اور معرکہ آرائی کو کچھ ایسے انداز میں لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خود جھوم رہے ہیں اور اپنی کتاب کے پڑھنے والوں کو جھومنے کی دعوت دے رہے ہیں، صلیبی جنگ کی تفصیلات کو سمیٹنا آسان نہ تھا، لیکن شاہ صاحب نے ان کو چند اوراق میں سمیٹا ہے، انھوں نے اس ایجاز میں اطناب کا رنگ پیدا کر دیا ہے، جس کو پڑھ کر دینی حمیت اور ایمانی حرارت ہر ورق کا

نے بغیر نہیں رہ سکتا، انھوں نے اس مجاہد اعظم کے اخلاق و سیرت کی تصویر اس کے رفیق خلوت و جلوت
قاضی بہاء الدین ابن شداد کے حوالہ سے اپنی کتاب کے بیس صفحوں میں کھینچی ہے، وہ اس لائق ہے کہ
اس کو ایک علٰحدہ چھوٹے سے رسالہ میں شائع کر کے ہر مسلمان کو پڑھنے کے لیے دیا جائے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ
ایک مسلمان فرماں روا نے اپنی جہانگیری، جہانبانی اور جہانداری میں کیا کیا اعلیٰ نمونے پیش کیے، خود شاہ
صاحبؒ کا خیال ہے کہ صلاح الدین تنہا شمشیر زن مجاہد ہی نہ تھا، بلکہ فضائل اخلاق کا بھی مکمل نمونہ تھا
اس نے شعائر دینی کا جو احترام کیا، یا اپنی عدل پروری، شجاعت، رواداری، حلم، بردباری، مہمان نوازی،
رعایا پروری کی جو مثالیں پیش کیں، ان سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کی تاریخ روشن ہوئی، ان
تمام چیزوں کو قلمبند کرنے میں شاہ صاحبؒ نے بڑی خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے،

شاہ صاحبؒ نے جہاں ان فرماں رواؤں کی تعریف و تحسین کر کے اپنے ناظرین کو فخر کے ساتھ
سر اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے، وہاں عباسیوں کے پورے دور میں جو شورشیں، بغاوتیں اور
اقتدار کی خاطر جو باہمی آویزشیں ہوتی رہیں اور اس سلسلہ میں جو خوں ریزی اور قتل ہوتے رہے
ان کی تفصیل بھی لکھی ہے، انھوں نے متوکل علی اللہ اور مقتدر باللہ کے قتل اور معتز باللہ، مہتدی باللہ
اور قاہر باللہ کی معزولی کا ذکر بہت دکھ سے کیا ہے، اسی طرح اپنی چوتھی جلد میں مستکفی باللہ،
مطیع للہ، طائع للہ، راشد باللہ کی معزولی اور مستعین باللہ، مسترشد باللہ، راشد باللہ اور مستعصم باللہ
کے قتل پر ان کا قلم اور سوگوار ہو گیا ہے، پھر مقتدر شخصیتوں کا جو قتل ہوا اس کی فہرست شاہ صاحبؒ
کی اس کتاب سے تیار کی جائے تو وہ بہت لمبی ہو جائے گی، اس طرح ان کی تاریخ کی چاروں جلدیں
بڑی معروضیت اور حقیقت پسندی سے لکھی گئی ہیں، جن میں مسلمانوں کے لیے عبرت اور بصیرت حاصل
کرنے کا پورا سامان موجود ہے، حکمرانی اور جہانبانی کے سلسلہ میں دوسری قوموں میں بھی معزولی، قتل، سفاکی،
غارتگری اور خوں ریزی کی مثالیں ملتی ہیں مگر مسلمان تو خیر امت قرار دیے گئے ہیں، ان کے کردار کا

نمونہ ہر شعبۂ حیات کے ساتھ سیاسی زندگی میں اعلیٰ ہونا چاہیے تھا، وہ تو قیصر و کسریٰ کی روایات کو ختم کرکے اخلاق اور انسانیت کو سنوارنے کے لیے دنیا میں مامور کیے گئے تھے، مگر انھوں نے اپنے بشری تقاضوں کی بنا پر اپنی حکمرانی میں وہی سب کچھ کیا جو اور قومیں کرتی رہیں تو اس کے لیے کوئی حسن تاویل قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی چوتھی جلد میں ایک خاص چیز کی کمی رہ گئی ہے، انھوں نے اس کی دوسری جلد میں بنو امیہ کے زوال کے اسباب لکھے ہیں، اس کی آخری جلد میں بنو عباس کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے تھی، مگر معلوم نہیں کیوں اس پہلو پر تفصیلی بحث نہیں کر سکے، حالانکہ بنو عباس پر جو دو جلدیں لکھی گئی ہیں ان کے اندر کے واقعات سے زوال کے اسباب کا تجزیہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔

دکھ بھری بات تو یہ ہے کہ بنو عباس کے حکمرانوں میں تھوڑی سی بھی کمزوری پیدا ہو جاتی تو پھر دور دراز کے علاقوں میں خود مختاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا، پہلے ذکر آیا ہے کہ ادریسیوں، طولونیوں، طاہریوں، صفاریوں، سامانیوں وغیرہ نے اپنی اپنی حکومتیں بنو عباس کی مملکت سے کٹ کر ضرور بنائیں، لیکن وہ ان کو قائم نہ رکھ سکے، اس نفاق اور افتراق سے ان کو بنو عباس اور مسلمانوں کے سواد اعظم کو نقصان پہونچتا رہا، کلام پاک کے ذریعہ سے مسلمانوں کو یہ پیام دیا گیا تھا کہ وہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں، ورنہ وہ بزدل ہو جائیں گے اور ان کی ہوا خیزی ہو جائے گی (انفال آیت ۴۷ - ۴۵) پھر رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، یہ کہہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے۔ لیکن بنو عباس اور ان کے عہد کے لوگوں نے ان تعلیمات پر عمل نہیں کیا، زیادہ تر مذہبی گروہ بندی، فکری انارکی، ذاتی مفاد پرستی، بدعہدی، پیمان شکنی، اور علاقائی تعصب کے جذبات سے مغلوب رہے، جس سے ان کی ہوا خیزی ایسی ہوتی رہی کہ ایک منفعت اور ایک نقصان کے احساس رکھتے، ایک ہی دین، ایک حرم پاک، ایک اللہ اور ایک قرآن کے تابع

...نے کے باوجود ایک نہ ہو سکے، ان میں وصال مصطفوی کے بجائے افتراق ہی پیدا ہوتا رہا اس لیے ...پ نہ سکے، عباسی دور کے آخری فرماں رواؤں میں ظاہر باللہ (۶۲۲-۶۲۳ھ/۱۲۲۵-۱۲۲۶ء) نے اپنے عمال کو یہ ...ان بھیج کر تنبیہ کی تھی کہ ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ملک کی بربادی، رعایا کی خانماں خرابی، شریعت ...ی اہانت ہوئی، انھوں نے اپنے ذاتی اغراض کی خاطر باطل کا اظہار کیا، تحصیل محاصل کی ظالمانہ صورتوں پر استغفار اور استدراک کے خوشنما الفاظ سے پردہ ڈالا، اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے باطل کو حق سے خلط ملط کیا، وہ خدا سے نہیں ڈرے، انصاف کے بجائے ظلم کیا، پھر اس نے آخر میں لکھا کہ اگر تم خلفاء اللہ فی الارض کے عہدہ داروں اور اس کی مخلوق کے امینوں کے طریقہ پر چلو گے تو فبہا، ورنہ برباد ہو جاؤ گے، یہ تنبیہ صحیح تھی، مملکت اس لیے برباد ہوئی کہ اس کے حکمراں اور عہدہ دار صحیح راستہ پر نہیں چلے۔

قاضی ابویوسفؒ نے ہارون رشید کو یہ مشورے دیے تھے کہ کوئی عمارت جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو، قائم نہیں رہ سکتی، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے بنانے والے پر گرا دیتا ہے، تقویٰ اگر خدا کے لیے اختیار کیا جائے تو خدا بھی تقویٰ اختیار کرنے والوں کی حفاظت کرتا ہے، بادشاہوں کو اپنے خدا کے بارہ میں وہی چیز پیش کرنی ہوگی جو چرواہا اپنے مالک کی خدمت میں پیش کرتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے خوش قسمت وہ راعی ہوگا جس کے ذریعہ اس کی رعایا کو خوش بختی حاصل ہوئی ہو، راعی کی کج روی سے رعایا بھی سیدھی راہ سے ہٹ جاتی ہے، ایک حکمراں کو خواہش نفس کی تعمیل اور غصہ کی بنا پر مواخذہ کرنے سے پرہیز کرتے رہنا چاہیے، اگر اس کے سامنے ایسے دو امور آئیں جن میں ایک میں دنیا کا بھلا ہو اور دوسرے میں آخرت کا، تو آخرت والے امر کو اختیار کرنا بہتر ہے، دنیا فانی اور آخرت پائیدار ہے، خدا کے معاملہ میں قریب و بعید سب کو برابر قرار دینا چاہیے، اس بارہ میں ملامت کا خوف سدراہ نہ ہو، خدا کا خوف دل سے ہو، زبان سے نہ ہو، خراج وصول کرنے والے عمال صالح، پاکدامن، فقیہ اور عالم ہوں، وہ ظالم نہ ہوں، خراج ادا کرنے والوں کی تحقیر و تذلیل نہ کریں، وہ

مسلمانوں کے ساتھ نرمی، نافرمانوں کے ساتھ سختی، ذمیوں کے ساتھ عدل، مظلوم کے ساتھ انصاف کریں، ظالموں کے لیے درشت ہوں، اور عام لوگوں سے درگذر اختیار کریں، جب کسی عامل کا ظلم یا حرام خوری یا بدکرداری ثابت ہوجائے تو اس کو اس کے عہدہ پر برقرار رکھنا، اس سے مدد لینا، رعایا کے کسی معاملہ میں اس کو مختار بنانا اور حکومت کے معاملات میں شریک کرنا حرام ہے، اس کو ایسی عبرتناک سزا دینی چاہیے کہ دوسروں کو سبق ہو، خبر رساں رعایا اور حکام کی کوئی خبر نہ چھپانے پائیں، اور نہ اس میں اپنی جانب سے کچھ اضافہ کریں، ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے، قاضیوں، والیوں اور دوسرے عہدہ داروں پر خبر رسانوں کی نگرانی ضروری ہے، اور جب تک وہ عادل اور ثقہ نہ ہوں ان کی بھیجی ہوئی اطلاعیں قبول نہ کی جائیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ اس زمانہ کی صحت مند پولیٹیکل سائنس تھی، جس کو شاہ صاحبؒ نے بھی قلمبند کیا، ہارون رشید نے ان ہی اصولوں کو اپنا رہنما بنایا تھا، اسی لیے اس کا شمار دنیا کے کامیاب ترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے لیکن جب یہ اصول نظر انداز ہوتے رہے تو حکومت زوال کی طرف مائل ہو کر ختم ہو گئی۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی تاریخ اسلام کی چوتھی جلد ختم کرلی تو برابر اپنی نجی صحبتوں میں کہتے رہے کہ وہ بنو عباس کی علمی اور تمدنی تاریخ ایک علیحدہ جلد میں قلمبند کریں گے، مگر ان کی دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے یہ جلد مکمل نہ ہو سکی، البتہ جلد چہارم کے ایک نئے ایڈیشن میں "عباسیوں کا تمدن" کے عنوان سے ۴۰ صفحے کے ایک باب کا اضافہ کیا جو ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیا گیا، وہ لکھتے ہیں کہ اسلام ایک فطری اور سادہ مذہب ہے، اس کا دامن بے جا تمدنی تکلفات سے پاک ہے، گو جائز حدود کے اندر شریعت نے عیش و تنعم کی اجازت دی ہے، لیکن ہر وہ شے جو سادگی اور جہد و عمل کے خلاف ہو، اسلامی روح کے منافی ہے، اسلام کی یہ سادگی خلافت راشدہ کے دور تک قائم رہی، اس زمانہ میں صحرائے عرب میں سونے چاندی کے دریا بہنے لگے تھے، لیکن خلیفۃ المسلمین کے جسم پر وہی پیوند لگا کپڑا

اور غذا میں جو کی روٹی اور روغن زیتون رہا، لیکن دولت کی فراوانی اور مختلف تمدنوں اور قوموں کے اختلاط کے اثرات طبعی ہیں، خلافت راشدہ کے خاتمہ اور صحابۂ کرامؓ کے اٹھنے کے بعد اموی دور ہی سے دوسری قوموں کے اختلاط کے اثرات ظاہر ہونے لگے، اور گو خلفائے راشدین کی طرح ان میں اسلامی روح نہ تھی، لیکن ان کی عربی عصبیت کی وجہ سے ان کی حکومت خالص عربی تھی، اس لیے ان میں غیر عربی عنصر اور اس کے تمدن کا غلبہ نہیں ہونے پایا، لیکن بنو عباس کے عہد کی حکومت، سیاست، تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون عجمی قالب میں ڈھل گئے، اس کے اسباب یہ تھے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں میں مذہبی روح کمزور ہونے لگی تھی، پھر عباسی خلافت تمام عجمیوں کے بل پر قائم ہوئی تھی، اس کے بڑے بڑے عہدہ دار عجمی ہی تھے، اس کے علاوہ عباسیون کا پایۂ تخت بابل اور نینوا کے کھنڈر پر تعمیر ہوا تھا جس کی آب و ہوا میں عجمی اثرات سرایت کیے ہوئے تھے، اہل عجم نہایت دلکش اور نظر فریب تمدن کے مالک تھے، ان کا اثر انداز ہونا ناگزیر تھا، پھر بھی عربی تمدن بالکل ختم نہیں ہوا، دونوں کی آمیزش سے ایسا دلآویز تمدن پیدا ہوا جو سارے مشرقی ملکوں میں پھیل گیا۔

اس تجزیہ کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قوموں کے تمدن کا ایک بڑا مظہر اس کی عمارتیں ہیں، ان کا شکوہ و تجمل، بانیوں کی شوکت و عظمت کا نشان اور اس کے نقش و نگار ان کے ذوق جمال کی تحریریں ہیں، جن سے ان کی تمدنی تاریخ پڑھی جا سکتی ہے، ان جملوں میں کیسی نکتہ آفرینی ہے، خلیفہ منصور نے بغداد کو جس طرح آراستہ کیا، اس کی پوری تفصیل ہے، یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ مزدور اور کاریگر روزانہ کام کرتے تھے، پھر اس کے اندر جو محلات قصر الذہب اور مہدیہ بنائے گئے ان کی تفصیل ہے، شاہی ایوان کے شاہزادوں کے محلات، ان کے امرائے دولت اور ارکان حکومت کے مکانات تھے، برامکہ کے محلوں کی عظمت و شان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض محلوں کی

تعمیر میں اس زمانہ میں ۲۰ لاکھ درہم صرف ہوئے، ہارون رشید کی لڑکی ام حبیب نے اپنے لیے ایک علیحدہ محل بنوایا جو قصر ام حبیب کے نام سے مشہور تھا، پھر معتضد باللہ نے اپنے لیے جو محل بنوایا وہ بغداد کے تمام محلوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان تھا، اس کی چھت اور دیواریں جواہرات اور قیمتی پتھروں سے آراستہ تھیں،

بغداد کا ذکر کرتے ہوئے خطیب بغدادیؒ کے حوالہ سے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جلالت، عظمت، علماء و اعلام کی کثرت، خواص و عوام کی تہذیب و شائستگی، رقبہ کی وسعت، مکانات، محلوں، گلیوں، پھاٹک بند کوچوں، سڑکوں، بازاروں، مسجدوں، حماموں، سراؤں کی کثرت، آب و ہوا کی خوبی، پانی کی شیرینی، درختوں کی چھاؤں، ان کی ٹھنڈک، سردی و گرمی کے اعتدال، وغیرہ کے لحاظ سے دنیا کا کوئی شہر بغداد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، مگر شاہ صاحبؒ دکھ کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بغداد کی عظمت گذشتہ پر آنسو بہانے والے کھنڈر بھی باقی نہیں رہ گئے ہیں، اب بغداد میں اس کے پرانے شکستہ مقابر کے علاوہ اس کا کوئی مرثیہ خواں بھی باقی نہیں ہے، صرف کتابوں کے اوراق سے اس کی عظمت و شوکت کا پتہ ملتا ہے۔

یہی حال ان محلات کا ہے جو آباد کیے ہوئے نئے نئے شہروں میں بنائے گئے، ایک نئے شہر سامرا میں اتنے محلات تعمیر ہوئے کہ ان کا شمار کرنا مشکل تھا، مورخین نے ان کے کچھ نام یہ لکھے ہیں: عروس، وحید، جعفری، غریب، شیدان، برج، صبیح، ملیح، بستان، تل، برکوان، جوسق، قلائد، غرد، قصر متوکلیہ، بہو، لؤلؤ، شاہ، حیری، کمین الدارد قہ وغیرہ،

شاہ صاحبؒ نے عباسیوں کی تمدنی زندگی کے اور پہلوؤں پر جو روشنی ڈالی ہے، ذرا ان کی تفصیل بھی ان ہی کی زبانی سنیے:

عباسیوں کے دسترخوان کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ہارون رشید کے دسترخوان پر ایک وقت میں

یں تیس قسموں کے کھانے ہوتے تھے، مطبخ کا خرچ دس ہزار درہم روزانہ تھا، مامون کا ذاتی خرچ چھ ہزار اشرفی یومیہ تھا، جس کا بڑا حصہ باورچی خانہ پر صرف ہوتا تھا، معتضد کے عام اور خاص مطبخ کا خرچ دس ہزار اشرفی ماہانہ تھا، باورچیوں کی تنخواہ ایک ہزار اشرفی ماہانہ تھی، قاہر کے دسترخوان پر تیس ۳۰ اشرفی کے روزانہ میوے ہوتے تھے، ان کے امراء کا دسترخوان بھی بہت پُر تکلف ہوتا، وزیر ابوالحسن بن فرات کے باورچی خانہ میں تین سو ۳۰۰ اشرفی ماہانہ کا صرف مشک خرچ ہوتا تھا۔

اس دور کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امراء باریک کپڑے کے چھوٹے کرتے، قہستان کے کپڑے کی بنیائن، اسکندریہ کے زیرپوش، دبیقی اور جنابہ کے اعلیٰ درجہ کے نرم اور خوش رنگ کتان کی قمیص، نیشاپور کے عمامے، دبیق کے کمربند اور تونس کی طیلسان، عدن کی دلابیان، کوفی خز اور سوس کی حاشیہ دار چادریں، نیشاپور کے دھاری دار کمربند، بنی سعد کی چھینٹ، کوفی خز کے جبے، دھوپ چھاؤں کی کتان وغیرہ استعمال کرتے تھے۔

عطریات کا بھی ذکر آگیا ہے، شوقین حضرات مشک اور گلاب کا محلول، لونگ کے پانی میں بھگویا ہوا عنبر، عنبر عود، بحرین کا عنبر وغیرہ استعمال کرتے تھے، خلیفہ معتدر کی ماں کے لیے ریشم کی جو جوتیاں بنتی تھیں ان کی تہہ میں مشک وغیرہ پیس کر جمایا جاتا تھا، بیت الخلاء کو خوشبودار بنایا جاتا تھا،

تقریبات کے موقع پر جو تکلفات ہوتے ان کی تفصیل بھی شاہ صاحبؒ نے لکھی ہے، وزیر دولت حسن بن سہل کی لڑکی کی شادی مامون کے ساتھ ہوئی تو ہاشمی امراء، افسرانِ فوج، کاتبوں اور دوسرے بڑے عہدیداروں میں مشک کی گولیاں لٹائی گئیں، ہر گولی میں کاغذ کا پرزہ لپٹا ہوا تھا جس میں زمین، جائداد، لونڈی، غلام، گھوڑے اور مختلف چیزیں لکھی ہوئی تھیں، جس کے ہاتھ جو گولی پڑی اس میں جو کچھ تحریر ہوتا اسی وقت مل جاتا، عام لوگوں میں روپے پیسے اور مشک وغیرہ کے گولے لٹائے گئے، مامون اپنی بارات کے ساتھ انیس ۱۹ دن

سسرال میں رہا، رخصتی کے وقت تمام امراء کو علیٰحدہ علیٰحدہ تحفے دیے گئے، دلھن کے لیے سنہرے کام کا فرش بچھایا گیا تھا، جیسے ہی اس نے اس پر قدم رکھا تو اس کے اوپر بڑے بڑے موتی نچھاور کیے گئے، شب عروسی کی روشنی میں چالیس من موم بتیاں سونے کی لگن میں روشن کی گئی تھیں، اسی طرح مقتدر کی ماں نے اپنے صغیر السن پوتے کی ایک تقریب میں چاندی کا ایک چھوٹا سا گاؤں بنوایا تھا، جس کے مکانات، کھیت، فصلیں، درخت، پھل، تالاب، نہریں، گائے، بیل، گھوڑے، اونٹ اور دوسرے مویشی وغیرہ چاندی ہی کے تھے۔

شاہ صاحبؒ نے عباسی دور کے اسی قسم کے دوسرے تکلفات اور تعیشات کا ذکر بڑے طاقتور اسلوب میں کیا ہے، جس کو پڑھنے میں لطف تو ضرور ملتا ہے لیکن یہ ایک خیال جاتا ہے کہ ان سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کی تعمیر ہوئی یا ان کے ذریعے وہ تمام عوامل واسباب جمع ہو گئے جن سے قوموں پر زوال آتا ہے، اعلیٰ تمدن سے تہذیبی زندگی ضرور بنتی ہے، اس سے فہم وادراک کو بھی جلا ہوتی ہے، لیکن یہی اعلیٰ تمدن نبرد آزمائی، معرکہ آرائی اور سپہگری کی خصوصیات کو زائل بھی کر دیتا ہے، مسلمان اور ان کے حکمراں متمدن ہوئے تو ان کی تمدنی قوت مدرکہ ضرور بڑھی مگر وہ اس جرأت، قوت ارادی اور عزم سے بیگانہ ہوتے چلے گئے، جن کی بدولت وہ دنیا پر چھا گئے تھے، پھر یہی تمدن ان کے زوال کا سبب بن گیا۔

دلی کالج
کے
تعمیری کارناموں پر ایک نظر

از

ڈاکٹر سمیع اللہ، استاذ ایونگ کالج، ہندو یونیورسٹی بنارس

دلی کالج کی بنیاد مدرسۂ غازی الدین تھا، جسے سنہ ۱۷۹۲ء میں قائم کیا گیا تھا، اس کے نام کی وجہ سے عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اس کے بانی غازی الدین خاں تھے، اصل واقعہ یہ ہے کہ غازی الدین خاں فیروز جنگ نواب آصف جاہ اول بانی سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کے والد اور اورنگ زیب کے معتمد امرا میں تھے، انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اجمیری دروازہ کے قریب اپنے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرا لیا تھا، سنہ ۱۷۱۰ء میں جب ان کا انتقال (احمد آباد گجرات) میں ہوا تو ان کی لاش دلی لائی گئی اور اسے یہیں آسودۂ خاک کیا گیا[۱]۔ سنہ ۱۷۹۲ء میں اسی عمارت میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو بانیِ عمارت کے نام پر "مدرسۂ غازی الدین" یا "غازی الدین خان کا مدرسہ" کہلایا۔

کمپنی کی نئی پالیسی کے تحت سنہ ۱۸۲۵ء میں دلی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے اس کا احیا کیا گیا، بعد میں یہی مدرسہ دلی کالج کے نام سے مشہور ہوا، سنہ ۱۸۲۹ء میں شاہ اودھ کے وزیر اعتماد الدولہ میر فضل علی خان نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیے کی خطیر رقم بصورت وقف گورنمنٹ کو تفویض کی اور سنہ ۱۸۳۰ء میں جب وصیت قلمبند کی گئی تو انھوں نے یہ شرط لکھوائی کہ اسے پانچ فیصد والے قرض میں شامل کیا جائے، اور اس کی

---

۱ مولوی نجم الغنی، تاریخ ریاست حیدرآباد دکن، ص ۷۰، (طبع سنہ ۱۹۳۰ء لکھنؤ)

آمدنی سے اس کالج کی امداد کی جائے جو غازی الدین خان مرحوم نے دلی میں عربی و فارسی علوم کی ترقی کے واسطے قائم کیا تھا، جو سرے مذہبی علوم ہیں اور اخلاق کے سرچشمے ہیں۔[1] حکومت نے ان کی اس فیاضی اور دریا دلی کے اعتراف میں ایک کتبہ مقبرہ یعنی کالج کے اندرونی صحن کے صدر دروازہ کی اوپری منزل پر نصب کرایا، جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے:

نہ بر لوح نقشے بماند ولیک   جزائے عمل ماند و نام نیک

بیادِ حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خان بہادر سہراب جنگ کہ یک لک و ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسۂ ہذا واقع دہلی خاص مولد و موطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند منقوش گردیدہ در ۱۸۲۹ء[2]

لیکن جب طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا، اور یہ جگہ ناکافی ہونے لگی تو ۱۸۴۴ء میں کالج کو یہاں سے کشمیری دروازے والی عمارت میں منتقل کر دیا گیا، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر کے زمانہ میں اسے بند کر دیا گیا، اس کے سات سال بعد یکم مئی ۱۸۶۴ء کو اسے دوبارہ جاری کیا گیا، لیکن اس کی گئی ہوئی رونق اور چہل پہل واپس نہ آ سکی، چونکہ غدر کے زمانہ میں جب کہ دلی میں انگریزوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا تو پنجاب نے انھیں کمک پہونچائی تھی، اس لیے حالات پر دوبارہ قابو پانے کے بعد انھوں نے اہل پنجاب کے مقابلہ میں دلی والوں کو نیچا دکھانے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی، اس پالیسی کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ دلی کالج کو محکمۂ پنجاب کے انتظام میں دے دیا جائے، اس طرح دلی کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا، لیکن جب اس سے بھی ان کی مراد بر نہ آئی تو اپریل ۱۸۷۷ء میں دلی کالج کو لاہور گورنمنٹ کالج میں ضم کر دیا گیا اور اس کے تمام طلبہ و اساتذہ کو لاہور کالج بھیج دیا گیا۔

---

[1] بحوالہ قدیم دلی کالج از مالک رام ص ۲۷ (طبع ۱۹۶۲ء دلی) [2] بحوالہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے از مولانا عبدالسلام ندوی، ص ۳۰۰ (طبع ۱۹۶۳ء اعظم گڑھ)

دلی کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد مغربی علوم و السنہ کی تعلیم یا مشرقی زبان و ادب کی ترویج و ترقی یا ہندوستان کے ارباب علم و فضل کی حوصلہ افزائی کر کے ہندوستانیوں کی تالیف قلوب ہو، بہر صورت مغربی و مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کا یہ خوش گوار امتزاج ہندوستانیوں کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی کالج نے نہ صرف اردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں، بلکہ جدید و قدیم اقدار کے خوش آیند ارتباط و امتزاج کی بنیاد رکھی اور اس جمہوری انداز نظر کی تاسیس و فروغ کا سامان کیا جو آج ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جس کی روشنی اور مدد سے ہم اپنے معاشرہ اور ملک کا لائحۂ عمل متعین کرنے میں مصروف ہیں۔

۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب نے یورپ کو صنعتی اعتبار سے بیدار کیا، جس سے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر میں مشینی دور کا آغاز ہوا، حتیٰ کہ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے سائنسی اور ٹیکنیکی تعلیم کی ضرورت و اہمیت شدت سے محسوس کی جانے لگی، رفتہ رفتہ ہندوستان کے حالات بھی اس کے متقاضی ہوئے کہ یہاں ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جہاں ہندوستانی طلبہ مشرقی علوم و السنہ کے پہلو بہ پہلو جدید مغربی علوم اور سائنس سے بھی استفادہ کر سکیں، دلی کالج کے نصاب تعلیم کے سرسری مطالعے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مشرقی علوم کے ساتھ تقریباً تمام مغربی علوم اور مضامین بھی شامل تھے، ہندوستانی طلبہ بڑے شوق و انہماک سے ان جدید علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور سائنس کے عملی تجربات میں پوری دلچسپی لیتے تھے، اور جب وہ گھر جاتے تو اس کے عجائبات اپنے بزرگوں سے بیان کرتے تھے۔

دلی کالج کے ماحول نے وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو مذہبی منافرت، قومی تعصب اور لسانی تنگ نظری سے بلند تر رکھ کر ان میں وسعت قلب اور کشادگی ذہن پیدا کی، ان لوگوں کو جہاں مشرق کی علمی و اخلاقی روایات عزیز تھیں، وہیں مغربی افکار و نظریات سے بھی کسی قسم کا بُعد نہ تھا، یہ طلبہ کالج سے صرف ادیب و شاعر ہی بن کر نہیں نکلے، بلکہ ان میں ڈاکٹر، انجینیر، وکیل اور جج بھی ہوتے تھے، اور یہ شریف ضرورت

ان ہی میں سے بعض لوگ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں پر بھی مامور کیے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر کالج کی دیہات تر دنیا میں قدم رکھنے کے بعد طلبہ کے مزاج میں جو تغیر اور فکر و نظر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے نتیجے میں ہندوستانی ادب اور معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا ہوا، اور رسمی روایات قائم ہوئیں جن کا خوشگوار نتیجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اگر دلی کالج نہ ہوتا تو شاید اس دور میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی مملوک العلی نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ضیاء الدین، میر ناصر علی (ایڈیٹر صلائے عام) مدن گوپال (ایڈووکیٹ) اور پیرزادہ محمد بخش (دسٹن جج) جیسی ہمہ جہت ہستیاں ہندوستان کی سرزمین پر پیدا نہ ہوتیں، دلی کالج نہ ہوتا تو یہ لوگ کیا ہوتے؟ اس کا جواب ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح دیا ہے:

" اگر میں دلی کالج میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگذر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علیٰ بصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں، اور جو حقیقت میں شرمندگی ہیں ان کو میں نے دلی کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں دلی کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا، مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ دوسرے کے عیوب کا متجسس، بر خود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"[1]

بہرحال اس سلسلہ میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ دلی کالج نے نہ صرف ایسی شخصیتوں کو جنم دیا، جن کی کوششوں اور کاوشوں سے ہمارے سرمایۂ ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا، بلکہ ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی فعّال اور بیدار مغز جماعت بھی پیدا کی جس نے ہندوستان کی تعمیر نو میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اس لیے اگر دلی کالج کو "شخصیتوں کا جنم داتا" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، مولوی عبدالحق نے بالکل صحیح لکھا ہے:

---

[1] بحوالہ داستان تاریخ اردو از مولوی حامد حسن قادری ص ۳۹۴ (طبع سنہ ۱۹۶۶ء آگرہ)

"دلی کالج کے کچھ اس کے وہ سپوت ہیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے، اور جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں منتقل تھا اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا، علم کے وہ چراغ آج ہماری زبان کے دیتا ہیں۔"[1]

عبدالرحمن پرواز اصلاحی بھی اعتراف کرتے ہیں کہ

"اس کالج سے وسیع النظری اور رواداری کی فضا قائم ہوئی، ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات پروان چڑھے، تحقیق و ریسرچ کا ذوق پیدا ہوا، علمی و ادبی بیداری پیدا ہوئی، اردو کے صاحب طرز ادیب و نقاد اور چوٹی کے مصنف اور بلند پایہ شخصیتیں پیدا ہوئیں۔"[2]

ماہرین تعلیمات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو اس کا خاطر خواہ برآمد ہوتا ہے، دلی کالج کی سب سے بڑی اہمیت اور خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ں، اور صرف عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کے لیے ہی اردو کا استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ سائنس، ہنی، تاریخ و جغرافیہ، قانون اور منطق و فلسفہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی اس وقت تک اردو کسی علاقائی اور مذہبی و ملی تفریق کے بغیر ہندوستان کی مقبول عام زبان بن چکی تھی، وسرا سبب یہ تھا کہ اس زبان میں تمام موضوعات کے لیے اظہار خیال کا ذریعہ بننے کی صلاحیت موجود ھی، ناظم تعلیمات، احاطۂ بنگال "مسٹر کر" نے کالج کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۸۴۳ء میں اس کی امتیازی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے، اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور سے ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ و اخلاق و فلسفہ (مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے اس طریقۂ تعلیم کے

[1] بحوالہ مرحوم دلی کالج از مولوی عبدالحق ص ۱۵۶ ادبی طبع ۱۹۴۵ء (دہلی) [2] مفتی صدرالدین آزردہ از عبدالرحمن پرواز ص ۱۰۹ طبع ۱۹۷۷ء (دہلی)

مسٹر بٹروس نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اسپرنگر نے سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا، یہ اب دلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم کر لیا گیا ہے، مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھلنے پھولنے دیا جائے، چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں کے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا۔[1]

دلی کالج کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اردو کے علمی و ادبی سرمایے میں قابل قدر اضافے ہوئے، کالج کے قیام سے قبل اردو میں نہ صرف یہ کہ مغربی علوم و فنون سے متعلق کتابیں نایاب تھیں بلکہ مشرقی علوم پر بھی معقول کتابوں کا فقدان تھا، اردو نثر میں تالیف یا ترجمہ کی صورت میں جو کتابیں دستیاب تھیں وہ فورٹ ولیم کالج کی لکھی ہوئی تھیں اور اکثر و بیشتر قصوں اور کہانیوں پر مشتمل تھیں، چونکہ دلی کالج کا دائرۂ کار فورٹ ولیم کالج کے مقابلہ میں زیادہ وسیع تھا، اس لیے یہاں جدید مضامین و موضوعات پر بہ کثرت کتابیں تالیف اور ترجمہ ہوئیں، تاکہ مشرقی شعبے کے طلبہ کو مغربی علوم کے حصول میں دشواریاں پیش نہ آئیں، اس طریقہ کا اسے نہ صرف یہ کہ اردو کے سرمایے میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی مقبولیت بھی عام ہوئی، اور یہ سمجھا جانے لگا کہ ہندوستانی زبانوں میں اردو کو وہ وسعت و ہمہ گیری حاصل ہے کہ اسے یکساں طور پر مشرقی و مغربی دونوں علوم و فنون کے اظہار کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، دلی کالج کے زیر نگرانی سنہ ۱۸۴۳ء میں "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی"[2] کا قیام اسی غرض سے عمل میں آیا تھا کہ اردو میں جدید نصابی مضامین سے متعلق کتابیں تیار کرائی جائیں، اس کی کوششوں سے ریاضیات، سائنس، قانون، طب، فلاحت و زراعت، تاریخ و جغرافیہ، اخلاقیات وغیرہ پر تقریباً ایک سو چودہ کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں نئے نئے الفاظ اور مختلف النوع اصطلاحات کا

۱؎ بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۷۶ ۲؎ (حاشیہ ص ۲۰۳ پر)

اضافہ ہو گیا، چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ اس تحریک کی بدولت عثمانیہ یونیورسٹی جیسے عظیم ادارے کو معرض وجود میں لانے کی راہ ہموار ہوئی تو بے جا نہ ہوگا، دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دلی کالج عثمانیہ یونیورسٹی کا پیش رو تھا، کیونکہ یہی کالج ہندوستان کی پہلی درسگاہ تھی جہاں مغربی اور جدید علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان میں دینے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد) بعض انگریزوں نے اردو کی لغات، صرف و نحو کی کتابیں، اردو لسانیات اور اردو تاریخ پر بعض کتابیں لکھ کر اردو کے علمی مطالعہ کا آغاز کیا، لیکن فورٹ ولیم کالج کا حلقۂ اثر محدود اور اس ادارہ کے مصنفوں کا مقصد مخصوص تھا، اس لیے ان کے رجحانات نے اس وقت کسی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔ البتہ ۱۸۵۷ء سے کوئی پچیس تیس سال پہلے خود دلی میں ایک ایسا کالج قائم ہوا جہاں پہلی مرتبہ جدید علوم و فنون کی تعلیم مشرقی زبان میں دینے کا تجربہ کیا گیا، اور اس کے لیے انگریزی سے بعض درسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا"

(حاشیہ ص ۲۸۲) اس کا پورا نام "Socity for the Promotion of Knowledge in India through the Medium of Vernacular Language" (اشاعت علوم بذریعۂ السنۂ ملکی) تھا، لیکن اتنے بڑے نام کا یاد رکھنا آسان نہ تھا، چنانچہ بعد کے مصنفوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے، جن میں دو نام زیادہ مقبول ہوئے، پہلا "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی" اور دوسرا "ورناکولر سوسائٹی" اس سوسائٹی کی دیکھ بھال اور اسے بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی، اس کے پہلے سکریٹری فیلکس بوترو منتخب ہوئے تھے اور اس کے ارکان میں (۱) ٹامس مٹکاف، دلی (۲) چارلس گرانٹ، دلی (۳) ک۔ ریون شا، دلی (۴) ولیم سارٹن کوٹن کلکتہ اور (۶) دوارکاناتھ ٹیگور شامل تھے۔

(اس طرح، مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ایک اہم حصہ آہستہ آہستہ اردو میں منتقل ہو سکا تھا، جس کے ساتھ زبان میں نئے نئے الفاظ و اصطلاحات کا بھی اضافہ ہو رہا تھا"[1]

دلی کالج سے قبل ہندوستان میں عام طور پر تین قسم کی درسگاہیں پائی جاتی تھیں، اولاً وہ مکتب اور مدرسے جو مسلمانوں کی طرف سے چلائے جاتے تھے اور جن میں عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ درسگاہیں مسلمانوں کے مذہبی شغف اور عقائد کی نمائندگی کرتی تھیں، اور ان کے قیام کے پس پشت ثواب اور اجر آخرت کا جذبہ کارفرما رہتا تھا، دوسری قسم کی درسگاہیں وہ ہوتی تھیں جنہیں ہندو قائم کرتے تھے، اور جو دویا مندر یا پاٹھ شالہ کہی جاتی تھیں، مسلمانوں کے مکاتب و مدارس کی طرح یہ ادارے بھی دھارمک شکشا کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ ان میں سنسکرت اور دھرم شاستر کی تعلیم کو اولیت دی جاتی تھی، تیسری قسم کی درسگاہوں کے تحت وہ اسکول آتے تھے جن کا نظم ونسق انگریز مشنریوں، پادریوں اور چیلوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور جو عیسائیت ومسیحیت کی تعلیم وتبلیغ کی غرض سے کھولے جاتے تھے، ان اسکولوں میں انگریزی زبان کی تعلیم کو ترجیح دی جاتی تھی۔

ان روایتی قسم کے تعلیمی اداروں کے برخلاف دلی کالج ایک ایسا تعلیمی ادارہ تھا جس میں بیک وقت عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی زبانوں کے پہلو بہ پہلو دوسرے مشرقی ومغربی علوم وافکار کی تعلیم بھی کما حقہ طور پر دی جاتی تھی، مولوی عبدالحق کے الفاظ میں "یہی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق ومغرب کا سنگم قائم ہوا (اور جہاں) ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق ومغرب کا علم وادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا"[2]

دلی کالج کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے یہ تھی کہ اس کا فیضان ہندو، مسلمان اور عیسائی تمام فرقوں کے طلبہ کیلئے عام تھا، یہاں سب ایک ساتھ بیٹھتے اور اس

---

[1] ماہ نو، کراچی، ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۱۳ - ۱۲ [2] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۲۔

...ھوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ٹھیک یہی بات اساتذہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان میں ...عیسائی، ملکی اور غیر ملکی سبھی شامل تھے۔ کالج کے پرنسپل بالترتیب (ٹیلر، کارگل، بیٹسن و ٹ... (اسپرنگر) اور فرانسیسی (بوترو) قوم کے ہوئے لیکن باقی اساتذہ میں ہندوستانیوں کی کثرت تھی ...مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی کالج ایک ایسی ...ی حیثیت رکھتا تھا جہاں ہندوستان، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کے ہندو، مسلمان اور ...فضلا، سر جوڑ کر بیٹھتے، نژاد نو کی تعلیم و تربیت کے لیے نئے نئے منصوبوں کو عملی شکل دیتے ...پاشیوں سے طلبہ کے دل و دماغ کو منور کرتے تھے۔ باہمی ارتباط و اختلاط کے اس ماحول میں ...اور ان کے اساتذہ کے درمیان گاہ بگاہ مذہبی، ثقافتی، سائنسی اور سیاسی موضوعات و مسائل پ... ...تے رہتے تھے۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب تک دلی کالج قائم رہا مفید علمی تبادلۂ خیال اور ثقافتی ...رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کے طلبا اور اساتذہ مختلف و متنوع خیالات و نظریات کے حامل ہوتے، ...یے ادب کا گرویدہ ہوتا تو کوئی مشرقی تمدن اور علوم و السنہ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ذوق میں ...افکار و نظریات کی اس رنگا رنگی نے ہندوستانی طلبہ و اساتذہ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کے نتیجے میں ...یلی فکر کی اصلاح اور معلومات میں اضافے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس سے نہ صرف اردو ادب کی بنیاد پڑی ...اور تہذیبی دور کا آغاز بھی ہوا، اور ہماری نسلوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جس میں فکر و خیال کی ...زیر اثر ہمارے ملک میں ایسے روشن ضمیر اور بالغ النظر افراد پیدا ہوئے جنھوں نے ہمارے معاشرے ...تعمیر و ترقی کی ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔ ان کے احسانات ہماری علمی تہذیبی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے ...ان متنوع و گوناگوں خدمات و خصوصیات کے باوصف دلی کالج میں ایسا کوئی ادبی شاہکار وجود میں نہیں ...کی لازوال قدر و قیمت خواص کی طرح عوام میں بھی اس کا نام اور شہرت و مقبولیت برقرار رکھنے میں مددگا... ...اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی طرح یہاں بھی خاص ادبی اور عام دلچسپی کے موضوعات اور مباحث پر

مضمون کتابیں تالیف یا ترجمہ کی گئیں۔[1] لیکن ان میں میر امن کی باغ و بہار، شیر علی افسوس کی آرائش محفل،
حیدر بخش حیدری کی توتا کہانی اور قصۂ حاتم طائی، بہادر علی حسینی کی اخلاق ہندی، نہال چند لاہوری کی
مذہب عشق، خلیل علی خان اشک کی داستان امیر حمزہ جیسا قبول عام کسی کتاب کو حاصل نہ ہو سکا۔ دلی کالج کی کتابیں
فورٹ ولیم کالج کی ان کتابوں کے تقریباً چالیس پینتالیس سال بعد وجود میں آئی تھیں۔ اس اعتبار سے انھیں ادبی
چاشنی اور لسانی لطافت و نفاست سے زیادہ مزین اور مملو ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں کے مصنفین و مترجمین نے
اس اہم پہلو پر مناسب توجہ نہیں دی۔ اس لیے ان کا کارنامہ ادبیت کے اس اعلیٰ و ارفع معیار تک پہنچنے میں
ناکام رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کالج کا ماحول اور اس کے مطالبات و مقتضیات فورٹ ولیم کالج کے
ماحول اور اس کے اغراض و مقاصد سے یکسر مختلف تھے۔ یہاں تمام تر زور مغربی علوم و فنون کی ترویج و ترقی اور
توضیح و تشریح پر صرف کیا گیا اور ادب کی طرف کسی نے خاص توجہ مبذول نہیں کی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے بقول
"انگریزی اثر سے بنگال میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ زیادہ تر ادبی تھی، لیکن دلی میں اس کی حیثیت سائنٹفک تھی۔"[2]

دلی کالج کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت مقالہ نگاری اور صحافت کو فروغ حاصل ہوا اور اردو کے
طلبہ اور قارئین جدید علوم و فنون خصوصاً مغربی فلسفے اور سائنس سے روشناس ہوئے۔ اس کالج نے مشرقی
و مغربی علوم پر مستند و مفید اور کارآمد کتابیں مرتب کر کے جدید اور قدیم کے خوشگوار امتزاج سے ایک ایسی شمع
روشن کی جو آج بھی جادہ نوردانِ شوق کے لیے مشعل راہ بنی ہوئی ہے، اور جس کی ضیا پاشیوں سے ہماری علمی
تاریخ کا ایک باب رہتی دنیا تک منور اور تابناک رہے گا۔

---

[1] ان میں الف لیلہ، سفر یوسف خان کمبل پوش، گلستان وغیرہ، چشمۂ فیض، قصۂ یوسف زلیخا، عجائبات روزگار،
راجنیتی، جواہرات وغیرہ سنسکرت اور انگریزی کتابوں کے ترجمے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ [2] دلی کالج اردو میگزین، مرتبہ
صدیق الرحمٰن قدوائی، ص ۲۴ (طبع ۱۹۵۳ء، دہلی یونیورسٹی)

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سیمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا، آپ خیال فرمائیں کہ ان مستشرقین نے ہمیں کیا معلومات دیں، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ ملکوں میں رہنے کی حیثیت سے حقیقت پسند اور صداقت کے جویاں ہیں، مگر میں ان سے عربوں اور مسلمانوں کی طرف سے پوچھتا ہوں کہ انھوں نے عربوں کی کیا تصویر پیش کی، اسلامی تمدن کی کیا مرقع آرائی کی، اس کے اہم ارکان توحید، رسالت، نماز اور روزہ وغیرہ کی کیا تصریح کی؟ انھوں نے صرف یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام کے دو رکن ہیں، ایک حرم سرا اور ایک اونٹ، انھوں نے دو چار سو برسوں میں کیا کام کیا؟ سیل نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا، پھر فیسر اربری نے بڑی شہرت حاصل کی، منٹگمری واٹ آج کل بہت نمایاں ہیں، مگر انھوں نے کیا ذہنی تربیت کی؟ امریکہ عرب ملکوں اور خصوصاً مشرق وسطیٰ سے متعلق بڑے بڑے فیصلے کر بیٹھتا ہے، مگر اسلام کے متعلق اپنے ملک کو کیا روحانی غذا فراہم کی، وہاں کا ایک متوسط درجے کا آدمی یہی سمجھتا ہو گا کہ اسلامی تمدن کے دو سمبل ہیں، ایک حرم سرا کی وسعت اور دوسرا اونٹوں کی کثرت، یہ انسانیت اور خود ان کے ملک کی سیاست کی کون سی خدمت ہوئی، جو شخص کہیں داخل ہوتی ہے تو پہلے ہراول یا طلیعہ بھیجا جاتا

[illegible] ملک کے لوگوں کے مزاج، وہاں کی روایات، وہاں کی تہذیب اور وہاں کی زبان سے واقف ہو، تاکہ اس کو اندازہ ہو کہ وہ کس ملک میں قدم رکھ رہی ہے، اور وہاں کے لوگوں سے کس طرح پیش آئے اور ان کے مسائل سے کس طرح نپٹے اور وہاں کے لوگوں سے کس زبان میں بات کرے۔ کیا ہمارے مستشرقین کا یہی رویہ رہا؟ میں آپ سے نہیں اپنے ضمیر سے معذرت کرتے ہوئے ایک تلخ حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ایسی موزوں جگہ ابھی تک نہیں ملی، مستشرقین کے ایک گروہ نے تخریبی اور سلبی فرض انجام دیا ہے، ان کے دلوں میں صلیبی جنگ کی جو کدورتیں تھیں، اس کی ہزیمت کے جو داغ تھے، انھوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ اسلام جو ایک پیغام ہے، جو ایک زندۂ جاوید تحریک ہے، جو خود ایک زندگی ہے، اس سے یورپ کو جس کے ہاتھ میں قیادت آنے والی تھی، محروم رکھا جائے، اس کی صحیح تصویر سامنے نہ آئے، یہ بہت بڑا ظلم ہوا، میں اس کا شاکی نہیں ہوں اور نہ یہ ادارہ اس کا شاکی ہے بلکہ یورپ اور امریکہ کو شاکی ہونا چاہیے، ان کا دامن گیر ہونا چاہیے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ روز انصاف دور نہیں جب خود امریکہ اور یورپ کی عقلیت پسندی کے دور میں یہ حقیقت آشکارا ہوگی، یورپ کے حقیقت پسند معاملات کو ریاضی کے اصولوں بلکہ عملی اصولوں سے جانچنے کے عادی ہیں، وہ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ مستشرقین نے انھیں کتنے دھوکے میں رکھا، اور اسلام سے فائدہ اٹھانے سے روکا، روز حشر میں نئی نسل کے روشن ضمیر اور جری افراد کے ہاتھ ان مستشرقین کے دامن اور گریبان پر ہوں گے کہ انھوں نے لڑائیوں میں بے ضرورت مصروف رکھ کر ان کو غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا اور صحیح حقیقت نہیں بتلائی۔

عالم اسلام میں چار ملک بلا واسطہ رو در رو مغربیت سے دوچار رہے، جب مغربیت کا لفظ بول رہا ہوں تو اس سے مغربی سیاست، مغربی طریق افکار، مغربی تصورات، مغربی جذبات اور احساسات مراد ہے، ہاں تو جن چار ملکوں کا آمنا سامنا مغربیت سے ہوا، وہ ترکی، مصر، ہندوستان اور ایران ہیں، ان ملکوں میں مغربی زبانوں میں ہمارے مسلم فضلاء کو بہت بڑا کام کرنا تھا، یہ فرض عین تھا، فرض [illegible]

بہت سے لوگوں کے حق میں زہر ثابت ہوتا تھا، منہ زہر کتنا بھی کم اہمیت نہیں رکھتا، ان کو سارے کام چھوڑ کر یہ فرض انجام دینا تھا تاکہ وہ اپنی نئی نسل کو ان سمی اثرات سے محفوظ رکھیں اور غذائے صالح مہیا کرتے رہیں، اس لیے کہ یہ تقدیر انسانی اور سنت الٰہی ہے کہ خلا نہیں رہ سکتا، خلا غیر طبعی ہے، کوئی مثبت کی چیز مہیا نہ کی جائے تو آپ زیادہ دیر تک خلا باقی نہیں رکھ سکتے، آپ کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غذا کہیں اور سے حاصل نہ کرے، ضرورت اس کی تھی کہ ہمارے فضلا، وہ غذائے صالح فراہم کر دیتے جس سے ہمارا نوجوان طبقہ مطمئن ہوتا، اور وہ اپنے کو متعفن اور مسموم غذا کی طرف لے جانے پر مجبور نہ پاتا، لیکن افسوس ہے کہ جہاں تک میں واقف ہوں کہ کم سے کم ترکی، مصر اور ایران میں یہ کام بقدر ضرورت بھی نہیں ہو سکا، ترکی کا تعلق جرمن زبان، مصر کا پہلے فرنچ، پھر انگریزی اور ایران کا فرنچ اور انگریزی دونوں سے رہا، جہاں تک میری معلومات ہیں، ان زبانوں میں ان ملکوں میں کوئی بڑا اور کوئی وقیع کام نہیں ہوا، عرب ممالک سے بھی بڑی کوتاہی ہوئی، وہ مغربی زبانوں میں وہ ٹھوس اور وسیع اسلامی لٹریچر پیش نہیں کر سکے، جس کا نوجوان طبقہ بھوکا تھا، بلکہ اس کے لیے وہ بے تاب تھا، عربی زبان میں بے شک فرسٹ گریڈ کی چیزیں لکھی گئیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ترکی اور مصر میں ان موضوعات پر جن پر مستشرقین لکھ رہے تھے، کام نہیں ہوا، اور ہوا تو وہ ناقابل ذکر ہے، یہ کہنے میں مجھے فخر ہو رہا ہے اور اس کے کہنے میں سب سے بہتر جگہ یہی ہے کہ کمیت، کیفیت، جوہر اور قدر و قیمت کے لحاظ سے سب سے زیادہ کام ہندوستان میں ہوا، گو مجھ کو اس کا بھی شکوہ ہے کہ جتنا عرصہ ہماری مسلمان نسل کو انگریزی زبان و ادب میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ملا، اس کے لحاظ سے کام تشفی بخش نہیں ہوا، اگر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کی مدت کو سامنے رکھیں تو اس طویل مدت میں جتنا کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا، اس کے مقابلہ میں ہمارے قدیم مدرسوں کے علمائے ان زبانوں میں جن کے وہ ماہر تھے، زیادہ کام کیا، اور جیسا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے میرے والد مرحوم کی کتاب یاد ایام کا پیش لفظ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ یہ ایک مولوی کے

طبقہ کی [illegible] ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ کیا نمونہ پیش کرتا ہے، اور پھر [illegible]

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق — ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یہاں عربی میں بعض ایسے عظیم الشان کام ہوئے ہیں کہ جو بظاہر ایک آدمی کا کام نہیں معلوم ہوتا، میں کبھی کبھی کہتا ہوں کہ قدیم مدرسہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک آدمی وہ کام کرتا ہے جو ایک اکاڈمی کرتی ہے، ایک آدمی اور اکیڈمی، معجم المصنفین کے بیس ہزار صفحات میں چالیس ہزار شخصیتوں کے تذکرے ہیں اور ان جلدوں کو تنہا مولانا محمود حسن خاں ٹونکی نے لکھا، صاحب نزہۃ الخواطر نے ۵۲ - ۴ ۵ سال کی عمر میں آٹھ جلدوں میں چار ہزار سے زائد شخصیتوں کا تذکرہ ایسا منضبط کر دیا ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر کوئی اور مرجع نہیں، ایسے ہی ان کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" ہے، جس سے ہمارے دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی خوب واقف ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سو برس میں جتنا کام ہونا چاہیے تھا وہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے نہیں ہوا، پھر بھی اس عرصہ میں یہاں جو کام ہوا اس کی نظیر عالم اسلام میں نہیں، امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کے بہت سے مقامات سے مجھے بھی اختلاف ہے، اور نظر ثانی کرنا ہر صاحب علم کا حق ہے، لیکن جس طاقتور انگریزی زبان اور جس ادیبانہ بلکہ ساحرانہ زبان میں یہ لکھی گئی اس کا اعتراف اہل زبان بھی کرتے ہیں، کسی اسلامی ملک میں اس سے زیادہ موثر اور طاقتور زبان میں [illegible] پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اسی طرح ان کی کتاب ہسٹری آف سرسینس میں جو روانی ہے اور جس فاضلانہ بلکہ مستشرقانہ انداز میں اس کے مواد کو جمع کر دیا گیا ہے اس کی مثال بھی کم ملے گی، پھر قرآن مجید کے بہترین انگریزی ترجمے بھی اسی سرزمین میں ہوئے، ڈاکٹر عبد اللہ یوسف علی کا ترجمہ، پکتھال صاحب کی میننگ آف دی [illegible] قرآن بھی ہندوستان ہی کی رہین منت ہیں، مولانا عبد الماجد دریابادی کا فاضلانہ اور محققانہ ترجمہ بعض حیثیتوں سے بالکل منفرد ہے، پھر بھی حضرات! یہ واقعہ ہے کہ اس سو برس میں جو کام اس سلسلہ میں ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اگر ہم آج بھی یورپ اور امریکہ جائیں اور ہم سے کہا جائے کہ

ہم اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس ہندوستانی مصنفین کے سوا کوئی اور کتاب نہیں، علامہ اقبالؒ کی کتاب دی کنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ کے بعض مقامات سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اختلاف تھا، لیکن اگر کوئی شخص اسلامی فکر کی بلندی، عمق اور گہرائی سے متاثر ہونا چاہے تو علامہ اقبال کی اس کتاب کو پڑھنا چاہیے، اگر کسی شخص کے دل میں سیرت اور صاحب سیرتؐ کی محبت کی طلب ہے تو خطبات مدراس کا مطالعہ کرے، اس کا انگریزی ترجمہ دی گلوریس پرافٹ کے نام سے ہماری مجلس نشریات و تحقیقات نے شائع کیا ہے، اس کا عربی زبان میں ترجمہ "الرسالۃ المحمدیۃ" ہمارے فاضل دوست مولانا محمد ناظم ندوی نے کیا ہے، علامہ یوسف قرضاوی منھ بھر کر اس کی تعریف کرتے ہیں، سیرۃ النبی پر اس سے بہتر اور ایسی مختصر اور جامع کتاب دوسری نہیں، یہ کام اس سو برس میں انجام پایا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے جن لوگوں کے ذہن میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا، ان میں علامہ شبلی نعمانی کو اولیت حاصل ہے، ان ہی میں نواب عماد الملک اور چند دوسرے لوگ بھی تھے، سرسید کے خیالات اور ان کی تفسیر کے بعض مقامات سے اختلاف ہے لیکن وہ پہلے شخص ہیں جن کے دل پر سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ پڑھ کر چوٹ لگی، انھوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اب زمانہ کس رخ پر جا رہا ہے اور ہمیں کس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے، اور کس طرح سیرۃ النبیؐ اب لکھی جانی چاہیے، میں علم دین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور علی گڈھ کے اہم ترین افراد کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ سرسید پہلے شخص ہیں جن کے دل پر ایک چوٹ لگی اور ان کی مغفرت کے لیے یہ کافی ہے کہ جب وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کیلئے لندن گئے اور وہاں سے انھوں نے محسن الملک کو جو خطوط لکھے ان میں یہ بھی ہے کہ میرے ظروف، میرے گھر کے برتن فروخت کر کے مجھے پیسے بھیجے جائیں تاکہ میں کام انجام دے سکوں، ان کے ساتھ ان کے کام کے مددگار، مولوی چراغ علی وغیرہ بھی تھے، میں یہ کہنے کے لیے معافی کا خواستگار ہوں کہ ان کا طرز معاندانہ اور معذرت آمیز ضرور تھا لیکن کبھی کسی چیز کو اپنے زمانہ اور ماحول سے الگ کر کے دیکھنا

نہیں چاہیے، کسی چیز کو اس کے ماحول سے نکال کر کسی دوسرے ماحول میں پہونچا کر کوئی حکم لگانا ٹھیک نہیں ہے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت کے حالات کیا تھے، زمانہ کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے۔

ہمیں یہ فخر ہے کہ ادب اسلامی پر پہلا سیمینار ندوۃ العلماء، لکھنؤ کو بلانے کا شرف حاصل ہوا، عربی زبان کا امام مصر ہے، سعودی عرب کی تو وہ زبان ہی ہے، اور وہیں سے عراق اور شام وغیرہ بھی گئی، اللہ تعالیٰ نے ندوہ کے خادموں کو یہ خیال اور شرف بخشا کہ انھوں نے ادب اسلامی پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا، جو بہت کامیاب رہا اور اس کی صدائے بازگشت ابھی تک سنی جا رہی ہے، اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سب سے پہلا سیمینار ہندوستان ہی میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ ٹھوس اور سب سے قیمتی کام یہیں انجام پایا اور پھر ہندوستان میں ہونا تھا تو اعظم گڈھ ہی سب سے موزوں جگہ تھی، اور مزار شبلیؒ ہی سے چند گز کے فاصلہ پر، اور دارالمصنفین کی دیوار کے سائے میں ہونا چاہیے تھا، لیکن حضرات! ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

علم و تحقیق کا کوئی کام آخر نہیں ہوتا ہے، علم میں کوئی چیز آخر نہیں کہی جا سکتی، علامہ شبلیؒ کی خدمات آج بھی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں، ان کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق آج بھی بے مثال ہیں، الجزیۃ فی الاسلام، حقوق الذمیین، کتب خانۂ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر آج بھی اہمیت کی حامل ہیں، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کتب خانۂ اسکندریہ پر جب ان کا مضمون شایع ہوا تو کالج کے مسلمان طلبہ کا سر فخر سے اٹھ گیا، وہ دن رات یہ طعنہ اپنے انگریز استادوں سے سنا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلا دیا، اس میں آگ لگا دی، مسلمان طلبہ اب ان کو فخر کے ساتھ جواب دینے لگے، اب تو ڈاکٹر ہٹی نے بھی اپنی کتاب اے شارٹ ہسٹری آف دی عربس میں بڑے مدلل طریقے سے اس کا انکار کیا، اب کوئی صاحب علم اس کے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو جلایا، لیکن ہم آپ

اندازہ نہیں کر سکتے کہ علامہ شبلیؒ کے مضمون سے پہلے مسلمان طلبہ کو کس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کو اٹھتے بیٹھتے یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ مسلمان تو علم دشمن ہیں، علم سوز ہیں، کتاب سوز ہیں، لیکن مولانا شبلیؒ کے مدلل مضمون کے بعد ان طعنہ زنوں کو مسلمان طلبہ خاموش کر دیتے تھے۔

اس سیمینار میں شرکت کے لیے عرب، پاکستان اور تھائی لینڈ سے فضلاء آئے ہوئے ہیں، تاکہ وہ یہ شہادت دیں کہ علامہ شبلیؒ نے غلطی نہیں کی، انھوں نے سفر کا رخ غلط طریقہ سے متعین نہیں کیا تھا، انھوں نے کوہ کندن اور کاہ برآوردن پر عمل نہیں کیا، انھوں نے صحیح سمت اور رخ متعین کیا، اور جو لوگ کشتیاں جلا کر دنیا اور دنیا کی تمام ترقیوں اور آسائشوں سے آنکھیں بند کر کے اس آستانۂ شبلی و سلیمان پر بیٹھے ہیں وہ غلطی نہیں کر رہے ہیں، وہ عالم اسلام کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

میں دار المصنفین کے ذمہ داروں کو جن میں خوش قسمتی سے میں بھی شریک ہوں اور خود بھی اس مبارکباد کو بلا کسی تواضع و انکسار کے قبول کرتا ہوں اور اپنے رفقاء، پورے ضلع اعظم گڈھ، شہر اعظم گڈھ اور ان سب لوگوں کو جن کو علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے جذباتی و ذہنی تعلق ہے، مبارکباد دیتا ہوں کہ اس سیمینار کے انعقاد سے مدتوں کی تمنا پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کو مبارک فرمائے اور اس سے علم کا کارواں آگے بڑھے۔"

یہ ایمان پرور خطبہ ہزاروں کے مجمع میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے سنا گیا، اور سامعین کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ محض ایک خطبہ نہیں سن رہے ہیں بلکہ اس سے بہت کچھ حاصل بھی کر رہے ہیں، جس سے ان کے ذہن میں جلا اور قلب میں سکینت پیدا ہو رہی ہے، اس خطبہ کے بعد مولانا سعید الرحمن ندوی ایڈیٹر البعث الاسلامی و استاذ عربی دار العلوم ندوۃ العلماء نے مہمانوں کا تعارف عربی میں کرایا اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین نے اس کام کو اردو میں انجام دیا، پھر باری باری یہ معزز مہمان

اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کرنے کے لیے اسٹیج پر مدعو کیے گئے۔

ڈاکٹر محمد محمود طنطاوی | سب سے پہلے ابوظبی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ شریعت و قانون اسٹیج پر تشریف لائے اور انھوں نے عربی میں مجمع کو مخاطب کیا، بعد میں اس کا اردو ترجمہ مولانا سعید الرحمٰن ندوی نے کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج ہم اپنے بھائیوں سے مل رہے ہیں، جن سے ملنے کی تمنا بہت دنوں سے دلوں میں موجود تھی، مجھے آپ سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور ہم کو ہمیشہ ملاتا رہے، اس مبارک مجلس میں متحدہ عرب امارات یونیورسٹی، اس کے ریکٹر اور اساتذہ کی طرف سے آپ حضرات کو ان کا سلام پیش کر رہا ہوں، ان کی نمایندگی کی عزت حاصل کر کے ان کے بہترین جذبات بھی آپ کے لیے ساتھ لایا ہوں، میں اس سمینار کے ذمہ داروں کا بھی بہت شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ہمیں یہاں آنے کا موقع فراہم کیا، اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جس نیک مقصد کے لیے یہ اجتماع ہو رہا ہے، اس میں پوری کامیابی ہو، اس کا ایک بہت اہم مقصد ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے جو کچھ ابھی فرمایا اس میں ہمارے لیے بہت بڑی رہنمائی ہے، ان کی باتوں کی روشنی میں ہم چل کر بہت کچھ اس سمینار سے فائدے اٹھا سکتے ہیں جن سے ہمارا صحیح مقصد حاصل ہو، امید ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے تعاون سے آگے بڑھیں گے، اور اپنے اصلی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

جناب حکیم محمد سعید | اس کے بعد جناب حکیم محمد سعید ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی اسٹیج پر اپنی مخصوص سفید شروانی میں آئے تو حاضرین کی نظریں ان کی وجیہ اور شکیل شخصیت پر جمی ہوئی تھیں، انھوں نے فرمایا:

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن و معزز حاضرین! میرا یہ بڑا خوش گوار فرض ہے کہ میں منتظمۂ موتمر کا شکریہ صمیم قلب سے ادا کروں کہ انھوں نے از راہ لطف و کرم مجھے اس عظیم اجتماع میں شرکت کی دعوت دی اور پھر آپ کی خدمت میں یہ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ

آپ نے مجھے اس کا موقع بھی عطا فرمایا کہ میں اس موتمر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ارباب دانش کے سامنے کروں، مجھ کو سب سے پہلے یہ اعتراف کرنا ہے کہ ہم اس خطۂ زمین پر جمع ہیں جہاں سیرت رسولؐ لکھی گئی اور اس کی برکت یہاں اور اس وقت سایہ فگن ہے، آپ سب واقف ہیں کہ دارالمصنفین کے عظیم ادارہ کا آغاز اسی ارادہ سے ہوا تھا کہ سیرت نبویؐ لکھ کر اس کی تکمیل کی جائے، تاکہ اس کے مطالعہ سے لوگ مستفید ہوتے رہیں، اس موتمر کا عنوان "الاسلام والمستشرقون" کئی اعتبار سے ہمارے لیے قابل توجہ ہے، اس موضوع پر ہمارے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈال دی ہے، اور علامہ شبلی نعمانیؒ اور جناب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے جو اقتباسات ناظم دارالمصنفین نے پیش کیے ہیں وہ اور بھی باعث فکر و توجہ ہیں، مجھے یقین ہے کہ جس شاندار انداز سے اس موتمر کا انتظام کیا گیا ہے، اس کے نتائج ان شاء اللہ تعالیٰ دور رس ہوں گے، اور ہم مستشرقین کے خیالات کی اصلاح اور تردید کرسکیں گے، علوم و فنون کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی علم دائرۂ اسلام سے خارج نہیں، لیکن ہم نے جس انداز سے علوم و فنون سے تنافس برتا ہے، اس پر بہت احتیاط سے ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے، اگر یہ موتمر ہمارے اور عالم اسلام کے لیے کوئی لائحۂ عمل بنا سکے جس سے ہم اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہوسکیں تو یقیناً یہ ایک عظیم کامیابی ہوگی، میں اپنے لیے یہ خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ آخر میں اپنی، اپنے ادارہ اور پاکستان کی طرف سے اس موتمر کے منتظمین کو مبارکباد دوں کہ انھوں نے یقیناً یہ ایک نہایت نیک قدم اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں میں برکت عطا فرمائے۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اس وقت اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اسلام آباد میں پروفیسر، موتمر عالم اسلامی کے آنریری ڈائرکٹر جنرل اور بین الاقوامی المجمع العلمی لرابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے رکن ہیں، وہ اسٹیج پر آئے تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے ناظم دارالمصنفین کی دعوت ملی کہ میں اس اجتماع میں شرکت کروں تو شکر گذاری سے زیادہ اپنے اوپر ایک

باوجود محسوس ہوا، اتفاق سے انہی دنوں مجھے ایک ڈگری لینے کے لیے بنکاک جانا تھا، اس کے بعد مکہ مکرمہ گیا، وہاں سے آیا تو صرف تین گھنٹے اسلام آباد میں ٹھہر کر یہاں آگیا، اور محض اس شوق میں آیا کہ دار المصنفین ہی پہلا ادارہ ہے جو مستشرقین کے زہر کا تریاق پیش کر رہا ہے، اسلام پر مستشرقین نے جو کام کیا ہے، اس کی بنا جھوٹ پر ہے، وہ بار بار جھوٹ بول کر اس کو سچ کا درجہ دے دیتے ہیں، مشہور مثل ہے کہ جھوٹ چوبیس گھنٹے آگے نکل جاتا ہے، سچ دوڑتا ہی رہتا ہے، لیکن پیچھا کر نہیں پاتا، انھوں نے اچھے کام ضرور کیے ہیں، کتابیں چھاپی ہیں، ان کا انڈیکس بھی بنایا ہے، لیکن انھوں نے یہ کام دل سے نہیں کیا۔ ان سے کہا گیا، اس کی اجرت پائی، اس لیے یہ کام کرتے رہے، لیکن جب کبھی اپنے دل سے کوئی بات کہی یا لکھی تو کہیں ڈنک مار دینے کا موقع نہیں چھوڑا، ہم اس کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر پہلا سمینار آپ کے دار المصنفین میں ہو رہا ہے، دار المصنفین آپ کے لیے باعث فخر ہے، ہمارے لیے باعث فخر ہے، اور سب کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ کسی تعصب کے بغیر علمی کام کر رہا ہے اور یہ ہر قسم کی معاونت کا سو فی صدی مستحق ہے، ہمارے لیے یہ مسئلہ اہم رہا ہے کہ مستشرقین جو زہر پھیلا رہے ہیں اس کے علاج کی کیا ترکیب کی جائے، اللہ کرے کہ ہم ایک پروگرام بنا کر اس کے لیے کچھ کر سکیں، اور اس کی جگہ دار المصنفین ہی ہو سکتی ہے، اور قطعی طور پر ہو سکتی ہے، یہ کام یہیں سے شروع ہو، اسی شوق کی بنا پر میں آپ کے یہاں پہنچ کر آ گیا ہوں، یہ واقعہ ہے کہ اگر یہاں یہ کام نہیں ہوا تو کہیں نہیں ہوگا، اس وقت اتنے اہل فضل و کمال جمع ہو گئے ہیں، ان سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب عیسائیوں سے خلافت راشدہ کے زمانہ کی فوجوں نے شام، عراق اور مصر کی سرزمین حاصل کی تو ان کا غصہ کبھی ٹھنڈا نہیں ہوا، اور ان کے انتقامی جذبات کبھی مردہ نہیں ہوئے، یہ تلوار کے ذریعہ سے صلیبی جنگ کی شکل میں ابھرے اور ان کا قلم تو برابر چلتا رہا، ان کے اولین مستشرق کو تو اللہ نے ہدایت دیدی کہ وہ مسلمان ہو گیا، اس کے بعد سے جتنا کام ہوا تو ان کا رخ بدلا ہوا ہے، اسلام کا مقابلہ آج

کسی نرم سے ہے، اس کا لب ولہجہ بھی بدلا ہوا ہے، لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ان کا لائحۂ عمل بدل گیا ہے، وہ اپنے قلم سے آپ سے اسی طرح لڑ رہے ہیں، گیارہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی کے مستشرق سب کے سب عیسائی اوقات سے تنخواہ پاکر خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرتے رہے، اور اگر وہاں سے ہٹ جاتے تو چپراسی کی تنخواہ بھی شاید نہ پاتے، مگر ان تنخواہ دار مستشرقین نے جو زہر پھیلایا ہے اس کا علاج اگر آپ اجتماعی طور پر نہ کریں گے تو ہمارے نوجوانوں پر زہریلے اثرات ضرور مترتب ہوتے رہیں گے، یہ وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہم دنیا کو سمجھائیں کہ اسلام وہ نہیں ہے جو مستشرقین پیش کرتے ہیں۔ اسلام وہ ہے جو تھا اور واقعی ہے، مستشرقین کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں گہری لیاقت نہیں ہوتی، میرا تجربہ ہے کہ عیسائی مشنریوں میں کسی کا ایمان عیسائیت پر نہیں ہے، صرف ان کو اپنی تنخواہ پر ایمان ہے، لیکن ان کا ایمان کچھ بھی ہو، وہ جو زہر پھیلا رہے ہیں، اس کا تریاق ہم کو برابر پیش کرتے رہنا چاہیے، ہم آپ کے لیے دعا کرتے ہیں، اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل پاکستان مفتی صاحب پاکستان کے اسلامی نظریاتی کونسل کے اہم رکن ہیں، وہ اسٹیج پر مدعو کیے گئے تو اپنی جاندار آواز میں فرمایا کہ دارالمصنفین سے میرا تعارف میرے بچپن کے زمانہ سے ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فضل وکرم ہے کہ ابتدا ہی سے میرا تعلق اہل علم سے رہا، اسی بنا پر بچپن سے اب تک اس ادارہ کا معتقد رہا ہوں، اس کی علمی خدمات کی قدر کرتا ہوں اور اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد اس کے لیے دعائیں بھی کرتا ہوں، مستشرقین کیا کچھ کر رہے ہیں، اس کا علم ہے، لیبان کی کتاب تمدن عرب کی بڑی شہرت ہے، لاہور میں یہ کتاب تیسری بار شائع ہو چکی ہے، مگر اس میں جو حصہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے، اس کو پڑھ کر دوبارہ نہ پڑھ سکا، اس نے جو کچھ لکھا وہ تو اپنی فطرت کی بنیاد پر لکھا، لیکن مجھ کو اس پر حیرت ہوئی کہ اس کے مترجم نے جابجا بڑے بڑے حواشی

لکھے ہیں، مگر جو حصہ حضورؐ کی شان مبارک میں ہے اس پر کچھ نہیں لکھا ہے، اس اجتماع سے قرارداد یہ بھی ہو کہ یہ کتاب جب کوئی مسلمان ناشر شایع کرے تو اس میں اس حصہ کی پرزور تردید لکھی جائے، میرا تعلق اس وقت ایک قانونی ادارہ سے ہے، اسلامی قوانین کے سلسلہ میں مستشرقین نے بہت ہی لغویت سے کام لیا ہے، انھوں نے ان کو اس طرح غلط شکل میں پیش کیا ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں نفرت اور وحشت پیدا ہو، اوران کو وہ غیر مہذب قسم کے قوانین سمجھیں، اس سلسلہ میں کچھ کام کرنا ہمارے ذہن میں تھا، لیکن الحمد للہ دار المصنفین کی اس تحریک، اس اجتماع اور اس محفل سے میرے دل میں اس کی ضرورت کا اور احساس بڑھ گیا، اب میں اپنے ادارے کی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ ان مستشرقین کے گمراہ کن خیالات و بیانات کا پورا ازالہ ہو، میں یہاں آکر انتہائی خوش ہوں، یہاں جو لمحات گذر رہے ہیں، ان کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی لمحات سمجھ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، اور اپنے مقاصد میں کامیاب کرے، اس ادارہ ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند اور اس ملک کے دوسرے دینی اداروں کو اسی طرح دین کی خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان کے لیے موانع دور ہوتے رہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی اس وقت جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی میں ثقافت اسلامیہ کے صدر ہیں، وہ اسٹیج پر بلائے گئے، تو بہت ہی جذباتی انداز میں بولے: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے شروع کروں، تقریباً ۲۵ پچیس برس کے بعد یہاں حاضر ہوا ہوں، میں اپنے ساتھ یادوں کی بارات لایا ہوں، جس میں شہنائیاں بھی ہیں، اور ہاں کچھ نوحے بھی، میں یہیں پیدا ہوا، میرا بچپن یہیں گذرا، میری تعلیم و تربیت کی داغ بیل اسی جگہ ڈالی گئی، ۱۹۵۳ء میں والد مرحوم آخری بار ہندوستان تشریف لائے تھے، تو ندوۃ العلماء کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے انھوں نے ایک شعر پڑھا تھا، وہی میرے جذبات کی

ترجمانی کرسکتا ہے ؎

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

یہ شعر پڑھتے وقت ان پر رقت طاری ہوگئی، کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے کہ دارالمصنفین کی تاسیس کا سب سے بڑا سبب مستشرقین کے حملہ کا دفاع تھا، سیرت نبویؐ کی تدوین کا آغاز اسی کام کے لیے ہوا، دارالمصنفین کو اس کا حق تھا کہ اس اجتماع کا انعقاد کرے، اگر مجھے معاف کیا جائے تو شاید میں یہ کہوں کہ آج سے بہت پہلے ہونا تھا، لیکن ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، بحمد اللہ بنیاد پڑگئی، اب کارواں کے آگے بڑھنے کا موقع ہے، والد مرحوم نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جو خطوط لکھے تھے اس میں انھوں نے اپنے حالات وکوائف لکھے تھے، اس کا ایک پیراگراف یہ تھا کہ میں پچھلے پچیس تیس سال سے یورپ اور مستشرقین کے حملوں کا جواب دے رہا ہوں اور اس کا دفاع کر رہا ہوں، حضرت مولانا تھانویؒ نے اس پر تحریر فرمایا تھا کہ جو کام آپ کر رہے ہیں وہ آپ ہی کے قلم سے ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے، کہنا یہ ہے کہ جس مجلس اور جس جگہ یہ کام ہوا تھا، اور جہاں یہ اجتماع آج ہورہا ہے اس کے بعد امید ہے کہ ان شاء اللہ کوشش اور تیز ہوگی، میری چند تجاویز ہیں، وہ ان شاء اللہ مقالہ کی نشست میں پیش کروں گا اللہ تعالیٰ برکت اور کامیابی عطا فرمائے۔

سید حامد | مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جب اسٹیج پر آئے تو فرمایا کہ یہ مجلس ایک طویل صبر آزما علمی مساعی کا نقطۂ آغاز ہے، مستشرقین سے ہماری شکایت بجا ہے، لیکن دراصل یہ شکایت ہمیں خود سے ہونی چاہیئے قدرت کا اصول ہے کہ خلاء کو گوارا نہیں کرتی، ہم نے علمی تحقیقات کا دامن ہاتھ سے جانے دیا تو گویا اغیار کو دعوت دی کہ آؤ، میدان تمھارے ہاتھ ہے، نتیجہ ظاہر ہے، میں آپ کا رہین منت ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دی، مجھے اس کا احساس ہے کہ ایک فرد کی حیثیت سے یہ کم سواد ہرگز اس کا مستحق نہ تھا کہ علماء کے اس جلسہ میں شریک ہوسکے، آپ نے مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نمائندے کی

حیثیت سے بلایا ہے، میں یونیورسٹی کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر اور ارمغان تبریک پیش کرتا ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ دونوں اداروں کے درمیان جس شرکت کار کی یہ دعوت غماز ہے، ان شاء اللہ وہ فروغ پائے گی اور اس کے نتائج معنی خیز ہوں گے، یہ علمی تعاون مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت اور ان کی دینی فلاح کے لیے ممد و معاون ثابت ہوگا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی | پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سابق سفیر شام نے اس اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وقت کے ایک اہم تقاضے کو انھوں نے پورا کیا، اور سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہوگیا، ہر قوم کی تاریخ اور تمدن کی ایک اجتماعی روح ہوتی ہے، مستشرقین نے اسلام پر بہت کچھ کام کیا ہے، لیکن وہ اس کی روح تک نہیں پہونچ سکے ہیں، گو اپنے پُر فریب اور معروضی نقطۂ نظر سے اس کی روح کو مجروح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، چند غلطیوں کی تصحیح آسان ہے، اگر زہر اس طریقہ سے دیا جائے کہ خام ذہن کو تلخی محسوس نہ ہو، لیکن اگر رگ وپے پر اس کے اثرات اتر جائیں تو بہت سخت بات ہے، مستشرقین نے ہماری خودداری اور خود اعتمادی دونوں پر بڑی ضرب لگائی ہے، اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام سرسید احمد خاںؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور علامہ اقبالؒ نے انجام دیا، اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ جس علم کو ہم کھو چکے ہیں اس کو حاصل کرکے پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے، انھوں نے بتایا کہ اپنی خودی کو کھونے کے بعد مسلمانوں نے برسوں نطشے اور یورپ کے مستشرقین کی زنار اپنی گردن میں ڈالے رکھی، دار المصنفین نے یہ بہت بڑا کام شروع کیا ہے، امید ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی اور رہبری میں یہ کام پورے طور پر انجام پائے گا، مگر یہ پہلی منزل ہے، اس سے مطمئن نہیں ہونا ہے، مستشرقین کے کام بہت عظیم الشان ہیں، اس کے دفاع اور آگے بڑھنے کے لیے بڑے عزم اور ہمت کی ضرورت ہے، مگر امید ہے کہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرکردگی میں یہ عزائم کامیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر ابراہیم قریشی

جمعیۃ اسلام بنکاک تھائی لینڈ کے نمایندے جناب ڈاکٹر ابراہیم قریشی اسٹیج پر تشریف لائے تو انھوں نے فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ اس نے ہمیں اس مذاکرۂ علمی میں یکجا کیا، میں امید کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے دین اسلام کی بہتر سے بہتر خدمت ہوگی، میں جمعیۃ علمائے تھائی لینڈ کی طرف سے اس موقع پر آپ سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ تھائی لینڈ کے عوام مسلم وغیر مسلم دونوں کسی نہ کسی حیثیت سے دارالمصنفین سے تعلق رکھتے ہیں، میں جب بچہ تھا تو میرے والد بزرگوار نے شبلی اکیڈمی کے بارے میں بتایا تھا، لیکن اس وقت اس کی پوری اہمیت سے واقف نہ ہوسکا، اپنے اسکول کی تعلیم کے زمانہ سے اب تک اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیر مسلموں کے حلقہ میں جو مسخ شدہ حالات پیش کیے جارہے ہیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس کی اصلاح درسی کتابوں اور اچھے لٹریچر کے ذریعہ سے کریں، یہ میری خواہش ہے کہ تنقیدی اور تحقیقی انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھوں، سنہ ۱۹۷۰ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ رابطۂ عالم اسلامی کا مہمان تھا، جب ہم مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہوکر دعا کی کہ "اللہ کے رسول! ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور اخلاص کے ساتھ آپ کی اتباع کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے طاقت دے، علم دے اور وسائل دے کہ میں اس مشکل کام کو انجام دوں، آمین"۔ میں بھی رویا، میری اہلیہ بھی روئیں، کچھ سال قبل مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ کی جلدیں حاصل کیں، مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس کی زبان بہت عمدہ ہے، اور یہ الفاظ کے ذخائر سے مالا مال ہے، مگر اردو نہ جاننے کی وجہ سے اس سے استفادہ کرنا میرے لیے مشکل ہے، میں کراچی آیا تو سیرۃ النبیؐ جلد اول کا انگریزی ترجمہ جو جامعۃ الفلاح نے شایع کیا ہے، اور دوسری جلد جو حیدرآباد سے چھپ کر شایع ہوئی ہے، ان کو میں نے حاصل کیا، اور جب ان کا مطالعہ کیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ

اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مجھے پکارو میں سننے کے لیے تیار ہوں) اس کے بعد میں نے اور کتابیں مہیا کیں، خاص کر صحاح ستہ حاصل کی، جہاں مولانا شبلیؒ نے صرف حوالہ دیا، میں نے پوری حدیث نقل کی اور اس کا ترجمہ دیا، اسی مناسبت سے میں نے یہ عرض کیا کہ تھائی لینڈ کا تعلق دارالمصنفین سے ہے، میری کتاب کی پہلی جلد ہجرت کے واقعات تک ہے، یہ تین سال پہلے شائع ہو چکی ہے، دوسری جلد پہلی ہجری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک ہے، یہ زیر طبع ہے، جو ان شاء اللہ سنہ ۱۹۸۳ء تک شایع ہو جائے گی۔

یہ اسلام کے احیاء کا دور ہے، ہم اپنے ایمان کو قوی بنائیں، ایک مسلمان کا ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہے، ہم الٰہ کے سارے تصورات کو ختم کر کے اپنے دلوں کو پاک کریں، اور ان میں اللہ کا خیال جاگزیں کریں تب ہی ہمارا ایمان پختہ ہوگا، اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہمارے ایمان میں پختگی پیدا نہیں ہو سکے گی، اس کے بعد ہم اس پر عمل کریں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ — تمھارے لیے اللہ کے رسول میں

اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (احزاب) — بہترین نمونہ ہے۔

تب ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عقیدہ پختہ ہوگا، ہم کو رسول اللہ صلعم کی احادیث پر عمل کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ — اور نہ کمزور پڑو اور نہ غم کرو، اگر تم مومن ہو

الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آل عمران) — تو تم ہی سربلند ہو گے۔

ہم نے دارالمصنفین کے ایک کتابچہ میں یہ پڑھا کہ سیرۃ النبیؐ کے ترجمے ترکی اور انگریزی زبانوں میں ہوئے اور عربی میں بھی کیا جا رہا ہے، اب اس میں یہ اضافہ کر دیا جائے کہ اس کے بڑے حصے کا ترجمہ

ی زبان میں بھی ہو گیا ہے، اور ۱۹۶۷ء سے پڑھا جا رہا ہے، شبلی اکیڈمی سے ہم لوگوں کا تعلق
ابنا پرہے۔"

ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری | ڈاکٹر ظفر اسحٰق ظہران کی پٹرولیم یونیورسٹی کی نمایندگی کرنے کے لیے تشریف
لائے تھے، جب وہ اسٹیج پر آئے تو فرمایا: ظہران یونیورسٹی کے مدیر کو اس سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ
وصول ہوا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر شریک نہیں ہو سکے، سب سے پہلے ان کی طرف سے
شکریہ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ہماری یونیورسٹی کو بھی یاد کیا، اس موقع پر مجھ کو بھی دعوت نامہ
وصول ہوا، اس کے لیے بھی شکر گذار ہوں، جس جذبہ سے یہ مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے، ہم اس کی
قدر دل سے کرتے ہیں، دار المصنفین کے کام اور اس کے مقاصد سے عالم اسلام کے ہر خطہ کے لوگ
واقف ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اردو اچھی طرح نہیں جانتے ہیں، وہ سب اس کی قدر
کرتے ہیں، ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ مذاکرہ ہر لحاظ سے کامیاب ہو، ان مختصر الفاظ کے ساتھ میں
آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔

جناب شوکت سلطان | جناب شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل پوسٹ گریجویٹ شبلی کالج اسٹیج پر
بلائے گئے، تو انھوں نے فرمایا: مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرا رشتہ علامہ شبلی مرحوم سے ہے، گو کہ ان کے
پوتی داماد ہونے کی حیثیت سے میرا رشتہ قانونی ہے، مگر میری اہلیہ اور اولاد کو زیادہ فخر ہے کہ ان کا رشتہ
علامہ سے خونی ہے، میں سرزمین شبلی پر معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہوں، خوش آمدید کہتا ہوں،
اھلاً وسھلاً، میں مولانا شبلی کے قائم کردہ شبلی کالج میں تیس ۳۰ برس تک فرایض ادا کرنے کے
بعد ریٹائر ہوا ہوں، اور اب ان کے دوسرے قائم کردہ ادارے شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ
اور عاملہ میں ہوں، یہ تعارف میرے خیال میں کافی ہے، اس تیس ۳۰ سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے
بہت سے کام کرائے ہیں، جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، علامہ شبلی مرحوم کے

الفاظ میں "اپنا آنسو خود کیا گاؤں"۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی | سب سے آخر میں صدر مجلس جناب ڈاکٹر یوسف قرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی قطر یونیورسٹی نے تقریر کی، جس کو سنتے وقت محسوس ہوتا تھا کہ وہ عربی زبان کے بڑے اچھے خطیب ہیں، اور اپنے ماہرانہ، باوقار اور سنجیدہ انداز بیان میں جو کچھ فرما رہے ہیں اس پر ان کو پورا اعتبار اور اعتماد ہے، انھوں نے فرمایا کہ یہاں پر دو رابطے جمع ہو گئے ہیں، ایک تو عقیدہ اسلام کا ہے، اور وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے، دوسرا علم کا ہے جو قوی بین کر رشتوں کو جوڑتا ہے، ہم نے علم ہی کے ذریعہ سے ہندوستان کے علماء سے واقفیت حاصل کی، ہم ان کی خدمات کے مرہون منت ہیں، ہم میں کون ہے جو حکیم الامت شاہ ولی اللہ ابن شاہ عبد الرحیم سے واقف نہیں ہے؟ کون ہے جس نے حجۃ اللہ البالغۃ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے، کون ہے جو کشاف اصطلاحات الفنون سے مستفید نہیں ہوا؟ کون ہے جو کنز العمال سے واقف نہیں ہے؟ کون ہے جو نواب صدیق حسن خان سے واقف نہیں ہے اور ان کی کتابوں کا خوشہ چین نہیں ہے؟ ہم عرب ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، کون ہے جو مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو نہیں جانتا ہے؟ کون ہے جو حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کا رتبہ شناس نہیں؟ ان کو دیکھنے سے پہلے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین سے واقف ہوا، یہ علمائے ہند کے کارنامے ہیں۔

عصر حاضر میں سب سے بڑی چیز جو مسلمانوں پر مسلط کی گئی وہ استعماریت ہے، استعماری طاقتیں اپنے ساتھ اپنے افکار و خیالات لائیں جو فوج کشی اور قبضہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئیں، فوجیں تو وقتی طور پر آتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں لیکن ان کے ساتھ جو افکار و خیالات اور عقائد آتے ہیں ان کے نفع اور ضرر کے اثرات لوگوں کے کردار پر پڑتے ہیں، ہم اس کو فکری یلغار کہتے ہیں، جس میں سب سے زیادہ خطرناک استشراقی تحقیقات ہیں، علمائے اسلام کو بنیادی طور پر مبشرین اور مستشرقین دونوں کا خطرہ لاحق ہے

عیسائی مبلغین اپنی وضع قطع اور لباس سے پہچان لیے جاتے ہیں، مسلمان ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں، جس مسلمان کے اندر تھوڑی بہت اسلامی حمیت وغیرت ہوتی ہے وہ ان کے جال میں نہیں پھنستا ہے، لیکن مستشرقین کے فریب سے بچنا مشکل ہے، وہ علم کا لباس پہن کر اور تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں تو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور سمجھدار مسلمان بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور ان کی کاوشوں اور تحقیقوں کی داد دینے لگتے ہیں پھر انہی کو مرجع بھی تسلیم کرتے ہیں، یہ مستشرقین اسلام کے خلاف نئے نئے انکشافات کرتے ہیں، جن میں اپنی افترا پردازیوں سے بھی کام لیتے ہیں، انھوں نے جمع و ترتیب، تبویب اور فہرست کی تیاری میں مفید کام ضرور انجام دیے ہیں، کتب خانوں میں پڑے ہوئے مخطوطات کو علمائے اسلام سے روشناس کرایا، ان ہی میں طبقات ابن سعد ہے، المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف اور مفتاح کنوز السنۃ جیسی کتابوں سے ان کی عرق ریزی کی نشاندہی ہوتی ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی کتابوں کا تعلق روح سے نہیں ہے، عقائد سے بھی نہیں ہے، سیرت و تاریخ سے بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے ظاہری اشکال سے ہے، کیونکہ جب عقائد یا اسلامی تاریخ یا روح اسلام کا مسئلہ آتا ہے تو پھر ان کے خفیہ عزائم ظاہر ہوجاتے ہیں، ان کا قلم اسلام کے خلاف زہر اگلنے سے رکتا نہیں ہے، انھوں نے اسلام کو تسلیم نہیں کیا، ان کو غزوۂ موتہ، اجنادین اور صلیبی جنگوں میں جو شکستیں ہوئی ہیں ان کو وہ بھولے نہیں اور اس کا بدلہ قلم سے لے رہے ہیں، جس میں وہ بعض اوقات بڑی بھونڈی غلطیاں کر جاتے ہیں، جس وقت میں اپنی کتاب فقہ الزکوٰۃ لکھ رہا تھا تو گولڈزیہر کا وہ مضمون پڑھا جو چند صفحات پر مشتمل تھا، اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں، وہ بہت سی ایسی باتیں لکھ گیا ہے جن کا کوئی مرجع، مصدر یا حوالہ نہیں، ایسے مستشرقین کی تحقیقات سے عالم اسلام کے بہت سے محققین متاثر ہوئے، ان ہی میں طٰہٰ حسین کا نام لیا جاسکتا ہے جنھوں نے الشعر الجاہلی میں گولڈزیہر اور دوسرے مستشرقین کے افکار و خیالات کو صحیح سمجھتے ہوئے جمع کردیا ہے اور اسے عالم اسلام میں پھیلایا بھی ہے، اور نہ جانے کتنے نوجوا

اس سے متاثر ہوئے، علمائے ازہر بھی ایسے اثرات قبول کیے بغیر نہ رہ سکے، ان کی کتابوں کو مرجع قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں احمد امین کا نام لیا جاسکتا ہے، مستشرقین کو اسلام میں اگر کوئی مستحسن چیز اور خوبی نظر آتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو یونانی اور رومی قانون سے ماخوذ ہے، انھیں قرآن اور سنت نبوی میں بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی، اور اگر آتی ہے تو اسے یہودیت اور نصرانیت سے مستعار بتاتے ہیں، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم نے السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی میں گولڈ زیہر کی ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ہے جو اس نے امام زہریؒ کے سلسلہ میں کی ہیں، ان استشراقی کوششوں کو ہندوستانی علماء نے خوب سمجھا ہے، اور ان کے جوابات بھی دیے ہیں، جس طرح مصر میں مفتی محمد عبدہ نے الاسلام والنصرانیۃ فی العلم والمدنیۃ میں اور ان کے بعد ان کے خلیفہ علامہ رشید رضا مصری نے اپنے مجلۃ المنار میں پینتیس ۳۵ سال تک ان مستشرقین کی افتراپردازیوں کے جوابات دیے، اسی طرح ہندوستان میں دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء نے اس قسم کی کتابوں کا جائزہ لیا اور جوابات لکھے، اگرچہ ان کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل نہیں ہوسکی ہیں، علامہ شبلیؒ اس دستہ کے روح رواں ہیں، مگر ان کا کارنامہ عربی میں منتقل نہیں ہوسکا، ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صرف ایک کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا، ان کی الرسالۃ المحمدیۃ سے ہم نے ان کو پہچانا، ان محققین کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا جائے، ہم اس میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، ہم اسلام کو صاف، شفاف، اور منقح شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں[1]۔"

یہ کھلا اجلاس جب اپنے پورے وقار کے ساتھ ختم ہوا تو تمام سامعین کے چہرے یہ کہہ رہے تھے کہ جو چیز وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کرسکتے تھے، وہ ان کو اس پنڈال میں اچھی طرح حاصل ہوگئی، وہ بہت کچھ سیکھ کر اٹھ رہے ہیں، ہر شخص کی زبان پر تھا کہ اس کھلے اجلاس کی جاذبیت

[1] ان تقریروں کا متن تعمیر حیات لکھنؤ کی اس روداد کی مدد سے بھی تیار کیا گیا ہے جو اس میں برابر شائع ہوتی رہی ہے

سیمنار کی آیندہ کارروائیوں کی کامیابی کی ضامن ہے، ہر شخص میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا اور چھوٹے بڑے کام کو انجام دینے میں پیش پیش ہوگیا، جناب محمد مسعود خاں صاحب سابق وزیر اترپردیش اپنی متانت اور خاموشی کے ساتھ ہر جگہ پہونچ کر کسی نہ کسی کام میں مفید مشورے دے رہے تھے، وزارت میں رہنے کی وجہ سے ان میں بڑی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی ہے، میں ان کا شکر گذار اس لحاظ سے بھی ہوں کہ میری بعض پریشانیوں میں انھوں نے مفید مشورے دیے اور ضرورت کے وقت ٹیلیفون پر دیر تک بیٹھنے کی زحمت گوارا کی، شبلی منزل میں برابر تشریف لاکر یہاں کے کارکنوں کے حوصلے بڑھاتے رہے، کھلے اجلاس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ناظم جناب ابوالحسن علی فراہی اور جناب احمد محمود نائب ناظم اور جناب عبدالرحمٰن ناصر مہتمم مال کو بھی دیکھا کہ وہ اس کی کارروائیوں سے پوری دلچسپی لے رہے ہیں، اس مدرسہ کا تعلق دارالمصنفین سے بڑا گہرا ہے، اس بنا پر ان کی یہ دلچسپی بالکل فطری اور حق بجانب تھی، کھلے اجلاس کے بعد وہاں سے مولانا عبدالمجید ندوی صدر مدرس، دیگر اساتذہ اور کچھ طلبہ بھی آگئے تھے، مدرسۃ الفلاح بلریاگنج کے صدر مدرس مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور وہاں کے استاذ مولانا نظام الدین اصلاحی اور مولانا ابوالکلام اصلاحی نے وہی سارے حقوق ادا کیے جس کی توقع ان سے تھی، یہ سب حضرات اس تقریب کو اپنی تقریب سمجھتے رہے، اور کھلے اجلاس سے متاثر ہوکر سیمنار کی کامیابی پر قبل از وقت مبارکباد دے رہے تھے، مئو کے جامعہ اثریہ دارالحدیث کے شیخ الحدیث مولانا فیض الرحمٰن، شیخ الجامعہ مولانا محمد احمد اثری، ناظم جامعہ مولانا فخر المجید اور استاذ مولانا عبداللطیف بھی انتظامی امور سے دلچسپی لے رہے تھے، اور مبارکپور کے مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم مولانا عبدالباری قاسمی، شاہ گنج کے مدرسہ بدرالاسلام کے مولانا محمد عثمان بھی اس تقریب کی کامیابی پر خوش تھے، مئو کے کاغذ محل کے مالک محمد حسن بھی ہر کام میں پیش پیش تھے، اور حیرت اس بات کی ہوئی کہ جناب حکیم محمد مختار اصلاحی نے

بھائی نے اس تقریب میں شرکت کے لیے ایک لمبے سفر کی زحمت گوارا کی ، اس کے لیے ہم سب ان کے بھی شکر گذار ہیں ، کھانے کے بعد ظہر کی نماز کے لیے شبلی منزل کی مسجد میں لوگ جمع ہوئے جو اس موقع کے لحاظ سے ہر طرح سجائی گئی تھی ، آج سے پچاس سال پہلے نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے اس کے لیے قیمتی دریوں کی جانمازیں اور پردے عطا کیے تھے ، جو بڑی حفاظت سے رکھے جاتے ہیں ، اس موقع پر ان سے مسجد کو آراستہ کیا گیا تھا ، لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس موقع کے لیے بمبئی سے سیٹھ عبدالغنی اطلس والے نے بڑی خوبصورت اور دیدہ زیب چٹائیاں بھیجی تھیں ، جو صحن میں بچھائی گئی تھیں ، ان سے مسجد کی رونق دوبالا ہو رہی تھی ، اس کے لیے ہم دل سے ان کے شکر گذار ہیں ۔

اس مجمع میں مولانا وصی اللہؒ کے خلیفہ اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا عبدالحلیم صاحب کو دیکھ کر بھی خوشی ہوئی ، اس سمینار میں علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کی شرکت نہ ہو سکی ، حالانکہ آخر وقت تک یہ امید تھی کہ وہ اپنی تشریف آوری سے ہم لوگوں کو منون نوازیں گے ، اگر وہ آجاتے تو یہاں کے لوگوں کو ان کے دیدار کے اشتیاق کی تشنگی بڑی حد تک فرو ہو جاتی اور سمینار میں مزید رونق ہو جاتی ، انھوں نے اپنے آخری خط میں تحریر فرمایا کہ حکومت پاکستان کی منشا کے بغیر میرا کسی بھی غیر ملکی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونا ممکن نہیں ہوتا یہ رول ججوں کے لیے خاص طور پر ہے ، اعظم گڈھ حاضر ہو کر آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں ، خدا نے چاہا تو کوئی اور موقع فراہم کر دے گا "

(باقی)

دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار سے متعلق کچھ اہم خطوط

کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ، مکتب العمید

مرکز بحوث السیرۃ والسنۃ النبویۃ، قطر

۲/۶/۱۴۰۲ھ مطابق ۲۷/۳/۱۹۸۲م

برادر مکرم مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

دارالمصنفین دیکھ کر اور "الاسلام و المستشرقون" کے مبارک سیمینار کے سلسلہ میں آپ حضرات کی ساعیٔ جمیلہ اور پر خلوص کوششوں کا اندازہ کر کے ہم کو جو خوشی اور مسرت ہوئی ہے، اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، اس سیمینار کو منعقد کرنے کے پیچھے جو مقاصد اور مقدس جذبات کارفرما تھے، وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہیں، سیمینار کی کامیاب کارروائی کے لیے بھی آپ مبارکباد کے مستحق ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم الشان کام کی قدر و قیمت کا وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں کو کرنے کا تجربہ ہو چکا ہے۔

میرے محترم بھائی! مجلس دارالمصنفین کی تعریف و تحسین اور اس کی عظمت کے اعتراف کے لیے یہ چند سطریں ہرگز کافی نہیں ہو سکتیں، اس لیے ہم صرف یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کے اور ہمارے کاموں کو شرف قبولیت بخشے۔

اخی کریم! سیمینار کے سلسلہ میں آپ حضرات کی سرگرمیاں خلوص اور گرمجوشی کے ساتھ مہمان نوازی

اور بالخصوص آپ کی افتتاحی تقریر جس نے حاضرین کو بہت متاثر اور برانگیختہ کر دیا تھا نیز ان وداعی تقریریں میں جن متلاطم جذبات کے ساتھ آپ نے ہم لوگوں کو رخصت کیا تھا اسے ہم کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

اخی مکرم! میں آپ تمام لوگوں کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں، خصوصاً مولانا ابو الحسن علی ندوی اور اپنے بھائیوں محمد رابع، سعید الاعظمی اور سلمان ندوی کو، آپ تمام حضرات ہمارے رفقاء ڈاکٹر عبد العظیم الدیب اور استاذ علی یوسف محمدی کا سلام بھی قبول فرمائیں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا بھائی: یوسف القرضاوی

ڈین شریعت فیکلٹی و ڈائرکٹر مرکز بحوث السنۃ والسیرۃ النبویۃ

(نوٹ) یہ خط عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

— ۲ —

کراچی ۲ر جمادی الاولی ۱۴۰۲ھ، ۲۷ر فروری ۱۹۸۲ء

حضرت محترم زید مجدکم العالی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میری طرف سے ہدیۂ تشکر و امتنان قبول فرمائیے کہ آپ کے لطف و کرم کی وجہ سے مجھے شہر انسان خیز اعظم گڈھ میں موتمر اسلام و مستشرقون میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور میں آپ کی خدمت میں ارمغان پیش کرتا ہوں کہ بہر لحاظ کامیاب اور بہر طور پُر مقصد کانفرنس کے انعقاد پر مجھے یقین ہے کہ یہ بیداری کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔

میں اپنے مستقر پر واپس پہونچ گیا ہوں اور اپنے ساتھ اعظم گڈھ سے ان گنت یادیں ساتھ لایا ہوں اور آپ کے گرمیٔ خلوص و انس کے ناقابل فراموش تاثرات سے سرشار ہوں۔

احترامات فائقہ کے ساتھ۔

آپ کا مخلص: حکیم محمد سعید

-۳-

ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

۲۷ر فروری ۱۹۸۲ء

مولانا محترم و معظم طال بقاءہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

کل رات کو ہم سب رفقائے وفد بخیر و عافیت اسلام آباد واپس آ گئے، الحمدللہ میں ۱ر مارچ تک اسلام آباد میں رہوں گا، اس کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ کراچی جاؤں گا۔

دارالمصنفین کی طرف سے مہمان داری، اعزاز و اکرام اور برادرانہ سلوک کا اثر سارے رفقائے وفد کے قلوب پر ہے، اور بہت ہی خوشگوار یاد ان کے دلوں میں ان شاء اللہ تعالیٰ تا بہ دیر باقی رہے گی۔

۲۴ر اور ۲۵ر کو ندوہ میں قیام رہا، اور محبت و یگانگت کے ساتھ اعزاز و تکریم کا جو سلوک ندوہ میں ہوا اس سے سبھی متاثر ہوئے، رہا میں، تو مجھے یہ شکایت ندوہ سے رہی کہ:

کرشمہ انقلابِ دہر کا ہے اس کو کیا کہیے — کہ خود اپنے ہی گھر میں آج مہماں بن کے آیا ہوں

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب لوگوں کو بخیر و عافیت رکھے۔

مخلص و دعا گو: عبدالقدوس ہاشمی

-۴-

فیصل آباد

۲۸ر فروری ۱۹۸۲ء

جناب محترم و مکرم مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب زید مجدہم و دامت برکاتہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ ہم چھ رفقاء ۲۵ر فروری کی شام کو لکھنؤ سے پنجاب میل میں سوار ہو کر ۲۶ر کی صبح کو امرتسر پہونچے اور سرحد پار کرکے ۲ بجے لاہور اسٹیشن تک گئے

ذریعہ پہونچے، اسلام آباد کے پانچ رفقار تو ڈھائی بجے ویگن میں سوار ہوکر راولپنڈی روانہ ہوگئے، میں لاہور میں رہ گیا اور ۲۷ر کا دن بھی وہاں گذار کر شام کو فیصل آباد آگیا، یہاں مدرسہ کے حالات کی خبرگیری کرکے اور آئی ہوئی ڈاک دیکھ کر اور جواب لکھ کر ان شاء اللہ ۲ر ۳ر کو پشاور جاؤں گا، اور ۱۰ر تا ۱۱ر اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد آؤں گا، دارالمصنفین کی حاضری، وہاں کا برائی العین مشاہدہ جو عرصۂ دراز کی تمناؤں کے بعد حاصل ہوا تھا، اور ایسے علمی مذاکرہ میں شرکت اور اہل علم سے ملاقات کا شرف، یہ ساری چیزیں میرے لیے انتہائی قلبی مسرت و ابتہاج کا موجب تھیں، آپ کی مخلصانہ دعوت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ ساری سعادتیں نصیب فرمائیں، آپ نے جس خلوص و محبت کے ساتھ ہماری پذیرائی فرمائی، مہمان نوازی کی، قدم قدم پر شفقت و رحمت کا مظاہرہ فرمایا، آپ کی ان خوب مخلصانہ اداؤں کی یاد ہمیشہ رہے گی، اور ان کا نقش میرے قلب پر مرتسم رہے گا، دارالمصنفین کے لیے آپ کے لیے، اور آپ کے تمام رفقائے کار کے لیے تہِ دل سے دعائیں کرتا رہوں گا، اللہ تعالیٰ آپ سب کو بخیر و عافیت اور صحت و سلامتی کے ساتھ اسی طرح دین کی خدمت اور علوم دینیہ کے نشر و اشاعت کی توفیق نصیب فرمائے اور ہر قسم کے موانع و عوائق کو دور کرکے آپ کو ان خدمات کے سرانجام دینے کے لیے وسائل و ذرائع مہیا فرماتا رہے، میں تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، سیرۃ النبیؐ کی ساتوں جلدوں کا ہدیہ آپ کا ایک ایسا بہترین تحفہ ہے جس سے میں خود بھی استفادہ کروں گا اور اپنی اولاد کو بھی بتاکید کہوں گا کہ اس سے استفادہ کرکے آپ سب کے حق میں دعائیں کیا کریں۔

سیمینار کے مقالات چھپ جائیں تو مہربانی فرماکر ایک نسخہ میرے نام مندرجۂ بالا پتہ پر بھی ارسال فرمائیں، تاکہ یہ علمی مقالات محفوظ رکھوں، دارالمصنفین کے تمام رفقاء اور شبلی کالج کے اساتذۂ کرام کو میری طرف سے سلام مسنون پہونچا دیجئے، فقط والسلام خیر ختام۔

احقر سید تاج الدین کاکاخیل مدرسہ اشاعت العلوم جامع مسجد فیصل آباد۔

-۵-

ادارۂ تحقیقات اسلامی ۔ اسلام آباد

۹ مارچ ۱۹۸۳ء

سیدی المحترم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ہمارا قافلہ ۲۶؍ کی شب بخیر وعافیت اسلام آباد پہونچ گیا، اعظم گڈھ سے لکھنؤ تک کا سفر بوجوہ خاصا تکلیف دہ رہا، اور بعد کے مراحل آسان اور سفر خوش گوار اور آرام دہ رہا، راستہ بھر آپ لوگوں کی عنایات، الطاف، مہمان نوازی اور کرم گستری کے تذکرے ہم لوگ آپس میں کرتے رہے۔

وفد کی صورت میں نمایندگی اور شرکت کی تجویز اور تحریک چونکہ میں نے ہی کی تھی، اس لیے میں نے اس کو اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ اظہار اعتذار و تشکر کی ذمہ داری بھی میں ہی ادا کروں، معذرت اس بات کی کہ مہمان اور مندوب ہونے کی حیثیت میں ہم سے یقیناً کچھ کوتاہیاں ہوئی ہوں گی، بلکہ زیادہ درست یوں ہے کہ ہوئیں، اور شکریہ اس بات کا کہ آپ لوگوں نے ہماری توقع سے بڑھ کر ہماری پذیرائی کی، سردست مجھے اس سے زیادہ لکھنے کا اور آپ کو اس سے زیادہ پڑھنے کا یارا نہیں، دونوں تھکے ہوئے ہیں، آپ لوگ انتظامات کی وجہ سے مسلسل مصروف رہے اور اب تک ہوں گے، ہم لوگ طویل سفر کی وجہ سے درماندہ ہیں، میرا ارادہ ہے کہ اس سفر کی روداد قلمبند کر ڈالوں، بعض اخبارات کی طرف سے اس کی فرمائش بھی ہے، اگر یہ ارادہ پورا ہوگیا تو باقی باتیں آپ تک مطبوعہ شکل میں پہونچیں گی، سمینار کی کارروائی کی ترتیب وطباعت کا کام آپ کے ہاں سے ہوگا ہی، اس لیے میں اپنی سرگذشت میں اس حصے سے سرسری ہی گذروں گا، دارالمصنفین کے رفقاء اور کارکنوں کو ہماری طرف سے سلام ونیاز، دفتر کی طرف سے پہونچنے کا ٹیلی گرام ۲۷؍ کو روانہ کر دیا گیا تھا، اور ہاشمی صاحب نے خط بھی بھیج دیا تھا۔

شرف الدین اصلاحی

لاہور۔

۵؍مارچ ۸۲ء

مخدوم و محترم! السلام علیکم۔

میں آپ کے یہاں سے سیمنار کی خوشگوار یادیں لیے ہوئے بخیریت پہونچ گیا، راستہ میں ایک رات اور تقریباً ایک دن ندوہ میں قیام رہا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑا کرم کیا، ندوہ کے تمام شعبے اور کتب خانہ کھلوا کر دکھلایا۔

میں اپنا مقالہ مستشرقین اور علوم اسلامیہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کو دے آیا تھا، مقالہ کے آخری دو صفحات آپ بھی دیکھ لیں، اس میں میں نے بعض نئی باتیں لکھی ہیں جو شاید کسی نے نہ لکھی ہوں، آپ کی مہمان نوازی کی عنایات کے لیے مکرر شکر گذار ہوں، اللہ تعالیٰ دار المصنفین کو آباد اور آپ کا سایہ تا دیر قائم رکھے، کارلایقہ سے یاد فرماتے رہیں، ضیاء الدین صاحب، منصور نعمانی صاحب اور عمیر الصدیق دریابادی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔ والسلام۔

شیخ نذیر حسین

مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لاہور

—— ۷ ——

وزارت عدل ابوظبی، متحدہ عرب امارات

۲۲؍مارچ ۸۲ء

محترم المقام جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، واپسی کے بعد سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، مگر مہینہ کے

مشاغل کی وجہ سے تاخیر ہوئی، سمینار کو کامیاب بنانے میں آپ اور آپ کے رفقاء نے جس طرح کوشش کی، اس پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ کرے یہ مذاکرہ ہر طرح باعث خیر و برکت ہو، یہاں کے مقامی سرکاری ڈیلی اخبار "الاتحاد" میں دارالمصنفین کی مختصر خبر شایع ہوئی تھی، اگر دارالمصنفین سے متعلق تعارف وغیرہ پہلے مل گیا ہوتا تو اس کو بھی یہاں شایع کرا دیتا، ہمارے عزیز مولوی ارشد سلمہٗ گھر جا رہے ہیں، ان کے ذریعہ یہ خط ارسال کر رہا ہوں، مولانا ضیاء الدین اور دیگر رفقاء کو سلام مسنون، مذاکرہ کے سلسلہ میں کوئی چیز شایع ہو تو مجھے ضرور بھجوا دیں، حضرت شیخ الحدیث مدظلہم کی صحت قدرے بہتر ہے۔ والسلام

مخلص: تقی الدین ندوی مظاہری

— ۸ —

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۷ مارچ ۲۰۰۰ء

صدیق مکرم و محترم! السلام علیکم۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، مضمون "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور، طریقۂ کار کا تجزیہ اور اصلاح حال کی راہ" ارسال خدمت ہے، براہ کرم ایک ہی قسط میں شایع کیا جائے، قسطوں میں اثر جاتا رہے گا۔

سمینار کی شاندار کامیابی پر ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہے، میں گھر سے نکلنے میں بڑے حیلے اور بہانے کرتا ہوں، لیکن دارالمصنفین میں کچھ ایسی کشش محسوس کی کہ اعظم گڈھ جلد از جلد پھر آنے کو جی چاہتا ہے۔ والسلام

نیازمند: خلیق احمد نظامی

ادبیات

غزل

از جناب وارثؔ ریاضی، چمپارن

چلا چل جادۂ الفت میں یہ کس کی صدا آئی
کہ پیدا ہوگئی ہے رہ نوردی میں توانائی

خدا جانے چمن میں کس کی آمد کے تصور میں
لبِ گل برگ پر "موجِ صبا" لیتی ہے انگڑائی

تصور میں وہ جب آئے ہوا محسوس یہ مجھ کو
کہ جنت کی بہارِ جلوہ زا مجھ تک چلی آئی

جنوں کا ہے کرم یہ بھی کہ اکثر راہِ منزل میں
بڑھا دیتی ہے ہمت ہر قدم پہ آبلہ پائی

وہ میرے ضبطِ غم کا معجزہ تھا ان کی محفل میں
تماشا گاہِ حیرت بن گئے میرے تماشائی

قفس لکھا تھا قسامِ ازل نے میری قسمت میں
چمن کی سیر و بوئے گل طبیعت کو نہ راس آئی

حقیقت سے چمن کی وہ نہیں واقف بہاروں میں
نہ سمجھی جس نے پھولوں کی ہنسی کلیوں کی برنائی

خزاں کی نذر ہو جائے جو وہ گلشن تو کیا غم ہے
ازل سے آج تک جس میں نہ صبحِ پُر بہار آئی

ہوا ہے منکشف مجھ پہ یہ ایامِ مصائب میں
کہ وہ نا آشنا ہیں جن سے ہے میری شناسائی

ہوا نادانیوں سے عشق کا ہر مرحلہ آساں
نہ کام آئی رہِ الفت میں داناؤں کی دانائی

خدا کو کیا وہ پہچانے گا جو خود کو نہ پہچانا
نہ پہچانے گا خود کو جس نے کھو دی دل کی بینائی

کہاں میں اور کہاں ساقی کی بزمِ کیف زا وارثؔ
اُدھر کھینچے لیے جاتا ہے میرا شوقِ رسوائی

مطبوعات جدیدہ

ارشادات و مکتوبات بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ مرتبہ مولانا افتخار فریدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۵۲، قیمت مجلد بارہ ۱۲ روپے وغیر مجلد دس ۱۰ روپے۔ پتے: (۱) مولانا افتخار فریدی، فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔

(۲) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶۔

مولانا محمد الیاسؒ کی دینی و اصلاحی دعوت کی جانب الحمدللہ اس وقت ہر خطہ کے مسلمان متوجہ ہوگئے ہیں، لیکن عام لوگوں کی کثرت اور کام کے اس قدر پھیلاؤ کی وجہ سے اس کی اصل روح باقی نہ رہ جانے کا اندیشہ بھی ہے، اس کو خود بانیٔ تبلیغ بھی محسوس کرتے تھے، اس لیے وہ اس دینی دعوت کی صحیح نوعیت برابر واضح کرتے رہتے تھے، اور وقتاً فوقتاً اس کے غلط رخ اختیار کر لینے کے خطرے سے آگاہ فرما کر اس کے بارہ میں ضروری اور مفید ہدایات بھی دیتے رہتے تھے، مولانا افتخار فریدی دین کا بڑا درد رکھتے ہیں اور وہ مدتوں اس تحریک میں پیش پیش رہے ہیں، اس لیے اچھی طرح اس کے مزاج شناس ہیں، یہ مجموعہ انھوں نے اس غرض سے شایع کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے اس کام کی نوعیت و نزاکت کو واضح کرکے اسے غلط نہج سے محفوظ رکھا جائے، یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں بانیٔ تبلیغ کے زریں فرمودات و اقوال نقل کیے گئے ہیں، اور دوسرے حصہ میں ان کے خطوط درج ہیں، مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے ان ارشادات و مکتوبات میں دعوت و تبلیغ کے کام کی صحیح نوعیت، ضرورت، اس کی ساخت، خصوصیت، آداب، چھ اصول، کلمہ، نماز، فرائض،

نوافل، اذکار و اوراد، توبہ، ندامت، اعتراف قصور اور دوسرے دینی اعمال و اشغال کی اہمیت بیان کی ہے، قرآن سے رہنمائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کامل، ایمانی و اسلامی زندگی اختیار کرنے، خدمت خلق کو شعار بنانے اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہونے کی تلقین کی ہے، اور رذائل، فواحش، منکرات، معاصی اور صفات ذمیمہ سے بچنے اور تبلیغ کی راہ کے خطرات و وساوس سے آگاہ فرمایا ہے، اس کو پڑھ کر ایمان و یقین اور فکر آخرت میں اضافہ، دین کی جانب رغبت، اس کے لیے قربانی کا جذبہ اور تبلیغ دین کے لیے گھر سے نکلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، مکتوبات میں ایک مولانا محمد علی جوہرؒ کے نام ہے، اس سے مولانا محمد الیاسؒ کی نگاہ میں ان کی عظمت کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یوروپین اقوام میں تبلیغ اسلام کے لیے مولانا محمد علیؒ کو سب سے زیادہ اہل اور موزوں سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کی طرح غیر اقوام کو بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے مضطرب رہتے تھے، اس مجموعہ میں دعوت و تبلیغ کے تعلق سے دین کے مختلف ارکان، اعمال اور اشغال کے متعلق گوناگوں مفید باتیں اور بہت سے علم و تجربہ پر مبنی نکتے بھی بیان ہوئے ہیں، اس لیے ہر مسلمان کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے، اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے تو یہ زریں ہدایت نامہ ہے، جیسے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے بقول ہمیشہ پیش نظر رکھنا اور باہم مذاکرہ کرتے رہنا چاہیے، البتہ مولانا نے یہ ارشادات مختلف مجلسوں میں اور مختلف اشخاص کے سامنے فرمائے تھے، اس لیے ان میں جا بجا تکرار ہے، مگر اس کی حیثیت تذکر کی ہے، مولانا افتخار فریدی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس کتاب کو مرتب کرکے اس کی افادیت کو عام کر دیا ہے، امید کہ جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا تو اس کی بعض عبارتوں میں جو غموض و خفا ہے، اور بعض جملوں میں سابقہ و لاحقہ کی جو بے ترتیبی ہے، وہ دور کر دینے کی کوشش کر دی جائے گی۔

"ض۔ ع"

فرائد قاسمیہ، مرتبہ مولانا حافظ سید عبد الغنی پھلاودی، متوسط تقطیع، کتابت و طباعت بہتر، کاغذ قدرے بہتر، صفحات ۲۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: ادارہ ادبیات گلی قاسم جان، دہلی ۶۔

مولانا حافظ سید عبد الغنی پھلاودی (م ۱۹۳۲ء) ایک صاحب علم و عمل اور جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، ان کو مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت عقیدت و محبت تھی، اس لیے اپنے کتب خانہ میں ان کی تمام مطبوعہ کتابوں کے علاوہ غیر مطبوعہ تحریروں کا بھی ایک ذخیرہ "فرائد قاسمیہ" کے نام سے بڑی تلاش و محنت سے جمع کیا تھا، ان کے پوتے مولانا عبد المغنی نے جب مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کو اپنے جد بزرگوار کا کتب خانہ دکھایا جو اچھا علمی ذوق رکھنے کے علاوہ اکابر کے مکتوبات، ملفوظات، ارشادات اور منقولات وغیرہ کو سلیقہ سے مرتب کرنے اور ان کی دلنشین تشریح و ترجمانی کا بھی خاص ملکہ رکھتے ہیں تو ان کی نظر اس ذخیرہ پر بھی پڑی، اور انھوں نے اس کے چند قیمتی حصوں کو چھوڑ کر اس پورے مجموعہ کا عکسی فوٹو شایع کیا ہے، "فرائد قاسمیہ" کی اکثر تحریریں کسی شک و شبہہ یا استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں، ان میں بعض مکاتیب کی صورت میں ہیں، ان سب میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، عقائد اور معقولات کے مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، بعض تحریروں میں عیسائی پادریوں کا جواب دیا گیا ہے، اور بعض شیعوں کے رد میں ہیں، بعض میں قرآن و حدیث کے تعارض کو رفع اور بعض اشکالات کو حل کیا ہے، اس طرح یہ مجموعہ گوناگوں علمی و دینی مباحث پر مشتمل ہے، اس کا ابتدائی حصہ اردو میں اور آخری فارسی میں ہے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے دور کے متبحر عالم اور مشہور متکلم و مناظر تھے، اس مجموعہ سے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، شروع میں مولانا نسیم احمد فریدی کا مفید اور جامع مقدمہ ہے، اس میں "فرائد قاسمیہ" کے مباحث کا اجمالی تعارف، مولانا پھلاودی، مولانا نانوتویؒ اور اُن سب حضرات کا مختصر تذکرہ ہے، جن کے نام کے

خطوط اس مجموعہ میں درج ہیں۔ ایسے نادر مجموعہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، اس کے لیے مولانا زیدی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یادگار وحشت:۔ مرتبہ جناب اسحٰق راشد صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، بلا قیمت، پتہ:۔ ڈاکٹر محمد بلال کنوینر وحشت صدی ۱۰۲ رپن اسٹریٹ کلکتہ۔

گذشتہ برس کلکتہ میں سید رضا علی وحشت، کلکتوی کے قدر دانوں نے ان کا صد سالہ جشن منایا اور اس موقع پر یہ یادگار مجلہ بھی شایع کیا، اس کے شروع میں وحشت کے فوٹو، غیر مطبوعہ خطوط نشان خط کا نمونہ اور مختصر خود نوشت حالات درج ہیں، گو یہ مجموعہ مختصر ہے، اور بعض مضامین ہلکے پھلکے ہیں، تاہم کلام وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو" از ل احمد اکبر آبادی" رنگ وحشت" از آغا رشید مرزا دہلوی، "چند یادیں کچھ تاثرات" از رضا مظہری، "میر کارواں وحشت" از شانتی رنجن بھٹا چاریہ، اور "وحشت مرحوم اور ان کی مہارت فن" از تمنا عمادی اچھے اور مفید مضامین ہیں، ان میں وحشت مرحوم کے ضروری حالات، ادبی زندگی، شاعرانہ کمالات اور بعض قومی خدمات کا ذکر ہے، آغا رشید مرزا دہلوی کے مضمون سے ان کے اچھے ادبی ذوق اور حسن تحریر کا اندازہ ہوتا ہے، جمیل مظہری، سالک لکھنوی، شیدا دہلوی، علقمہ شبلی وغیرہ کی شعراء کا منظوم خراج عقیدت بھی درج ہے، اس یادگار مجلہ کے مرتب جناب اسحٰق راشد کے مختصر تمہیدی مضمون میں تغزل کی لطافت و دل آویزی کے علاوہ اس صدی کے نصف اول کے بعض اکابر غزل گو شعراء کی عظمت کا ذکر ہے کہ انھوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی اردو غزل پر پھبتی اور غزل گوئی کے خلاف ترقی پسند و جدیدیت کی مخالفانہ مہم کے باوجود اسے اردو شاعری کی آبرو سمجھا ہے، انھوں نے آخر میں وحشت کے سو منتخب اشعار بھی دیے ہیں، جناب وحشت اردو کے ممتاز غزل گو شاعر تھے، اس لحاظ سے ان کی یادگار میں شایع ہونے والے مجلہ کو زیادہ وقیع ہونا چاہیے تھا اور اس میں کلکتہ سے تعلق رکھنے والے اہل علم کی نگارشات ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے تھا، تاہم یہ یادگار مجلہ بھی سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے اور فائدہ سے خالی نہیں۔ "ض"

جلد ۱۲۹ ماہ رجب سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۸۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات

پشاور یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر محمد اشرف خان نے اپنی تصنیف سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت کی دو۲ جلدیں دارالمصنفین کو کیا بھیجیں کہ وہاں بیٹھ کر یہاں کے لوگوں کے لیے روحانی انبساط و نشاط کا ایک خوانِ یغما بچھا دیا ہے۔

ان دونوں جلدوں میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صوفیانہ اور عارفانہ تعلیمات ہیں، وہ دارالمصنفین کے قیام میں اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی نظروں میں ایک بے مثال عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک بے عدیل سیرت نگار، ایک غیر معمولی متکلم اسلام، ایک دیدہ ور مورخ اور ایک نامور ادیب و انشا پرداز رہے، ان کی وجہ سے دارالمصنفین کا یہ دور افتادہ گوشۂ عافیت علم و فن کا ایک حصن حصین بن گیا تھا، وہ جب اپنے آخری ایام زندگی میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے تو ان میں عظیم انقلاب آیا جس سے دارالمصنفین کو سلوک و معرفت کا بھی چشمۂ حیوان بننا چاہیے تھا، مگر یہاں کے لوگ ظلمات کو طے کر کے اس کے آب حیات کو نہ پا سکے، لیکن اس کے امرت دھارا سے سب سے زیادہ سیراب کراچی کے جناب غلام محمد صاحب اور پشاور کے پروفیسر محمد اشرف خان صاحب ہوئے، جناب غلام محمد نے جو کچھ حاصل کیا، اس کو تذکرہ سلیمان" میں منتقل کیا، پروفیسر محمد اشرف خان نے اپنے مرشد کے یہاں سے سلوک و طریقت کا جو آب زلال پایا، اس کو اپنی تصنیف سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت میں لنواز عرفانی جو بار بنا دیا ہے،

یہ دونوں جلدیں ہاتھ میں آئیں تو ندامت سے گردن جھک گئی کہ جو کام دارالمصنفین کے اندر ہونا چاہیے تھا وہ یہاں سے دور اس برصغیر کے سرحدی علاقہ پشاور میں انجام پایا ع تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے۔

اس شرم کے باوجود کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس میں رشد و ہدایت کا خزانۂ عامرہ کھلا ہوا ہے، روحانی معلومات کے سیم و زر کا انبار لگا ہوا ہے، سلوک و معرفت کی مے ارغوانی کے شیشہ و ساغر کھنکھناتے ہوئے دل و جان کو سرشار کر رہے ہیں، اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف کے انداز بیان میں ان کے مرشد کے اسلوب نگارش کی جھلکیاں ہیں، پھر حضرت سلیمان اشرفی کو راہ سلوک میں جو کیف آگینی حاصل تھی، وہ خود مصنف کی ذات میں سرایت ہو کر اس کتاب کی ہر سطر اور ہر لفظ میں منتقل ہو گئی ہے

اس کتاب میں جان اس لیے بھی پڑگئی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت سید سلیمان اشرفی سے دبے نظر نہیں آتے، یعنی اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کوئی مرتاض زاہد یا گوشہ گیر عابد یا کسی خانقاہ کے سجادہ نشین کے افادات و ملفوظات نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے محقق اسلام کی تعلیمات ہیں جن کی تحریروں میں کبھی ابن تیمیہؒ، کبھی ابن قیمؒ، کبھی غزالیؒ، کبھی مجدد سرہندیؒ اور کبھی شاہ ولی اللہؒ کے جلوے نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنی آخری زندگی میں واردات، انتخاب شیخ، بیعت، صفات الٰہی، مراقبات، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، فنا، عبدیت، اجتباء، انابت اور طلب و وصول کے متعلق جو تعلیم دی، وہ محض رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ ایک جید سیرت نگار کی بھی سوچی سمجھی ہوئی تعلیم ہے۔

یہ تعلیم ان کے لیے بھی چراغ راہ ہے جو تصوف کو غیر اسلامی اعمال و اشغال اور غیر شرعی بدعات، مکاشفات اور مجاہدات کا مجموعہ سمجھ کر اس کو نظر انداز کرتے ہیں، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ صحیح حدیث میں احسان کے ذریعہ جس طرح مذہب کی روح پیدا کی گئی یا اخلاق میں جو جان ڈالی گئی یا ایمان میں جو کمال پیدا کیا گیا، وہی تعلیم حضرت سید صاحبؒ نے تصوف کے ذریعہ دی یعنی حقیقی اور شرعی تصوف دین کی روح، اخلاص فی اللہ اور علم حصول تقویٰ کا نام ہے، یہ تو افلاطونی نظریہ، اشراقی حکمت، رواقی دستور، مشائی عقیدہ، ہندی ویدانت اور مسیحی رہبانیت سے بالکل الگ چیز ہے، اگر اس میں احکام الٰہی کی تعمیل و تکمیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جمیل کی جلوہ سامانیوں کی ضیا پاشیاں نہ ہوں تو یہ تصوف نہیں کچھ اور چیز ہے۔ اسلامی تصوف میں جمال نبوی ہی سے دین میں روح، ایمان میں جان اور قلب میں تزکیہ پیدا ہوتا ہے، ایک سیرت نگار کی تعلیم یہی اور صرف یہی ہو سکتی تھی۔

حضرت سید صاحب کی اسی تعلیم کی روح پرور شرح اس کتاب کی دونوں جلدوں میں ہے، اس کی اشاعت سے پہلے اسی عنوان سے مصنف کی کچھ تحریریں پڑھ کر مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے تحریر فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ اشرفی سلوک سلیمانی قالب میں قلم اشرف سے اشرف السلوک ہی ثابت ہوگا، اسی زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی لکھا تھا کہ نام کے اشرف کام کے لحاظ سے بھی اشرف نکلے، جس کسی کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملے گا، وہ ان دونوں بزرگوں کی رائے سے صرف اتفاق کریگا بلکہ اس کو غیر شعوری طور پر یہ بھی احساس ہوگا کہ اگر کسی کو اخلاص دین، اخلاق باطن، تہذیب نفس، صفائی روح اور تعلق مع اللہ تعالیٰ کی تعلیم کی تلاش ہو تو اس کو اس کتاب میں ضرور مل جائے گی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ ع از سلیمان گیر اخلاص عمل۔
اسی اخلاص عمل کی تعلیم و تلقین کے آبدار موتی اس کتاب کی ہر سطر میں جھلملاتے نظر آتے ہیں، یہ مختصر تحریر کتاب کی رسید کی خاطر

لکھی جارہی ہے، ان شاء اللہ معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں اس پر طویل تبصرہ ہوگا۔

یو۔پی کی حکومت کی طرف سے اردو کو اس ریاست میں اسی طرح سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا ہے، جس طرح بہار میں یہ بنائی گئی ہے، تقریباً پینتیس ۳۵ برس کے گریہ زاری کے بعد اردو بولنے والوں کو یہ عنایت حاصل ہوئی، جب اپنا حق منوانے کی قوت اور صلاحیت ہی نہ ہو تو جو بھی رعایت حاصل ہو جائے اس کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، یو۔پی میں اردو کا حق تو یہ تھا کہ تعلیمی اداروں میں کسی نہ کسی درجہ تک اس کی تعلیم لازمی قرار دی جاتی، مگر اپنی مجبوری اور بے چارگی میں اسی کو غنیمت تصور کر لینے پر قناعت کر لینا چاہیے کہ کم از کم اردو کو سرکاری درجہ تو دے دیا گیا ہے، اب یہ ریاست سے شاید دربدر نہ ہو سکیگی، اس خسروانہ مراحم کی مزید تفصیلات کا انتظار ہے، معتبر ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت بہار نے اردو دو سال پہلے کو سرکاری زبان تو تسلیم کر لیا ہے لیکن اس کے کاغذی اعلان پر اب تک عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے، خدا کرے کہ یو۔پی میں یہ صورت پیش نہ آئے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے سابق پروفیسر جناب عبدالمنان بیدل کی وفات گذشتہ اپریل میں ہوگئی، انھوں نے تقریباً نوے ۹۰ سال کی عمر پائی، وہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ اپنی زندگی میں اپنے شاگردوں کو علم و ادب میں بڑی شہرت حاصل کرتے دیکھا، بڑے شفیق استاد تھے، اس خاکسار کو بھی ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی، اپنے زمانہ میں فارسی کی نصابی کتابیں انگریزی لباس پہن کر انگریزی زبان میں پڑھاتے وقت اس مشرقی زبان میں مغربی رنگ پیدا کر دیتے، بڑے اچھے شاعر بھی تھے، بیدل تخلص کرتے، مشاعروں میں اپنے ترنم سے اپنی شاعری میں دلنوازی، دل ربائی اور دل نشینی کی ساری کیفیت پیدا کر دیتے، آخر عمر میں مذہبی رنگ بھی زیادہ غالب ہوگیا تھا، زائرین حج کی خدمت مختلف حیثیتوں سے کرتے رہے، استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے سفر حج میں ساتھ تھے، سلیمان نمبر میں ان کا ایک پُر کیف مضمون "سفر حجاز کے تاثرات" کے عنوان سے شایع ہوا، گذشتہ اگست میں ان کو حکومت ہند کی طرف سے فارسی کی سند کا ایوارڈ بھی ملا، لیکن حکومت کی یہ جوہر شناسی اس وقت ہوئی جب ان کے بہت سے شاگردوں کو ان سے پہلے اس اعزاز سے نوازا جا چکا تھا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں۔ آمین۔

مقالات

مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور

طریقۂ کار کا تجزیہ اور اصلاحِ حال کی راہ

از پروفیسر خلیق احمد نظامی

ہر قوم کی حیاتِ اجتماعی کی ایک روح ہوتی ہے، جس کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی تاریخ یا تمدن کی بنیادی حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں، مستشرقین نے اسلام کی تاریخ اور تہذیب کی تحقیق میں بہتم بالشان کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر اس کی داخلی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، اس ناکامی کے اسباب کی توجیہ اس وقت ممکن ہے جب ان عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا جائے جن کے زیرِ اثر مستشرقین نے تاریخِ اسلام پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی اور اس کے مذہبی افکار اور تمدنی اداروں کی نوعیت کو سمجھنا چاہا تھا، یہ محرکات کبھی مذہبی عصبیت کا سہارا لیتے تھے، کبھی مقتضائے سیاست سے ان کا رخ متعین ہوتا تھا، کبھی معاشی دور اندیشی، علمی جد و جہد کا پیکر اختیار کر لیتی تھی، مذہب، سیاست اور معاشیات کی اس تگ و دو میں خالص علمی اور تحقیقی کوششوں کی کیفیت گریزپا نظاروں کی سی رہتی تھی، اگر تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو مستشرقین کی تحقیقی جد و جہد کے پانچ دور سامنے آئیں گے۔

پہلا دور

(۱) اسلام اور اس کے تہذیبی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ مغرب اُس وقت بیدار ہوا تھا جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا تھا، یہ صرف ملک یا ایک جزیرہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آ دور کا آغاز تھا، ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر میسی نیون[1] تہذیبی اعتبا یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے امکانات پیدا کر دیے، عربوں کے علوم کو حا کرنے، ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی علمی سربلندی کا راز دریافت کرنے کا جذ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے، عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور گو پیغمبر اسلامؐ کے متعلق ج گفتگو کرتے تو اپنے متعصبانہ جذبات کو چھپا نہ پاتے تھے، لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریع علمی سربلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی، ۱۱۳۰ء میں طلیط کے ایک فاضل ڈریمونڈ نے ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کا قائم کیا، اس محکمہ میں بہت سے یہودی عالم شامل تھے، ۱۱۵۰ء میں طلیطلہ ہی کا ایک یہودی ابراہیم بن عذرا، انگلستان پہونچا اور علوم اسلامی کے مطالعہ کی ضرورت اور افادیت پر توجہ اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں نے جن کی زبان عبرانی تھی عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل کی، ا عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا، گیرڈ ڈی کریمونا دم ۱۱۸۷ء (Gerarddi Crimona) نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا، اسی زمانہ میں یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درسگاہو میں تحصیل علم کے لیے آنے شروع ہوئے، بارہویں صدی کے ان علماء میں ایڈیلرڈ (Adelard) ...

[1] روزگار نقیر۔ نقیر سید وحید الدین، ص ۱۳۶۔

ں طور پر قابل ذکر ہے، اس نے انگلستان میں نہ صرف عربی علوم کی حمایت میں بہت کچھ لکھا، بلکہ متعدد ی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ڈینیل آف مارلے (Daniel of Marley) نے اسپین پہونچ کر عربوں درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی، میکل اسکاٹ (Michael Scott) نے سسلی میں اسلامی م کی تحصیل کی اور پھر ارسطو کی تصانیف کا عربی سے ترجمہ کرنے میں عمر گذار دی، کلیسا نے بھی عربی علوم افادیت کو محسوس کیا اور پوپ جان (Pope John XXII) نے ۱۳۲۵ء میں ک منشور کے ذریعہ اپنے نمایندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبہ کی نگرانی میں غفلت نہ برتی جائے۔[1]

ایڈیلرڈ نے اپنی کتاب "مسائل طبیعیہ" (Natural Questions) میں عربوں کے احسانات کا بھی ذکر کیا ہے جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی، عربوں نے یورپ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح حاصل ہے، یورپ کا دور احیائے علوم (Renaissance) اسی اصول کا شرمندۂ احسان تھا۔ آنے والی صدیوں میں اسی پر عمل پیرا ہو کر یورپ نے علمی دنیا کی سربراہی کا راز پایا اور وہ عظیم الشان علمی کارنامے انجام دیے جنھوں نے اس کو علمی فضیلت کی صف اول میں پہونچا دیا، اقبال نے اسی دور کے عربوں کے کارناموں کے پیش نظر کہا ہے ؎

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند

---

۱ انگلستان اور عربی علوم و فنون۔ برنارڈ لیوس کی تقریریں، ص ۵ ـ ۴

پہلا دور (۱) اسلام اور اس کے تہذیبی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ مغرب میں
اس وقت بیدار ہوا تھا جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا تھا، یہ صرف ایک
ملک یا ایک جزیرہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آفریں
دور کا آغاز تھا، ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر میسی نیون[1] تہذیبی اعتبار سے
یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے امکانات پیدا کر دیے، عربوں کے علوم کو حاصل
کرنے، ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی علمی سربلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ
اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے، عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات،
نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور گو پیغمبر اسلامؐ کے متعلق جب
گفتگو کرتے تو اپنے متعصبانہ جذبات کو چھپا نہ پاتے تھے، لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریعہ
علمی سربلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی، ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ
کے ایک فاضل ڈریمونڈ نے ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کیلئے
قائم کیا، اس محکمہ میں بہت سے یہودی عالم شامل تھے، ۱۱۵۰ء میں طلیطلہ ہی کا ایک یہودی عالم
ابراہیم بن عذرا، انگلستان پہونچا اور علوم اسلامی کے مطالعہ کی ضرورت اور افادیت پر توجہ دلا
اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں نے جن کی زبان عبرانی تھی عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل کی، اور
عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا، گیرارڈ ڈی کریمونا (م ۱۱۸۷ء)
(Gerarddi Crimona) نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا عربی
لاطینی میں ترجمہ کیا، اسی زمانہ میں یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درسگاہوں
میں تحصیل علم کے لیے آنے شروع ہوئے، بارہویں صدی کے ان علماء میں ایڈیلرڈ (Adelard) کا

[1] روزگار فقیر - فقیر سید وحید الدین، ص ۱۳۶ -

...طور پر قابل ذکر ہے، اس نے انگلستان میں نہ صرف عربی علوم کی حمایت میں بہت کچھ لکھا، بلکہ متعدد
...کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ڈینیل آف مارلے (Daniel of Marley) نے اسپین پہونچ کر عربوں
...درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی، میکل اسکاٹ (Michael Scott) نے سسلی میں اسلامی
...کی تحصیل کی اور پھر ارسطو کی تصانیف کا عربی سے ترجمہ کرنے میں عمر گذار دی، کلیسا نے بھی عربی علوم
...افادیت کو محسوس کیا اور پوپ جان (Pope John XXII) نے ۱۳۲۵ء میں
...منشور کے ذریعہ اپنے نمایندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبہ کی نگرانی میں
...غفلت نہ برتی جائے۔

ایڈیلرڈ نے اپنی کتاب "مسائل طبیعیہ (Natural Questions) میں عربوں کے
...ان احسانات کا بھی ذکر کیا ہے جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی، عربوں نے
یورپ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح
حاصل ہے، یورپ کا دور احیائے علوم (Renaissance) اسی اصول کا شرمندۂ احسان تھا[1]
آنے والی صدیوں میں اسی پر عمل پیرا ہو کر یورپ نے علمی دنیا کی سربراہی کا راز پایا اور وہ عظیم الشان
علمی کارنامے انجام دیے جنھوں نے اس کو علمی فضیلت کی صف اول میں پہونچا دیا، اقبال نے اسی
دور کے عربوں کے کارناموں کے پیش نظر کہا ہے ؎

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند

---

[1] انگلستان اور عربی علوم و فنون۔ برنارڈ لیوس کی تقریریں، ص ۵ – ۴

دوسرا دور | (۲) مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے گو بعض مستشرقین جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے صلیبی جنگ کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی علمی جدو جہد کا مرکز اسلام نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے وہ علوم و فنون تھے جن کے حصول میں انھوں نے کسی تعصب کو قریب نہیں آنے دیا۔ مولانا شبلیؒ نے اس دور کے مستشرقین کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "یورپ کی فیاض دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ ربائی شروع کردی[1]" لیکن اس فیاضی کا تعلق غیر مذہبی لٹریچر سے تھا، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، صلیبی جنگ کے بعد مستشرقین کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں بنیادی تبدیلی رونما ہوگئی، اب اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ اور اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا جو ان کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آگیا ہو، انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کا رخ اسلام کو غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، اس لیے کہ اسی میں ان کو عیسائیت کی مدافعت کی راہ نظر آتی تھی، کتنے ہی غلط اور بے بنیاد الزام تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اس دور میں تراشے گئے، اور ان کو شہرت عام دے دی گئی، حضرت عمرؓ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا حکم اسی زمانہ میں مستشرقین نے وضع کیا اور اس کو اس طرح مشہور کیا کہ اپنے پرائے سب کو اس کی صداقت پر یقین آگیا، اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے ان کے متعلق گمراہ کن خیالات کو قومی گیتوں میں اس طرح سمو دیا کہ یہ جنگی معرکوں میں رجز کے طور پر گائے جانے لگے، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ جب کسی شخص کو عیسائی بنایا جاتا تھا تو یہ خیالات عقائد کے طور پر اس کو سکھائے جاتے تھے۔

---

[1] مقالات شبلی ج ۵ ص ۵۰۔

مستشرقین نے اسلام کی جو غلط تصویر اس دور میں پیش کر دی تھی وہ مدتوں تک یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہا۔

تیسرا دور (۳) مستشرقین کی علمی جد و جہد کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا۔ اب یوروپین اقوام نے مسلمان ملکوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنی شروع کر دیں۔ ان حالات میں اسلام کی طرف کھلا ہوا دشمن سیاسی مصالح کے منافی نظر آنے لگا۔ ان ملکوں پر اقتدار کے مضبوط پنجے جمانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک پیچ و خم ان کے افکار و احساسات کی ایک ایک خلش اور ان کے سماجی رجحانات اور دینی شعور کے ایک ایک نشیب و فراز کا پتہ لگایا جائے۔ محکوم کے دل و دماغ تک پہونچے بغیر حکمراں کی کوئی ساحری کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یوروپین ممالک نے سب سے پہلے اپنی یونیورسٹیوں اور اداروں کی طرف دیکھا اور ہمت افزا جواب پایا۔ سترہویں صدی میں کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا اور اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے۔ آکسفورڈ کے عربی پروفیسر ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) نے حلب سے عربی مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے حاصل کیے اور انجیر کے ایک درخت کے سایے میں جو وہ شام سے لایا تھا (اور جو اب تک وہاں موجود ہے) عربی تصانیف کے خلاصے کرنے شروع کر دیے تاکہ مسلمانوں کے ملی مزاج اور علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ جارج سیل (George Sale) نے اسی زمانہ میں قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا، یوروپی زبانوں میں قرآن کا یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا۔ استشراق کی یہ لہر جو مقتضیات سیاسی نے تیز تر کر دی تھی یورپ میں اس طرح پھیلی کہ ہر ملک مسلمانوں کی زبان، تاریخ اور مذہب کی تحقیق میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

جرمنی میں ریسکے (م ۱۷۷۴ء) (Reiske) سوئٹزرلینڈ میں بورہرڈ (م ۱۸۱۷ء) (Burkhard)
فرانس میں سلویسترڈی ساسی (Sylvestre de Sacy) ہالینڈ میں ڈوزی (Dozy)
انگلستان میں رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) نے اسلامی تاریخ اور ادب پر تصانیف
کے انبار لگا دیے برکہارڈ (Burkhard) نے تو مسلمان بن کر شام اور حجاز کا سفر کیا، پیرس، میڈرڈ،
برلن، لندن، لائڈن، آکسفورڈ کے علوم مشرقی کے شعبوں میں اسلام پر تحقیقی کام میں غیر معمولی دلچسپی کا
اظہار ہونے لگا۔ نپولین نے ۱۷۹۸ء کے بعد مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کر دیا،
انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے نادر قلمی نسخے لندن پہونچا دیے، انڈونیشیا
ہندوستان، ایران، مصر، شام، عراق کے کتنے ہی انمول موتی جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقول اقبال
"دل سی پارہ ہوتا ہے" یورپین کتب خانوں کی زینت بن گئے۔ نپولین نے وقت کے اشاروں
کو سمجھا اور ازہر کے ساٹھ علماء کے سامنے اسلام سے اپنے احترام کا اعلان کیا اور اپنے نائب
کلیبر (Kleber) کو ہدایت کی کہ حکومت کے معاملات میں مسلمانوں کے مذہبی طبقوں کا تعاون
حاصل کرے[1]۔ یہ سب سیاست کے تقاضے تھے جن کا اظہار آکسفورڈ سے لے کر ازہر تک مسلسل
ہوتا رہا تھا۔

اس زمانہ میں صلیبی دور کا کھلا ہوا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا، لیکن مقصد کے نشتر
تیز تر ہو گئے، اب ساری جد و جہد کا رخ اس طرف تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے ایسے
احساس کمتری میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ میں ہدایت و رہبری کے لیے مغرب کی طرف
دیکھنے پر مجبور ہوں، تشکیک اور شبہات کے ذریعہ ان کے قوائے ذہنی کو اس طرح مفلوج کر دیا جائے
کہ وہ نہ صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں، نہ صحیح زاویۂ نگاہ سے چیزوں کا جائزہ لے سکیں، پست

---

[1] Thiry, Bonaparte en Egypte p. 434.

پلائے ہوئے انسان کی طرح نہ اعضائے جسمانی ان کے قابو میں ہوں نہ قوائے ذہنی پر ان کا بس چلے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے متعلق مستشرقین کے کام کے دو پہلو خاص طور پر جاذب توجہ نظر آتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے والے بہت سے مصنفین فوج سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً ریورٹی (Raverty)، برگس (Briggs)، اسکاٹ (Scott)، ڈاؤ (Dow)، ڈیوی (Davy)، دوسرے یہ کہ سیاسی مقاصد کے پیش نظر مسلمانوں کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی وہ شگفتگی برقرار نہ رہ سکے جو صدیوں تک ان کی سماجی زندگی کی خصوصیت رہی تھی، سر ہنری ایلیٹ نے یہ کام آٹھ ضخیم جلدوں میں انجام دیا، ہمیں ایلیٹ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک یادداشت (Memorandum) میں انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا، اس یادداشت کو بعد میں کتاب کا جزو بنا کر شائع کر دیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دستاویز ہے جو ان کے مفسدانہ مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح مصر کے متعلق یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نپولین کے بیشتر مددگار اور ترجمان فرانس کے مشہور مستشرق سلوسٹر دی ساسی کے شاگرد رشید تھے، اور جب دی لیسپس (de Lesseps) نے نہر سوئز کو جاری کیا تھا تو اس کے عزائم کو کامیاب بنانے میں کتنے ہی فرانسیسی مستشرقین کی بے تاب تمنائیں کام کر رہی تھیں۔

اس دور کے مستشرقین نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام و دہن کو تلخی محسوس نہیں ہوئی، لیکن زہر رگ و پے میں اتر گیا۔

چوتھا دور (۴) جب نوآبادیاتی نظام کا دم واپسیں شروع ہوا اور اسلامی ممالک میں آزادی کی

تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو مستشرقین کے انداز تحقیق اور طریقۂ کار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگئی۔ نوآبادیوں کی آزادی کو ٹالنا اب ممکن نہ رہا تھا، لیکن ان سے بے تعلق ہو جانا ملک کے سیاسی اقتدار پہ ضرب کاری کے مترادف تھا، چنانچہ اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لیے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوگیا، دولت برطانیہ نے اپنی نوآبادیوں سے دستبردار ہونے میں پس و پیش نہیں کیا، لیکن تمدنی سرمایہ کو (جو آج بھی کتابوں اور آثار کی شکل میں انگلستان کی زینت بنا ہوا ہے) واپس کرنے سے انکار کر دیا، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس دور کے مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں میں رنگِ احترام آگیا، اقبال نے سنہ ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر مسی نیون سے کہا کہ "مغرب کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے وہ وقت گذرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے، اور اسلام کی صداقت اور حقیقت ان پر آشکارا اور واضح ہوتی جا رہی ہے" تو مسی نیون نے ان کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ فکر کی یہ تبدیلی مقصد بدل جانے کا نتیجہ تھی، اب سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بظاہر اپنے انداز تحقیق میں اسلام کے ساتھ احترام کا برتاؤ کیا جائے، مبادا سیاسی آزادی کی تحریکیں مغرب کی ذہنی غلامی سے بغاوت کا رنگ اختیار کرلیں، لیکن دوسری طرف ایسے فتنوں کو خاموشی سے بیدار کر دینے کی جستجو شروع ہوگئی جن سے مسلمان ممالک افتراق اور انتشار کا شکار بنے رہیں، اور ملی وحدت کی پرچھائیاں بھی ان کے ذہن پر نہ پڑنے پائیں۔ اس دور کے مستشرقین اپنے ملکوں کی وزارت خارجہ کے مشیر بن گئے، اور ان کی تحقیق اگر ایک طرف مغربی حکومتوں کی خارجی پالیسی کا رخ متعین کرنے لگی تو دوسری طرف ان علاقوں میں خیالات کی تبدیلی لانے کے لیے وزارت خارجہ ان مستشرقین سے مدد لینے لگی، جو کام کبھی سپاہیوں کے ذریعہ

---

[1] روزگار فقیر ص ۱۳۵۔

انجام پاتا تھا، اب پروفیسروں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں اسکاربرو رپورٹ (Scorbrough
Report) تیار ہوئی جس کو بجا طور پر Charter of Modern Orientalism[1]
(استشراق جدید کا منشور) کہا جا سکتا ہے، اس رپورٹ میں اس بات کا شدید احساس ملتا ہے کہ
اگر نئے ابھرتے ہوئے مشرق کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا تو برطانوی مقاصد بری طرح متاثر
ہوں گے۔ ان مقاصد کو World Peace (امن عالم) کا معصوم نام دیا گیا ہے لیکن سامراجی
جذبات افکار کا نیا چولہ بدل کر اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے جھانکتے نظر آتے ہیں
ایچ۔ اے۔ آر گب (H. A. R. Gibb) نے Modern Trends in Islam
میں نئے انداز سے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے، اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں
کے پیش نظر علوم اسلام پر نظر ڈالی ہے۔

پانچواں دور (۵) مستشرقین ابھی اسی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے کہ
اسلامی ممالک میں زرسیال کے چشمے ابل پڑے اور دنیا کا مرکز ثقل عرب ممالک کی طرف منتقل
ہوگیا، مستشرقین کے حاشیۂ خیال میں بھی ایسی صورت نہ تھی، اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی
کے خیال نے ان کی استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ نئی صورت حال کے
امکانات ان کے لیے تشویش بلکہ توحش کا باعث بن گئے۔ اقتصادی اعتبار سے ان حالات سے
فائدہ اٹھانے کی کوشش برابر جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ قرون اولیٰ کے اسلام کے مطالعہ
سے بے توجہی برتی جا رہی ہے، اب مستشرقین کی دلچسپی جدید مذہبی تحریکات، سماجی رجحانات
اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے، اور فکر اسلامی کی توجیہ اور تعلیل

---

[1] A. J. Arberry, Oriental Essays. p. 241

زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے تجزیے کی طرف توجہ ہے، قومیت (Nationalism) کے وہ عناصر جو عربوں کی وحدت ملی کے تصورات کو پارہ پارہ کر سکتے ہیں، اب توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صیہونیت نے مستشرقین کے انداز تحقیق سے خاموش ساز باز کر لیا ہے۔

شاید تاریخ کے کسی دور میں دیار مغرب کے رہنے والوں کو اسلام سے وہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی جو عصر حاضر کا خاصہ بن کر سامنے آئی ہے، حالات کی اس نئی کروٹ نے مستشرقین کو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، ان کا ترکش خالی ہے اور حالات کچھ اور ہی رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں، اس زمانہ میں مستشرقین نے جو کام اسلام پر کیے ہیں، وہ اسلام سے زیادہ خود ان کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں Area Studies کے تصور کو اقتصادیات، سیاست ارضی geopolitics اور عمرانیات (sociology) سے قریب لا کر دینی عناصر کے مطالعہ سے گریز کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں امریکہ میں The Middle East Studies Association of North America قائم ہوئی اور ۱۹۶۷ء میں British Society for Mid-Eastern Studies کا قیام عمل میں آیا، یہ انجمنیں بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی مطبوعات اور رسائل سے ان ذہنی خلشوں کا اندازہ ہو جاتا ہے جن سے مستشرقین اس وقت دوچار ہیں، کبھی Hydropolitics of the Nile Valley (John Waterbury — 1979) کی طرف ان کی نظر جاتی ہے، کبھی Islam and Colonialism: The Doctrine of Jihad in Modern History (Rudolph Peters. Monton 1979 —)

پر غور کرتے ہیں، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں کہ اسلامی فکر کا دھارا اب کس رخ بہے گا۔ اور انھیں کہاں کہاں اور کیا کیا بند باندھنے چاہئیں، ایک جدید ترین کتاب Islam and the West کے مصنف Normal Danial نے مستشرقین کی تصانیف پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ Latin Europe نے اسلام کے خلاف بہت سے غلط نظریات پھیلائے تھے، لیکن اس کی عصبیت اس کو "علمی بددیانتی" تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتی،

یہ ہیں وہ پانچ دور جن میں مستشرقین کی فکر، ان کے مقصد و منہاج، محرکات و محسوسات کی پرورش ہوئی، اور جن کے زیر اثر ان کی علمی کاوشیں وقت اور حالات کا ساتھ دیتی رہیں۔

مقاصد

(۱) افراد کی زندگی میں جو حیثیت حافظہ کی ہے، قوموں کی زندگی میں وہی اہمیت ان کی تاریخ کی ہے، مستشرقین کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیات اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے تاکہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصور کریں تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہو سکے، بقول مولانا شبلیؒ "ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے، بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مردوں پر یورپ کے مردوں نے فتح پالی ہے"[1] اس مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کو علمی اعتبار سے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی فکر کے سوتے خشک ہو جائیں، ان کی خودی ختم ہو تو ان کی گردنوں میں برگساں اور ہیگل سے عقیدت کی زنار ڈالی جائے۔

(۲) ایک ایسے دور میں جب کہ اسلامی ممالک میں معرکۂ سائنس و مذہب برپا تھا اور سائنس کی ایجادات نے ایک ذہنی خلش پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی جد و سعی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ مسلمان

لہ مقالات شبلی ج ۵، ص ۱

سائنس کی برتری تسلیم کرکے اپنے مذہب سے بیزار ہوجائیں، ان کو اپنا قانون، اپنی شریعت، اپنا طرزِ زندگی سب فرسودہ اور بیکار نظر آنے لگے، مسلم پرسنل لا میں تبدیلی اور اصلاح کا آوازہ سب سے پہلے مستشرقین ہی نے بلند کیا تھا، یورپ میں سائنس اور مذہب کا معرکہ جلدی شروع ہوا، اور جلد ہی ختم بھی ہوگیا، مستشرقین نے مشرق میں اس جنگ کو طول دے دیا تاکہ مسلمانوں کو قدم قدم پر اپنے مذہب کے ناقص ہونے کا احساس ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اسلام اس معرکہ میں ناکام ہوچکا ہے۔

(۳) مسلمانوں کے ذہن کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا ان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن جو تو اسے ذہنی کو مضمحل کرنے میں کارگر ثابت ہوں، اقبال کی نظم میں ابلیس کا جو مشیر مسلمانوں کو ان گتھیوں کے سلجھانے کی تلقین کرتا ہے:

ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اس کے پہلو میں مستشرق ہی کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔

(۴) اسلامی تاریخ کے ایسے گوشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر زیر بحث لایا جائے جو مسلمانوں میں اتحادِ ملی کے جذبات کو نشو ونما پانے سے روک دیں، اس مقصد کے پیش نظر مستشرقین نے کتنی ہی عداوتوں کو جو وقت کے ساتھ بے جان ہوچکی تھیں، نئی زندگی بخش دی۔

طریقۂ کار (۱) سب سے زیادہ موثر حربہ جو ان مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا، وہ اسلام کے علمی ذخیروں پر قبضہ تھا، یورپ کے علمی اداروں، قومی میوزیم اور کتب خانوں میں تاریخ اسلام کے سارے ماخذ جمع کردیے گئے، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمان اپنی تاریخ کے ماخذ کے لیے

ین کے مکمل طور پر دست نگر ہو گئے۔

(۲) ایک پُر فریب معروضی نقطۂ نگاہ نے ان علمی کاوشوں کی حقیقی نوعیت کو نظروں سے
ردیا، مثلاً جرجی زیدان نے چار جلد وں میں تمدنِ عرب کی تاریخ لکھی جس میں بظاہر مسلمانوں
سرائی کی، لیکن در پردہ مسلمانوں پر سخت اور متعصبانہ حملے کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی
کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی[1]"

(۳) مستشرقین نے بعض نظریات کو جو بنیادی طور پر غلط اور گمراہ کن تھے اس خود اعتمادی
ت دآہنگی کے ساتھ پھیلایا کہ خود مسلمانوں کو ان کی صداقت پر یقین آگیا۔

چنداں گنہ از بدگمانی می کند نسبت   کز من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

(۴) مستشرقین کا ایک مخصوص طرز استدلال جس کے اثرات تو سب مسلمانانِ عالم محسوس
تھے، لیکن اس کی نفسیاتی مصلحتوں کا احساس بہت کم لوگوں کو تھا، یہ تھا کہ دروغ بیانی
تراؤں کے دفتر جب کھولے جائیں تو موقع بموقع ایسے جملے ضرور کہے جائیں جن سے مسلمان پڑھنے
الو طیش آجائے اور وہ سکون کے ساتھ ان کے پیدا کیے ہوئے مفسدوں کا جواب نہ دے سکیں
سے پہلے مولانا شبلیؒ نے اس طرز استدلال کے نفسیاتی پہلو کو طشت از بام کیا اور لکھا "خود
بھی یہی اثر پڑا ہے، لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش و غضب سے
اٹھائیں[2]۔ سرسیدؒ نے جب میور کی کتاب کو دیکھا تھا تو بقول خود ان کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا
سرسیدؒ یا مولانا شبلیؒ کی طرح جذبات پر قابو پاکر مدلل اور سنجیدہ گفتگو کرنا ہر شخص کے لیے
نہ تھا، چنانچہ بعض لوگوں نے طیش میں آکر مستشرقین کو صرف برا بھلا کہا اور اصل مفسدہ اپنی جگہ
رباقی رہا، بعض نے ان کے بیانات کو ناقابلِ اعتنا قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی، جو

---

[1] مقالات شبلی ج ۴، ص ۱۲۳ [2] مضامین عالمگیر ص ۵۰ ۔

لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی، ان کو "عذر خواہ حامیٔ" (Apologetic Mohammedans) کہہ کر خود ان کی نظروں میں گرا دیا گیا۔ مستشرقین کے طریقۂ کار کے یہ نہایت مؤثر حربے تھے جو موقع اور مصلحت سے استعمال کیے جاتے تھے۔

(۵) مستشرقین کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ جس کے ذریعہ اگر ایک طرف اسلامی علوم کے متعلق معاصرین کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، تو دوسری طرف مسلمانوں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا دروازہ نہ صرف بند ہو گیا ہے، بلکہ صدہا ایسی غلط فہمیاں عام ہو گئیں جن کا دور کرنا آسان کام نہیں،

Encyclopaedia of Islam 'Dictionary of Islam' Bibliotheque Orientale Muslim Theories of Finance

جیسی کتابوں کی اشاعت ہے۔ ان کتابوں کی ترتیب اور تیاری میں جو علمی کاوشیں کی گئی ہیں، وہ اپنی جگہ مسلّم ہیں، اور کوئی دیانت دار مصنف ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کر سکے گا، لیکن ان میں جن نظریات اور افکار کو بین الاقوامی علمیت کا ٹھپا لگا کر رواج دے دیا گیا ہے، ان کی تردید و اصلاح کے لیے بڑا علمی تبحر اور اس سے زیادہ محنت و جانفشانی درکار ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے، اسلام کے فقہی، تمدنی، سیاسی تمام مسائل پر ان تصانیف کو حرف آخر کا درجہ دے دیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھائی اور انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (۱۹۲۳ء) میں کہا: "یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے ٹیگور ڈیلنڈ (Tagore Lectures) کی کتاب کے ذریعہ بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ، اگناڈیز کی عینک سے سمجھے جاتے ہیں، ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں۔"[1]

---

[1] مقالات سلیمان حصہ اول، ص ۴۴-۴۳۔

(۶) مشرقی علوم بالخصوص اسلام کے مطالعہ کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں جو شعبے قائم کیے گئے وہاں مسلمان طلبہ کثیر تعداد میں استفادہ کے لیے جمع ہوئے، یہ طلبہ بعد کو اپنے ملکوں کے اداروں کے سربراہ بنے، مستشرقین کی مقبولیت بڑھانے میں ان طلبہ کا خاص حصہ تھا، ان پر مغربی استادوں کی تعلیم کا ایسا جادو تھا کہ "آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم" کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی اور جن خیالات کی اشاعت خود مستشرقین کے لیے شاید ممکن نہ ہوتی، وہ ان طلبہ کے ذریعہ بہت آسان بلکہ موثر ہوگئی، اگر انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل کے اسلامی ملکوں کے علمی اداروں اور ان پر مستشرقین کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان شاگردوں کے ذریعہ مستشرقین کس طرح اسلامی دنیا کے پورے علمی افق پر چھاگئے تھے۔

(۷) ان شاگردوں کی فکر کو مسلسل اپنے نظریات اور تحقیقات کے حصار میں رکھنے کا کام ان استادوں نے انجمنوں، کانفرنسوں اور رسالوں سے لیا، ۱۷۸۴ء میں سب سے پہلی ایشیاٹک سوسائٹی قائم ہوئی، ۱۷۸۴ء میں سرولیم جونس نے ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، ۱۸۲۱ء میں پیرس ایشیاٹک سوسائٹی وجود میں آئی، ۱۸۲۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۸۴۲ء میں امریکن اورینٹل سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی، ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی فکر میں کوئی خلا ایسا نہ رہنے دیا جائے جس کو وہ اپنے ہی تحقیقی کام سے پُر کرلیں۔

پھر بعض کانفرنسیں ترتیب دی گئیں جن کے مقاصد بظاہر علمی تھے، لیکن جن کے ذریعہ مختلف ملکوں کی وزارت خارجہ کی پالیسیاں بروئے کار لائی جاتی تھیں، بے شمار جریدوں کی اشاعت نے مستشرقین کا علمی رابطہ پوری علمی دنیا سے قائم رکھا، ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلہ میں مستشرقین کی کوششوں کو خراج تحسین ادا نہ کیا جائے، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ان تمام کوششوں کی باگ ڈور دفاتر خارجہ کے ہاتھ میں تھی، اور ان سے بہت سے دوسرے مقاصد بھی حاصل کیے جاتے تھے، مولانا شبلیؒ نے مارگولیتھ کے ذکر میں بڑی صحیح بات لکھی ہے کہ "تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں

خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے۔[1]

مستشرقین اپنے علم کے سہارے اسلامی تہذیب کی روح تک پہونچنے میں تو شاذ و نادر ہی کامیاب ہوئے لیکن ان کی متعصبانہ تیز نگاہی نے اس کی روح کو مجروح کرنے کا سامان ضرور مہیا کر دیا۔

<u>ہندوستان میں ردعمل</u> | ہندوستان میں مستشرقین کے طریقۂ کار اور انداز فکر کے خلاف علی گڑھ، دیوبند، ندوۃ العلماء تینوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں آواز اٹھائی، عجیب اتفاق تھا کہ سب سے پہلا ٹکراؤ اس شخص سے ہوا جو ہندوستان میں مغربی علوم کا سب سے بڑا داعی تھا، جب ولیم میور کی کتاب سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر شایع ہوئی تو اس کی مفسدہ پردازی اور دروغ گوئی پر سرسیدؒ تڑپ اٹھے، ان کا ردعمل ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، انھوں نے لندن میں خطبات احمدیہ تیار کیے اور میور کے ایک ایک اعتراض کا نہایت دندان شکن جواب دیا، سرسید کا آخری مضمون جو انھوں نے وفات سے چند دن قبل لکھا تھا ازواج مطہرات سے متعلق تھا[2] جس میں مستشرقین کے مفسدانہ خیالات کی قلعی کھولی گئی ہے،

مولانا عبدالحلیم شررؔ کا بیان ہے کہ سرسیدؒ کے پاس ایسے مسلمان طلبہ کے خطوط تھے جنھوں نے لکھا تھا کہ اگر یہ خطبات ان کو نہ ملتے تو وہ مذہب اسلام چھوڑ بیٹھتے، سرسیدؒ ان خطوط کو اپنے لیے سرمایۂ آخرت سمجھتے تھے۔[3] اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید یورپ کی تقلید میں پیش پیش تھے، لیکن انھوں نے مستشرقین کے خلاف آواز اٹھانے میں بے پناہ عزم، غیر معمولی جرأت اور حیرت انگیز علمی تبحر کا ثبوت دیا، اور خود مستشرقین کے وضع کیے ہوئے ہتھیار ان کے خلاف

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱، ص ۰، [2] محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اور انسٹیٹیوٹ گزٹ، اپریل ۱۸۹۸ء

[3] سرسید کی دینی بصیرت۔ ص ۹

استعمال کیے۔

ہندوستان میں مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کے خلاف جن علماء نے پیہم جد و جہد کی اُن میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور سید امیر علیؒ کے نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، ہندوستان میں 'مشنری' اور 'مستشرق' کی سازش نے نازک صورت حال پیدا کر دی تھی، میور نے خود لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پادری فنڈر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی تھی، مولانا کیرانویؒ اور مولانا مونگیریؒ نے مشنریوں اور مستشرقین کے اس اتحاد عمل کا مقابلہ کیا اور بڑی ہمت اور استقلال سے بہت سے فتنوں کا سدباب کیا، مولانا کیرانویؒ کی کتابیں ازالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک، احسن الحدیث، اظہار حق، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں، مولانا مونگیریؒ کی کتابوں پیغام محمدی، ساطع البرہان، برہان قاطعہ وغیرہ نے مشنریوں اور مستشرقوں کی سازش کو ناکام بنایا۔

مولانا شبلیؒ مدت العمر مستشرقین کی پیدا کی ہوئی گمراہیوں سے برسرپیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلیؒ نے اس پر پُرزور تنقید کرتے ہوئے کہا: "ہم بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا"[۱] اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا، پادری بروکلی نے تعدد ازدواج پر اعتراضات کیے تو مولانا شبلیؒ کا قلم حرکت میں آیا، جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام بھی مولانا شبلیؒ ہی نے انجام دیا[۲]۔ آرمینیا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہو چکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز، بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، مولانا شبلیؒ نے حقوق الذمیین اور الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر

---

[۱] مقالات شبلی ج ۱، ص ۹۴-۹۶ [۲] ایضاً ج ۴، ص ۱۳۳۔

کردیا، جب سیرۃ النبیؐ پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا، اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۱-۱۲ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا، جن میں مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔[1]

ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن مستشرقین کے افکار اور انداز تحقیق کا گہرا مطالعہ کیا، انھوں نے مسلم نوجوان سے جس کی آنکھیں مغرب اور مستشرق دونوں سے خیرہ ہو رہی تھیں، خاموشی سے کہا ہے

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

اور پھر اس کی خودی اور خود اعتمادی کے گرے ہوئے مینارے اور ٹوٹے ہوئے حصار کی تعمیر میں لگ گئے، اقبال نے مستشرقین کی علمی برتری کا طلسم توڑا، ان کے پُر فریب معروضی نقطۂ نگاہ کو بے نقاب کیا، مسلمانوں کو خود اعتمادی کا بھولا ہوا سبق پڑھایا اور بتایا کہ جدید سائنس مغربی الاصل نہیں ہے، اس کی ابتدا مسلمانوں سے ہوئی ہے، یورپ نے اس کو روح انسانی کے کچلنے کے لیے استعمال کیا، مسلمانوں کو مغربی علوم کے سلسلہ میں "بولہب را حیدر کرار کن" پر عمل کرنا چاہیے، اقبال نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اس ذہنی غلامی اور احساس کمتری سے نجات دلائی جو مستشرقین کی پیدا کی ہوئی تھی اور جس نے مسلمانوں کی فکر کے سوتے خشک کر دیے تھے، انھوں نے اپنے خطبات میں جس طرح مسلمانوں کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کا سوال اٹھایا ہے اور جس طرح علوم مغربی اور مستشرقین کے احساس برتری کو بے جان کر دیا ہے، وہ تاریخ اسلام میں یادگار رہے گا۔

کام کا اعتراف مستشرقین کی سرگرمیوں کی یہ روداد بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ "ہنرش نیز بگو" کے تحت ان کی خدمات کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا جائے، علوم اسلامی پر کام کرنے میں انھوں نے

---

[1] الندوہ، جولائی ۱۹۱۱ء (۲۵ - ۱۸) اگست (۲۶ - ۲۰) نومبر (۲۳ - ۱۵) وغیرہ۔

جس بے پناہ لگن، غیر معمولی انہماک اور مسلسل جد و جہد کا ثبوت دیا اور اپنی پوری پوری زندگیاں مختلف اسلامی علوم اور فنون کے مطالعہ اور تحقیق میں بسر کر دیں اس کو نظر انداز کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا، مولانا ابو الکلام آزادؒ نے مستشرقین کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا: "تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی اور مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آ رہی ہیں"۔ مولانا شبلیؒ نے طبقات ابن سعد، مناقب عمر بن عبد العزیزؒ، تجارب الامم وغیرہ کی اشاعت پر مستشرقین کو مبارکباد دی تھی، اور ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا تھا، تاریخ، جغرافیہ، لغت، طب، فلسفہ، ادب پر قدیم مسلمان علماء نے جو بیش بہا علمی کام کیے تھے اُن کو مستشرقین کے ذوق نے تباہی سے بچایا اور علمی حلقوں تک پہونچایا۔

نکلسن کے متعلق اربری (Arberry) نے ایک بار بتایا تھا کہ مثنوی کا رات دن مطالعہ کرتے کرتے اس کی بینائی جاتی رہی تھی، مارگولیتھ کے متعلق مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں لکھا ہے: "اس نے، مسند امام حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے، اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔"[1] گولڈ زیہر (Goldziher) اور وین سنک (Wensinck) نے احادیث کی ترتیب کی طرف توجہ کی تو حدیث کے سارے ذخیروں کو کھنگال ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ نکلسن، میسی نیون، اربری، گب وغیرہ کی پُر خلوص علمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مستشرقین کی اس لگن اور انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ اور تمدن کے سارے ماخذ ان کے قابو میں آگئے، C.K. Niebuhr کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا سبق آموز ہے، اس نے عرب ممالک میں کچھ قدیم کتبات دریافت کیے تو وہاں کا کوئی عالم ان کو نہ سمجھ سکا۔ جب ان کتبات کی نقلیں جرمنی میں Reinke کو

---

[1] سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۶۹

بھیجی گئیں تو بواپسی ڈاک جواب مل گیا، علمی اعتبار سے قطع نظر اگر محض جذبہ اور ادراک کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسلسل اسلام کے مطالعہ نے ان کی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا تھا، گب جب سورۂ کہف پڑھتا تو اس کے چہرے پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی تھی، گوئٹے (Goethe) قرآن پاک کے متعلق کہا کرتا تھا: "جب میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے" ا ماری شمل کی تصوف اسلام میں غیر معمولی دلچسپی جذبات و احساسات کی گہرائی کی غماز ہے، ایک بار شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریر دیکھ کر ان کے چہرے کی جو رنگت ہوئی اور جس طرح "برکت" کے خیال سے انھوں نے تحریر پر انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اس سے ان کی قلبی کیفیات کا اندازہ ہوتا تھا، بعض اوقات جب مستشرقین کی تنقید میں حد سے زیادہ گرمجوشی دکھائی جاتی ہے تو بے اختیار خسرو کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے، جو انھوں نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

اے کہ طعنہ زبت بہ ہندو بری ہم آموز از وے پرستش گری

راہِ عمل یہ ساری گفتگو بے معنی رہے گی اگر اس سوال پر غور نہ کیا جائے کہ آیندہ کے لیے راہِ عمل کیا ہونی چاہیے؟ محض مستشرقین کی تنقید کو مقصد بنا لینا، یا ان کی علمی بد دیانتیوں پہ نوحہ کرتے رہنا قوائے ذہنی کے اضمحلال کی نشانی ہے۔

(۱) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ علوم اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کیے جائیں، اور دنیا کے ہر گوشے سے جدید سائنسی سہولتوں کو کام میں لا کر اسلامی علوم و فنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کر دیے جائیں، اس منصوبہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے اور جس طرح مولانا سید عبد الحیؒ مرحوم نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند میں ہندوستان کے علمی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے، اسی طرح کے کام ہر ملک میں شروع کیے جائیں، پروگرام

ا؎ روزگار فقیر، ص ۴۲۔

اور دستوری کی کوششیں چراغ راہ کا کام دے سکتی ہیں، لیکن منزل نہیں بن سکتیں، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی محتاجگی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہوگا وہ علمی جدوجہد میں نئی توانائی پیدا کر دے گا۔

(۲) گو یورپ نے اب تک حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، جغرافیہ وغیرہ کے لاتعداد ماخذ شایع کیے ہیں، لیکن ابھی عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں اسلامی تاریخ کے ایسے منابع موجود ہیں جن کی اشاعت سے تحقیق کی گذرگاہیں روشن ہو سکتی ہیں، اس کام کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہیے۔

(۳) اسلامی تاریخ، مذہب اور تمدن کے متعلق ایسی Encyclopaedias تیار کی جانی چاہئیں جن کی معلومات معتبر اور نقطۂ نگاہ معروضی ہو اور جن سے ان تمام غلط نظریات کی اصلاح ہو سکے جو مختلف طریقوں سے پھیلائے گئے ہیں،

جب Encyclopaedia of Islam کے دوسرے ایڈیشن کا کام شروع ہوا تھا تو کچھ مسلمان فاضلوں نے اس کو یہودی مستشرقین کی منظم سازش سے تعبیر کیا تھا، لیکن وہ کام اپنی تکمیل کو پہونچنے والا ہے، اور مسلمان اپنی کوئی ایسی اسکیم اب تک بروئے کار نہ لا سکے اس سے بھی بڑھ کر افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض مسلمان ممالک اسی انسائیکلوپیڈیا کو اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے، حال ہی میں Prof. Mircea Eliade کی نگرانی میں ایک بڑا منصوبہ چودہ[۱۴] جلدوں میں Encyclopaedia of Religion تیار کرنے کا بنایا گیا ہے کیا مسلمانوں کیلئے اس طرح کے منصوبے تیار کرنے اور بروئے کار لانے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان نے مستشرقین کے غلط افکار و نظریات کی اصلاح کے لیے ترکوں کی تاریخ اور تمدن پر ایک بسیط کام کا خاکہ تیار کیا تھا، لیکن ڈاکٹر طوغان کی وفات کے بعد معلوم نہیں اس منصوبے کا کیا حشر ہوا، ایران نے Encyclopaedia Persica کا منصوبہ تیار کیا ہے اور ہر چند کہ احسان یار شاطر کی نگرانی میں

یہ کام ہو رہا ہے، لیکن حقیقی باگ ڈور امریکی مستشرقین ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس جسارت کا مقصد غلط نہ سمجھا جائے تو ان Encyclopaedias سے اپنے ذاتی تعلق اور معلومات کی بنا پر عرض کروں کہ جو عزم، لگن، جذبہ اور عالمانہ تیز نگاہی ان مستشرقین میں نظر آتی ہے اس کا عشر عشیر بھی مسلمان فاضلوں میں نظر نہیں آتا۔

آج سائنس کے انقلابی انکشافات اور ترقیوں نے زمان و مکان کی پہنائیاں ختم کر دی ہیں اور فکر و نظر کے نئے سانچے وجود میں آ رہے ہیں، بعض کام جدید سائنسی نظریات اور تجربات سے باخبر ہوئے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے، اقبال نے صحیح کہا تھا: "اسلامی ثقافت کے مورخ کی مشکل زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ عربی کے ایسے علماء تقریباً مفقود ہیں جو سائنس کے مخصوص شعبہ جات کے تربیت یافتہ ہوں"[1] اس لیے ضروری ہے کہ قدیم اور جدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا کریں، ہر عہد ایک نئے علم کلام کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ پ۱۴ (اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا) کی منشائے الٰہی کو پورا کرتا ہوا نظر آ رہا ہے، نیا علم کلام سائنس کو نظر انداز نہیں کرے گا، ایک زمانہ تھا جب مسلمان مفکرین اور علماء نے (جن میں سر سید کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے) مذہب کو سائنس کے نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، پھر ایک دور آیا جب مولانا ابو الکلام آزاد نے اعلان کیا کہ سائنس اور مذہب کی راہیں مختلف ہیں اور مذہب کو سائنس کے مطابق ثابت کرنا غیر ضروری ہے، لیکن آج وہ زمانہ آیا ہے کہ سائنس خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں مذہب کے بنیادی نظریات کی تائید کرتا ہوں، وقت اور حالات کا یہ انقلاب عظیم الشان ہے، ضرورت ہے کہ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے، اگر اس بنیادی ضرورت سے بے اعتنائی برتی گئی تو

---

[1] روزگار فقیر

ہماری کوششوں کا حال یہ ہوگا کہ ع خوب است وخوش است و پسندا مد۔

بعض دینی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوگیا ہے، قرآن کے Semantics مطالعہ کو Word study کے ہاتھ سے لے کر آگے بڑھانا چاہیے اور حدیث کے مطالعہ میں Goldziher اور Wensinck کے خطوط پہ تحقیق و ترتیب کی نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں علمائے اسلام نے علوم قرآن اور علم حدیث سے متعلق جو کام کیے ہیں وہ بلاشبہ بہتم بالشان ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ان کو آگے بڑھایا جائے، وقت کا ایک اور اہم تقاضا یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی ترتیب موجودہ دور کی ضروریات اور مزاج کے مطابق ہو تاکہ اسلامی نظام حیات کے افادی پہلو سامنے آسکیں، آج جب کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام سے بحیثیت دین غیر معمولی دلچسپی کا اظہار عوام میں ہو رہا ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس طرح نہ صرف میکڈانلڈ، شاخت، اینڈرسن وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ممکن ہوجائے گی بلکہ اسلام کے نظام حیات اور اسرار دین کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہوجائیں گے، ڈاکٹر اقبال کی دوربین نگاہ نے اس کام کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ آج سے پینسٹھ سال قبل لگالیا تھا اور وہ خود مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مدد سے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق پیش کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔

اس ساری جدوجہد میں آب و رنگ اسی وقت پیدا ہوگا جب علمی جذبہ سے سرشار مسلمان علماء اور فضلاء علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خون جگر سے اس کے خاکے میں رنگ بھریں گے، فاضل محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان علماء ایسی تصانیف تیار کریں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (Originality) مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی، ماخذ کے استناد و صحت اور محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق اور ممتاز ہوں[1]۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن   قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

---

[1] اسلام اور مستشرقین، ص ۲۷۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا نظریۂ سیاست

از

جناب سید محی الدین اظہر، لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کے والد سلطان سید ابراہیمؒ[1] اپنے عہد کے مشہور صوفی بزرگ سید محمود نوربخشیؒ[2] کی اولاد میں تھے، اور ان کی والدہ سیدہ خدیجہ بیگم کا سلسلۂ نسب خواجہ احمد یسویؒ[3] سے ملتا ہے، دو تین صاحبزادیوں کے بعد جب حضرت سید اشرف کی پیدائش ہوئی تو خدا رسیدہ والدین نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی، وہ پیدائشی طور پر بہت ذہین واقع ہوئے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات برس کی کمسنی میں قراءت سبعہ کے ساتھ حافظ قرآن ہوگئے، اور چودہ سال کی عمر کو پہونچتے پہونچتے انھوں نے علوم متداولہ میں وہ کمال حاصل کیا کہ سمنان اور اس کے اطراف کے علماء ان سے رشک کرنے لگے، لیکن تحصیل علم سے فارغ ہوئے ابھی ایک سال ہی

---

[1] لطائف اشرفی (مطبوعہ)، ج ۲ ص ۹۰-۹۱۔ [2] سید محمود نوربخشی، اسماعیل سامانی (متوفی [illegible]) کے ہمعصر تھے اور ان ہی کی دعا سے اسماعیل نے بادشاہت کی جنگ میں اپنے بھائی محمد پر فتح پائی تھی، خاتمۂ مکتوبات اشرفی (مخطوطہ)، آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی۔ [3] خواجہ احمد یسوی، خواجہ یوسف ہمدانی کے چار جلیل القدر خلفاء میں سے تھے، وہ تبلیغ اسلام کے لیے ترکستان گئے اور وہاں انھوں نے ننانوے ہزار مشائخ کی پیشوائی کی اور ۵؟[illegible]ھ میں "یسیہ" میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ لطائف ج ۱ ص ۳۰۶۔

...ذرا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور پندرہ سال کی عمر میں ان کو بادشاہت کا تاج پہنا کر تختِ سمنان
...ر بٹھا دیا گیا۔[1]

بچپن ہی سے ان کے مزاج میں چونکہ فقر و استغنا رچ بس گیا تھا اس لیے بادشاہ ہونے کے
...اوجود دربار شاہی کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان کے دل کو نہ لبھا سکیں، جب کبھی وہ کسی درویش
...کی خبر سنتے تو اس کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کی بابت دریافت کرتے، جب بادشاہت کرتے
...وئے دس سال کا عرصہ گذر گیا تو اپنے چھوٹے بھائی سلطان سید محمد کے سر پر سمنان کی بادشاہت
...کا تاج رکھ کر راہِ خدا میں اٹھ کھڑے ہوئے، والدہ کی خدمت میں اجازت کے لیے حاضر ہوئے،
...انھوں نے ہنسی خوشی اپنے لختِ جگر کو اس سفر کی اجازت دے دی، دو سال کی مسافت طے
...کرکے جب وہ بنگال میں پنڈوہ شریف کی سرحد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضرت شیخ علاء الدین
...گنج نبات شہر سے ایک کوس باہر آکر ایک سنبھل کے درخت کے نیچے محفہ[2] لیے ہوئے ان کے استقبال
...کو کھڑے ہیں، یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے لیے ظاہری طور پر اگرچہ اجنبی تھے، لیکن جذبِ دل
...نے ایسا جوش مارا کہ شیخ ان کی طرف کمال محبت سے چند قدم آگے بڑھے اور ادھر حضرت سید اشرف نے
...بھی دوڑتے ہوئے ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا، شیخ گنج نباتؒ نے جو مریدوں کی تربیت کے معاملہ
...میں بہت سختی سے کام لیتے تھے، ان کے مسلسل اصرار کے باوجود انھیں کسی خاص خدمت پر مامور نہیں
...کیا، اور صرف ذکر و فکر کی تاکید کرتے رہے۔[3]

شیخ علاء الدین گنج نباتؒ کی خدمت میں رہ کر سلوک کے منازل و مدارج طے کرتے ہوئے
جب چھ سال کا عرصہ گذر گیا تو جونپور کا سفر کیا اور اس مقام کی جستجو شروع کی جس کا نقشہ شیخ نے

---

[1] لطائف ج ۲، ص ۹۳ [2] یہ ایک سواری ہے جسے بنگالی میں "سنگھاسن" کہتے ہیں، لطائف ج ۲
ص ۹۶ [3] لطائف ج ۲، ص ۹۶-۹۸۔

ان کو پنڈوہ سے رخصت کرتے وقت بذریعہ کشف دکھایا تھا اور جو آج کل درگاہ کچھوچھہ شریف کے نام سے موسوم ہے۔[1]

کچھوچھہ شریف (پہلے جونپور میں تھا اور اب ضلع فیض آباد میں ہے) آکر اپنی خانقاہ قائم کی اور پھر یہاں سے دو[2] مرتبہ بیرونِ ہند کا سفر کیا، جس کا مقصد اولیاء و مشائخ کے مزارات مقدسہ پر حاضری حرمین شریفین کی زیارت، معاصر علماء و صوفیہ سے ملاقات و استفادہ، اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کی رشد و ہدایت تھا، جن ہمعصر علماء و فضلاء اور صوفیہ و مشائخ سے ان کی ملاقات ہوئی، ان میں بعض سے انھوں نے خود استفادہ کیا، اور بعض لوگوں نے ان سے سلوک میں رہنمائی حاصل کی، وہ جس شان و شوکت سے سفر کرتے تھے وہ بعض لوگوں کو اگرچہ پسند نہ تھی

---

[1] حضرت سید اشرفؒ کا مزار مبارک جس موضع میں ہے اس کا نام آج کل "رسول پور" ہے، درگاہ شریف کا علاقہ غالباً اس وقت بے نام اور محض جوگیوں کا مسکن تھا، اور یہاں گرہست لوگوں کی آبادی نہ تھی، جہاں آج مزار شریف ہے وہاں اس وقت ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے سے متصل ایک تالاب بھی تھا، لطائف میں اس تالاب کو "کول" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

[2] لطائف میں مذکور ہے کہ حضرت سید اشرفؒ نے جب دوسری مرتبہ جونپور کا سفر کیا تو کچھوچھہ تشریف لائے اور اس وقت اس علاقہ کا بادشاہ ابراہیم شاہ شرقی تھا، ۸۰۴ھ یا ۸۰۵ھ کے بعد کا یہ واقعہ ہے، لیکن لطائف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے حضرت سید اشرفؒ کے کچھوچھہ تشریف لے جانے کے واقعہ کے بیان کی ترتیب مشتبہ معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ مرشد کے حکم سے پنڈوہ سے رخصت ہو کر وہ اسی جگہ کو اپنا صدر مقام بنانے کے لیے چلے تھے، اسی بنا پر قیاس چاہتا ہے کہ وہ جونپور کے دوسرے سفر میں نہیں بلکہ پہلے ہی سفر میں کچھوچھہ پہنچے تھے، شیخ گنج نبات نے جن الفاظ میں جائے مقررہ کی نشاندہی فرمائی تھی وہ یہ ہیں:

"میان آں تال کہ دائرہ وار برآمدہ است نقطۂ تل دیدہ می شود منزل خاک تو آنجا باشد۔" (لطائف ج ۲)

ر جہاں وہ پہونچ جاتے لوگ جوق در جوق قدم بوسی کو آتے اور دولت ایمان سے مالامال ہوکر لوٹتے اور جب تک اس جگہ سے کوچ نہ کر جاتے، مریدوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔

حضرت سید اشرفؒ کی شخصیت بادشاہی اور فقیری کا حسین ترین امتزاج تھی اور اسی وجہ سے وہ فقراء و مشائخ کے لیے بادشاہوں اور امراء سے میل جول رکھنے کو مناسب سمجھتے تھے، ان کے خیال میں عوام میں یہ بات غلط مشہور ہو گئی ہے کہ فقراء کو اہل دول سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے' ان کے نزدیک اگر کوئی درویش کسی بادشاہ سے اس لیے نہیں ملتا کہ وہ زہد و تقویٰ کے معاملہ میں اس کو کمتر سمجھتا ہے تو اس کا یہ خیال جہالت اور غرور پر مبنی ہوگا، کیونکہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھنا ابلیس کی سنت ہے، اور ایسا ہونے سے لوگ نیکی کی طرف مائل ہونے کے بجائے اور بھی بہک جاتے ہیں، اگر کوئی درویش کسی بادشاہ یا امیر کو خود سے بہتر تصور کر کے اس سے ملے تو یہ عمل اس کو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے، جب نہ نیکوکاروں کی نیکیاں گنہگاروں کے فرد اعمال میں لکھی جاتی ہیں اور نہ بدکاروں کے گناہ نیکوں کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے ہیں تو بادشاہوں اور امراء کے مراتب دینی کا تنزل اور عبادت میں ان کی کوتاہی کسی صوفیِ کامل کے مشرب کو نقصان نہیں پہونچا سکتی[1] چنانچہ حضرت سید اشرفؒ نے اپنی اس رائے کی حمایت میں جو دلیلیں پیش کی ہیں' وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) صوفیوں کا بادشاہوں سے پرہیز کرنا انھیں اپنے سے کمتر سمجھنا ہے' اس میں خود ستائی کی بو آتی ہے اور یہ نفس امّارہ کے غلبہ کی دلیل ہے[2]

(۲) بادشاہ عادل ہوگا یا ظالم، اگر وہ عادل ہے تو اس سے ملنا عین سعادت ہے[3] کیونکہ عادل بادشاہ کے بارے میں حسب ذیل احادیث قدسی وارد ہیں۔

(الف) عادل بادشاہ سے ملاقات کے وقت بادشاہ اور اس سے ملنے والے پر خدا اپنی

---

[1] لطایف ج ۲، ص ۱۰۸، [2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

رحمتوں کی بارش کرتا ہے۔[1]

(ب) قیامت کے دن عادل بادشاہوں کو اللہ کی بہترین مخلوق میں جگہ دی جائے گی۔[2]

(ج) ایک ساعت کا عدل ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے۔[3]

حضرت سید اشرفؒ نے اپنی رائے کو مزید باوزن بنانے کے لیے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عادل بادشاہ کا وجود ابر باراں سے بہتر ہے۔[4]

اگر بادشاہ عادل اور دیندار ہے تو اس کے واسطے دعا گو ہونا اور اس کی مدح کرنا عام خلایق پر لازم ہے اور اگر وہ ظالم اور فاسق و فاجر ہے تو اس کو امور خیر، دینداری، زہد و تقویٰ اور عدل و انصاف کی تلقین کرنے کے لیے علماء و مشایخ کا اس سے ملنا فرض ہے، مگر نصیحت کرتے وقت بادشاہوں اور امراء کے مراتب کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے، کیونکہ اگر باحسن وجوہ اصلاح نہ کی گئی تو ان کی طبیعت کو گرانی محسوس ہوگی اور اس کا اثر الٹا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پروردگار عالم نے فراعنۂ مصر کے پاس حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو تبلیغ کے واسطے بھیجا تو ان کو یہ حکم دیا کہ فرعون سے نرمی سے بات کرو۔[5]

حضرت سید اشرفؒ کے اسی نظریۂ تصوف کا یہ کرشمہ تھا کہ وہ عام صوفیہ کی طرح خانقاہ میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھے نہیں رہے، بلکہ اسلام اور اس کے عقائد و نظریات کی تبلیغ کی غرض سے زندگی بھر سفر کرتے رہے، یوں تو بہت سے امراء و رؤسا ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور ان کی معیت اختیار کرکے راہِ سلوک میں اعلیٰ مقام تک پہونچے، لیکن بادشاہ جون پور ابراہیم شاہ شرقی اور بادشاہ مالوہ

---

[1] عند ملاقاۃ الملوک تتنزل الرحمۃ، لطایف ج ۲، ص ۱۰۸۔ [2] ان افضل عباد اللہ عند اللہ منزلۃ یوم القیامۃ امام عادل ورفیق کامل، لطائف ج ۲، ص ۱۰۹۔

[3] عدل ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ، لطایف ج ۲، ص ۱۰۹ [4] سلطان عادل خیر من مطر، لطایف ج ۲، ص ۱۰۹ [5] لطایف ج ۲، ص ۱۰۹۔

ہوشنگ خاں غوری[1] کے نام لکھے گئے خطوط[2] سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمہ گیر شخصیت نے ہندوستان کے ان دو نامور حکمرانوں کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ انتظامِ حکومت کے معاملات میں بھی ان سے مشورے کے خواہشمند ہوتے تھے۔

حضرت سید اشرفؒ نے اپنے ایک مکتوب[3] میں ہوشنگ خان کے اس خط کے جواب میں جو انھوں نے اپنی رسم تاج پوشی کے موقع پر انھیں لکھا تھا اس کو طویل نصیحتیں کی ہیں اور عدل و انصاف کی اہمیت اور بادشاہ کے فرائض سے آگاہ کیا ہے، اس خط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے سمنان کی بادشاہت کے زمانہ میں حاصل کیے ہوئے اپنے تمام تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، یہ تحریر ان کی حرکی اور فعّال شخصیت کا ایک ایسا اہم ثبوت ہے جس کی روشنی میں یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ تاریخ صوفیہ میں غالباً وہ واحد شخص ہیں جو علوم شریعت و طریقت میں غیر معمولی مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ وزراء اور رعایا کے ساتھ بادشاہ کے تعلقات کی نوعیت، حکومت کے نظم و نسق اور ملکی و غیر ملکی سیاست پر ایک تجربہ کار سیاست داں اور انسانی نفسیات کے ایک عظیم ماہر کی حیثیت سے بڑی بلیغ نظر رکھتے تھے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سطور ذیل میں متذکرۂ بالا مکتوب سے چند اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جائے تاکہ ان کا نظریۂ سیاست واضح ہو سکے اور ان کی ہمہ جہت اور تہہ دار شخصیت اور بھی کھل کر سامنے آسکے۔

حضرت سید اشرفؒ سب سے پہلے بادشاہت کے حصول پر اس نعمت کی شکر گذاری کی تلقین

---

[1] ہوشنگ خاں (متوفی ۸۳۸ھ) کا اصلی نام الپ خاں تھا، اس نے تخت نشینی کے بعد ہوشنگ خاں لقب اختیار کیا اس کا دار الخلافہ "مانڈو" تھا، ملاحظہ ہو "مانڈو، شادی آباد از غلام یزدانی (اردو ترجمہ از مرزا احمد بشیر) مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۲ء ص ۹۔ [2] ملاحظہ ہو مکتوب بیست و سوم، بیست و چہارم، بیست و ہشتم و بیست چہل و ششم۔ مکتوبات اشرفی (مخطوطہ) مرتبہ سید عبدالرزاق نور العین، سبحان اللہ کلکشن آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[3] مکتوب بیست و ہشتم علی گڑھ

کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تاکہ نعمت اور شوکت میں اور زیادتی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم تمہیں اور زیادہ دیں گے، سلطنت پانے کا شکریہ قیام عدل و انصاف ہے[1]"

وزیر جنگ، سپہ سالار اور لشکر و افواج کے تعلقات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح کے ہونا چاہئیں، ملاحظہ ہو:

"وزیر جنگ عاقل اور روشن رائے ہو اور فوج اس کی فرماں بردار ہو اور اس کے حکم کے دائرے کے اندر نقطے کی طرح اپنی جگہ پر ہو[2]۔"

وزیر جنگ کو جن جن برائیوں سے بچنا چاہیے ان کا اجمالی بیان اس طرح ہوا ہے:

"وہ امیر جو قوم کا پیشوا ہو اور لشکر کا سپہ سالار جس کا مطیع ہو، یعنی وزیر جنگ، اس کو چاہیے کہ نفسانی خواہشات سے خود کو دور رکھے اور حرام مشروب سے بچے، کیونکہ شراب عقل کو زائل اور رائے روشن اور فکر صائب کو برباد کر دینے والی ہے، کاموں میں شراب سے سستی پیدا ہوتی ہے، شرابی آج کے ہزاروں کام کل پر چھوڑ دیتا ہے[3]۔"

---

[1] شکرانۂ ایں نعمت بجاے باید آورد تا موجب ازدیاد نعمت شود و سبب مید اد شوکت گردد، کما قال اللہ تعالیٰ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ، شکرانۂ دولت عدالت بود۔" [2] "در کارزار امیری باید صاحب رائے و در پیکار وزیری شاید ثاقب آراے، لشکر مبارزان میدان ہمت و عسکر لشکران معرکۂ جلادت تابع او باشند از دائرۂ حکمش چون نقطہ بیرون نروند۔" [3] "امیرے کہ پیشواے قوم باشد و سر لشکر اسلام خلق مطیع وے باشد باید کہ او را از لذائذ و شہوات نفسانی بستہ دارد و بشرب مناہی اقدام ننماید چہ شراب مزیل عقل است و رائے ثاقب و فکر صائب و کسالت و اہمال در افعال از نتیجۂ شراب و ہر کیفیت کہ مقتضی بایں معنی بود، او ہزار کار امروز بفردا افگند۔"

رعایا پر ظلم کرنے سے جو خوفناک نتائج پیدا ہوتے ہیں، ان کا اجمالی بیان یہ ہے :

"رعایا ظلم سے متنفر اور شکستہ دل ہو جاتی ہے اور تعمیر و زراعت میں مشغول نہیں رہ پاتی، مال میں کمی ہونے لگتی ہے اور رعایا بدحال ہو جاتی ہے، ملک میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، لشکری بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور حکم سے سرتابی کرتے ہیں[۱]"

ملکی نظم و سیاست اور سفارتی تعلقات کی تفصیل حسب ذیل ہے :

"وزراء اور ارکان دولت کو دوسری سلطنت کے امراء و سلاطین سے پہلے باریابی دینی چاہیے تاکہ وہ فوجیوں کی ضرورت اور مطالبات کو خلوت میں پیش کر سکیں اور انھیں ایسا جواب دینا چاہیے جس سے ان کو پورا اطمینان ہو، اس کے بعد دوسرے ملکوں کے امراء و سلاطین کو ملنے کا موقع دیا جائے اور ان کے مرتبہ کا خیال رکھا جائے اور ان کے رتبہ کے مطابق ان کے اعزاز میں کمی نہ کی جائے[۲]۔"

حضرت سید اشرفؒ کے عہد میں ہندوستان کے بیشتر علاقوں کے بادشاہ مسلمان تھے، اور رعایا کی اکثریت غیر مسلم تھی، یہ بات وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مذہب کا جوش اور ہم مذہبوں کی حمایت کا جذبہ بعض اوقات ایک مذہب کے بادشاہ کو دوسرے مذہب کی رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرنے میں مانع ہوتا ہے، مگر چونکہ وہ اسلامی اصول و عقائد کے زبردست مبلغ تھے، اس لیے انھوں نے

---

[۱] رعایا از ظلم متنفر گردد و شکستہ دل، بعمارت و زراعت اشتغال نتواند نمود، نقصان در اموال ظاہر گردد و رعایا مستاصل گردد، خرابی در مملکت آید، لشکریان کلاہ کج کنند و بعنان بیرون آیند۔ [۲] "وزراء و ارکان دولت را پیش از امراء و سلاطین سلطنت دیگر بار دہند کہ ایشاں عرائض عساکر منصورہ و عرائض لشکر موفورہ در محل خلوت درمیان نہند و جواب شافی بگیرند، بعد ازاں سلاطین و خوانین را بار دہند و در خور حال شان اکرام کنند و اندازۂ معہودۂ ہر کسے نقصان نہ کنند۔"

مسلمانوں اور غیر مسلم رعایا کے جھگڑوں کے فیصلے کے وقت بھی انصاف کو قائم رکھنے کی ہدایت ان پر زور الفاظ میں کی ہے :

"سلاطین و امراء کے بعد عام لوگوں کو باریابی کی اجازت ہو، رعایا اور مسلمانوں کے جھگڑوں کا فیصلہ انصاف اور شریعت کے مطابق ہو[1]۔"

بادشاہ کو بڑی احتیاط سے گفتگو کرنی چاہیے، کیونکہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات اہم ہوتی ہے، اس کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہوتا ہے :

"ہر شخص سے بے ضرورت کلام نہ کیا جائے، اس لیے کہ سلاطین و امراء کی گفتگو انعام کی خوشخبری ہے اور اکرام کی امید دلاتی ہے، ہر ایک کو خوشخبری دیکر امیدوار بنانا اور اس کو وفا نہ کرنا ان بادشاہوں کا طریقہ نہیں ہے جو احسان کے زیور سے آراستہ اور ایمان کے نور سے منور ہیں[2]۔"

ارکان دولت کے تقرر اور عہدوں کی تقسیم میں ذاتی لیاقت اور انفرادی استطاعت کا خیال رکھنا ضروری ہے، ملاحظہ ہو :

"وکالت ایسے شخص کے سپرد ہو جو تیز فہم اور حاضر جواب ہو، جہانداری اور شہریاری مناصب کی نہ ہو ایک کا کام دوسرے کے سپرد نہ کیا جائے۔"

مندرجۂ ذیل اقتباس میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے حکومت و سیاست کا وہ اسلامی نظریہ

---

[1] "بعد از خوانین و امراء بار عام دہند تا تقاضای دادخواہی و دعاوی رعایا و مسلمانان بعرض رسانیدہ ہر یک را بقدر عدالت و بر نہج شریعت حکم آن بواجبی بجائے آرند۔" [2] "و تکلم بے ضرورت بہر کسے نکنند چہ تکلم سلاطین روزگار و تزنم خوانین نامدار نوید است از انعام و امید از اکرام، پس ہر کسے را نوید دادن و امیدوار ساختن و بہ آن وفا ناکردن شعار ملوک متحلی باحسان نبود و نہ شان متجلی بایمان نباشد۔"

...ش کیا ہے، جس کی رو سے زمین و آسمان کا حقیقی بادشاہ صرف اور صرف خالقِ کائنات ہے، اور دنیا کے ...ادشاہ دراصل روئے زمین پر اس کے ایک ایسے نائب کی حیثیت سے ہیں، جن کا فرض یہ ہے کہ وہ ...الموں کی چیرہ دستیوں سے عوام اور کمزور بندگانِ خدا کی حفاظت کریں اور سلطنت کے مال و دولت ...ور رعایا کی فلاح و بہبود میں لگادیں، ملاحظہ ہو:

"بادشاہوں کا مال راہ خدا میں محتاجوں پر صرف کرنے اور ان کی جان معرفت و حقایق سے آگاہی کے لیے ہے، جتنا جلد بادشاہ اپنے جان و مال کو راہ حق میں لگا دیں اتنا ہی بہتر ہے، اور ہر مال کا جو حصہ راہ حق میں خرچ ہو وہی کار آمد ہے[1]۔"

حضرت سید اشرفؒ یہ جانتے تھے کہ سلطنت کے انتظامی امور میں وزیر (جس کی شخصیت بادشاہ کے بعد سب سے اہم ہوتی ہے) کلیدی رول ادا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کی ذرا سی غفلت سے اکثر وزیروں نے تخت پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس لیے وہ وزیر کے لیے دیندار اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا ضروری سمجھتے تھے، تاکہ اگر کبھی وہ لشکر کے ساتھ سازش کرکے بادشاہ کو معزول کر دینا اور خود تخت پر قابض ہوجانا چاہے تو دینداری اس کے ارادے کو روبہ عمل لانے میں مانع ہوسکے۔

"وزیر کو سارے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے ساتھ دیندار ہونا چاہیے، سلطنت کے امور میں حشم و خزانہ بھی وزیر کے محتاج ہیں، اس لیے اگر وزیر سلطنت پر قبضہ کرنے کا خیال کرے تو دینداری مانع ہوگی[2]۔"

---

[1] اموال ایشاں برائے صرف محتاجان بود و در راہ خدا تعالیٰ و جان ایشاں در پرواز فضائے حقایق و طیران صحرائے دقائق باشد کہ ہر چہ زود در راہ حق فنا کنند ہماں در کار آید۔" [2] "وزیرے کہ بہمہ فنون آراستہ و بجمیع ہنر پیراستہ بود بتخصیص دیندار باید چہ وزیر در ہمہ امور سلطنت از حشم و خزائن و ارکان دولت ہمہ بوے محتاج اند، چوں خواہد کہ بسلطنت تسلط یابد مانع گردد۔"

بادشاہت دراصل مطلق العنانی اور آمرانہ طرز کی حکومت ہے، جس میں عوام کے احساسات وجذبات اور ان کی خواہشات وضروریات کو لحوظ نہیں رکھا جاتا، اس شخصی طرز حکومت میں صرف ایک ہی شخص کی نمایش ہوتی ہے اور اس کی زبان سے نکلا ہوا حرف فرمان کا درجہ رکھتا ہے، کوئی شخص خواہ کیسا ہی عبقری ہو، مگر کبھی کبھی اس سے بھی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی تاریخ شاہد ہے کہ صرف اپنی ذاتی رائے پر اصرار کرنے اور دوسروں کے مشوروں کو حقیر سمجھکر رد کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے فرماں رواؤں نے نہ صرف سلطنت وحکومت کھوئی بلکہ اپنی جانیں بھی گنوائیں۔ حضرت سید اشرفؒ نے اسی خطرے کے پیش نظر حسب ذیل اقتباس میں ہوشنگ خان کو وزرا اور ارکان دولت سے مشورے کی ہدایت کی تھی:

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت، رسالت، فکر ورائے کے باوجود ان کو امور میں مشورے کا حکم دیا گیا تھا . . . . . آپ کو بھی مشورے سے کام کرنا چاہیئے۔"[1]

بادشاہ کے لیے ارکان دولت سے مشورہ لینے اور ایک مجلس مشاورت کے قیام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لطایف میں ایک جگہ حضرت سید اشرفؒ فرماتے ہیں:

"سلطنت کے امور میں رائے دینے کے لیے ایک مجلس مشاورت ہونی چاہیے جو ملک کے اصحاب رائے اور سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل ہو، مشورہ کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ عقلا کے مشورے سے خیر ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ عقول انسانی میں فرق ہو نا ضروری ہے اور اختلاف رائے سے جو تدبیر حاصل ہوتا ہے اس سے ان امور کی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے جہاں تلوار کام نہیں دیتی، اگر رائے کی احتیاج نہ ہو تب بھی عوام کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے سربرآوردہ لوگوں سے رائے

---

[1] باوجود رائے نبوت آرائے وفکر رسالت افزائے صلی اللہ علیہ وسلم امر شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ شدہ . . . . . . کار بر مشورت کنند۔"

لینا ضروری ہے[1]۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مذکورہ بالا ارشادات سے ان کا جو نظریۂ سیاست واضح ہوتا ہے، وہ دنیا میں جمہوری طرزِ حکومت کی موجودہ شکل کے برعکس ہے، کیونکہ آج کی دنیا میں جمہوریت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کو عوام کے منتخب نمایندوں کی اکثریت کے ذریعہ طے شدہ رائے کا پابند ہونا چاہیے، جب کہ حضرت سید اشرفؒ کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے، حاجی نظام یمنی لکھتے ہیں:

"بہت سے عقلاء کا خیال ہے کہ مشاورت میں نقصان ہے، کیونکہ اس سے افشائے راز ہوتا ہے، حالانکہ یہ عین کتمان ہے، اس لیے کہ اختلافِ رائے کی موجودگی میں یہ کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ بادشاہ کس رائے پر عمل کرے گا[2]۔"

جن چیزوں سے ملک میں فساد برپا ہوتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

"چار چیزوں سے ملک میں فساد ہوتا ہے۔ اول بادشاہ کی عیش پرستی، دوسرے مقربین کے ساتھ بدخلقی سے پیش آنے اور تیسرے مجرموں کو سزا دینے میں مبالغہ کرنے سے، مثلاً ایک مجرم تازیانہ کا مستحق ہے لیکن اسے قتل کا حکم دے دیا جائے۔ اور چوتھے رعایا پر مسلسل ظلم سے[3]۔"

اس کے بعد ترجمۂ اردشیر بابکان[4] سے ایک عبارت نقل کی گئی ہے جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

---

[1] خلاصہ از لطایف ج ۲، ص ۱۶۵ - ۱۶۶ [2] ایضاً ص ۱۶۶ [3] ایضاً ص ۱۶۶ - ۱۶۷ [4] اردشیر بابکان صوبۂ فارس (ایران) میں ایک چھوٹی سی ریاست کا حاکم تھا، اس نے ۲۲۳ء میں اشکانیوں (۲۴۹ قبل مسیح تا ۲۲۶ء) کے خلاف بغاوت کر دی اور تھوڑے ہی دنوں میں ایران کے تمام مشرقی صوبوں پر قابض ہو گیا اور ۲۲۶ء میں اشکانی پایۂ تخت "طیسیفون" پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، وہ ۲۴۱ء تک بقیدِ حیات رہا، اس میں جہانبانی و جہانداری کا خداداد ملکہ تھا، اس کے کارناموں سے متعلق ساسانیوں کے آخری عہد میں ایک تاریخ مرتب کی گئی جس کا نام کارنامک ارتخشتر پاپکان ہے، اسی کتاب کو موجودہ فارسی میں اردشیر بابکان کہتے ہیں، ملاحظہ ہو ہسٹری آف پرشیا از پرسی سائکس ج ۱، ص ۳۹۲

"آدمیوں کے بغیر ملک کی کوئی حیثیت نہیں، اور آدمی مال و دولت ہی سے مل سکتے ہیں، مال و دولت ملک کی آبادکاری ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور آبادکاری عدل و انصاف کے قیام سے ہوتی ہے اور عدل و انصاف کا قیام سیاست سے ہوتا ہے[1]۔"

لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید اشرفؒ کے مریدوں اور معتقدین میں ایسے بہت سے امرار و رؤسا تھے جنھوں نے دولت و امارت کو چھوڑنا چاہا مگر انھوں نے سختی سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ

"بے علایق روزگار و عوائق کاروبار سلوک پر در و گار صوفیہ را میسراست، مردانہ باید کہ بجمعیت اسباب و تفرقۂ داراب در راہ آیند[2]۔"

ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں :

"اگر بعین بصیرت ملاحظہ کردہ شود ہم امرائے روزگار و وزرائے نامدار و بر ایلے اہل صناعت و حرفت در کار عبادت و سلوک اشتغال دارند[3]۔"

حضرت سید اشرفؒ نے اپنے دامن سے وابستہ تمام صاحبانِ ثروت کی تعلیم و تربیت انکو دنیاوی معاملات میں مشغول رکھ کر ہی کی، کیونکہ ان کے خیال میں دولت و امارت قربِ حق کی راہ میں ہمیشہ حارج نہیں ہوتیں، وہ جہاں جاتے وہاں علمار و مشائخ کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار لوگوں سے بھی ملتے اور ان کو جادۂ حق پر چلنے اور عدل و انصاف قائم کرنے کی

---

[1] اصل عبارت یہ ہے : "لاملك الّا بالرجال ولا رجال الّا بالمال ولامال الّا بالعمارة ولا عمارة الّا بالعدل ولاعدل الا بالسياسة"

(لطایف ج ۲، ص ۱۶۶ - ۱۶۷)

[2] لطایف ج ۲، ص ۱۱۳ [3] ایضاً ص ۱۱۴۔

تلقین فرماتے، گویا وہ ایک ایسی حرکی اور فعال شخصیت کے مالک تھے کہ اپنی قوت عمل اور جہد مسلسل سے جہاں ایک طرف عام انسانوں کے دلوں میں ایمان اور زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش کی، وہاں امراء اور بادشاہوں کے دلوں کی دنیا بھی اس انداز سے بدلنے کی سعی کی کہ یہ لوگ اپنا ہر قدم اسلامی ضابطۂ حیات کے مطابق اٹھائیں، اور اپنی اپنی حدود مملکت میں بندگان خدا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھیں، تاکہ ملک آباد اور رعایا خوشحال رہے۔

بزم صوفیہ

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

بہ کثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا تیسرا ضخیم ایڈیشن جس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، حضرت بو علی قلندر پانی پتی، حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے حالات و سوانح، تعلیمات و ارشادات، ان کے ملفوظات اور ان کی تصنیفات کی روشنی میں قلمبند کیے گئے ہیں، موخر الذکر کا مزار کچھوچھہ شریف فیض آباد میں ہے اور مرجع خلائق ہے، ہر سال ان کا باقاعدہ عرس ہوتا ہے، اس میں حضرت شیخ احمد عبدالحق توشہ ردولوی کے حالات و تعلیمات کے علاوہ "ملفوظات خواجگان چشت" اور "ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ پر ایک نظر" مستقل اضافہ ہے جس سے اس کتاب کا افادہ اور وسیع ہو گیا ہے، قیمت ۲۵ روپے۔

صوفی امیر خسرو

تصوف میں مصنف کی دوسری اہم کتاب جس میں امیر خسرو کو پہلی مرتبہ ایک صاحب دل صوفی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کے جامع کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، قیمت ۸ روپے۔ "منیجر"

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سمینار

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

اس سمینار کے کھلے اجلاس کے بعد رات کو شبلی کالج کے وسیع ہال میں مقالات خوانی کی نشست شروع ہوئی، یہ ہال جناب محمد الانبار زندی کی خوش سلیقگی اور انتھک محنت کی وجہ سے بڑی اچھی طرح سجایا گیا تھا، اس کی زیبائش و آرایش میں ان کی مدد ندوۃ العلماء کے طلبہ نے ہر طرح کی، جو چھوٹے بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ کام کرنے میں اپنی پوری مستعدی کا ثبوت دے رہے تھے، مندوبین ایک بڑے مثلث کی شکل میں بٹھائے گئے تھے، سامعین کے لیے ہر طرف کرسیاں بچھادی گئی تھیں، شائقین کے ہجوم سے پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لاوڈ اسپیکر کا انتظام اچھا تھا، اس لیے لوگ باہر بھی کھڑے اور بیٹھے نظر آرہے تھے، مقالات کافی تعداد میں آگئے تھے، اس لیے کھلے اجلاس کے بعد ایک کمیٹی بنادی گئی تھی کہ یہ مختلف نشستوں میں صدارت اور مقالہ خوانی کی ترتیب دیتی رہے، اس کے ارکین یہ تھے:

(۱) ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق، ڈائرکٹر جنرل رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ (۲) ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی

صدر شعبۂ شریعت و قانون العین یونیورسٹی متحدہ عرب امارات (۳) ڈاکٹر سید سلمان ندوی صدر ثقافت اسلامیہ ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ (۴) ڈاکٹر ظفر اسحق انصاری پروفیسر تاریخ اسلامی ٹیچر دلیم یونیورسٹی طہران (۵) جناب مولانا محمد رابع الحسنی ندوی، صدر شعبۂ عربی دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ (۶) مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی استاذ ادب عربی دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ (۷)، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ نئی دہلی (۸)، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

پہلی نشست کی صدارت جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی قطر یونیورسٹی قطر نے کی جن سے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے پہلو میں بیٹھنے کی درخواست کی گئی، ان کے بائیں جانب ڈاکٹر سید سلمان ندوی بیٹھے جو کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض کو انجام دینے کے لیے بلائے گئے، وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے ہیں، ان کو دیکھنے کے لیے لوگ مشتاق رہے، ماشاء اللہ اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح شکیل اور وجیہ نظر آرہے تھے، عربی، انگریزی اور اردو بڑی روانی اور متانت کے ساتھ بولتے ہیں جس سے حاضرین متاثر ہوئے، سب سے پہلے ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی صدر شعبۂ شریعت و قانون العین یونیورسٹی متحدہ عرب امارات اپنا مقالہ پیش کرنے کے لیے بلائے گئے۔

ڈاکٹر محمود محمد طنطاوی | ان کے مقالہ کا عنوان "الاسلام انتشر بالسلم لا بالسیف" تھا، وہ زیادہ تر زبانی بڑی رواں اور سلیس عربی میں بولتے رہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا، حالانکہ اس کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ایک فرد واحد نے اس کی تبلیغ شروع کی، جب غار حرا میں وحی نازل ہوئی تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بنت خویلد، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ نے اسلام قبول کیا، ایک مدت تک

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر دعوت دیتے رہے، لوگوں نے اپنی خواہش سے دائرہ اسلام میں داخل ہونا پسند کیا، اسلام آگے بڑھتا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں، نہ کہ اسلام قبول کرنے والے دوسروں کو سزائیں دیتے، مسلمانوں پر جو ظلم کیا گیا تو حبشہ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا، اور پھر مدینہ کی ہجرت ہوئی، جہاں اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی گئی، پھر بھی مسلمانوں کے آلام و مصائب بڑھتے گئے، جس کے بعد یہ حکم نازل ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝	جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا، وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔
(حج : ۳۹)	

مسلمانوں پر ظلم و تعدی کا سلسلہ جاری تھا، جس پر ظلم کیا جاتا ہے اس کو حق ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے، اسی لیے اس آیت میں ظالموں کے خلاف وسائل کو بروئے کار لانے کی اجازت دی گئی، اسلام کی تبلیغ اور کفار سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں پہلا حکم تو یہ ہے کہ ان کو صلح و آشتی اور حجت و دلیل سے دعوت دی جائے، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو دوسرا حکم یہ ہے کہ ان سے جزیہ طلب کیا جائے، جس سے یہ مراد ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومت کی بالادستی قبول کر لیتے ہیں تو پھر وہ ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہیں، اور اگر وہ اس کو بھی قبول نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دعوت اسلام میں رکاوٹ پیدا کریں گے، جس کے بعد یہ تیسرا حکم ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ ان ممالک کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے جہاں اسلام پھیلا۔ ان میں ہندوستان بھی ہے جہاں یہ مسلمانوں کے اخلاق و برتاؤ سے پھیلتا گیا۔ مدینہ کے اہل کتاب سے رسول اللہ صلعم نے

ن وسلامتی کا معاہدہ کیا، مگر جب ان لوگوں نے اس کی پابندی کرنے کے بجائے در پردہ دشمنوں کی مدد کی، حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے خلاف ناپاک سازش کرنے لگے تو اس کا سدباب کیا گیا، یہ کھلی ہوئی ہدایت ہے کہ جو چاہے اسلام لائے اور جو چاہے اپنے دین پر برقرار رہے، البتہ دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، اس کو جبراً اسلام قبول کرنے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ	جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان
لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ	نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا	رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام
يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ	سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے
اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ	حرام کی ہیں، اور نہ دین حق کو قبول کرتے
عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ.	ہیں ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ
(توبہ : ۲۹)	ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

پروفیسر امیر حسن عابدی | دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اپنا مقالہ "پروفیسر ایڈورڈ براؤن اور اسلام" کے عنوان سے پیش کیا، وہ اپنا پورا مقالہ تو پڑھ نہ سکے، اس کے خاص خاص حصے پڑھ کر سنائے، جو یہ ہیں:

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتدا ہوئی، جس کے ذریعہ سے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے، تیرہویں صدی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کر کے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اس صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈ لل نے مشرقی زبانوں کے حاصل کرنے پر اصرار کیا، جس سے فلسفہ اور سائنس کا

مطالعہ ہو سکے، چودہویں صدی کے شروع میں پانچویں پوپ نے یورپ کے مختلف شہروں میں عربی کی پروفیسر شپ قائم کرائی، مگر اس کا خیال رکھا گیا کہ اس سے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہونچے سولہویں صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا چرچا اور رواج ہوا، دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے یونانی علوم وفنون کو زندہ رکھا، یورپ والے ان ہی عربی ترجموں سے استفادہ کر کے آگے بڑھے ہیں۔

یورپ میں عربی اور فارسی وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے ایک تو یہ کہ ان زبانوں، خاص کر عربی کے ذریعہ سے وہ یونانی علوم کو حاصل کر کے سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں نکال کر ان پر کیچڑ اچھال سکیں، پھر بھی بہت سے ایسے مستشرقین بھی ہیں جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ بڑی دیانت داری سے کر کے ان سے پورا پورا استفادہ کیا، اور مسلمانوں کے دین کے معترف ہوئے، پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا شمار ایسے ہی مستشرقین میں کیا جائے گا، انھوں نے فارسی ادب کی تاریخ لکھنے میں مسلمانوں کی ہر قسم خدمات کا صحیح جائزہ لیا ہے، جس میں وہ ایک سچے اور ایماندار محقق کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، انھوں نے ابن ہشام، الطبری، دینوری، بلاذری، مسعودی اور یعقوبی وغیرہ کے حوالے سے اپنی تحقیقات کی تکمیل کی ہے، ان کا خیال ہے کہ نوشیروان کی شاندار حکومت (۵۳۱ء تا ۵۷۸ء) کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا بیالیسواں سال (۵۷۲-۳ء) ہے جسے عرب عام الفیل کہتے ہیں، اسی سال ایک طرف تو ایران نے یمن کی سلطنت پر فتح پائی، دوسری طرف مکہ معظمہ میں محمد صلعم کی ولادت ہوئی جن کی تعلیمات کے نتیجہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، یہاں اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ نوشیروان بڑا جابر، ظالم اور سفاک بادشاہ تھا، اس نے زرتشتی مذہب کے سوا

سی مذہب و ملت کو پنپنے نہیں دیا، سب کا قلع قمع کر دیا، مزدک اپنے زمانہ کے کمیونسٹ تھے،
ں نے ۵۲۸ء میں ان کی تحریک کو بھی بالکل کچل دیا، وہ عیسائیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا
ذہب مانی کو بھی کچلا، مگر اس نے زرتشتیوں کا پورا احترام کیا، ان کو ہر طرح کی سہولتیں دیں اس لیے
ان کی نظروں میں بڑا مہربان بادشاہ تھا، وہ اسے نوشیروان عادل کے خطاب سے یاد کرتے ہیں
جو ہماری روایتوں کا جزبن گیا ہے، براؤن نے نوشیروان کو متشدد اور متعصب بتایا ہے، مگر اسی کے
ساتھ اس کو مامون الرشید اور اکبر جیسے بادشاہوں کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ
براؤن ان مسلمان فرماں رواؤں کی عظمت کے معترف تھے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے براؤن نے لکھا ہے کہ آپکا کام بہت مشکل
تھا، اس لیے کہ ریگستانی عرب دل سے مادی اور متشکک ہوتے ہیں، انھیں ماورا الطبیعیات اور
الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، انھیں ایسے خدا کی بھی ضرورت نہیں جو طاقتور تو ضرور ہے، مگر
ان سے خدمت اور نفی ذات کا خواہاں ہے، براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ء) سے لے کر
حضرت عمرؓ کی وفات (۶۴۴ء) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا زریں عہد ہے، جو فلسفیانہ
اسلام سے جدا اور الگ ہے۔

براؤن نے طبری کا ایک طویل اقتباس دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ بازنطینی اور ایرانی
حکومتوں کی شان و شوکت ایک مثل بن گئی تھی، لیکن لوگ ان کی مطلق العنانیت کے بوجھ سے
دبے ہوئے تھے، دونوں شاہی خاندانوں نے دہشت پھیلا رکھی تھی، اور دونوں اپنے مذہبی
تعصب کی وجہ سے لوگوں کو ہر طرح کی اذیتیں دے رہے تھے کہ یکایک عرب کے ریگستان سے کچھ
نئے لوگ نمودار ہوئے جو پہلے تو بیشمار قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، اور باہمی جنگ و خوں ریزی میں
مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہو گئے تھے، وہ آزاد، لباس و غذا میں سادہ، شریف، مہمان نواز اور

سمجھ دار تھے، لیکن اسی کے ساتھ غیور، خوددار، تندمزاج، انتقام پسند، سفاک اور ظالم بھی تھے، دیکھتے دیکھتے نڈی گگی ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لیے، ٹیوٹن نسل کی حکومت کو اپنے قدموں سے کچل دیا اور بقیہ یورپ میں دہشت پھیلا دی، دوسری طرف ان کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہو گئیں، پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لیے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انھوں نے ایسی توحید کا اعلان کیا، جس کو لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا اور جو آج بھی انسانی آبادی کے دسویں حصہ کا مذہب ہے۔ براؤن نے ڈوزی کا یہ اقتباس دے کر اس کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اس کے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے، گرچہ ڈوزی کے بعض خیال سے مسلمانوں کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔

براؤن نے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی، خلفائے راشدین، حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت علیؓ کی خلافت اور معاویہؓ کا اس سے انکار، جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں، خوارج، معاویہؓ کے ساتھ صلح، امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری، یزید، معرکۂ کربلا، ابن زبیرؓ اور مختار کی بغاوتوں، عبدالملک کی حکومت، حجاج کے مظالم، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابن عباسؓ کے پروپیگنڈے، بنی امیہ کے زوال کے اسباب، ابومسلم خراسانی، عباسی حکومت، برامکہ، نوروز تہوار کے احیاء وغیرہ کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے ان پہلوؤں پر ان کی نظر اچھی تھی۔

براؤن کے یہاں معتزلہ اور اشاعرہ کی بھی بحث ملے گی، ان کے خیال میں معتزلہ شروع ہی سے یونانی فلسفہ سے متاثر رہے، عباسی خلیفہ متوکل (۲۳۲ھ-۲۴۷ھ) کے زمانہ میں ان کی سیاسی حیثیت ختم ہو چکی تھی، لیکن ان کے دبستان خیال کی تین سو سال بعد بھی زمخشری جیسے مفسر قرآن نے نمائندگی کی، براؤن نے ابوالحسن اشعریؒ اور ان کے بزرگ ابوموسیٰ اشعریؓ کے بے عقل ہونے کی تائید کی ہے، اس رائے سے مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کو اتفاق نہیں۔

براؤن نے اخوان الصفا جیسی جماعت کو اہمیت دی ہے، جس کے ذریعہ سے ان کے خیال کے مطابق اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق ہوئی، براؤن نے زرتشتیوں کے صاحب کتاب ہونے کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کرنے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان سے کہا کہ میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔ براؤن نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لیے اس کے خلاف ایرانی جذبات کارفرما ہے، اس کے برخلاف ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؓ کی شادی یزدگرد سوم کی لڑکی شہربانو سے ہوئی، جن سے نو امام عالم وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبر اور ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے، ایران میں حضرت شہربانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، ان کے نام سے ایک پہاڑ بھی ہے، جس کو کوہ بی بی شہربانو کہا جاتا ہے اور جو تہران سے ۴-۳ میل جنوب میں ہے۔

براؤن کے نزدیک ایران پر عربوں کی فتح سے زیادہ مشکل کام اسلام کا زرتشتی مذہب پر غلبہ حاصل کرنا تھا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان فاتحوں نے لوگوں کیلئے قرآن اور تلوار کے سوا کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انھیں جزیہ دینا پڑتا تھا، کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں پر کوئی خاص سختی کی گئی، یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، بیشتر تبدیلی مذہب اختیاری تھی، براؤن کی اس رائے سے ان کی رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔

براؤن نے بہت سے مسلمان علماء کا ذکر کر کے ان کے تبحر علمی اور دقت نظر کا اعتراف کیا ہے ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی ہیں جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں، "جہاں تک میں فیصلہ کر سکتا ہوں شروع سے لیکر

سترہویں صدی کے آخر تک ممتاز فارسی شعراء کا بہترین تبصرہ انتہائی بدقسمتی سے اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعرالعجم ہے' براؤن کی اس رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کیے جانے کی ضرورت ہے، علامہ شبلیؒ کی منتخب تصنیفات اور تالیفات کو دنیا کی زبانوں میں' خاص کر انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ دوسری زبان کے لوگ اس سے پورے طور سے استفادہ کرسکیں۔

یہ مقالہ ختم ہوا تو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے پروفیسر امیر حسن عابدی سے یہ سوال کیا کہ براؤن کا خیال ہے کہ اسلام نے ایران کی صرف اوپری سطح کو چھوا تھا اور جو چیز ایرانیوں کے خون میں شامل تھی کبھی ختم نہیں ہوئی، اس کی ایک شکل عجمی تصوف ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا: الحذر زیں گوسفنداں الحذر۔ کیا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟ پروفیسر امیر حسن عابدی نے جواب دیا کہ تصوف کی بحث میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا ہوں، کیونکہ میں فارسی کا طالب علم ہوں' اور وہ بھی ادب کا، اسلامیات کا نہیں، اس سیمنار کے لیے میں نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے اسلام کا مطالعہ ضروری تھا، براؤن نے اسلام کا مطالعہ جس طرح کیا' وہی میں نے پیش کیا ہے، میرے مقالہ میں تصوف کا ذکر کہیں نہیں ہے، اس لیے تصوف پر براؤن کے خیالات پر بحث کرنا اس وقت مناسب نہیں ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی | مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مقالہ "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور اور اصلاح حال کی راہ" کے عنوان سے تھا جو بڑا پُرمغز اس لیے تھا کہ پوری تحقیق اور امعان نظر سے لکھا گیا تھا، یہ مقالہ معارف کی زیر نظر اشاعت میں چھپ رہا ہے، جس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جاسکتا ہے، اسی کے کچھ حصے حاضرین کو پڑھ کر سنائے گئے، اس میں قابل توجہ وہ حصہ ہے'

جس میں مستشرقین سے محاذ آرائی کرنے کے بجائے ایک راہِ عمل متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

مستشرقین کی تنقید کو محض مقصد بنا لینا یا ان کی علمی بددیانتیوں کا نوحہ کرتے رہنا تو اسے ذہنی اضمحلال کی نشانی ہے، سب سے پہلے ضرورت یہ ہے کہ روح اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کیے جائیں اور دنیا کے ہر گوشہ سے جدید سائنسی تجربوں کو کام میں لاکر اسلامی علوم و فنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کر دیے جائیں، اس منصوبہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی محتاجی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہوگا وہ علمی جد و جہد میں نئی توانائی پیدا کر دے گا، یورپ نے اب تک حدیث، فقہ اور جغرافیہ وغیرہ کے لاتعداد ماخذ شائع کیے ہیں، اب ضرورت ہے کہ مسلمان علما بھی اسی طرح توجہ کریں، وہ اسلامی تاریخ، تہذیب اور تمدن کے متعلق ایسی انسائیکلوپیڈیا تیار کریں جن کی معلومات معتبر اور نقطۂ نگاہ معروضی ہو، اور جن سے ان تمام نظریات کی اصلاح ہو سکے جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام یا ڈکشنری آف اسلام کے ذریعہ پھیلائے گئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک اجلاس میں کہا تھا: یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قدیم و جدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا کریں، پھر ہر عہد ایک نئے علم کلام کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ اور اس کے منشاے الٰہی کو پورا کرتا نظر آرہا ہے تو علم کلام سائنس کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن کے مطالعہ کو آگے بڑھایا جائے، حدیث کے مطالعہ کو بھی گولڈ زیہر کے حدود سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، وقت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی تشریح موجودہ دور کی ضروریات

کے مطابق ہو تاکہ فقہ اسلامی کے افادی پہلو سامنے آسکیں، آج جب کہ یورپ و امریکہ میں اسلام سے بحیثیت دین غیر معمولی دلچسپی لی جارہی ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس طرح نہ صرف شاخت وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ہو جائے گی بلکہ اسلام کے نظام حیات کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہو جائیں گے، ڈاکٹر اقبالؒ کی دور بین نگاہ نے اس کام کی اہمیت کا اندازہ آج سے پینسٹھ ۶۵ سال پہلے لگایا تھا، اور وہ مولانا انور شاہ کشمیری کے ذریعہ سے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق پیش کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جاسکتا، اس ساری جدوجہد میں آب ورنگ اس وقت پیدا ہوگا جب علمی جذبہ سے سرشار مسلمان علماء و فضلاء علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خون جگر سے اس خاکے میں رنگ بھریں گے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مقالہ کو اس شعر پر ختم کیا ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن   قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

تو مجمع میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوگئی، یہ مقالہ اپنے وزن اور وقار کی وجہ سے بڑی توجہ اور خاموشی سے سنا گیا، اس پر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا، شاید اس لیے کہ اس میں کوئی متنازع فیہ بات نہیں تھی، یہ ایک علمی، تحقیقی اور تاریخی رنگ کا مقالہ تھا، جس میں قیمتی اور مخلصانہ مشورے بھی تھے اور یہ وہاں دیے جارہے تھے جہاں علماء کا سنجیدہ طبقہ بھی تھا، ان میں جدید طبقہ کے جذبات کی ترجمانی بھی ہے کہ وہ اس ترقی یافتہ دور میں اپنے ذہنی، قلبی، نظری اور فکری تسکین کے لیے اپنے ارباب فکر سے کس قسم کی توقع رکھتا ہے، امید کہ یہ آواز جس اخلاص سے اٹھائی گئی ہے اسی اخلاص سے سنی بھی جائے گی، مگر اسلامی علوم و فنون اور ان کے ماخذوں کی کمی کا احساس بھی زیادہ صحیح نہیں، تیرہ سو ۱۳۰۰ سال کے اندر اسلام اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اگر ان کا مطالعہ

خاطر خواہ طریقہ پر کیا جائے تو ان تمام غلط نظریات کی تردید اور اصلاح ہو جائے جو کسی مقصد کی خاطر پھیلائے گئے ہیں اور اب تو اسلامی ادارے، اسلامی سنیٹر اور اسلامی ریسرچ انسٹیٹیوٹ جا بجا نئے قائم ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہر قسم کا لٹریچر مہیا ہو رہا ہے، ان میں نیا کلامی رنگ بھی ملے گا، صرف ان کو زیادہ سے زیادہ عام کرکے ان میں توانائی اور آب و رنگ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے سلسلہ میں بھی کافی لٹریچر مہیا ہو رہا ہے، اس میں اگر باضابطگی اور باقاعدگی پیدا کر دی جائے تو یہ مشکل آسانی سے خود بخود حل ہو جائے، مگر ذہنی تسکین کا مسئلہ کبھی ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے کہ مذہب، مذہب کی اساس اور مذہب کی روح قربان ہو کر رہ جاتی ہے، جیسا کہ آج کل کی مغربی دنیا میں ہو رہا ہے، وہاں مختلف قسم کے نظری اور فکری خیالات کے انبار کے نیچے مذہب بالکل دب کر رہ گیا ہے، رہا مستشرقین کی علمی بددیانتیوں کو ظاہر کرنے میں ذہنی اضمحلال کا سوال، تو اس پر اس زاویۂ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی بظاہر معروضی تحقیقات کا جواب معروضی انداز میں اگر دیا جائے تو یہ علمی اور تحقیقی خدمت بھی ہے، ان مستشرقین پر یہ بھی ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ظنیات کو یقینیات کا درجہ دے کر اور اپنے نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات میں سلسلۂ معلولات پیدا کرکے علم اور تحقیق جیسے مقدس اور معصوم فن کو کس قدر مجروح کر رہے ہیں، خود بھی گمراہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی | مولانا کا مقالہ "پروفیسر اجناس گولڈ زیہر" پر تھا، وہ اس کا کچھ حصہ ہی پڑھ پائے، شروع میں یہ بتایا کہ ان کی ولادت ہنگری کے ایک شہر میں ۱۸۵۰ء میں ہوئی، پانچ برس کی عمر میں عہد عتیق کے عبرانی ایڈیشن کا مطالعہ شروع کیا، آٹھ برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، بارہ برس کی عمر میں عبرانی زبان میں ایک مقالہ لکھا، پھر بوڈاپسٹ، لپزگ، برلن اور لیڈن میں مزید تعلیم پائی، لیڈن کے قیام میں اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق ان کی علمی زندگی کا

نہایت اہم مشن بن گیا۔ جامعہ ازہر قاہرہ کے بھی وہ طالب علم رہے، اپنے وطن واپس آکر اسلام کا تحقیقی مطالعہ جاری رکھا، جب ۱۸۷۱ء میں وائنا کی امپیریل اکیڈمی میں ان کے علمی کارنامے کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ، خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے ان کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگیں، معاشی ضرورتوں سے مجبور ہوکر وہ یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کام کرتے رہے، مگر اپنی علمی تحقیقات بھی جاری رکھیں، ۱۹۰۴ء میں وہ بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر ہوگئے، پھر اسلامی فقہ کے شعبے کے صدر ہوئے، ان کے تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن چند معرکۃ الآرا کتابیں یہ ہیں: (۱) فرقہ ظاہریہ (۲) اسلامیات کا مطالعہ (۳) اسلامی دینیات اور قانون (۴) مذاہب التفسیر الاسلامی میں تفسیر قرآن کے مختلف مناہج سے بڑی محققانہ بحث ہے۔

پھر مولانا نے گولڈزیہر پر جو عام تبصرہ کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے: گولڈزیہر یہودی تھے، ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم دیدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی معاملات ومسائل میں اپنے آپ کو عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، ان وجوہ کے باعث گولڈزیہر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے، اس کے متعلق بدنیتی کا الزام نہیں دیا جاسکتا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ گولڈزیہر نے غلطیاں نہیں کی ہیں، ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں (۱) مستشرقانہ غلطیاں (۲) علمی غلطیاں،

مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ یاد کر لینا چاہیے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت وعظمت کا دل وجان سے قائل ہو وہ بہرحال غیر مسلم ہے، اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کرتا ہے وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر

ہرگز نہیں ہو سکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لیے بعض جو بنیادی عقائد ناگزیر ہیں اگر مستشرق بھی ان عقائد کا حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا اسلام میں تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبویؐ اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا، یہ اور اسی طرح کی چند اور باتیں ہیں جو مستشرقین عام طور سے تسلیم نہیں کرتے، گولڈ زیہر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈ زیہر سے ہوئی ہیں وہ علمی غلطیاں یا تعبیر و بیان کی فروگذاشتیں ہیں، لیکن یہ چنداں تعجب انگیز نہیں اور ان سے گولڈ زیہر کے بلند مرتبہ و مقام پر حرف آتا ہے، جو انھیں علم و تحقیق کی بارگاہ معلّٰی میں بجا طور پر حاصل ہے، اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ جہانتک ان کی مستشرقانہ غلطیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق ہے مسلمان تو مسلمان، زمانۂ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور ان کی طرف سے ان کی معذرت کی ہے، ان کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا" پر برنارڈ لیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ گولڈ زیہر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لیے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین ہی کو بناتے ہیں، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈ زیہر بھی قرآن کو پیغمبر اسلامؐ کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈ زیہر نے بھی قرآن و حدیث میں عہد جاہلیت اور بعض اجنبی اثرات پر بحث کی ہے، یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈ زیہر نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ اب سے ایک سو برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی، لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لیے آزردگی کا سبب ہو، برنارڈ لیوس نے گولڈ زیہر کی "انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا" کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث

اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات و تشریحات کے معاملہ میں گولڈ زیہر کی تحقیقات کو ان نئے معلومات اور دلائل کی روشنی میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے جو گولڈ زیہر کے بعد سے اب تک حاصل ہو چکے ہیں اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مہر تصدیق ثبت کردی ہے، برنارڈ لیوس ان غلطیوں اور فروگذاشتوں کو سامنے لاکر یہ بھی لکھتا ہے کہ گولڈ زیہر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہمدردی کا جا بجا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہے، ان کے معاصرین اور پیش رو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرکے اور ان میں رد و بدل کرکے اسلام پر اعتراضات کیے تھے، گولڈ زیہر نے ان لوگوں کی پردہ دری کرکے اسلام کی حقانیت، اصلیت اور ان کے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں وہ عیسائیت کے ان علماء کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں تو اپنی یکطرفہ عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لیے معیار تنقید بہت سخت اختیار کر لیتے ہیں۔

پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈ زیہر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ بڑی بات تو یہ ہے کہ عرب علمائے اسلام کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ علمائے عرب نے گولڈ زیہر کی دو کتابوں کے ترجمے "مذاہب التفسیر الاسلامی" اور "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی" کے نام سے کیے، اول الذکر ترجمہ قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار کا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ قرآن مجید کے درس و مطالعہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد، منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کارنامہ ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض دینی عواطف و جذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح گولڈ زیہر سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، یہ علمی اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، لیکن گولڈ زیہر کو ایک عالم اور محقق کی

حیثیت سے جو بلند مرتبہ حاصل ہے، اس کو ان غلطیوں سے نقصان نہیں پہونچتا، مذکورۂ بالا دوسرا ترجمہ مصر کے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر، اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے مل کر کیا ہے، اس ترجمہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے مستشرقین پر عام تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ کے جن علماء نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے، ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے، اس لیے یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق و تدقیق کے بعد جو بات حق نظر آئی، اسے برملا کہا، گولڈزیہر کا شمار اسی طبقہ سے ہے، پھر ان کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا" کے بارہ میں لکھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدہ اور شریعت کے نشو و نما اور عہد بہ عہد اس کا ارتقاء، زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی تحریکات اور ان کے اسباب و علل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، اس کتاب میں انہی مراجع سے کام لیا گیا ہے جو معتبر ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت معاون رہی ہے، لیکن اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں، اس کے وجوہ متعدد ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی، اصول اور اصل روح تک پہونچنے سے قاصر رہا۔ اس کے بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بتایا کہ فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت سے گولڈزیہر کی کتابوں کو عربی جامہ پہنایا، دوسری طرف اس کی نوع بہ نوع غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح بھی کی، آخر میں مولانا نے اپنے سامعین کو مخاطب کر کے کہا کہ جو روش علمائے عرب نے پروفیسر گولڈزیہر کی نسبت اختیار کی ہے، وہی روش ہمیں گولڈزیہر جیسے دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہیے۔

مولانا تقی الدین تبصرہ جب یہ مقالہ ختم ہوا تو ابوظبی کے نمایندہ مولانا تقی الدین مظاہری ندوی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

حضرت مولانا نے اپنے مقالہ میں گولڈزیہر کے سلسلہ میں علمائے عرب کے بیانات نقل کرکے ان کو سراہا ہے، مگر مجھے تعجب ہے کہ مولانا کی نگاہ سے عرب علماء میں ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی کی کتاب" السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" نہیں گذری، اس میں ڈاکٹر صاحب نے گولڈزیہر کے افکار ونظریات کا پوسٹ مارٹم کیا ہے، میں وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفاء کروں گا۔

گولڈزیہر نے امام زہریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

انّ ھؤلاء الامراء اکرھونا	ان امرائے بنی امیہ نے ہمیں ایسی
علی کتابۃ احادیث	حدیثیں تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

اس میں احادیث کے لفظ میں انھوں نے سراسر تحریف سے کام لیا ہے، اور الاحادیث کو احادیث کر دیا ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تدوین حدیث کے لیے امام زہریؒ کو مقرر کیا تو ابتداء میں وہ اس پر راضی نہیں ہوئے، مگر بعد میں راضی ہوگئے، یہ گولڈزیہر کی تحقیق کے بجائے سراسر تحریف ہے کہ امام زہریؒ نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان امراء نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اپنی طرف سے ایسی ایسی حدیثیں بنا کر پیش کریں جن سے بنی امیہ خوش ہوں، گولڈزیہر نے ایک کارنامہ تو یہ انجام دیا، دوسری مثال جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ حافظ ذہبی کا یہ قول ہے:

لم یجتمع علماء ھذا الشان	علمائے فن کا کسی ثقہ کو ضعیف
علی تضعیف ثقۃ ولا علی	قرار دینے اور کسی ضعیف کی توثیق

توثیق ضعیف ۔ کرنے پر اتفاق نہیں ۔

امام ذہبی تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس راوی کے ضعیف ہونے پر علماء کا اتفاق ہو اس میں کلام ہی نہیں، اسی طرح جن کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے ان میں بھی کوئی کلام نہیں، کلام ان رواۃ میں ہے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ ثقہ ہیں یا ضعیف؟ لیکن گولڈ زیہر نے اس کا یہ مطلب نکالا ہے کہ رواۃ میں کوئی ایسا راوی ہی نہیں ہے جس پر علمائے فن کا اتفاق ہو، گویا وہ کتب رجال کے سارے ذخیرے ہی کو مشکوک قرار دینا چاہتے ہیں، ان کے یہاں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں، مولانا سے درخواست ہے کہ وہ علمائے عرب میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ کی یہ کتاب بھی پیش نظر رکھیں تاکہ گولڈ زیہر کی تلبیسات کا اندازہ ہو اور معلوم ہو کہ انھوں نے اسلامی حقایق کو کس طرح مسخ کیا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس کا جواب دینا چاہا، لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے مباحثہ روک دیا گیا، پھر اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تقریر عربی میں شروع ہوگئی ۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی | صدر صاحب نے پہلے مقالہ نگاروں کے مقالات پر اپنے کچھ خیالات ظاہر کیے، جس کو سن کر اس حیثیت سے تعجب ہوا کہ وہ اردو نہ جاننے کے باوجود ان کے مطالب سے کچھ نہ کچھ واقف ہوگئے تھے، ان کی رائے تھی کہ ایک ایک مستشرق پر علٰحدہ علٰحدہ مضمون لکھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اہل نظر کے سامنے آجائے گا' پھر انھوں نے فرمایا کہ قدیم مستشرقین نے سیرت، حدیث، تاریخ، تصوف اور تمدن اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے' اور جدید مستشرقین کے جو خیالات و افکار ہیں' ان سب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، انھوں نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی کہ آج کل یہ مستشرقین خود آپس ہی میں

دست وگریباں ہیں، ایک داہنے جانب ہے تو دوسرا بائیں جانب ہے، اور وہ ایک دوسرے کی تردید و تنکیر میں لگے ہوئے ہیں، اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس طرح ہم کو ایک بڑی جنگ لڑنے سے بچنے کا موقع فراہم ہو گیا ہے، صدر موصوف نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ مستشرقین کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا مستشرقین کے تلامذہ کا ہے جو اب ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور ان مستشرقین ہی کے دماغ وعقل سے سوچتے ہیں، وہ اس لحاظ سے نسبتہً زیادہ خطرناک ہو رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہوتے ہیں، ان کی تحقیقات وتالیفات مسلمانوں کے حلقوں میں بہت جلد پہونچ جاتی ہیں، اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس پر اعتماد بھی کر لیا جاتا ہے، ایسے افراد کا مقابلہ بھی کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اس تقریر کے بعد پہلی نشست ختم کی گئی۔

(باقی آیندہ)

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

از مولانا سید سلیمان ندویؒ

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی وتحقیقی مضامین کا یہ بیش قیمت مجموعہ ہے، گو اس کے مضامین میں بڑا تنوع ہے، تاہم حدیث وسنت سے متعلق اس مجموعہ کے مضامین خاص طور پر معرکۃ الآرا ہیں، اس سلسلہ کے مندرجہ ذیل چار مضامین میں حدیث ورجال حدیث کے بارہ میں مستشرقین کے اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے، اور ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے (۱) محمد بن عمر الواقدی اور سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی (۲) پھر واقدی (امام زہری پر الزام) (۳) سنت (۴) پھر بحث سنت (کچھ اور اعتراضات والزامات) قیمت ۔/۲۰ روپئے

"منیجر"

"اسلام اور مستشرقین" سے متعلق

خطوط

اٹک شہر (سابقہ کیمبل پور) 19/۴/۸۱

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

"اسلام اور مستشرقین" کے عنوان سے بین الاقوامی سیمینار منعقد کرنے پر احقر کی جانب سے کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ دلی مبارکباد قبول فرمائیں، بحمدہ تعالیٰ دار المصنفین نے اسلام کی ایک بڑی خدمت کرکے اپنے لیے محشر میں سرخ روئی کا کافی سامان مہیا کرلیا ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔۔

اس موضوع پر مجلس مذاکرہ کا انعقاد وقت کی سب سے بڑی علمی و دینی ضرورت ہے، مغربیت زدہ مرعوب مسلمان مستشرقوں کو ہی عالم سمجھ کر ان کی اقتدار کرتے ہیں، حالانکہ ان کا مبلغ علم ناقص اور ان کی نیت بخیر نہیں، اگر اس سیمینار کی پوری رپورٹ کے ساتھ حتی المقدور ان کے مبلغ علم پر بھی مواد شایع کیا جائے تو اس سے بہترین نتائج پیدا ہوں گے، اس گنہ گار نے اپنی لغات مرتب کرتے وقت کچھ حوالجات جمع کیے تھے، جن میں چند پیش خدمت ہیں:

(۱) مشہور امریکی مستشرق فلپ کے حتی نے "دی عرب" نامی کتاب میں پرچم نبویؐ عقاب کے متعلق ترجمہ کرتے وقت "Eagle" لکھا ہے، پھر اس کا ترجمہ کرتے وقت عبد السلام خورشید نے لکھا ہے کہ:

"علم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر عقاب بنا ہوا تھا"

(عربوں کا عروج وزوال از عبد السلام ص ۵۸)

حالانکہ تمام لغات عرب میں ہے، ھو ضرب من ثیاب الھودج الموشی۔

(۲) جرمن مستشرق فلوگل نے نجوم القرآن مطبوعہ ۱۹۰۰ء میں عجیب گل کھلائے ہیں، مثلاً لیزلقونک کو زُلفیٰ سے اور اِلحافًا کو اِلحاق سے اور فَاسْتَبِقُوا کو بقی سے اور فردوس کو فردٌ سے مشتق قرار دیا ہے۔

(۳) پادری احمد شاہ نے مفتاح القرآن میں کئی اغلاط کا ارتکاب کیا ہے، مثلاً ثُلّة اور ثُمَّ کو ایک سمجھ لیا، اور جَرَحْتُم کا معنی تم نے زخمی کیا، کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ جناب کو اپنے رفقار کے ساتھ باعافیت رکھ کر علوم اسلامیہ کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

محتاج دعائے حسن خاتمہ: قاضی زاہد الحسینی دارالارشاد اٹک شہر، پاکستان۔

(۲)

دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک ۲۹ر اپریل ۱۹۸۲ء

مکرمی! السلام علیکم

معارف کی مارچ و اپریل کی اشاعتیں ایک ساتھ موصول ہوئیں، اس میں آپ کے قلم سے مستشرقین پر منعقدہ عالمی سیمنار (اعظم گڈھ) کی روداد پڑھ کر اس سیمنار کی اہمیت، عظمت اور افادیت کا احساس ہوا، روداد کی خوش سلیقگی اور حسن ترتیب دل کو بھا گئی، سیمنار میں شریک ہوئے مہمان علماء اور اصحاب بینش و دانش کا تعارف جس بلیغ انداز میں ایجاز کے ساتھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اور شخصیات کی "جلالت علم" کی قلمی تصویر صفحۂ کاغذ پر جس پر وقار انداز میں اپنے

موئے قلم سے کھینچی ہے، وہ آپ ہی جیسے فن کار مشاق اور آزمودہ کار قلم کار ہی کا حصہ ہے، دور بیٹھے ہوئے لوگ بھی سیمینار کی روداد کی ان دو قسطوں کو پڑھ کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا وہ بھی شریک محفل ہیں، انکھوں دیکھا حال تو سبھی لکھتے ہیں، مگر آپ نے تو سیمینار کی کارروائی کو قلم کے ذریعہ "ٹیلی کاسٹ" کر دیا ہے، معارف کا مطالعہ کرنے والا ناظر صرف کاغذ پر لکھی ہوئی کارروائی کا ہی مطالعہ نہیں کرتا، بلکہ اس تحریر کے آئینہ میں تقریر و تصویر دونوں کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ اور کانوں سے براہ راست سماعت کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، یہ آپ کا کمال انشاء پردازی ہے۔

سیمینار میں آپ کی خیر مقدمی تحریر، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ کے استقبالیہ ارشادات بڑے ہی بصیرت افروز ہیں۔

مستشرقین کے بارے میں آپ نے بڑی احتیاط مگر بڑی بے باکی کے ساتھ حقایق کا اظہار فرمایا ہے، اور مولانا شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کے رہنما ارشادات کے اقتباسات پیش فرما کر سیمینار کو صحیح سمت میں رواں دواں ہونے کا راستہ دکھایا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب نے بجا طور پر مستشرقین کی جانبداری اور تعصب کو واشگاف فرمایا ہے، اور بڑے دلنشین اسلوب میں ظاہر فرما کر دینی ژرف نگاہی اور بلند خیالی کا ثبوت مرحمت فرمایا، مولانا کی تقریر معلومات کا ایک بحر بیکراں تھا جس سے سیمینار میں آنے والے جویائے علوم اور غواص معانی نے درہائے آبدار حاصل کیے ہوں گے، یہ سیمینار اپنی انفرادیت و افادیت کے لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کا حامل بن گیا ہے، دارالمصنفین اعظم گڈھ کی گذشتہ زریں خدمات کے ساتھ یہ اس کا جدید کارنامہ ایسا ہے جسے آنے والا مورخ سونے کے حروف سے لکھے گا، فی زمانہ ایسے تحقیقی سیمینار کی اشد ضرورت تھی جس کا سہرا آپ کے سر ہے، خداوند کریم آپ کی یہ علمی سعی کامیاب کرے۔ والسلام دعاگو: منظور الحسن برکاتی

ادبیات

غزل

از
جناب محمد حسین فطرت بھٹکلی، بھٹکل

ہزار جام [illegible] بزم میں چھلک جائے
مرے شعور کو زیبا نہیں بہک جائے

جنوں میں خندۂ گل کا بہار نام نہیں
یہاں تو شرط ہے زخمِ جگر مہک جائے

ہوس کی چارہ گری سے کبھی نہیں ممکن
جگر کا داغ مٹے، درد کی کسک جائے

چمن کے پھول بھی نشتر زنی میں کیا کم ہیں
نگاہِ دہر میں کانٹا ہی کیوں کھٹک جائے

ترے لہو کا ہو فیضانِ صبح و شام اگر
تو کیا عجب ہے کہ پتھر پہ گل چٹک جائے

اندھیری رات کا جگنو کی ضو سے دور نہ ہو
ہزار صحنِ گلستاں میں وہ چمک جائے

اگر ہو چارہ گری پر مسیحا آمادہ
مریضِ عشق کے سینے میں دم اٹک جائے

زمانہ کھوکھلے دعووں کا تو نہیں قائل
جسے ہے زعمِ جنوں دار پر لٹک جائے

امیدِ رقصِ صبا تو نہیں ہے اے فطرتؔ
سمومِ وقت سے شاخِ چمن لچک جائے

باب التقریظ والانتقاد

مثنوی حزن اختر

(ایک جائزہ)

از جناب سبط محمد نقوی صاحب اکبرپور

مثنوی حزن اختر سلطان عالم واجد علی شاہ کی تصنیف ہے، جسے میرے کرم فرما نواب امجد علی خاں نے اچھی کتابت اور طباعت کے ساتھ خوش نما سرورق سے مزین کرکے تیسری بار شائع کیا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت بادشاہ مرحوم کی حیات میں انہی کے قائم کردہ مطبع سلطانی کلکتہ سے ۱۸۶۰ء (۱۲۷۶ھ) میں ہوئی تھی، اسے دوسری بار ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں محبوب علی صاحب ناظم دائرہ ادبیہ لاٹوش روڈ نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا، اس اشاعت میں مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم کا مقدمہ بھی شامل تھا،

زیر جائزہ اشاعت سے شرر مرحوم کا مقدمہ ساقط کر دیا گیا ہے، اور ۸۶ صفحات کے متن کے ساتھ ۱۵۶ صفحات کا سابقہ اور لاحقہ شامل کرکے ۲۴۲ صفحات پر کتاب مشتمل ہے۔ ان ۱۵۶ صفحات میں سے ۴ صفحات ڈاکٹر انیس اشفاق کے پیش لفظ پر مشتمل ہیں، جنھوں نے اسی کتاب سے اپنی مقدمہ نگاری کا افتتاح فرمایا ہے، بقیہ تمام کا تمام مرتب مکرم کے رشحات قلم ہیں،

پیش کش اس اعتبار سے بھی بڑی خصوصیت کی حامل ہے، کہ اس کی بسم اللہ ہی غلط کی

گئی ہے یعنی مثنوی حزن اختر کے نام میں توضیحی فقرے خطوط وحدانی میں (واجد علی شاہ کی آپ بیتی) لکھے گئے ہیں، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو داستان اسیری یا زندان نامہ کہا جانا چاہئے، آپ بیتی کی اصطلاح جس وسیع مفہوم کو محتوی ہوتی ہے، اس سے اُسے دور کا تعلق بھی نہیں. تقریباً بارہ سو سات سات کے اس منظومے میں حمد، نعت، منقبت، ساقی نامہ کے تقریباً سو بیتیں ایسی ہوں گی جن میں انتزاع سلطنت اور مہاجرت کا ذکر ہے، ورنہ سب سب اسیری سے متعلق بیان ہے، یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ نوجوان اور صاحبِ صلاحیت پیش لفظ نویس نے مغز سخن تک پہونچنے کی زحمت نہیں کی، اور جا بجا مثنوی کو آپ بیتی یا خود نوشت ہی تعبیر کیا ہے،

اس منظومے کو آپ بیتی قرار دینے کے باوجود فاضل مرتب نے بیان واقعی کے عنوان سے واجد علی شاہ کے حالات کا مبسوط بیان کیا ہے، اور وہاں بھی خشتِ اول کج نہادی کا کار فرما ہے،

واجد علی شاہ کا سالِ ولادت واجد علی شاہ کے سنہ ولادت میں بڑے اختلافات ہیں، اس ضمن میں اُن کے اپنے بیانات میں بھی تباین ہے، اردو کے مایہ ناز محقق و نقاد پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے جو تاریخ اودھ پر محققانہ ہی نہیں گہری مبصرانہ نظر بھی رکھتے تھے، کافی تلاش و تفحص کے بعد مستند مدرک کی مدد سے سنہ ولادت ۱۲۳۸ھ قرار دیا تھا، مگر مرتب نے منشی رام سہائے تمنا، حکیم نجم الغنی خاں کے بیانات اور چھبن لال مجز کے قطعۂ تاریخ پر اعتماد کر کے سنہ ولادت ۱۲۳۳ھ تسلیم کر لیا، اور دلیل یہ دی کہ مجز کے قطعۂ تاریخ پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مرتب مکرم غور فرماتے تو مجز کے قطعۂ تاریخ پر اعتماد نہ کرنے کے حسب ذیل وجوہ فوراً سامنے آجاتے (۱) چھبن لال مجز ایسے مشاہیر شعرا میں نہیں ہیں کہ جن کا

بت ممکن ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ زمانۂ ولادت میں نہ کہا گیا ہو بلکہ تمنا کی کتاب
، تصنیف کے وقت کتاب کی زینت بڑھانے کے لئے کہا گیا ہو، [illegible] اسطور کا قیاس
کہ پہلا مصرع "آسماں جاہ و ثریا منزلت" امجد علی شاہ کے خطابات کی طرف
اور اغلباً یہ خطابات انہیں ولی عہد ہونے کے وقت ملے ہیں، اور یہ واقعہ امجد علی
پسہا برس بعد کا ہے (۲) تمنا اور نجم الغنی ۱۰ ر ذی قعدہ کے ساتھ روز شنبہ
، اور یہ تاریخ منگل کے دن ۱۲۳۷ھ ہی میں واقع ہوئی تھی ۱۲۳۸ھ میں
یکشنبہ یا دوشنبہ کو واقع ہوئی تھی (۳) منشی تمنا نے کافی تصریح کی ہے کہ "۱۰ ذیقعدہ
بی سمبت ۱۸۷۹ ساون سودی دوادشی روز سہ شنبہ بعدہ ۵ گھڑی ۲۹ پل جنتیا
جناب مرتب نے یہ عبارت نقل بھی فرمائی، پھر بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی، کہ
کی تطبیق کر لی جائے، انھوں نے یہ زحمت برداشت کی ہوتی تو جو ٹھوکر کھائی ہے
پھیلائی ہے، اس سے بچے رہتے، واقعہ مختصراً یہ ہے کہ سمبت اور ساون کی تاریخ
ہی سے مطابق ہیں، ۱۲۳۸ھ کی ۱۰ ر ذی قعدہ کو سمبت ۱۸۸۰ کے اساڑھ
دشی تھی، ساون نہیں (۴) مرتب محترم اودھ کے تحقیق کار ہی نہیں، ناٹک اور
رکھی ہیں، ان کی نظر میں یہ بات رہنی چاہیے تھی کہ واجد علی شاہ کے زائچۂ ولادت
ن نے منحوس بتایا تھا، اور تمنا کی لفظوں میں رفع نحوست کی تدبیر واجب ہے
ت میں حالت فقیری اختیار کی جائے، تو نحوست بہ سعادت مبدل ہو جائے"
لی شاہ کی سالگرہ میں ان کی مادر گرامی پوشاک جوگیانہ پہناتی تھیں، اور بادشاہ
وں نے اسی وجہ سے ساون میں جوگیانہ میلے کی طرح ڈالی، اگر ان کی تاریخ پیدائش
۱۲۳۸ھ ہوتی تو میلہ ساون میں نہیں اساڑھ میں ہوتا،

مرتب کی سہل انگاری نے اتنے ہی پر بس نہیں کی ہے، اور تحقیق کی راہ میں کمال بے فکری سے گذرے ہیں، موصوف نے عہد واجد علی شاہ کی اہم تاریخیں ص ۱۰۲ تا ۱۱۰ پر ذکر فرمائی ہیں، ان میں واجد علی شاہ کی ولادت ۳۰ رجولائی ۱۸۲۲ء درج کی ہے، اور یہ ۱۲۳۷ھ ہی سے مطابق ہے، ۱۲۳۸ھ سے نہیں،

شادی | واجد علی شاہ کی شادی کا ۱۲۵۲ھ بتایا جاتا ہے، غالباً اس غلطی کی ذمہ داری خود سلطان عالم کے بیان پر ہے، کیونکہ ان کی نثری تصنیف عشق نامۂ فارس کا جو ترجمہ مرزا فدا علی خنجرؔ نے محل خانہ شاہی کے نام سے کیا ہے، اس میں یہی سنہ مذکور ہے، تحقیق کے ساتھ تو عرض نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مسامحہ ماتن، مترجم یا کاتب میں سے کس کا ہے لیکن لیکن قیاس کا قرینہ کہتا ہے کہ غلطی متن میں ہی راہ پاگئی ہو ورنہ پروفیسر مسعود حسن مرحوم ادیب ایسے دیدہ ور محقق کی نظر متن و ترجمہ کے اس اختلاف پر اٹکے بغیر نہ رہتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی شادی ۱۲۵۲ھ میں ہوئی تھی، اس سلسلے میں واجد علی شاہ کے دو بیانات ایسے ہیں جن میں غلطی کیا، غلط فہمی کی بھی ادنی گنجایش نہیں (۱) مانجھے کی تاریخ ۱۵ رشعبان تھی، ۱۵ رشعبان اس فرقے میں جس سے بادشاہ مرحوم تعلق رکھتے تھے خصوصی اہمیت کی حامل ہے، اور بطور جشن ولادت امام عصرؑ منائی جاتی ہے (۲) یہ تقریب نصیر الدین حیدر شاہ مرحوم کی حیات میں ہوئی، اور تقریب شادی کے ۵ مہینے بعد ان کا سانحۂ وفات پیش آیا، یہ امر مسلمہ ہے کہ نصیر الدین حیدر شاہ کا انتقال ۳ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ کو ہوا، اُن کی حیات کا آخری شعبان ۱۲۵۲ھ میں ہی واقع ہوا تھا، اور واجد علی شاہ کی پہلی شادی کا سال وہی ہے جو اس طرف اگر پہلے کسی کی نگاہ نہیں گئی تو یہ محض اتفاق ہے،

اس بحث میں یہیں یہ دیکھ لینا چاہئے کہ واجد علی شاہ کے پہلے خسر کا نام کیا تھا، زیر نظر

کتاب میں محل خانہ شاہی کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے، اس میں نواب علی تقی خاں لکھا گیا ہے! خود محل خانۂ شاہی میں نواب علی نقی خاں بہت صاف لکھا ہے: اور یہ دونوں بداہتہً غلط ہیں، کیونکہ نواب علی نقی خاں کی صاحبزادی سے عقد ثانی ہوا، اور وہ وزیر اعظم بھی ہوگئے اس لئے خسر کی حیثیت سے بھی سب سے زیادہ شہرت پائی، اس لئے متن میں نواب علی خاں پڑھ کر مترجم نے یہ سمجھا ہوگا کہ نقی لکھنے سے ترک ہوگیا ہے، اور انھوں نے تقی کا اضافہ کر دیا۔ مثنوی حزن اختر کے مرتب نے یہ خیال کیا کہ نواب علی نقی تو دوسرے خسر تھے پہلے خسر ان کے چچازاد بھائی تھے، اس لئے انھوں نے نقی کو تقی بنا دیا، جب کہ اصل یہ ہے کہ اصل نام نواب علی خاں تھا، جیسا کہ ادیب مرحوم نے سلطان عالم واجد علی شاہ (ایک تاریخی مرقع) میں افادہ فرمایا ہے،

واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے فاضل مرتب نے اس سوال پر جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے نفس و ضمیر کی کشاکش کا روشن آئینہ ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ برجیس قدر واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے نہیں ہیں لیکن برجیس قدر بہادر مرحوم کے وارث و جانشین شہزادہ انجم قدر بہادر کا تقرب مجبور کرتا ہے، کہ برجیس کو اسی حیثیت سے پیش کیا جائے، اور اس سوال پر مرتب عزیز کی کیفیت صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والی ہوگئی ہے، ہر چند تفصیل میں طوالت ہے لیکن بے محل نہیں ہوگی، ناظرین گرامی کے لئے دلچسپ بھی ہوسکتی ہے اور موجب عبرت بھی واقعہ یہ ہے کہ برجیس قدر واجد علی شاہ کے چوتھے بیٹے تھے، مگر اب مصالح مقتضی ہیں کہ انھیں ولد اکبر ثابت کیا جائے، اس سلسلے میں مرتب مکرم کی سعی قابل دید ہے، کتاب کے انتساب میں منسوب الیہ کے تعارف کے سلسلے میں رقم فرمایا ہے کہ "..... حضرت برجیس قدر بہادر آخری تاجدار اودھ خلف اکبر حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ اختر بادشاہ اودھ ...." کمال حسن ظن کو

مان لی جائے تو مان سکتے ہیں کہ یہاں لفظ "خلف" اصطلاحی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ بادشاہ کے پسماندہ صاحبزادگان میں برجیس قدر بہادر سب سے بڑے تھے، مگر اس کے بعد ص۱۱ پر ارشاد ہوتا ہے"..... واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے اور پہلی جنگ آزادی کے ہیرو" ....." یہاں تو تاویل سے کام نہیں چلتا، سب سے بڑے بیٹے کا مطلب دلد اکبر ہی ہوتا ہے، یہ بات بھی نہیں کہ مرتب اس حقیقت سے بے خبر ہوں، موصوف نے اس ترتیب سے پہلے بھی اودھ پر دو کتابیں لکھی ہیں، ایک تاجدار اودھ، دوسری تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ، پہلی کتاب تو فی الوقت پیش نظر نہیں ہے، مگر دوسری کتاب (ص ۲۰۲) میں برجیس قدر کو تیسرا بیٹا بتاتے ہیں یعنی حامد علی اور فریدوں قدر کے بعد، اس کتاب میں حالات تو بسط سے لکھے ہیں لیکن بیٹے کے عنوان سے کچھ بھی نہیں لکھا، تاکہ یہ ذکر مستقل یا بلا واسطہ عنوان سے آہی نہ سکے، اور یہ سب مطالبۂ نفس کی تکمیل میں تھا لیکن اسے ضمیر کی ہدایت سمجھنا چاہیے کہ مثنوی کے متن سے وہ ابیات حذف یا مسخ نہیں کئے گئے، جس میں بادشاہ مرحوم نے اپنے فرزندوں کا ذکر فرمایا ہے، اور نہ عنوان کی عبارت میں تحریف کی گئی ہے، ہم کتاب کے کے صفحہ ۱۲۰ پر "ذکر حال شہزادۂ چہارم موسوم بہ مرزا برجیس قدر بہادر طول عمرہ" کا عنوان اور اس کے ذیل میں پانچ ابیات پاتے ہیں، دو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں،

جو وہ چوتھا شہزادۂ رشک بدر　　اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر

وہ مہ قبضۂ مفسداں میں ہے آہ　　بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

کتاب کے ص ۶۳ پر واجد علی شاہ مرحوم کی رحلت کے بعد ان کے متوسلین کے ایک وفد کے برجیس قدر بہادر کی خدمت میں جانے، اسی وفد کے ساتھ برجیس قدر کے کلکتہ تشریف لانے اور انگریزی فوجوں کے برجیس قدر کو محاصرہ میں لے لینے پھر وائسرائے کا

پیام آنے وغیرہ کا بیان ہے، یہ ایسی چیز ہے جو اب تک تاریخ اودھ سے متعلق کہیں بھی نظر قاصر سے نہیں گزری ہے، تحقیقات جدیدہ کا ماخذ یا راوی کا ذکر کرنا محقق کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے لیکن فاضل محقق نے یہ ذمہ داری پوری نہیں کی،

دیانت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بعد وفات واجد علی شاہ مٹیا برج کی تباہی کے بیان میں ان مساعی کا ذکر بھی کیا جائے، جو وہاں کے عزا خانہ بیت النجات کے تحفظ میں بادشاہ مرحوم کے برادر زادے اور خویش مرزا جہاں قدر بہادر نے انجام دیئے تھے، اور اس تعاون کا حوالہ بھی آئے جو مہاراجہ سر پرتاب نرائن سنگھ اور خان بہادر چودھری نصرت علی کی تحریک سے اودھ کے تعلقداروں نے پیش کیا تھا لیکن صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب چیزیں ارادی طور پر محذوف مستور کی جا رہی ہیں،

بادشاہ مرحوم پر وارد کئے جانے والے الزامات واتہامات کی صفائی کے سلسلے میں مسجد اجودھیا ... لوی امیر الدین علی کی عزیمت کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں مرتب کے رویے کو دھاندھلی کے علاوہ کسی اور چیز سے تعبیر ہی نہیں کر سکتے، مرزا جان کی "حدیقہ شہدا" کے تعارف میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے یہ اشعار ہوتا ہے کہ کتاب فاضل مرتب کی نظر انور سے گذر چکی ہے لیکن جہاں جہاں اقتباس یا حوالہ آیا ہے وہ مولوی رئیس احمد جعفری ندوی جامعی مرحوم کی تصنیف "واجد علی شاہ اور اُن کا عہد" کی معرفت آیا ہے، اور جہاں جہاں بھی اقتباسات میں نواب لکھا گیا ہے، وہاں خطوط وحدانی میں بادشاہ کا اضافہ کر کے وزیر علی نقی خاں کے اقدامات کو بادشاہ کے سر منڈھ دیا گیا ہے، جعفری صاحب مرحوم کثیر لجہات بسیار نویس مصنف تھے، عام طور سے مشہور ہے، کہ وہ اخذ و اقتباس کا کام بھی اپنے رفقا و معاونین سے لیا کرتے تھے، مرحوم نے اودھ کی تاریخ کو اپنے خصوصی مطالعہ کا موضوع بھی نہیں بنایا تھا،

اگر نواب سے کہیں انھوں نے بادشاہ مراد لے لیا تو چنداں قابل اعتراض و استعجاب نہیں کیونکہ غازی الدین حیدر کے وسط دورِ حکومت تک اودھ کے فرمانروا نواب یا نواب وزیر کہے جاتے ہی تھے لیکن نواب امجد علی خان تو تاریخ اودھ کا خصوصی مطالعہ فرما رہے ہیں، زیر نظر کتاب سمیت اب تک تین تاریخی کتابیں پیش فرما چکے ہیں، اس موضوع پر جو ناٹک لکھے اور کھیلے ہیں وہ مستزاد ہیں، وہ نواب کو عصری مصنف کی تحریر میں بادشاہ سمجھیں، اور بطور توضیح اس لفظ کا بلا استشہاد اقتباس میں اضافہ فرمائیں، نہایت نازیبا ہے، نواب امجد علی خاں کی عبارتوں یا اُن کے مقتبس حصّوں کے نقل و اعادہ کی ضرورت نہیں ہے ہم اصل کتاب کے ایسے حوالے حاضر کرتے ہیں جس سے یہ بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ مرزا جان اور خود مولانا امیر علی بادشاہ کو بادشاہ اور نواب کو نواب ہی سمجھتے ہیں، یہ امر غیر اختلافی ہے، کہ غازی الدین حیدر شاہ کے اعلان بادشاہت کے بعد وزیر کو نواب کہا جاتا رہا ہے، اور علی نقی خاں کا خصوصی خطاب حضور عالم تھا، اقتباسات اس امر کی بھی شہادت پیش کریں گے، کہ اصل معاملہ سے بھی بادشاہ کو بڑی حد تک ناواقف رکھا گیا، اب آپ حدیقہ شہدا کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں،

(۱) دیباچہ (ص ۳) "عذر تقصیر مدح سلطان و وزیر بعد حمد و نعت کے محرّروں کا دستور ہے کہ بادشاہ وقت اور اس کے وزیر کا زبان قلم سے مذکور ہوتا ہے لیکن اس مختصر میں اول سے آخر تک انہی حضرات کا ذکر ہے اس لئے عاصی نے اغماض کیا،"

(۲) "اس کے بعد کہتے ہیں (ص ۷) عہدِ حکومت محمد علی شاہ فردوس منزل میں پھر اذان کی رسم جاری ہوئی،...."

(۳) مصنف آگے بتاتا ہے (ص ۱۵) "چنانچہ ان دو تین صاحبوں نے کیفیت راست بے کم و کاست.... بارگاہ شاہی ہندوستان ہی میں ارسال کی ہے،"

(نمبر ۴) یہ بہت واضح اور بین شہادت ملاحظہ فرمائیں، (ص ۱۷) "........... یہ فقرہ
جما کے نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم! یہ کیفیت جو دونوں مولویوں کی
دو حرفی ہے، اس کا کیا اعتبار، یک طرفی ہے، اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا، اور اپنی رعایا کو ستانا
ضعف عملداری، بلکہ رعیت آزاری ہے، آپ نایب سلطان ہیں، آپ کے نزدیک برابر
ہندو اور مسلمان ہیں"

راقم کا خیال ہے کہ یہ اقتباسات کسی کو بھی یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ مرزا جان
سلطان و نواب کے فرق سے ہی واقف نہ تھے، بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضور عالم نواب کا لقب ہے۔
ذیل کا اقتباس یہ ثابت کر دیگا کہ اس معاملے سے بادشاہ کو زیادہ تر ناواقف رکھا گیا،

(۵) حاجی بشیر الدولہ کے بارے میں مصنف کہتا ہے، (ص ۲۶) "...... اسی بہادر
کے ذمہ مجاہدوں کا خرچہ برچہ رہتا تھا، سلطان عالم سے بھی موقع پر کچھ ذکر آجاتا تھا، لیکن
نواب کے خوف سے زبان دبا جاتا تھا، جیسا یہ ایک ہے اگر دو چار اور بھی ہوتے تو کافر
کو مسلمان مسجد کو رو دیتے، اور بادشاہ کا وہ عالم کہ بالکل غافل ..... اگر بادشاہ ہوشیار
ہوتے تو بشیر الدولہ بہادر کی جوہر دیندار ہی نمودار ہوتی (کذا)"،

اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں لیکن طوالت بے جا سے کوئی حاصل نہیں، اب ہم
مولوی امیر الدین علی کے منظوم عریضے سے چند ابیات نقل کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ
اس وقت نواب وزیر کا نیزان کے القاب و خطابات کا امتیاز آج کی طرح لامعلوم نہ
نہ تھا، یہ ابیات مولوی امیر الدین علی کی موزون طبعی اور قدرت شاعری کا بھی نمونہ
پیش کریں گی، ؎

امید ہے کہ شہنشاہ قبلۂ عالم ابو المظفر و منصور و خسرو اعظم

سپہر رفعت و قدسی صفات والا جاہ | خدیو کشور ہندوستان فلک درگاہ
محب خیل پیمبر، افتخار زمین | خلیفہ رب سبحانی و تاجدار زمین
جناب واجد علی شاہ ظل سبحانی | رئیس امت والا حبیب رحمانی
زبان فیض مبارک سے یوں کریں ارشاد | کہ کافران اودھ پر شتاب ہوئے جہاد
وزیر حضرت خاقان حضور عالم دیں | کریں وہ دستخط والا اس امر پہ تزئیں
بہ عہد میمنت عہد حضرت سلطاں | جناب واجد علی شاہ سایۂ رحماں
لوائے نصرت اسلام ہو گیا استاد | بہ سمت شہر اودھ از بہر عزم جہاد
غریب بیکس و مسکین با دل غمگیں | محب آل نبی عبدہ امیر الدین

(صفحہ ۳۵)

مرتب صاحب نے واجد علی شاہ کی صفائی میں باتیں تو بہت بنائی ہیں لیکن اُن کے ایسے بیانات کو نظر انداز کیا ہے جو ٹھوس شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں، مثنوی ثبات القلوب کا طویل اقتباس دبیان واقعی میں مرتب نے شامل کیا ہے لیکن ان ابیات پر جس میں سلطان عالم نے ہنومان گڑھی کے واقعے کا اظہار کیا ہے، اس کی ذمہ دار انگریزی کمپنی کو قرار دیا ہے، اور مولوی امیر الدین علی کو شہید سے تعبیر کیا ہے، توجہ نہیں فرمائی، تین بیت آپ ملاحظہ فرمائیں، ؎

یہاں تک سلیمن نے دورا کیا | رعایا کو بھڑکایا ہر ایک جا،
پھر آخوند صاحب کو لڑوا دیا | شہید اُن کی فوجوں نے ان کو کیا
ہنومان گڑھ پر کیا کچھ خیال | کبھی حکم گردن زدن بے مآل

ویسے تو مرتب کی چابک دستی کے اور بھی نمونے ہیں لیکن اب مجھے تخفیفِ زحمت کرنا چاہئے پھر بھی دو موارد ایسے ہیں جن کی طرف قارئین کرام کو متوجہ کرنا از بس ضروری سمجھتا ہوں، ایک

عہد واجد علی شاہ" کے عنوان سے مرتب جدول میں سنہ ۱۸۶۲ء کے واقعات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ

" کلکتے کے کچھ تاجروں نے سازش کرکے واجد علی شاہ پر چالیس۴۰ لاکھ روپیے کے فرضی قرضے کا دعوی کردیا" یہ سراسر منشی صفدر کی حرکت ناشایستہ کو چھپانے کی برملا کوشش ہے اس سلسلے میں سب سے مستند وزیر نامہ مصنفہ وزیر السلطان منشی سید وزیر علی خاں کا بیان ہے وزیر السلطان اس سیاق میں عصری مصنف ہونے کے علاوہ اس مقدمہ سازش کے پیروکار کی بھی اہمیت کے حامل ہیں، افسوس ہے کہ طوالت سے بچنے کی خاطر ان کے اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں ہے، صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ یہ دعویٰ کلکتہ کے تاجروں نے نہیں، بلکہ ..... منشی صفدر علی کے داماد طالب علی نے بیالیس۴۲ لاکھ روپیے کا کیا تھا، اس سلسلے میں وزیر نامہ کے ص ۲۵۶ اور اس کے بعد کے اوراق جویائے تفصیل و تحقیق کے لئے کارآمد و مفید ثابت ہوں گے۔

ختم کلام میں مذکورہ جدول کی اس طرفگی کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سنہ ۱۸۶۲ء سے لے کر سنہ ۱۸۸۷ء کی ربع صدی کی طویل مدت میں مرتب صاحب کو ۲ دو ہی واقعے قابل ذکر نظر آئے، ایک سنہ ۱۸۷۹ء میں حضرت محل کا انتقال اور سنہ ۱۸۸۷ء میں خود واجد علی شاہ اختر کی رحلت، اگرچہ اس ۲۵ سال کی مدت میں بہت کچھ ہوا ہے، مگر اس کا تفصیل کا اس تبصرے میں محل نہیں، یا رزندہ صحبت باقی، انشاء اللہ تعالیٰ

مطبوعات جدیدہ

العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین | مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت بہتر، کتابت ٹائپ، صفحات ۳۱۲

قیمت ۲۵ روپیہ، پتہ:۔ دائرہ ملیہ، مبارکپور، اعظم گڈھ (یوپی)

ہندوستان کے ابتدائی قدیم عہد کی اسلامی تاریخ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا خاص موضوع ہے، اس پر ان کی اردو اور عربی میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں، زیر نظر عربی کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس کا پہلا اڈیشن بارہ تیرہ برس قبل شایع ہوا تھا، اور اسی وقت اس پر معارف میں تبصرہ بھی کیا گیا تھا، یہ نیا اڈیشن بعض اضافوں کے بعد شایع ہوا ہے، نیز یہ ۲ دو جزوں پر مشتمل ہے، پہلے جز میں عہد رسالت، خلافت راشدہ اور بنی امیہ کے زمانہ کے عرب و ہند کے تعلقات کا ذکر ہے، اور دوسرے جز میں خلافت عباسیہ کے دور کے دونوں ملکوں کے تعلقات دکھائے گئے ہیں، پہلے جز کے شروع میں ہندوستان کی فتوحات کی قدیم عربی تصنیفات کا ذکر اس کے محل و قوع، یہاں صحابہ و تابعین کی تشریف آوری اور مختلف دور میں فتوحات کا اجمالی حال تحریر کیا ہے، پھر عہد رسالت میں عرب میں آباد ہندوستانی قوموں زط و سیابجہ، آنحضرتؐ اور صحابہ کرام کی ہند و اہل ہند سے واقفیت اور انکے بعض ہندوستانی اشیاء کے استعمال اور آنحضرتؐ کے غزوۂ ہند کی خبر و بشارت وغیرہ متعدد باتوں کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں کئی بے سرو پا روایتوں کی تردید بھی کی ہے جو ہندوستان کے تعلق سے آپؐ کی جانب

منسوب کی جاتی ہیں، اس کے بعد خلافت راشدہ اور اموی دور میں ہندوستان کی سرحدوں اور بعض علاقوں میں مسلمانوں کی فتوحات، امرار و والیان ریاست، مجاہدوں، سپہ سالاروں اور ان داعیوں و مصلحین کے حالات بھی لکھے ہیں جو غزوات و فتوحات یا دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں یہاں آئے، مصنف نے ان سب کے صحابی، تابعی اور تبع تابعی ہونے کی بھی صراحت کی ہے، آخر میں اس زمانہ کے مشہور ہندوستانی علماء و محدثین کا مختصر تذکرہ ہے، دوسرے جزء میں پہلے عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح (۱۳۲ھ) سے مطیع للہ کے دور (۳۴۰ھ) تک کا ذکر ہے، اس میں آل عباس کی طرف سے مقرر کیے جانے والے امراء کی ولایات و امارات کا تذکرہ اور بعض ہندوستانی راجاؤں اور عباسی خلفاء کے درمیان ہدایا و تحائف بھیجے جانے کا ذکر ہے۔

یہ کتاب مصنف نے بڑی محنت اور برسوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے، اور اس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد اور فتوحات وغیرہ کے بارہ میں مستند اور مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی۔

عقیدت کے پھول از جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع خوشنما گردپوش، قیمت ۲۵ روپیہ۔ پتے: (۱) انجمن ترقی اردو، راؤز ایونیو، نئی دہلی (۲) آستانہ بکڈپو، جامع مسجد، دہلی (۳) مکتبہ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، مرکزی نائب وزیر تعمیرات و مکانات حکومت ہند، ایک علمی و مذہبی گھرانے کے فرد اور نقشبندیہ سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہیں، ان کو شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے، مگر ان کی شاعری رخ و گیسو کی حکایت اور زلف و شانہ کی مصوری کے بجائے ان کے پاکیزہ خیالات اور مذہبی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے، زیر نظر کتاب ان کی نعتوں کا مجموعہ ہے، اس کے

آخر میں سلام و منقبت اور بزرگان دین کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے، پہلی نظم میں قرآن مجید کی عظمت و برکت، اس کے اعجاز و حسن بیان اور تعلیم رشد و ہدایت کے علاوہ اس امر کا خاص طور پر ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثنا خواں نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلہ میں اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرنے کے باوجود انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اللہ کی توفیق و یاوری سے فکر و خیال میں تازگی و ندرت، الفاظ میں زور و اثر اور سخن میں دلآویزی و رعنائی پیدا ہوسکتی ہے، اسی احساس نے ان کو نعت گوئی پر آمادہ کیا، ان کے سلسلۂ نعت کی ابتدا ظہور قدسی سے ہوئی ہے، اس میں آپؐ کی تشریف آوری کے مجسم خیر و برکت ہونے کا مختلف حیثیتوں سے دلآویز پیرایہ میں ذکر ہے، اس نظم کے آخر میں "تمنائے مدینہ" کا اظہار بھی ہے، جو دوسری نظم کی تقریب بنا، ایک اور نظم میں آنحضور صلعم کی عظمت شان اور آپؐ کے درجہ و مرتبہ کی بلندی بڑے موثر انداز سے واضح کی ہے، اس مجموعہ کی تمام نعتیں عارف صاحب کے نبی اکرمؐ کے مرتبہ و درجہ کے عارف و عظمت شناس ہونے کے علاوہ آپؐ کی ذات سے ان کی والہانہ عقیدت و محبت اور آپؐ کی دعوت و پیغام سے ان کی دلچسپی و شیفتگی کا ثبوت ہیں، اس مجموعہ میں کئی اچھی تضمینیں بھی ہیں، ان سے مصنف کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے، امام حسینؓ کی مدح و منقبت اور واقعۂ کربلا سے متعلق بھی چند نظمیں ہیں، ان میں جہاں امام ہمام کی مظلومانہ شہادت اور تاریخ اسلام کے اس خونچکاں واقعہ کا درد انگیز بیان ہے، وہاں آپ کے درس و پیام کی جانب بھی خاص طور پر توجہ دلائی ہے، اور اس ضمن میں بعض مروجہ رسموں اور طریقوں پر لطیف طنز و تبصرہ بھی ہے، آخر میں بزرگان دین کے کارنامۂ ارشاد و ہدایت کو موثر انداز میں بیان کیا ہے اور شریعت و طریقت کے ان داعیوں سے اپنی نسبت و تعلق کو اپنے لیے مایۂ فخر بتایا ہے، نعت گوئی ایک نازک اور مشکل صنف سخن ہے، اچھے اچھے شعراء بھی اس کوچہ میں ڈگمگا جاتے ہیں، عارف صاحب جوش عقیدت میں بھی بڑی حد تک اعتدال و توازن پر قائم رہتے ہیں، ان کا یہ مجموعہ ان کے ادبی ذوق کی طرح ان کی

دینی و ایمانی کیفیت کا بھی نتیجہ ہے، شروع میں جمہوریۂ ہند کے نائب صدر عالی جناب محمد ہدایت اللہ کا پیش لفظ اور نعت نگاری پر جناب عارف کا بڑا متوازن دیباچہ ہے جو ادبی حیثیت سے خاصے کی چیز ہے۔

تحریکِ اسلامی اور برادرانِ وطن :۔ از جناب مولوی سید حامد علی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۸، قیمت دو روپے۔ پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶

اس کتابچہ میں ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو صرف مسلمانوں ہی کے سامنے شہادت حق کو کافی سمجھتے ہیں، مصنف نے ثابت کیا ہے کہ شہادت علی الناس کا خاص اقتضاء یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے، ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ اسلام نہ تو صرف مسلمانوں کے لیے ہے، اور نہ یہ ان کی کوئی قومی تحریک ہے، بلکہ سارے انسانوں کے لیے ہے، اور وہ ایک بین الاقوامی تحریک ہے، مصنف کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے مگر وہ اس کی بھی یہ کمی اور کوتاہی بتاتے ہیں کہ غیر مسلموں میں اسلام کی نشر و اشاعت کی ضرورت تسلیم کرنے کے باوجود اس نے بھی عملاً اپنا دائرۂ تبلیغ صرف مسلمانوں تک محدود رکھا ہے، آخر میں غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت و اشاعت کے بعض موانع بیان کر کے ان کے ازالہ کی صورتیں بتائی ہیں، کتابچہ اپنے موضوع پر مفید ہے، مگر مصنف کے انداز بیان سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اصلاح، تبلیغ و تواصی بالحق اور شہادت علی الناس کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے اور مسلمانوں کی اصلاح و تبلیغ اور انھیں حقیقی اسلامی زندگی اختیار کرنے کی دعوت کو وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں اور ہندوستان میں مسلمان جن مخصوص مسائل سے دوچار ہیں انھیں حل کرنے کے بجائے غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ و دعوت ہی کو اصلی اور بنیادی کام سمجھتے ہیں، حالانکہ شہادت علی الناس کا نہ یہ مطلب ہے اور نہ غالباً مصنف کا یہ منشا ہوگا کہ مسلمانوں کو پختہ ایمان و اعتقاد خدا زندگی کی دعوت نہ دی جائے، کیونکہ خود قرآن کا ارشاد ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا (اے ایمان والو!

ایمان لاؤ) اور آنحضرت صلعم کو آپ کے اس شدید اضطراب پر تنبیہ کی گئی ہے جو کفار و مشرکین کو اسلام کی جانب بلانے کے لیے آپ کے اندر پایا جاتا تھا، اور جس کی وجہ سے آپ کی توجہ مسلمانوں کی اصلاح و تزکیہ کی طرف سے کم ہو جاتی تھی، اس بنا پر اس وقت جبکہ خود مسلمان اسلام پر پوری طرح عمل پیرا نہیں ہیں ان کی اصلاح و تبلیغ کے کام کو غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا ہے، دعوت و تبلیغ میں حکمت، موقع و حالات کی رعایت اور الاہم فالاہم کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، علاوہ ازیں غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ اسی وقت زیادہ کارگر ہو سکتی ہے جب مسلمان خود اسلام کے سچے حامل بنیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بعض حلقے غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کی اصلاح و تبلیغ کو مقدم سمجھتے ہیں، ورنہ وہ بھی غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، تاہم جماعت اسلامی کی اس میدان میں بھی سبقت قابل ستائش ہے۔

صیانۃ الحدیث حصہ دوم: مرتبہ مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگری، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت چھ روپیے، پتہ: مصنف کیرآف خان کلاتھ ہاؤس، ڈاکخانہ رام رت گنج، ضلع بستی۔

یہ اس کتاب کا دوسرا حصہ ہے، اس میں طبقۂ تابعین و تبع تابعین کے ممتاز محدثین کی ان مساعی کا ذکر ہے جو احادیث کی حفاظت و صیانت اور جمع و تدوین کے سلسلہ میں انھوں نے انجام دی ہیں، لائق مصنف نے اس ضمن میں ان بزرگوں کے حدیث نبوی سے شغف، حفظ و ضبط میں کمال، نقل و روایت میں مکمل احتیاط اور عدالت و دیانت کے مستند واقعات بھی بیان کیے ہیں، تابعین میں امام نافعؒ، ہمام بن منبہؒ، قتادہؒ، امام شعبیؒ، امام زہریؒ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور امام شعبہؒ وغیرہ اور تبع تابعین میں ابن جریج، امام مالک، عبد اللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، عبد الرحمن بن مہدی، معمر بن راشد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، امام ابوزرعہ، یحییٰ بن معینؒ، امام احمد بن حنبل اور کئی دوسرے بزرگوں کا ذکر ہے، آخر میں ائمہ صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام ترمذی کا تذکرہ ہے، ان بزرگوں کے مختصر ترجمہ کے علاوہ اہم اور ممتاز کتب حدیث کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، اس مفید کتاب سے ائمہ حدیث کی روایات و احادیث کے اخذ و بیان میں اہتمام بلیغ کا اندازہ بھی ہوگا اور منکرین حدیث کے بعض بے بنیاد الزامات کی تردید بھی ہوگی۔ "ض"

جلد ۱۲۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات

۲۔ یکم شعبان ۱۴۰۲ھ کو حضرت مولانا محمد زکریا محدث سہارنپوری کا انتقال ستاسی سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں ہوگیا، جہاں شیدائیوں اور فدائیوں کے بے پناہ ہجوم نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھی، اور اسی مقدس سرزمین میں سپردِ خاک کیے گئے، جس کی آرزو زندگی بھر فرماتے رہے،

وہ چودھویں صدی ہجری میں علمائے سلف کی ایک بے مثال یادگار تھے، اُن کی تدفین کے ساتھ اسلام کے اس دور کی ایک بے قرار عبقریت کی نظرِ حکیمانہ، اسرارِ محرمانہ، جذبِ عارفانہ اور بیرونی علوم کی پشتیبانی، عالی استعداد کی جلوہ سامانی، تحریر کی صاعقہ پاشی اور قلم کی برق وشی بھی تہِ خاک ہوگئی، اب جب وہ آغوشِ رحمتِ الٰہی میں ہیں، اُن کو اُن کے معتقدین ملک العلما، سلطان الفضلا، منہاج المتقین، منبع الانوار اور شمس الفقرا کی حیثیت سے یاد کرکے ان کی دائمی جدائی پر آنسو بہاتے رہیں گے، ان کے جلوۂ صد رنگ پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائیگا، وہ دینی اور روحانی علوم کے دریا میں کبھی مثلِ موج اُبھر کر کبھی اس کے ساحل سے گذر کر کبھی اُس کے سینے میں اُتر کر اُن کے راز کو جس طرح فاش تر کرتے رہے، اس پر معلوم نہیں کیا کچھ قلم بند ہوتا رہے گا، انھوں نے خدا جانے کتنے اوراق پر اسرارِ الٰہی کے حقائق اور انوارِ الٰہی کے دقائق کو آشکارا کیا، اُن کی ان گنت تصانیف کی روحانی، مذہبی، نظری، فکری، اخلاقی اور دعوتی تعلیمات سے برابر عبرت و بصیرت کے درس حاصل ہوتے رہیں گے،

تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں پائی اور وہیں ایک عرصہ تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اپنے والد بزرگوار سے مجتہدانہ دماغ پایا تھا، اسی لئے طالب علمی ہی کے زمانے سے قرآن مجید، حدیث مقدس اور فقہ کا مجتہدانہ مطالعہ کرتے رہے، قرآن پاک کو سمجھنے اور سمجھانے میں اُن کی جو نظر لغت، نحو، صرف، اشتقاق، علم بیان، علم بدیع، علم قرأت، علم عقائد اور شانِ نزولِ آیاتِ کریمہ پر رہی ہو، وہ کم علما کی رہی ہوگی

اسی طرح حدیث کو سمجھنے کے لئے فرمانے کہ محدثیت اور فقہیت کے بجائے سلف صالحین کی جامعیت کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ خود اس جامعیت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، بہت بڑے محدث ہوئے حدیث کا درس دینے میں یگانۂ روزگار تسلیم کئے گئے، عربی میں ترمذی موطا اور بخاری شریف کی مختلف جلدوں میں جو شرحیں لکھی ہیں وہ اسلامی ممالک میں بھی تسلیم شدہ اہمیت بنی ہوئی ہیں وہ بہت بڑے فقیہ بھی تھے وہ اس کے قائل تھے کہ فقہ کا ماخذ قرآن پاک، سنت مطہرہ، اجماع اور قیاس ہے اس لئے ایک فقیہ کے لئے ان چیزوں کو معلوم کرنا ضروری ہے جو قرآن مجید اور حدیث پاک میں ہے،

ان علوم کے حصن حصین میں بیٹھ کر وہ سلوک و طریقت کی طرف بھی مائل ہوئے حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی صحبت میں تقویٰ حاصل کیا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فکر حکیمانہ اخذ کی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مجاہدہ کا درس لیا، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے تواضع اور انکسار سیکھا، اپنے چچا حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے مذہبی مراسم کی نگہبانی کی وراثت ملی، اور اپنے مرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے فن حدیث سے شغف و انہماک کے علاوہ عشق الٰہی، محبت رسول، سوز، گداز، صدق، صفا، زہد، توکل، محبت، خود انکاری اور ایثار کی دولت پائی، یہ وہ بزرگان دین تھے جن کے بارہ میں خود حضرت مولانا کا خیال تھا کہ ع :۔ انہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی،

رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن ہوتے تو انابت ہو یا عبادت، زہد ہو یا ریاضت، مجاہدہ ہو یا تفکر، استغنا ہو یا قناعت، بے نیازی ہو یا اخلاص، عشق الٰہی ہو یا محبت رسول، ان سب کے مدارج طے کر کے اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے باری تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو دیکھ کر محو اور متحیر رہتے، اور دنیا کو اپنی انگلیوں کے حلقہ ہی میں دیکھنا پسند کیا، ایسے ہی بزرگان دین کے لئے اقبال نے کہا ہے، ؎

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی   دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ

ان کی خدمت بابرکت میں رشد و ہدایت کیلئے جو بھی حاضر ہوا اس نے محسوس کیا کہ

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں   وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

تو پوچھنا ان حضرت چشتی کی اولاد ہوتی دیکھا ان کو یہ بتائے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اور وہ خود اپنے مریدوں کو بھی یہی تعلیم دیتے رہے ،ع :- دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں ،

وہ سہارنپور میں رہتے یا مدینہ منورہ میں ہر جگہ بہ فقراء کے دیدار سے مشرف ہوتا یا ہند میں پہنچ کر اپنے مشتاقوں کو دیدار کی تشنگی

بجھاتے یا لندن میں قیام کر کے اپنے فقر کی دولت کو عام کرتے یا جو بھی جا کر اخلاق نبوی افعال نبوی اور اقوال نبوی

کی تعلیم دیتے ہر جگہ بالالتزام ذکر الٰہی کی مجلس گرم رکھتے وہ روحانی منظر کیسا ایمان پرور ہوتا جب وہ خود جلوہ افروز ہوتے

ان کے ارد گرد ان کے حلقہ بگوشوں کی ایک باوقار اور سرشار جماعت ہوتی جس کے دل کے اندر سے لا الٰہ الا اللہ کی فلک شگاف

صدا بلند ہوتی، اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ع :- نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ ،

اس کم سواد راقم کے لئے اُن کے گوناگوں کمالات پر کچھ بھی لکھنا اس کے بس کی بات نہیں

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

وہ ایک بلند پایہ اور باکمال محدث ہونے کے باوجود عوام و خواص میں قدوۃ السالکین ہی کی حیثیت

سے مشہور ہوئے اب وہ عالم بالا میں تشریف فرما ہیں وہاں اگر محدثین کے جلو میں نظر آ رہے ہوں گے تو اقطاب الاسلام

سلاطین الطریقت سراج الاولیاء تاج الاصفیاء کی صف میں بھی دکھائی دے رہے ہوں گے قدوۃ السالکین کی حیثیت

سے وہ یہ پیام چھوڑ گئے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ احسان کیا چیز ہے تو آپ

نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے اس کو دیکھ رہے ہو اسی احسان کا ایک نام طریقت

یا سلوک یا تصوف ہے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی میں بالکلیہ مصروف ہو جانے علم دین پر قوت یقین رکھنے

اور جو کچھ حدیث میں ہے اس پر عمل کرنے کا نام اخلاق تصوف ہے ،

اسی پر عمل کر کے اُن کے معتقدین کو ان کی روح پر فتوح کو خوش رکھنا ہے، گو یہ یقین کامل ہو کہ ان کی

دینی فضیلت، روحانی عظمت، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی وجہ سے اُن کے مرقد مبارک پر انوار الٰہی اور

تجلیات ایزدی کی بارش برابر ہوتی رہے گی آمین ثم آمین ،

مقالات

مستشرقین اور علوم اسلامیہ

از

شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یورپ اور عالم اسلام کے باہمی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، یہ تعلقات شروع میں خالص تجارتی، دینی اور علمی تھے، بیت المقدس عیسائیوں کا دینی اور روحانی مرکز ہے، اس لیے فلسطین جانے والے عیسائی زائرین کی رہنمائی کے مختلف اوقات میں ہدایت نامے، سفرنامے اور عربی بول چال کی کتابیں لاطینی رسم الخط میں لکھی گئیں، ازمنۂ وسطیٰ میں اندلس ہی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا، لہٰذا اطالوی اور فرانسیسی طلبہ اشبیلیہ اور قرطبہ کا رخ کیا کرتے تھے، ان کے طفیل کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی بہت سی کتابیں لاطینی زبان میں منتقل ہوئیں، یورپ میں ویٹیکن پاپائے روم کا صدر مقام اور عیسائیت کی تعلیم و تدریس کا بڑا مرکز ہے، یہاں کے فارغ التحصیل دینی مناصب پاتے تھے، اور اپنے اپنے ملکوں میں جاکر تعلیم و تعلم کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے، یہ طلبہ عربی زبان سے بھی بقدر ضرورت واقف ہوتے تھے۔

عبرانی اور عربی زبانوں کی تحصیل کی طرف رغبت اور شوق کا ایک بڑا سبب کتاب مقدس کا علمی تحقیقی مطالعہ تھا، چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں تورات کے ترجمے مختلف یورپی ممالک میں

شایع ہوئے، جن کی اصل عبرانی اور عربی تھی، کتاب مقدس کے تراجم میں لبنان کے عیسائی فضلا کی علمی معاونت بھی شامل تھی، لبنان کے مارونی عیسائیوں کے پاپائے روم سے صدیوں سے تعلقات چلے آتے ہیں۔

مشرقی بالخصوص اسلامی زبانوں کی ترویج و اشاعت کا دوسرا بڑا محرک یورپی استعمار تھا، انیسویں صدی عیسوی میں فرانس نے الجزائر، مراکش اور تونس پر قبضہ کرلیا، برطانیہ نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرلی، ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ جمالیا، روس نے ترکستان کو غصب کرلیا، اطالیہ نے طرابلس کو ہتھیا لیا اور برطانیہ نے مصر پر اپنی سیادت قائم کرلی، ان مفتوحہ اور زیر حمایت ممالک کے علوم و آداب اور رسوم و رواج سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے متعدد ادارے وجود میں آئے، ابتدا میں ان اداروں میں کام کرنے والے زیادہ تر اہل کلیسا تھے، جو دینی عصبیت سے محفوظ نہ تھے، ان کے بعد بہت سے حقیقی عالم بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی زندگی کو علم کی تحقیق و اشاعت میں صرف کردیں، انھیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خاص عناد یا بغض نہ تھا، ان میں ہر یورپی ملک کے شیدائیانِ علم اور ان کے علمی کاموں کا سطور ذیل میں تعارف کرایا جاتا ہے:

اطالیہ جامعۂ روما میں علوم عربیہ کا شعبہ [illegible] سے قائم ہے، اطالیہ کے دوسرے شہروں میں بھی علوم عربیہ کی تدریس و تحقیق کا انتظام ہے، ان میں پاپائے روم کا مدرسۂ لغات مشرقیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں سریانی، عبرانی، آرامی اور عربی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، یہاں قلمی کتابیں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، یورپ میں سب سے پہلے اطالیہ کے مختلف شہروں سے عربی کتب کی اشاعت کا آغاز ہوا، چنانچہ ابن سینا کا القانون فی الطب [illegible] میں میلان سے شایع ہوا، ابن رشد کی شروح مؤلفاتِ ارسطو بارہ[12] جلدوں میں [illegible] میں شایع ہوئی، اس کے بعد بہت سے تراجم شایع ہوئے۔

انیسویں صدی عیسوی اطالیہ میں عربی زبان کے علوم و فنون کا زریں دور ہے، اس زمانہ میں
ت سے نامور علمائے مستشرقیات پیدا ہوئے، جن میں مندرجۂ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

امیر کایتانی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۲۶ء) اطالیہ کا مشہور فاضل اور امیر کبیر تھا، جس نے اپنی دولت
مخطوطات کے جمع کرنے میں صرف کر دی، اس کی زندگی کا سرمایہ تاریخ اسلام کی تالیف ہے،
ں میں سنہ وار واقعات ۹۲۲ء (۱۷ھ) تک مذکور ہیں، اس کی صرف پانچ جلدیں جو ۱۹۱۲ء
ے محیط ہیں چھپ چکی ہیں، اس کا دوسرا سرمایہ عمر شخصیات العالم الاسلامی (عالم اسلام
کے تراجم، ان کے مولفات اور مصادر کا ذکر) ہے، جس کی صرف دو جلدیں ۱۹۱۵ء میں شائع
ہو سکیں، بقایا کام ان کی موت کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا، ان کا جمع کردہ کتب خانہ مخطوطات عربیہ کا
بیش قیمت خزانہ ہے۔

اغناطوس گیڈی (۱۸۴۴ء تا ۱۹۳۵ء) جامعۂ مصریہ میں عربی زبان و ادب، تاریخ و
جغرافیہ کا استاذ تھا اور فصیح عربی زبان میں درس دیا کرتا تھا، کتاب الاغانی کی فہارس اس کی علمی
یادگار ہے۔

کارلو نلینو (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۸ء) عربی بے تکلف لکھتا اور بولتا تھا، اور جامعہ مصریہ
میں علم الفلک کا درس دیا کرتا تھا، تاریخ علم الفلک عند العرب اس کی مشہور کتاب ہے۔

بوسانی والمولو (۱۹۲۱ء) نے قرآن پاک کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اسے اردو اور
فارسی سے زیادہ شغف تھا، محمد اقبال، دانتے و اقبال اس کی تصانیف ہیں، الشرق الحدیث
(Oriente Moderno) اطالیہ کا مشہور علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔

فرانس: اہل فرانس اور عالم عرب کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں،
صلیبی جنگوں، تجارتی سرگرمیوں، سفیروں کے تبادلے اور شمالی افریقہ اور لبنان میں فرانسیسی

اور مغربی فنون نے ان تعلقات کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد کی ہے، فرانسیسیوں نے عربی علوم و فنون، اندلس اور صقلیہ (سسلی) کے مدارس سے حاصل کیے، ۱۵۳۰ء میں علوم شرقیہ کی تدریس کے لیے ایک درسگاہ قائم کی گئی، چودھویں صدی عیسوی میں جامعۂ پیرس میں شعبۂ عربی کا قیام عمل میں لایا گیا، جو کہ سوربون کے عربی شعبہ کی شاخ تھی، اس کے بعد فرانس کی بیشتر جامعات میں عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس کا اہتمام ہوا، ۱۶۹۱ء میں عربی ٹائپ کا پریس قائم ہوا، فرانسیسی سیاحوں نے شام اور مصر کا سفر کر کے متعدد سفرنامے لکھے۔

فرانسیسی علماے مشرقیات میں بیرن دی ساسی (۱۷۵۸ء تا ۱۸۳۸ء) استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتا ہے، اس کا نمایاں علمی کارنامہ مقامات حریری (متن و ترجمہ) کی اشاعت ہے، اس کے بعد کاترمیر (۱۷۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کا نام قابل ذکر ہے، جس نے مقدمۂ ابن خلدون تین جلدوں میں شایع کیا۔

بیرن دی سلان (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۸ء) فرانس اور جرمنی کے متعدد علماء و فضلاء کا استاذ اور شیخ المستشرقین تھا، اس کا بڑا کارنامہ مقدمۂ ابن خلدون اور وفیات الاعیان (ابن خلکان) کا انگریزی ترجمہ ہے۔

ہارٹوک دیرینبورغ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۸ء) نے مکتبہ اسکوریال (اسپین) کے عربی مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں شایع کی، کتاب (سیبویہ) کا متن اور فرانسیسی ترجمہ مفید حواشی کے ساتھ شایع کرایا، تاریخ الفخری کی عمدہ اشاعت بھی اس کا کارنامہ ہے۔

لیوی پروفنال (۱۸۹۴ء تا ۱۹۵۶ء) نے اپنی ملازمت کا آغاز جامعۃ الجزائر سے کیا، اسے اندلس اور شمالی افریقہ کی تاریخ اور علوم و آداب سے دلچسپی رہی ہے، بے شمار مقالات کے علاوہ اس کا نمایاں علمی کام جمہرۃ انساب العرب (ابن حزم) کی تصحیح اور اشاعت ہے۔

لوئیس ماسینون (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۲ء) بیسویں صدی کا ممتاز فرانسیسی مستشرق تھا، اس نے ممالک عربیہ کے متعدد سفر کیے اور علمائے اسلام سے ذاتی تعارف پیدا کیا، اس کی دلچسپی کا مرکز اسلامی تصوف رہا ہے، کتاب الطواسین (حلاج) کو پہلے پہل اسی نے شایع کیا۔

لاؤسٹ (المولود ۱۹۰۵ء) کو امام ابن تیمیہؒ کے افکار اور ان کی تصانیف سے بڑی دلچسپی ہے، چارلس پیلا سوربون میں عربی زبان کا استاذ اور مجلہ ارابیکا (Arabica) کا سکریٹری ہے، اس نے جاحظ کے متعدد رسائل تصحیح و تعلیق کے ساتھ شایع کیے ہیں، قومی کتب خانۂ پیرس میں عربی کی ہزاروں کتابیں ہیں، فرانسیسی زبان میں متعدد علمی و تحقیقی رسائل شایع ہوتے ہیں، جن کا موضوع عربی زبان و ادب اور عالم اسلامی کے حالات و مسائل ہوتے ہیں۔

ہالینڈ فرانس کے بعد ہالینڈ عربیات اور اسلامیات کی تدریس کا بڑا مرکز ہے، لائیڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا شعبہ ۱۶۱۳ء سے کام کر رہا ہے، مشہور عالم مطبع بریل کو مستشرق بریل نے ۱۶۸۳ء میں قائم کیا تھا، یہ مطبع پانچ سو سے زائد علوم شرقیہ کی کتابیں چھاپ کر شایع کر چکا ہے، جن میں نصف عربی زبان میں ہیں، مکتبۃ الجغرافیین للعرب کی آٹھ جلدوں کی اشاعت ایک بڑا علمی کارنامہ ہے، الجامع الصحیح للبخاری کا ایک عمدہ ایڈیشن ۱۹۰۸ء میں لائیڈن سے شایع ہوا تھا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بھی لائیڈن سے چھپ کر شایع ہو رہا ہے، اس کی جدید اشاعت جس میں مسلم ممالک کے اہل علم کے مقالات بھی شامل ہیں ہر لحاظ سے مستحق تعریف و تحسین ہے، ہالینڈ کے علمائے مستشرقیات نے مختلف ادوار میں علوم اسلامیہ کی بڑی خدمت کی ہے، ان میں سے ممتاز علماء کے نام یہ ہیں:

ڈوزی (۱۸۲۰ء، ۱۸۸۳ء) نے تاریخ اندلس چار جلدوں میں لکھی، تکملۃ معاجم العربیۃ اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔

[illegible] (۱۸۳۶ء تا ۱۹۰۹ء) نے فتوح البلدان (البلاذری) اور الطبری کی تاریخ الرسل والملوک دوسرے علماء کے اشتراک سے شائع کی، اس عظیم الشان کتاب کا انڈکس مع مختلف فہارس علمی کام کرنے والوں کے لیے ایک بڑی نعمت ہیں۔

ونسنک (Wensinck) (۱۸۸۲ء تا ۱۹۳۹ء): المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی کی سات ضخیم جلدوں میں تدوین اور اشاعت اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے اس کام میں اس کے اور اس کے رفقاء کے تیس[30] برس صرف ہوئے، یہ الفاظ حدیث کا انڈکس ہے جس کی مدد سے ہم بقید ابواب ہر حدیث کو اس کے مقام پر تلاش کر سکتے ہیں۔

جرمنی (المانیا) جرمنی کا عالم اسلام سے علمی رابطہ دوسری صلیبی جنگ (۱۱۴۷ء ۔ ۱۱۴۹ء) سے شروع ہوتا ہے جامعہ ہائیڈلبرگ میں عربی زبان کا شعبہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر سے کام کر رہا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شہنشاہ فریڈریان کے عثمانی سلاطین سے سیاسی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، انیسویں صدی کے آغاز میں دی ساسی کے جرمن شاگردوں کے فیض سے علوم اسلامیہ کی اشاعت اور تحقیق میں بڑی ترقی ہوئی، ان میں سے سربرآوردہ علماء کے نام یہ ہیں:

فریتاگ ([illegible] تا ۱۸۶۱ء) نے دیوان الحماسہ بشرح التبریزی مع حواشی و فہارس بون سے شائع کیا، عربی، لاطینی لغت بھی اسی کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔

فلوگل ([illegible] تا [illegible]) نے حاجی خلیفہ کی کشف الظنون (متن ولاطینی ترجمہ) تیرہ[13] برس کی محنت شاقہ کے بعد شائع کی، نجوم الفرقان فی اطراف القرآن[1] اس کا دوسرا کارنامہ ہے، یہ الفاظ قرآن کا انڈکس (اشاریہ) ہے۔

فلائشر ([illegible] تا [illegible]) جمعیۃ الشرقیۃ الالمانیہ کا بانی تھا، اس نے تفسیر بیضاوی

المفصل (الزمخشری) اور دوسری کتابیں مفید حواشی کے ساتھ شایع کیں۔

وشٹنفلڈ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) نے ساٹھ برس عربی زبان، اس کے علوم و آداب کی خدمت کی، وفیات الاعیان (ابن خلکان) تہذیب الاسماء (نووی) طبقات الحفاظ (الذہبی)، کتاب المعارف (ابن قتیبہ) تاریخ مکہ، سیرت ابن ہشام اور معجم البلدان (یاقوت) وغیرہ کی تصحیح اور اشاعت اس کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

آلورٹ (۱۸۲۸ء، ۱۹۰۹ء) فہرست مکتبہ برلن اس کی فضیلت پر شاہد ہے۔

یان (Jahn) (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۷ء) نے شرح المفصل (ابن یعیش) مفید تعلیقات کے ساتھ شایع کرنے کے علاوہ کتاب (سیبویہ) کا جرمن میں ترجمہ شایع کیا، جو حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

زخاؤ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۳۰ء) فلائشر کا شاگرد رشید تھا، البیرونی کی تحقیق ما للھند (متن و انگریزی ترجمہ) اور الآثار الباقیۃ (متن و انگریزی ترجمہ) اس کی یادگار ہے۔

کارل بروکلمان (K. Brockelmann) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۶ء) امام المستشرقین ہے، اس کا غیر فانی کارنامہ تاریخ الادب العربی کی تالیف ہے (پانچ جلدیں مطبوعہ لائیڈن) اس کی وسعت معلومات پر ایک طالب علم حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، عالم عرب کی مطبوعات کے علاوہ امرتسر، دہلی اور بھوپال تک کی چھپی ہوئی کتابیں اس کی دسترس میں ہیں، سارے جہان کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی فہارس اس کے پیش نظر ہیں، سوانح اور تراجم کی کتابیں اس کی نوک زبان ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اسکی تاریخ اسلام (جس کا عربی میں ترجمہ تاریخ الشعوب الاسلامیۃ کے نام سے ہو چکا ہے) اس کے دامن فضیلت پر بدنما دھبہ ہے، اس میں جابجا یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

فیشر (۱۸۶۵ء تا ۱۹۴۹ء) نے معجم اللغۃ العربیۃ کی جمع و ترتیب میں چالیس برس گذار دیے، اس عظیم الشان لغت کا مدار قدیم عربی کتب لغت پر ہے، المجمع اللغوی (قاہرہ) کے اہتمام میں اس کے چند اجزار شایع ہوئے ہیں،

ہیلمٹ ریٹر (H. Ritter) (۱۸۹۲ء تا ۱۹۷۱ء) نے اپنی عمر گراں مایہ کے تیس سال استنبول کے کتب خانوں میں نادر کتابوں کی تلاش و تحقیق میں بسر کر دیے، عربی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبۂ اسلامیہ استنبول میں قائم کیا، جس کے اہتمام میں مقالات الاسلامیین (اشعری) اور اسرار البلاغۃ (عبد القاہر الجرجانی) (متن و جرمن ترجمہ) وغیرہ نہایت آب و تاب سے شایع ہو چکی ہیں، الصفدی کی 'الوافی بالوفیات' عربی میں سوانح و تراجم کا بڑا خزانہ ہے، اس کی چھ سات جلدیں ریٹر اور اس کے رفقار کے طفیل اب تک اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

فؤاد سیزگین: ایک ترک عالم اور ریٹر کا شاگرد رشید ہے، اس نے الجامع الصحیح البخاری کے مصادر و مآخذ پر ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے، مجاز القرآن (ابو عبیدہ معمر بن مثنی) کو نہایت محنت سے شایع کیا ہے، کارل بروکلمان کی تاریخ الادب العربی کو نظر ثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ جرمن زبان میں شایع کیا ہے، اب تک اس جلیل القدر کتاب کی پانچ جلدیں شایع ہو چکی ہیں جو فاضل مصنف کی فضیلت پر شاہد ہیں، اسے فیصل انعام بھی ملا ہے۔

رودی پیرٹ نے قرآن مجید کا جرمن زبان میں ترجمہ تین جلدوں میں شایع کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ سب جرمن ترجموں میں بہتر اور مستند ہے۔

استنبول کے علمی خزائن سے ہماری واقفیت اور شناسائی تمام تر جرمن مستشرقین کی علمی

سامی کلچر بوں خت ہے۔

جرمنی کی ہر یونیورسٹی میں عربی اور اسلامی کتب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، علوم اسلامیہ پر مباحث اور مقالات کے لیے مجلۃ الاسلام (جرمن) ہیمبرگ اور مجلہ عالم الاسلام (لائپزگ) قابل ذکر ہیں، لائپزگ اور ویز باون کے عربی پریس صحتِ طباعت کے لیے سارے یورپ میں مشہور ہیں۔

آسٹریا ہنگری | آسٹروی مستشرقین کی توجہ زیادہ تر ترکی ادبیات تک محدود رہی ہے ان میں سربرآوردہ عالمِ مشرقیات گولٹ تسیہر (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) تھا جس نے قاہرہ جاکر مفتی محمد عبدہٗ سے بھی استفادہ کیا تھا، اس کی تصانیف میں حدیث کے مطالعات کی یورپ کے علمی حلقوں میں بڑی دھوم رہی ہے، اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔

عبدالکریم جرمانوس (۱۸۸۴ء تا ۱۹۷۹ء) نے اپنی زندگی کا آغاز شانتی نکیتن میں استاذ عربی سے کیا (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء) بعد ازاں انھوں نے جامعہ ملیہ جاکر اسلام قبول کرلیا اور قاہرہ پہونچ کر شیوخ ازہر سے علم کی تکمیل کی اور وطن واپس آکر بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک صدر شعبۂ مشرقیات رہے، ترکی زبان وادب کے متعلق ان کی تحقیقات اہم نتائج کی حامل ہیں، وہ حج سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

روس | روس کی جامعات میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تعلیم وتدریس کا انتظام بڑے عرصہ سے قائم ہے، روسی علماء نے الفارابی، ابن سینا اور البیرونی کی کتابوں کے روسی زبان میں تراجم شائع کیے ہیں، جدید عربی زبان کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی بیشتر تعداد روسی زبان میں منتقل ہوچکی ہے۔

علمی تحقیقات کے سلسلہ میں کراتشوفکی (۱۸۸۳ء تا ۱۹۵۱ء) کا نام خاص طور پر

قابل ذکر ہے، اس نے شام اور لبنان میں ایک عرصہ تک قیام کرکے وہاں کے ادباء سے ذاتی مراسم پیدا کیے تھے، اس کی تصانیف میں قرآن مجید کا روسی ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کتاب البدیع (ابن المعتز) اس کی تصحیح و تحشیہ سے پہلی دفعہ شایع ہوئی، عرب جغرافیوں کے حالات اور کارناموں کے متعلق اس کی کتاب عربی میں ترجمہ تاریخ الادب الجغرافی کے نام سے چھپ چکی ہے۔

کسی زمانہ میں قازان کے عربی مطابع ترکستان بھر میں مشہور تھے، لیکن اب عربی کی دینی کتب کی طباعت اور اشاعت حکماً ممنوع ہے، ادھر چند سالوں سے صرف قرآن پاک کی طباعت سرکاری انتظام میں ہونے لگی ہے۔

انگلستان: آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات میں عربی زبان وادب کے شعبے اٹھارہویں صدی عیسوی سے قائم ہیں، لندن میں سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سنہ ۱۹۱۶ء سے کام کر رہا ہے، اور نامور مستشرقین مثلاً سر طامس آرنلڈ اور مسٹر گب اس درسگاہ سے وابستہ رہے ہیں، انگلستان کے معروف مستشرقین اور ان کی علمی خدمات کا تذکرہ سطور ذیل میں درج ہے۔

جارج سیل (سنہ ۱۶۹۷ء، سنہ ۱۷۳۶ء) نے انگریزی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، جو غالباً فرانسیسی ترجمہ سے ماخوذ ہے، اس کے مقدمہ میں مترجم نے عجیب وغریب خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایڈورڈ لین (سنہ ۱۸۰۱ء، سنہ ۱۸۷۶ء): مدالقاموس (عربی، انگریزی لغت) اس کی تیس سالہ کاوش کا نتیجہ ہے، یہ لغت نہایت معتبر اور مستند مانی جاتی ہے، الف لیلہ کا انگریزی ترجمہ (چھ جلدیں) اس کی علمی یادگار ہے۔

ایڈورڈ ہنری پامر (۱۸۴۰ء تا ۱۸۸۲ء) عربی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتا تھا، ترجمہ قرآن کریم اور دیوان البہاء زہیر (متن و انگریزی ترجمہ) اس کا بڑا کارنامہ ہے۔

ولیم رائٹ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء) نے ڈوزی سے علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی اس کا علمی کارنامہ الکامل (المبرد) کی تین[۳] جلدوں میں اشاعت ہے، عربی قواعد پر اس کی انگریزی کتاب نہایت مفید اور جامع ہے۔

سر ولیم میور (۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۵ء) سابق گورنر یو۔پی (اترپردیش) لائف آف محمد اور تاریخ الخلفاء کا مصنف، یہ دونوں کتابیں متنازعہ فیہ چلی آرہی ہیں، سر سید نے لائف آف محمد کے جواب میں اپنی مشہور کتاب خطبات احمدیہ لکھی تھی۔

سر چارلس لائل، انڈین سول سروس کا ممبر اور سی۔پی (مدھیہ پردیش) میں کمشنر تھا، اشعار جاہلیت اس کا خاص موضوع تھا، المفضلیات (الضبی) بشرح الانباری (متن و انگریزی ترجمہ) کی اشاعت اس کی یادگار ہے۔

ایڈورڈ جارج براؤن (۱۸۶۲ء تا ۱۹۲۶ء) کیمبرج میں عربی و فارسی کے ممتاز استاذ تھے، تاریخ ادبیات ایران (چار[۴] جلدیں) ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، چہار مقالہ (متن و انگریزی ترجمہ) اور لب الالباب کی اشاعت بھی ان کی علمی کاوش کی مرہون منت ہے۔

سر طامس آرنلڈ (۱۸۶۴ء تا ۱۹۳۰ء) علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ۱۹۰۴ء میں لندن یونیورسٹی کے استاذ عربی بن کر واپس چلے گئے، شبلی اور اقبال کے علمی ذوق کو پختہ کرنے میں ان کا بڑا دخل ہے۔ ان کی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) کا اردو، عربی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اخیر زمانے میں ان کی توجہ کا مرکز اسلامی مصوری بن گئی تھی۔

مارگولیتھ (Margoliouth، مرجلیوث) (۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء) آکسفورڈ یونیورسٹی کا نامور عربی فاضل جو بے تکان عربی بولتا اور لکھتا تھا، تفسیر بیضاوی (سورۂ آل عمران) اور رسائل ابی العلاء المعری کا انگریزی ترجمہ اس کا مشہور علمی کارنامہ ہے، معجم الادباء (یاقوت حموی) اور کتاب الانساب (السمعانی)، کی اشاعت اس کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے، اس کی لائف آف محمد علمی حلقوں میں تنقید اور تردید کا موضوع بنی رہی ہے، اس کی غلط بیانیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا شبلی مرحوم کو سیرۃ النبی کی تالیف کا خیال پیدا ہوا تھا۔

رینالڈ نکلسن (۱۸۶۸ء تا ۱۹۴۵ء) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے استاد تھے، انھیں تصوف اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، منتخبات دیوان شمس تبریز، کشف المحجوب (داتا گنج بخش ہجویریؒ) اسرار خودی (اقبال)، اور مثنوی مولانائے روم کے انگریزی تراجم ان کے قابل ستائش کارنامے ہیں۔

کرنکو (Krenkow) (۱۸۷۲ء تا ۱۹۵۳ء) نسلاً جرمن تھے، لیکن انگریزی قومیت اختیار کر لی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام محمد سالم کرنکوی رکھ لیا، جمہرۃ فی اللغۃ (ابن درید) اور تنقیح المناظر (قطب الدین الشیرازی)، اور الدرر الکامنۃ (ابن حجر) اور بہت سے عربی دواوین کی اشاعت ان کی زندگی کا بہترین کارنامہ ہے۔

آربری (Arberry) (۱۹۰۵ء تا ۱۹۶۹ء) جامعہ مصریہ قاہرہ میں قدیم زبانوں کے استاد تھے، پھر انڈیا آفس لندن میں لائبریرین بن گئے، بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی میں شعبۂ عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے، تصوف اسلام سے انھیں بڑا شغف تھا، کتاب التعرف (الکلاباذی) کتاب المواقف (النفری)، کی تصحیح و اشاعت اور قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ان کی یادگار ہے، نثر فارسی کی تاریخ انگریزی میں لکھی ہے اور حکایات رومی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

برطانوی مستشرقین میں ہملٹن گب کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، عالم اسلامی کی تحریکات سے انھیں

بے حد دلچسپی تھی، عربی زبان کے جدید ادب پر ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی۔

امریکہ: امریکہ میں استشراق کی تاریخ کی ابتداء انیسویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے، لبنان کے عیسائی فضلاء امریکہ کی یونیورسٹیوں میں علوم عربیہ کا درس دیتے رہے ہیں، ان میں قابل ذکر فلپ خوری ہٹی ہے جس کی ہسٹری آف عربز (عربوں کی تاریخ) مقبول عام کتاب ہے، اس نے لبنان اور شام کی تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے۔

جارج سارٹن (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۶ء) بلجیم کا رہنے والا تھا، لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ چلا آیا تھا اور امریکی شہریت اختیار کر لی تھی، اسے عربوں کے علوم و فنون کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی، اس شوق میں اس نے بیروت میں ایک عرصہ قیام کر کے عربی زبان سیکھی، اس کا عقیدہ تھا کہ صرف عربی زبان کے ذریعہ قدیم یونانی علوم و فنون تک رسائی ہو سکتی ہے، اور یونانی اور لاطینی زبانوں کے درمیان عربی ہی واسطۃ العقد ہے، اس نے کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد انگریزی میں ہسٹری آف سائنس (Introduction to History of Science) (تاریخ العلوم) کے نام سے ایک کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے، جس میں مسلم علماء اور حکماء کے سائنسی کارناموں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس عظیم الشان کتاب کے بعض حصے عربی میں منتقل ہو کر قاہرہ سے شائع ہو چکے ہیں۔

فرانز روزنتال ایک جرمن مستشرق ہے، جو کسی امریکی یونیورسٹی سے متعلق ہے، اس نے مقدمہ ابن خلدون کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ نویسی کی تاریخ کے علاوہ اسلام میں علم کے تصور پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے، جو بے حد مقبول ہوئی ہے۔

خاتمہ: ہمیں تسلیم ہے کہ بعض مستشرقین کی کتابوں میں یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی جھلک بھی نظر آتی ہے، ہمیں یہ بھی اقرار ہے کہ ان سے دانستہ اور نادانستہ غلطیاں بھی ہوتی ہیں لیکن

ساتھ ہی علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ ان کی تلاش و محنت اور شوقِ علم یا جنونِ علم کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے، یورپ کے مشرقی علوم کے فاضلوں کی محنت کی بدولت اسلامی تاریخ، جغرافیہ، ادب، شعر، لغت، تفسیر اور فلسفہ اور دوسرے بہت سے علوم کے متعلق سیکڑوں کتابیں تصحیح و تعلیق سے نہایت عمدگی کے ساتھ چھپ کر شایع ہو چکی ہیں، جن کے نام صرف کتابوں میں مذکور تھے۔

جس محنت سے ڈوزی نے اپنا تکملہ لغات عربی میں ترتیب دیا، زخاؤ نے کتاب الہند کی تصحیح کی، ڈی خویہ نے تاریخ الطبری کو، فلوگل نے کشف الظنون کو، رائٹ نے المبرد کی الکامل کو، وسٹنفیلڈ نے سیرت ابن ہشام کو، ریٹر نے مقالات الاسلامیین اور عبدالقاہر جرجانی کی اسرار البلاغۃ کو اور دوسرے مستشرقین نے سیکڑوں کتابوں کو برسہا برس کی جس محنت، جانفشانی اور تصحیح اور تحشیہ اور مختلف فہارس کے ساتھ چھاپ کر شایع کیا، اس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

وینسنک اور اس کے رفقا نے تیس برس کی محنت شاقہ کے بعد کتب حدیث کا انڈکس بنام المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی سات ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شایع کیا، جو عصر حاضر کا عظیم کارنامہ ہے۔ مسلم ممالک کی تاریخی عمارتوں اور ان کے فنونِ لطیفہ پر K. A. C. Creswell کریسول کی مستند تصانیف بھی قابلِ توجہ ہیں۔

ہمارے ہاں صرف شعر و شاعری کو ادب سمجھا جاتا تھا، مستشرقین نے نثر کو بھی برابر کا درجہ دیا، ہمارے ہاں نقد الادب پر گنتی کی چند کتابیں تھیں، مستشرقین نے ادبی تنقید کو بھی ادب کی مستقل اور اہم شاخ بنا دیا ہے، قلمی کتابوں کی فہرست نگاری اور مسکوکات کی شناخت کے لیے ہم تمام تر مستشرقین کے مرہونِ منت ہیں، اسلامی ادبیات کی تاریخ کے لیے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران، بروکلمان کی تاریخ الادب العربی اور اسٹوری کی پرشین لٹریچر آج بھی مستند اور معتبر ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان علما مستشرقین سے شوقِ علم، لگن اور محنت کا سبق لیں اور ان کی غلطیوں، کوتاہیوں اور فرد گذاشتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علوم اسلامیہ کی خدمت ان سے بہتر اور احسن طریقہ پر سر انجام دیں۔

قسطا بن لوقا البعلبکی

دور عباسی میں طب کی ایک ممتاز شخصیت

از جناب وسیم احمد اعظمی، ڈپٹی ریسرچ یونٹ خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ

طب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء کرنے کا دعویٰ بہت سے ملکوں نے کیا ہے، اس میں مصر، بابل اور ہندوستان قابل ذکر ہیں، لیکن ایک بات جو سب کے دعاوی میں مشترک طور پر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں طب مذہب کے زیر اثر تھی، مذہبی رہنما اس کے وارث اور علمبردار قرار دیے گئے تھے، اور ہر طبی مسئلہ کا حل مخصوص مذہبی عقیدے کی روشنی میں تلاش کیا جاتا تھا، یونان کے عہد زریں میں طب کو مذہب کی گرفت سے آزادی ملی، اور ایک علم کے طور پر اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں[1]، یونانیوں کے زوال کے بعد یہ علم روم ہوتا ہوا عربوں تک پہونچا، مزید عربوں نے مختلف مقامات سے کتابیں حاصل کرنا شروع کیں، اس دور میں یہ علمی مذاق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جہلاء بھی کتابوں کا قابل قدر ذخیرہ رکھتے اور اس پر نازاں رہتے تھے۔

مسلمانوں کو عیسائیوں پر جب غلبہ حاصل ہوا تو خالد بن یزید بن معاویہؓ (متوفی [illegible]) نے ماریانوس[2] اور اصطافن القدیم کے ذریعہ فن کیمیا سے متعلق یونانی کتابوں کو عربی زبان میں

۱ے دیباچہ تجدید طب ص ۱۰ مرتبہ حکیم سید ظل الرحمٰن ۲ے المنجد ص ۱۶۲ فی الادب العلوم: الاب لویس معلوف الیسوعی۔

ترجمہ کرایا[1]، اسلامی تاریخ میں یونانی زبان سے عربی زبان میں یہ پہلا ترجمہ تھا[2]، بعد میں عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (متوفی ۱۵۸ھ) نے رومی شہنشاہ کے پاس قاصد بھیج کر کتابیں منگوائیں، عیسائی مترجمین نے ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، مسلمانوں نے پڑھا، مزید اشتیاق پیدا ہوا، نتیجہ کے طور پر مامون الرشید (۱۸۶ھ، ۲۳۳ھ) نے رومی شہنشاہ سے علوم فلسفہ کی جملہ کتابیں طلب کیں، وہاں سے مثبت جواب ملنے پر مامون الرشید نے حجاج بن مطر، ابن البطریق اور سلما کو کتابیں لانے کا کام سپرد کیا، کتابیں آ جانے پر ان کا عربی میں ترجمہ کرایا، یونانی اور سُریانی زبانوں کے علاوہ نبطی، فارسی اور سنسکرت سے تراجم بھی تقریباً اسی دور میں ہوئے۔ اس دور میں ترجمے کے دو انداز تھے، لفظی ترجمہ اور محاوراتی ترجمہ، پہلا انداز ابن البطریق اور ابن نعیمہ حمصی کا تھا، دوسرا حنین بن اسحاق اور جوہری کا، ترجمہ کے سلسلے میں چار خاندان آل بختیشوع، آل سرخ، آل ثابت، اور آلِ حنین نے بڑی دلچسپی لی[3]۔ مترجمین کی فہرست میں مذکورہ خاندان کے علاوہ حسبِ ذیل نام نمایاں طور پر لیے جاسکتے ہیں:

یوحنا بن ماسویہ، تیاذوق، عیسیٰ بن حکم، جابر بن حیان، زکریا رازی، عثمان الدمشقی ابن النعیمہ عیسیٰ بن یحییٰ، موسیٰ بن خالد، یوحنا بن بطریق، اصطفان بن باسل، یحییٰ بن ثابت، ابراہیم بن صلت، ابراہیم بن بختیشوع، ثابت بن قرۃ الکندی اور قسطا بن لوقا۔

قسطا بن لوقا علم حساب، ہندسہ، نجوم، منطق اور طبیعیات کا محقق اور فن طب کا ماہر تھا[4]، بعض رائے کے مطابق اس کو فن موسیقی سے بھی شغف تھا[5]، اس کا وطن شام کا مشہور علمی شہر البعلبک تھا[6]

---

[1] الفہرست ص ۲۴۴، ابن ندیم [2] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۲۶۲ از حکیم عبدالحئی (اردو ترجمہ) [3] تاریخ طب و اطبائے قدیم ص ۲۲ حصہ اول، سید حیدر علی جعفری [4] طبقات الامم ص ۴۳ (اردو ترجمہ) قاضی ابوالقاسم صاعد ابن احمد الاندلسی [5] المنجد ص ۱۶ فی الادب والعلوم۔

جس کو اہلِ یونان عقیدت و احترام کی وجہ سے "مدینۃ الشمس" کہتے تھے، وہ یونانی النسل تھا اور عقیدے کے اعتبار سے ایک کلیسا کا پیرو۔ مذہبیات میں بھی دخل ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایک نسطوری پادری سے حضرت مسیحؑ کی ثنویت پر بحث کی تھی۔[1]

قسطا بن لوقا کے سنہ ولادت اور وفات کی تعیین اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یقینی طور پر اس کا سنہ ولادت اور سنہ وفات معلوم نہیں ہے، ان سنین کی تعیین کے لیے ہم واقعات کی کڑیاں جوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، تذکروں میں ہے کہ خلیفہ مستعین باللہ (۸۶۲ء ، ۸۶۶ء) کے لیے Heron کی تصنیف "کتاب الاوزان والمکائیل" کا ترجمہ کیا تھا، ابوالحسن علی بن یحییٰ (۸۸۸ء ، ۸۸۹ء) کے لیے کتاب المدخل" لکھی تھی،[2] المعتمد علی اللہ (۸۷۰ء ، ۸۹۳ء) کے وزیر اسماعیل بن بلبل کے نام" کتاب فی شکل الکرۃ الاسطوانۃ" معنون کی، المقتدر باللہ (۹۰۸ء ، ۹۳۲ء) کے عہد میں زندہ تھا کیونکہ المقتدر باللہ کے بھائی ابواسحاق ابراہیم بن المدبر سے اس کے دوستانہ مراسم تھے۔[3]

سارٹن (Sarton) کا خیال ہے کہ قسطا بن لوقا کا انتقال ۹۱۲ء میں ہوا۔[4] صاحب المنجد کا بھی یہی خیال ہے۔[5] بعض ذرائع معلومات[6] یہ بھی بتاتے ہیں کہ قسطا بن لوقا چونکہ المقتدر باللہ کے عہد (۹۰۸ء ، ۹۳۲ء) میں تھا، لہٰذا وہ ۹۳۲ء تک باحیات رہا ہوگا۔[7] خدا بخش لائبریری پٹنہ میں قسطا کا ایک طبی مخطوطہ "کتاب فی الوباء و اسبابہ" کے نام سے ملتا ہے، اس کے مطابق قسطا بن لوقا

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۳۶ ج ۱۶/۲ شائع کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور [2] ایضاً ص ۱۳۶ ج ۱۶/۲ [3] ایضاً ص ۱۳۷ ج ۱۶/۲ [4] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۶ ج ۱۶/۲ شائع کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور [5] المنجد ص ۱۲۴ فی الادب والعلوم [6] نوادر ص ۶۱ خدا بخش لائبریری مرتبہ اطہر شیر طب العرب ص ۸۰ پر سال وفات ۹۲۳ء تحریر ہے۔

نے اسے [illegible] روم کے بادشاہ ابو العباس مامون بن مامون کے حکم پر لکھا تھا[1] ابو العباس کو [illegible] میں قتل کیا گیا تو گویا قسطا بن لوقا کوئی ۳۰۰ھ تک حیات رہا ہوگا۔ بعض تذکروں میں ہے کہ اس کی پیدائش ۲۲۰ھ کے قریب ہوئی اور اس نے ستر یا اسی برس کی عمر پائی[2]

پہلے ذکر کیا گیا کہ قسطا بن لوقا کو فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، حساب، موسیقی اور طب وغیرہ میں کامل دسترس تھی، وہ لسانیات کا بھی ماہر تھا، یونانی، سریانی اور عربی پر اچھی نگاہ رکھتا تھا[3]

ابن ندیم کے خیال میں وہ مشہور طبیب و مترجم حنین ابن اسحاق العبادی (۱۹۴ھ تا ۲۶۰ھ) سے بلند مرتبہ تھا[4] لیکن ابن ندیم کے بعض ہمعصروں کا خیال ہے کہ وہ حنین کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر تھا[5] ابن ندیم نے خود کتاب الفہرست میں حنین کا ذکر پہلے اور قسطا بن لوقا کا بعد میں کیا ہے[6] اس طرح گویا انھوں نے بھی عملی طور پر حنین بن اسحاق العبادی کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔

جدید مصنفین بھی حنین بن اسحاق العبادی کی برتری کے معترف نظر آتے ہیں[7] بہرحال قسطا بن لوقا کی علمی اور لسانی صلاحیتوں کا سب کو اعتراف ہے، اس کے تراجم کے انداز، اسلوب نگارش اور طریقۂ ترتیب نے بڑی شہرت پائی ہے[8]

عباسی دور حکومت میں قسطا بن لوقا شام سے روم چلا گیا اور وہاں کے دانشوروں سے کتابیں اور نادر مخطوطے حاصل کرکے پھر شام لوٹ آیا۔ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے عباسی خلفاء نے

---

[1] خدا بخش لائبریری کیٹیلاگ ص ۱۹ ج ۴ [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۲۷ ج ۱۶ / ۲ ۔

[3] الفہرست ص ۲۴۴، ابن ندیم [4] ایضاً ص ۲۴۴ [5] ایضاً ص ۲۹۵ [6] ابن ندیم نے حنین بن اسحاق العبادی کا ذکر ص ۲۹۴ پر کیا ہے اور قسطا بن لوقا کا ص ۲۹۵ پر کیا ہے ۔

[7] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۲۷ ج ۱۶ / ۲ [8] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۲۷ ج ۱۶ / ۲ ۔

کسی شے نے یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے عراق بلا لیا[۱] وہاں انھوں نے تراجم کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ان ترجموں کی لسانی تصحیح بھی کی جو حنین بن اسحاق یا بعض دوسرے مترجمین نے کیے تھے[۲] اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے قدیم یونانی علوم کو مشرق تک پہونچایا، اور ان سے لوگوں کو متعارف کرایا[۳]

ابن ابی اصیبعہ عبداللہ ابن جبرئیل کے حوالہ سے لکھتا ہے: زندگی کے آخری ایام میں آرمینیا کے بادشاہ سخاریب نے اسے اپنے ہاں بلالیا اور وہ وفات تک وہیں رہا[۴] وہیں اس کی تکفین و تدفین بھی ہوئی، اس کے اعزاز میں اس کے مقبرے پر ایک قبہ تعمیر کرایا گیا، حالانکہ یہ امتیاز اس دور میں صرف امرا اور بلند مرتبہ مذہبی عہدیدار کے لیے مخصوص تھا[۵]

قسطا بن لوقا بہت ملنسار طبیعت کا تھا، معاصرین کے ساتھ اس کے روابط بہت خوشگوار تھے، مشہور فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی (متوفی ۲۵۳ھ) اس کا معاصر تھا، تذکروں میں ہے کہ اس نے متعدد لوگوں کی طرف اپنی تصانیف کا انتساب کیا، جن میں مذہبی اور سیاسی دونوں شخصیتیں شامل ہیں[۶] انھوں نے مشہور ہیئت داں ابو عیسیٰ ابن المنجم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کے بارے میں ایک خط لکھا تھا[۷]

۱؎ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی تحقیق کے مطابق مامون نے طلب کیا ہوگا، ملاحظہ فرمائیں حاشیہ تاریخ الحکماء، اردو ترجمہ ص ۴۵۹ ۲؎ تاریخ الحکماء، ص ۳۶۱ (فارسی ترجمہ) ابن القفطی۔

۳؎ طبقات الاطباء ص ۲۴۴ جزء اول، ابن ابی اصیبعہ، الفہرست ص ۲۴۳ ۴؎ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص ۱۳۷ ج ۱۶ / ۲ ۵؎ طبقات الاطباء ص ۲۴۴ جزء اول، تاریخ الحکماء، ص ۳۴۴، الاعلام ص ۴۰ خیرالدین زرکلی ۶؎ ایضاً ص ۲۴۴، طبقات ۷؎ تاریخ الحکماء ص ۳۶۱۔ مختصر الدول ص ۲۵۹ ابی الفرج ۸؎ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ص ۲۴۴ الجزء الثانی۔

قسطا بن لوقا کی حیات اور خدمات کے بارے میں ہماری معلومات کا اصل ماخذ ابن ندیم کی "الفہرست" اور ابن ابی اصیبعہ کی "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ہے۔ الفہرست، تذکروں میں اس کے بارے میں جس قدر لکھا گیا ہے ان کا مدار یہی معلومات بھی کتابیں ہیں۔ اس کی تصانیف کی تعداد کا تعین بہت مشکل ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کی باسٹھ [۶۲] کتابوں کے نام بتائے ہیں[۱] ابن القفطی نے تقریباً بائیس [۲۲] کتابوں کی نشاندہی کی ہے[۲]، قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد الاندلسی نے چھ کتابوں کا ذکر کیا ہے[۳]، ابن ندیم نے چونتیس [۳۴] کتابوں کا نام لکھا ہے[۴]، خیرالدین الزرکلی نے تقریباً سولہ [۱۶] کتابوں کا تذکرہ کیا ہے[۵]۔ لوئیس معلوف الیسوعی نے متعدد تصانیف کے وجود کا اعتراف کرتے ہوئے صرف دو [۲] تصانیف کا ذکر کیا ہے[۶]، حکیم عبدالحئی کے خیال میں قسطا بن لوقا نے ترجمہ، شرح اور تفسیر کے علاوہ چونتیس [۳۴] مستقل کتابیں لکھی تھیں[۷]۔

قسطا بن لوقا کی یہ تصانیف علم سحر، ریاضی، ہندسہ، نجوم، فلسفہ، تاریخ، فلکیات، طبیعیات، رنگ ریزی، زراعت اور طب وغیرہ علوم و فنون پر مشتمل ہیں۔ تصانیف اور فنون کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے:

سحر: اس موضوع پر اس کی تصنیف کا لاطینی ترجمہ ہی دریافت ہو سکا ہے۔ اس میں اس نے تعویذوں اور جادو ٹونے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ موثر ہیں۔ ان کے سبب روح کو تقویت ملتی ہے اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

ریاضی: اس موضوع سے متعلق یونانی کتابوں کے مشکل اور غیر معروف مباحث پر مشتمل

---

[۱] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ص ۲۴۴۔ ۲۴۵ جزء اول [۲] تاریخ الحکماء ص ۳۹۱ (خواری ترجمہ) [۳] طبقات الامم ص ۴۳ (اردو ترجمہ) [۴] الفہرست ص ۲۹۵ [۵] الاعلام ص ۴۰ جزء سادس [۶] المنجد ص ۴۱۶ فی الادب والعلوم [۷] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۴۰۵ (اردو ترجمہ)

اٹھایا ہے، اس کی ایک کتاب چند سال قبل شایع بھی ہو چکی ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کا ایک نسخہ نظر سے گذرا ہے۔

ہندسہ :۔ اس موضوع سے متعلق ایک کتاب "المدخل الی علم الہندسۃ علی المسائل والجواب" کا پتہ چلتا ہے۔

نجوم :۔ اس موضوع پر اس کی گرانقدر تصنیف "المدخل الی علم النجوم" ہے۔

فلسفہ :۔ اس موضوع پر اس کی ایک مشہور کتاب "الفرق بین الروح والنفس" کا نام لیا جا سکتا ہے، اس میں اس نے روح اور نفس کے فروق کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے اور جہاں کہیں بھی عضویاتی افعال زیر بحث آئے ہیں وہاں اپنی بے پناہ طبی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اس کی یہ کتاب کافی مقبول ہوئی، عبداللہ بن الفضل نے اس موضوع سے متعلق اپنی کتاب میں اس سے خوب استفادہ کیا ہے جس کا لاطینی ترجمہ بھی ہوا ہے[1]

تاریخ :۔ اس موضوع پر کتاب الفردوس" لکھی جو غالباً آرمینیا میں مکمل ہوئی،

رنگ ریزی :۔ اس موضوع پر "کتاب فی الخضاب" اور "کتاب فی العلۃ فی اسوداد الحبشی وتغیرہ من الماش" کا پتہ چلتا ہے۔

زراعت :۔ مترجم کی حیثیت سے قسطوس بن اسکورس کینا کی تالیف "کتاب الفلاحۃ الرومیۃ" کا ترجمہ کیا تھا، لیکن اس ترجمہ کی پذیرائی نہ ہو سکی، اس کے مقابلہ میں سرجس بن ہلیا کا ترجمہ کافی مقبول ہوا[2]

فلکیات :۔ قسطا بن لوقا کی خدمات فلکیات پر بہت زیادہ ہیں، اس نے فلکی آلات بنا

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۹ ج ۱۶ / ۲

[2] کشف الظنون ص ۱۳۲ ج ۵ حاجی خلیفہ۔

...یت سے توجہ دی۔ اس موضوع پر اس کا کام اس قدر وسیع تھا کہ الفرغانی کی کتاب ہیئت کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ بعض حلقوں سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس موضوع سے متعلق کتاب "فی حل الاعصار لاب الکوی" کو قسطا بن لوقا کی طرف غلط طور پر منسوب کر دیا گیا ہے لیکن بعض مورخین نے اس کی زبردست طور پر تردید کی ہے[1]۔

طبیعیات:۔ اس موضوع پر اس کی دو[2] کتابوں "المرایا المحرقة" اور "کتاب الاوزان والمکاییل" کا نام لیا جاتا ہے۔

طب:۔ فن طب میں قسطا بن لوقا کی کافی تصانیف ملتی ہیں، جن میں "کتاب[1] اوجاع النقرس، کتاب[2] فی البرد الرّیح وعللها، رسالة[3] فی احوال الباه واسبابه علی طریق المسئلة والجواب، کتاب[4] جامع فی الدخول الی علم الطب، کتاب[5] النبیذ وشربه فی الولائم، کتاب[6] فی العطش، کتاب[7] فی الاغذیة علی طریق القوانین الکلیة کتاب[8] فی النبض ومعرفة الحمیات وضروب البحرانات، کتاب[9] فی علة الموت فجأة، کتاب[10] فی ایام البحران فی الامراض الحادة، کتاب[11] فی الاخلاط الاربعة وما تشترک فیه تحقیق کتاب[12] فی الکبد وخلقتها وما یعرض فیها من الامراض کتاب[13] فی تدبیر الابدان فی سفر الحج، کتاب[14] فی دفع ضرر السموم، کتاب[15] فی حرکة الشریان، کتاب[16] فی العضو الرئیس من البدن، کتاب[17] فی البلغم، کتاب[18] فی الدم، کتاب[19] فی المرة الصفراء، کتاب[20] فی المرة السوداء، کتاب[21] الفصد، کتاب[22] الحمام اور کتاب[23] فی الوباء واسبابه شامل ہیں۔

ہندوستان میں قسطا بن لوقا کے مخطوطات	ہندوستان کی جن لائبریریوں میں قسطا بن لوقا کے مخطوطات کا پتہ

۱؎ الفہرست ص ۴۰۲ فی الادب العلم ۲؎ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۹ ج ۱۶/۲

چھپتا ہے، ان میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور اور کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد شامل ہیں، خدا بخش لائبریری میں چھ[۱] مخطوطات ثاؤذوسیوس[۲] کی کتاب المساکن اور کتاب الاکر ابسقلاؤس[۳] کی کتاب المطالع اور ارسطرخس[۴] کی کتاب جوی النیرین کے ترجمے اور ذاتی تصانیف میں کتاب فی الوباء و اسبابہ اور کتاب فی حفظ الصحۃ و ازالۃ المرض ملتے ہیں، آخر الذکر مخطوطے کا دوسرا کوئی نسخہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے[۵]، رضا لائبریری کے کٹیلاگ کے مطابق وہاں پانچ مخطوطات محفوظ ہیں، ثاؤذوسیوس کی کتاب المساکن اور کتاب الاکر، ارسطرخس کی کتاب فی جوی النیرین اور ابسقلاؤس کی کتاب فی المطالع کے عربی تراجم اور ذاتی تصنیف کتاب فی تدبیر الابدان فی سفر الحج، کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد کے مخطوطات کی مطبوعہ فہرست حصہ دوم کے مطابق وہاں صرف ایک مخطوطہ الکتاب فی تدبیر بدن فی السفر ہے[۶]۔

---

[۱] یونان کا مشہور مہندس اور ریاضی داں جس کی تصانیف ان فنون پر کافی مشہور ہیں، اس کی تصنیف "کتاب الاکر" اتنی عمدہ ہے کہ علماء اسے المجسطی سے کم اور آقلیدس سے زیادہ مرتبہ دیتے ہیں (تاریخ الحکماء ص ۱۶۶ اردو ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق) [۲] یونان کا مشہور ریاضی داں جو آقلیدس کے بعد گذرا ہے، کتاب الاجرام والابعاد، کتاب المطالع اور آقلیدس کے چودھویں اور پندرھویں مقالہ کی اصلاح کی (تاریخ الحکماء ص ۱۱۲ اردو ترجمہ) [۳] فلسفہ کے لحاظ سے یونانی، مولد کے لحاظ سے اسکندری، علم الفلک کا فاضل، اس کی مشہور کتاب کتاب حد الشمس والقمر ہے (ایضاً: ص ۱۱۰) [۴] خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) کٹیلاگ ص ۱۸، ج ۴ [۵] رضا لائبریری رام پور کا آخر الذکر مخطوط اور آصفیہ حیدرآباد کا مخطوطہ دونوں ایک ہی ہیں۔

لیکن ہندوستان میں قسطا بن لوقا کے مخطوطات کی اس فہرست کو کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا، بلکہ بذاتِ خود یہ تحقیق کا ایک اہم موضوع ہے۔

مذکورہ جائزہ سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ قسطا بن لوقا اپنے وقت کا عبقری تھا عربی طب پر اس کی ذہانت و زبان دانی کے اثرات بڑے واضح اور دیرپا ہیں، مختلف فنون سے اس کی دلچسپی کے ساتھ موضوع طب پر اس کی عالمانہ گرفت نے طب میں ایک معیاری سرمایہ کا اضافہ کیا ہے جس کو ہر دور میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اس دور میں اس کی تصانیف کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت ہے، طب قدیم کے اسکالرس کو ایسی اہم شخصیتوں کے کارناموں پر نہ صرف توجہ دینی چاہیے، بلکہ ان پر تحقیقی کام بھی کرنا چاہیے۔

تیسری چوتھی صدی ہجری میں مرکزِ اسلام بغداد میں کتابیاتی سرگرمیاں

از جناب مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، نائیجریا

عہد عباسی میں علوم کی کثرت وتنوع سے اہل علم کتابیات کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ذخائرِ علوم سے آگاہی ہو، اہل علم کو اصل ماخذوں تک رسائی ہو اور حصول مواد میں کسی قسم کی دقت نہ ہو، عہد عباسی میں اس اہم کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے علماء اور مصنفین نے خود نوشت کتابیات کا سلسلہ شروع کیا، وراقوں نے مختلف کتب خانوں کے ذخائر سے فائدہ اٹھاکر اپنے مشاہدات وتجربات کی روشنی میں منتخب کتابیات تیار کیں، یہ سلسلہ اتنا پھیلا کہ کتابیات کو مختلف ناموں، فہرس، فہرست، ثبت، تذکرہ، برنامج، مشیخہ ومعجم سے یاد کیا جانے لگا۔

عہد عباسی کے اندر تیسری کیا چوتھی صدی ہجری میں ہر موضوع پر ہر موضوعی کتابیات کی ترتیب وتدوین شروع ہو چکی تھی، چنانچہ یعقوب بن اسحاق کندی المتوفی سنہ ۲۶۰ھ ۸۷۳ء کی موضوعی کتابیات اٹھارہ (۱۸) موضوعات اور دو سو چھتیس (۲۳۶) کتابوں پر مشتمل تھی، ان موضوعات پر کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے: (۱) فلسفیات ۲۲ الکتب رسائل، (۲) منطقیات ۹ (۳) حسابیات ۱۱ (۴) کرویات ۸ (۵) موسیقیات ۷ (۶) نجومیات ۱۵ (۷) ہندسیات ۲۳ (۸) فلکیات ۱۹ (۹) طبیات ۲۰ (۱۰) احکامیات ۱۰ (۱۱) جدلیات ۱۶ (۱۲) نفسیات ۵ (۱۳) سیاسیات ۱۲ (۱۴) احداثیات ۱۴ (۱۵) ابعادیات ۸ (۱۶) تقدمیات ۵ (۱۷) انواعیات ۳۳[1]۔

موضوعی کتابیات موضوعی کتابیات ارباب فن اور نامور اہل علم سے تیار کرائی جاتی تھیں چنانچہ حنین بن اسحاق (۱۹۴ھ/۸۱۰ء - ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) نے علی بن یحییٰ کے لیے جالینوس کی کتابیات (فہرست جالینوس)

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست لابن ندیم۔ المطبعۃ الرحمانیۃ، مصر ۱۳۴۸ھ، ص ۳۵۷ - ۳۶۵۔

مرتب کی تھی۔ اس کے مطالعہ کی روشنی میں ابن ندیم نے یہ کہا ہے کہ حنین کے بیشتر ترجمے سریانی میں تھے اور یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ حبیش اعسم اور عیسیٰ بن یحییٰ نے جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے وہ بھی حنین سے منسوب کی گئی ہیں[1] ابوبکر محمد رازی المتوفی ۳۲۱ھ/۹۳۲ء نے اس کتابیات پر استدراک "کتاب فی استدراک ما بقی من کتب جالینوس مما لم یذکرہ حنین ولا جالینوس فی فہرستہ" کے نام سے لکھا تھا[2] رازی نے پہلی مرتبہ کتابیاتی دنیا میں تحقیق کا دائرہ یہاں تک بڑھایا کہ خود جالینوس سے جن کتابوں کا تذکرہ رہ گیا تھا اس کا کھوج لگایا اور علمی دنیا کو واقفیت کے لیے پیش کیا،

یحییٰ بن عدی المتوفی ۳۶۴ھ/۹۷۵ء نے ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ ق م) کی تصانیف اور ان کی شروح پر مشتمل "فہرست کتب ارسطاطالیس" مرتب کی تھی۔ ابن ندیم نے یہ فہرست یحییٰ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی تھی[3] لیکن خود اس نے یحییٰ کی تصانیف میں اس کتابیات کا ذکر نہیں کیا ہے[4] اور نہ القفطی وغیرہ نے اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے[5] یہ اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس قسم کی کتابیات اس دور میں تیار کی جاتی تھیں لیکن ہر مقام پر ان کے بیان کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔

فہرست اسماء الخطباء والبلغاء: یہ ابو علی ابن مقلہ خطاط المتوفی ۳۲۸ھ نے طبقات پر مرتب کی تھی۔ ابن ندیم نے اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ فہرست دیکھی تھی، اس نے اسی ترتیب و الفاظ کے ساتھ اسے کتاب الفہرست میں نقل کیا ہے[6] مورخ ہشام کلبی المتوفی ۲۰۴ھ اور مدائنی المتوفی ۲۲۵ھ کی تصانیف کی موضوعی فہرست بخط ابو الحسن بن الکوفی المتوفی ۳۴۸ھ/۹۶۰ء کو اسی ترتیب و عنوانات کے ساتھ من وعن الفہرست میں نقل کیا ہے[7]

---

[1] کتاب الفہرست لابن الندیم المطبعۃ الرحمانیہ، مصر ۱۳۴۸ھ، ص ۴۰۳ [2] ایضاً، ص ۴۱۷۔
[3] ایضاً ص ۲۵۱-۲۵۲ [4] ایضاً ص ۳۶۹ [5] تاریخ الحکماء للقفطی طبع لیپزگ ۱۹۰۳ء ص ۳۶۱ [6] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۱۸۲ [7] ایضاً ص ۱۴۰-۱۴۳ و ۱۴۷-۱۵۲۔

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مصنفین کی موضوعی اور دوسری قسم کی کتابیات تیار کیے جانے کا رواج ہو گیا تھا، چنانچہ جابر بن حیان المتوفی سنہ ۲۰۰ھ کے نامور شاگرد خرقی کی تصانیف کی دو[2] فہرستیں تھیں، ایک فہرست کبیر کیمیاء اور دوسرے موضوعات پر تھی، اور دوسری فہرست صغیر تھی، جو صرف علم کیمیا کی کتابوں پر محیط تھی[1]

ابن ندیم بحیثیت فہرست نگار و کتاب شناس اور کتاب الفہرست کی خصوصیات

تیسری صدی ہجری میں ہر موضوع پر کتابوں کی کثرت کی وجہ سے اہل علم موضوعی کتابیات کی ترتیب کی طرف مائل ہوئے، پھر چوتھی صدی ہجری میں ابو الفرج محمد بن اسحاق الوراق الندیم نے فہرس الفہارس (کتابیات کی کتابیات) ترتیب دی، اس دور میں فہرس الفہارس کی اصطلاح ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لیے ابن ندیم نے اس وسیع مفہوم کو حسب ذیل الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے:

"یہ عرب و عجم کی ان تمام (منتخب) کتابوں کی فہرست ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی تھیں یا مختلف علوم و فنون سے عربی میں منتقل کی گئی تھیں"[2]

ظاہر ہے ان کا احاطہ کتابیات کے بغیر کیسے ممکن تھا، غالباً اسی جامعیت کی وجہ سے ابن ندیم نے اس کتاب کا نام سیبویہ کی الکتاب کی طرح "الفہرست" رکھا، جو اس امر کا غماز ہے کہ یہ کتاب الفہرست علم کتابیات کی جملہ مروجہ معلومات و مدونہ کتابیات کو حاوی ہے، یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ محمد ابن اسحاق الندیم نے اگرچہ ہذا فہرست کتاب جمیع الامم من العرب والعجم الموجود منہا بلغۃ العرب الخ کے الفاظ لکھے ہیں، لیکن کتاب کے مطالعہ و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ "جمیع" کا لفظ کثرت کتب کے اعتبار سے لایا گیا ہے، اس سے مراد مصنفین وغیرہ کی مشہور و متداول کتابوں کا تذکرہ ہے، جیسا کہ ابن ندیم نے فقیہ زعفرانی المتوفی سنہ ۲۶۰ھ کے تذکرہ میں کہا ہے کہ "ہمیں زعفرانی کی روایت کردہ

۱؎ ملاحظہ ہو الفہرست لابن الندیم ص ۵۰۰۔ ۲؎ ایضاً ص ۲۹۷۔

کتابوں کو نام بنام ذکر کرنے کی حاجت نہیں اس لیے کہ وہ زیادہ تر فنا ہو چکی ہیں اور مصنف کے بعد وہ نقل بھی نہیں کی گئی ہیں[1] بعض کے متعلق کثیر التصانیف ہونے کی تصریح کر کے اس کی چند تصانیف کو بیان کرنا[2] یا کسی مصنف کے بارے میں اس کا ومن کتبہ الخ[3] اور ولہ من الکتب الخ اس کی کتابوں میں سے یہ کتب ہیں[4]۔ کے الفاظ لکھنا پھر فہارس کو موضوعی کتابیات مصنفین کو ہر مقام پر من وعن نقل نہ کرنا، بلکہ بعض مقام پر انہی کتابوں کو درج کرنا جن کو خود دیکھا یا معتبر لوگوں سے سنا ہے، یہ وہ قرائن ہیں جو تصانیف کے دائرہ کو منتخب و متداول کتابوں تک محدود رکھنے کی دلیل ہیں، اس نے چونکہ اپنے زمانہ میں پائی جانے والی کتابوں کا بھی اندراج کیا ہے، اس لیے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گذشتہ عہد کی کتابیات ہی نہ تھی بلکہ یہ رواں کتابیات بھی تھی۔

الفہرست میں کتابوں کے ناموں کے اندراج میں کتاب کے معروف و غیر معروف دونوں نام نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا، تاکہ کتابیات سے فائدہ اٹھانے والے کو اشتباہ نہ ہو، مثلاً ابوعبد الله محمد ضبی کی کتاب "الزکوٰۃ" کے متعلق کہا ہے کہ یہ کتاب السنن[5] یا وکیع کی کتاب الطریق نواحی کے نام سے بھی مشہور ہے[6]۔

مشتبہ مقام پر ماں باپ کے نام کی نسبت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً محمد بن حبیب کے متعلق کہا ہے کہ حبیب ماں کا نام ہے[7] اور اسماعیل بن علیہ کی نسبت کہا ہے کہ علیہ ماں کا نام ہے[8]۔ کہیں لقب کے معنی اور وجہ لقب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مثلاً قطرب کے معنی حرکت کنان کیڑا اسے چونکہ قرار نہیں تھا، یہ سیبویہ کے پاس سویرے ہی آجاتا تھا اس لیے اس نے اس کا نام ہی قطرب رکھا تھا[9]۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۴۹ [2] ایضاً ص ۳۰۹ [3] ایضاً ص ۲۰۵ [4] ایضاً ص ۱۰۷، ۲۰۶، ۳۳۰، ۳۶۰، ۵۰۷ [5] ایضاً ص ۳۱۶ [6] ایضاً ص ۱۳۶ [7] ایضاً ص ۵۵ [8] ایضاً ص ۸۰ [9] ایضاً ص

مصنفین کے علمی مقام کو واضح کرنے اور ان کی تصنیفات کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے ماہرِ فن کا قول پیش کیا ہے، مثلاً اصمعی کے بارہ میں کہا ہے کہ ابو العباس مبرد کا قول ہے کہ اصمعی شعر و معانی میں سب سے برتر ہے، یہی حال ابو عبیدہ کا ہے، لیکن وہ علم نسب میں اصمعی سے بلند تر تھا اور اصمعی علم نحو کا اس سے بڑا عالم تھا[1] اس نوع کے تبصرے متعدد مقامات پر لکھے ہیں[2]، الفہرست کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں تشریحی کتابیات کا آغاز ہو چکا تھا، چنانچہ ابن ندیم نے الفہرست میں کتاب کے طرز و انداز کو بھی بتایا ہے، مثلاً ابن قتیبہ کی کتاب ادب الکاتب کے متعلق لکھا ہے کہ یہ معارف ابن قتیبہ کی طرح ہے[3]

مصنفین کے طرزِ تصنیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مثلاً کہا کہ فلاں مصنف کو تصنیف کا اچھا سلیقہ تھا[4]۔ فلاں مصنف فلاں کے انداز پر کتاب لکھتا ہے[5]۔ یا فلاں فلاں میں یہ فرق ہے اور ان میں فلاں زیادہ ماہر ہے۔ مثلاً فرار اپنی تصانیف میں فلاسفہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے[6] ابو زید بلخی کی فلسفیانہ تصانیف فلاسفہ کی بہ نسبت اہل ادب سے زیادہ قریب ہیں، اس لیے ان کا ذکر بھی ادباء کے زمرے میں کیا گیا ہے[7] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں فہرست ساز اسالیب تصانیف پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔ الفہرست اس دور کی تصانیف کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتی ہے، کوئی کتاب اگر کسی مصنف سے منسوب ہوتی ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا ہے[8] کسی مصنف نے بہت سے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں تو اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی کتابوں کی

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۸۲، ۱۳۶، ۱۴۰ [2] ایضاً ص ۸۰، ۲۱۶، ۱۳۶- [3] ایضاً ص ۹۲- ۱۶۶ [4] ایضاً ص ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۲۰، ۲۲۱ [5] ایضاً ص ۱۷۴، ۲۲۴، ۲۲۴ [6] ایضاً ص ۲۱۰ [7] ایضاً ص ۹۹، ۱۷۳ [8] ایضاً ص ۱۹۸- [9] ایضاً ص ۲۱۴ (تذکرہ عکسری)

[illegible] کتب خانہ کے نقطۂ نظر سے بتایا ہے۔

وہ مصنفین جن کی تصانیف کی طرف اہل علم کی توجہ حسن ضبط کی یا حسن خط کی وجہ سے رہی ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اگر کسی خاص شہر میں ان کو قبول عام حاصل رہا ہے اس کو بھی بتایا ہے۔ مختلف مرتب دواوین کے اشعار کی تعداد کو بھی بیان کیا ہے۔ کسی مشہور عالم کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری، صرف مسودات ہی مطالعے سے گذرے ہیں تو اس کی طرف بھی اشارہ کیا، گویا علمی و تحقیقی ورثے کو نظر انداز نہیں کیا ہے، چنانچہ بلخی فلسفی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے مسودات اہل علم کے پاس بہت دیکھے ہیں، لیکن کوئی پوری کتاب نہیں دیکھی، یہ کہا جاتا ہے کہ خراسان میں اس کی تصانیف موجود ہیں۔ رازی نے اس کی تصانیف کو اپنی تصانیف قرار دیا ہے، مشترک مصنفین کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ابن ندیم نے جگہ جگہ کتابوں کے اوراق کی تعداد بتائی ہے، ایک مقام پر تصریح کی ہے کہ بغیر کسی نسبت کے ورق کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے ورق سلیمانی مراد ہے جو بیس سطری ہوتا ہے، ہر شاعر کے کلام کی تعداد کو اسی ورق میں بیان کیا ہے، تاکہ ان کے کلام میں کمی بیشی کی نشاندہی ہو سکے، جو شخص ان کی کتابیں اور شعر جمع کرنے کا خواہاں ہے وہ علی وجہ البصیرت اس سے آگاہ رہے، ہمارا یہ اندازہ تقریبی ہے، تحقیقی نہیں۔ اس کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ عہد عباسی میں کتابیات کے Collation کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الفہرست کی تدوین کی غایت اہل علم میں کتابوں سے متعلق

---

۱ ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۲۱۴ (تذکرہ مروذی)۔ ۱۹۰ (المرزبانی) ۲ ایضاً ص ۱۲۰۔ ۳ ایضاً ص ۱۱۶۔ ۱۱۸ ۴ ایضاً ص ۱۱۵۔ ۱۲۴۔ ۲۷۵ ۵ ایضاً ص ۲۳۵۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۶ ایضاً ص ۱۹۴ ۷ ایضاً ۸ ایضاً ص ۳۴۰۔۵ (تذکرہ بنو الصباح)، ۹ ایضاً ص ۳۲۶۔

مفید معلومات فراہم کرنا، ذخائر کتب میں اضافہ و انتخاب میں مدد و آسانی پیدا کرنا تھا، ان ہی مقاصد کے پیش نظر ایک مصنف کے نامور مصنفین کو تقدم و تاخر زمانی و مکانی اور ترتیب حروف تہجی کا لحاظ کیے بغیر ہر مقام پر ایک ہی جگہ بیان کیا ہے، پوری کتاب میں اس کا یہی انداز ہے[۱] ابن ندیم کے بعد بھی فہرست نگاروں نے مذکورہ بالا اصول کو اپنایا ہے، جیسا کہ ابن خیر کی فہرست ص ۱ ر ۲۱ ص شیوخہ سے ظاہر ہے۔

ابن ندیم نے کسی اہم کتاب کا نسخہ کسی کے پاس دیکھا ہے تو اس کی تفصیل پیش کی ہے، مثلاً کتاب القبائل والایام محمد بن حبیب اخباری المتوفی ۲۴۵ھ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ کتاب موصوف نے فتح بن خاقان کے لیے تصنیف کی تھی، اس کا اصل نسخہ ابو القاسم بن ابی الخطاب بن فرات کے پاس دیکھا، یہ طلحی کاغذ پر تیس ۳۰ سے کم اجزاء پر مشتمل تھا، اس نسخہ کی ظاہری ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اصل مقدار سے کم ہے، اس کا ہر جزء دو سو ۲۰۰ یا اس سے زیادہ اوراق پر مشتمل تھا، اس نسخہ کی فہرست طلحی کاغذ کے پندرہ ۱۵ اوراق پر خط جرک میں تستری بن علی وراق کی لکھی ہوئی ہے، اور یہ فہرست قبائل اور ان کی سرگذشت ایام پر محیط ہے[۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کتاب سے اہل علم کو روشناس کرانے اور تعیین موضوع میں فہرست سازوں اور درجہ بندی کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے تیسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں فہرست کتاب کے شروع میں لگانے کی ابتداء ہو چکی تھی اور اس اہم کام کے آغاز کا سہرا محمد بن حبیب بغدادی کے سر ہے[۳]

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۶۵، ۲۰۹، ۲۱۰ [۲] ایضاً ص ۱۵۵، ۱۵۶ [۳] معجم الادباء یاقوت طبع دوم مطبعہ ہندیہ مصر ۱۹۲۵ء ج ۶ ص ۴۷۶ و کتاب المحبر از محمد بن حبیب مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۶۱ھ ص ۵۱۰، ۵۱۱ (کلمۃ الختام للکتاب لمحمد حمید اللہ) ص ۵۱۰، ۵۱۱

فہرست مضامین کتاب کے لیے لفظ فہرست کا استعمال

ابن ندیم نے فہرست مضامین کتاب کے لیے "ثبت" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ نضر بن شمیل المتوفی سنہ ۲۰۳ھ کی کتاب الصفات کے متعلق لکھا ہے کہ بڑی کتاب ہے، ابو عبید نے غریب المصنف میں اس سے استفادہ کیا ہے "میں نے اس کا ثبت ابو الحسن بن کوفی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے، جو من وعن نقل کرتا ہوں پھر ہر جلد کے مضامین کی فہرست پیش کی ہے" [1]

مصطلحات فن کتابیات کا استعمال

ابن ندیم نے مصطلحات فن کو استعمال کیا، مثلاً زائدہ ابن قدامۃ الشہید المتوفی سنہ ۱۶۱ھ کی کتاب السنن کے لیے لکھا ہے کہ یہ انہی ابواب پر مشتمل ہے جن پر کتاب السنن مشتمل ہوتی ہے جیسے کتاب الطہارۃ، صیام وصلوٰۃ وغیرہ [2]

الف بائی ترتیب کی وضاحت کے لیے مثلاً دو لفظ عملہ علی حروف المعجم اور علی الحروف کی اصطلاح استعمال کی ہے [3]، اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم مرتبین کتابیات نے تشریحی اندراجات میں ایسی معلومات پیش کیں جو اہل علم کی ترغیب کا باعث ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ صرف موضوع ہی نہیں خود کتاب سے آگاہی بھی اس دور میں اہل علم کو مطالعہ کتاب پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھی، اس سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ ابن ندیم نے کتابیاتی اندراجات میں موجودہ کتابوں کے نادر نسخوں سے بھی اعتنا نہیں کیا، بلکہ قدیم نادر و نایاب کتب کی توجہ اہل علم کی طرف منعطف کرانے کے لیے تشریحی کتابیات پیش کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔

ابن ندیم نے کتابوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ان ماخذوں کی نشاندہی بھی کی ہے، چنانچہ جن کتابوں کو بچشم خود دیکھا ہے، ان کے کاتبوں کے نام کی تصریح کی ہے [4] اور جن علماء سے

---

[1] کتاب الفہرست ص ۷۷، [2] ایضاً ص ۳۱۶ [3] ایضاً ص ۲۰۰، ۲۱۳، ۲۳۵۔

[4] ایضاً ص ۱۱۷، ۲۳۴

معلومات حاصل کی ہیں ان کا بھی حوالہ دیا ہے[1]۔ کبھی دو فنون کی کتابوں کو ایک مقام پر دو عنوان[2] سے پیش کیا ہے[3]۔ بعض موضوع پر ایسی مشہور کتابوں کو جن کے مصنفین کا علم نہیں ہے، ان کو بھی فہرست میں جگہ دی ہے[4]۔ اپنے معاصر مصنفین کا ذکر مشہور و ہمعصر ہونے کی وجہ سے نہایت مختصر کیا ہے[5]۔

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ندیم نے بعض مقامات پر کتابیں بروقت دستیاب نہ ہونے یا ان کے مولفین کے متعلق معلومات فراہم نہ ہونے کی وجہ سے بیاض چھوڑ دی، تاکہ معلومات حاصل ہو جانے کی صورت میں ان کا اضافہ کیا جا سکے، اس نوع کے اضافہ کا اختیار ناظرین کو بھی دیا ہے[6]۔

مندرجۂ بالا امور کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ کتابیات کی تاریخ کے اندر کتب خانے کے نقطۂ نگاہ سے تبصرے، تنقید و جائزے اور تعارف کتب کی طرح سب سے پہلے ابن ندیم نے ڈالی، نیز عہد عباسی میں کتاب کی ظاہری و باطنی ہیئت کو نمایاں کرنے کی سعی بلیغ کی، اگرچہ بعض علمی دشواریوں کی وجہ سے ہر جگہ ان امور کا التزام نہیں کیا جا سکا ہے، تاہم جہاں بسہولت ممکن ہو سکا مذکورۂ بالا امور کی روشنی میں کتاب کے ہر دو رخ کی تصویر کشی کی گئی ہے، آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مخطوطات کی ظاہری و باطنی ہیئت کو نمایاں کرنے کے لیے مذکورۂ بالا امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جو ابن ندیم کے وضع کردہ رہنما اصول کی افادیت و اہمیت اور مقبولیت کا نہایت بین ثبوت ہے۔

ابن ندیم پہلا ماہر کتابیات ہے جس نے چوتھی صدی ہجری میں کتابیاتی اندراج میں تنوع و وسعت پیدا کی اور کتابیاتی مواد کے تواม میں ایسے بنیادی اجزاء کو شامل کیا جن کے اندراج کے بعد کتاب کا پورا تعارف و تشخص ہو جاتا اور کتاب کے طلبگار کو کتاب کی ظاہری و باطنی ہیئت کو سمجھنے میں

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۴۳۲ [2] ایضاً ص ۱۲۶ [3] ایضاً ص ۴۳۵ [4] ایضاً ص ۲۰۸۔

[5] ایضاً ص ۲۶۴ (الزیدیہ)

کوئی تبدیلی باقی نہیں رہتی ہے کتابیاتی مواد کے اندراج میں جن بنیادی اجزاء کو شامل کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مصنف (۲) کتاب (۳) ایڈیشن (۴) مقام اشاعت (۵) ناشر (۶) تاریخ اشاعت کتاب

(۷) تعداد اوراق (۸) اجزاء و مجلدات

اس ترقی یافتہ دور میں ان اجزاء میں سے تین جزء (۱) مقام اشاعت (۲) ناشر (۳) تاریخ اشاعت کو Imprint کے نام سے یاد کیا جاتا اور کیٹلاگنگ کے بنیادی اجزاء میں اس کا شمار کیا جاتا ہے بقیہ اجزاء کو Collation میں داخل کیا گیا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی کتابیاتی اندراج اور کیٹلاگنگ دونوں میں قدرے تغیر و اصلاح کے ساتھ ابن ندیم کی وضع کردہ اساس پر عمل کیا جاتا ہے جو اس کے کتابیاتی مواد کے اندراجی اجزاء کے انتخاب ساخت اور ان کی صحت نیز اس کی بنائی اور اپنائی ہوئی مبادی کی اہمیت، افادیت و استحکام کی نہایت روشن دلیل اور اس کے ذہن کی جدت و اختراع، فن کتابیات سے طبعی مناسبت، اس فن میں اس کی مجتہدانہ بصیرت کی شاہد عدل ہے۔

کتابوں میں حوالوں کا اہتمام اور کتابیات کا آغاز

عہد عباسی میں جب تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور کتابیں استعمال میں آنے لگیں تو علماء اور مصنفین اپنی کتابوں میں حسب ضرورت ان کے حوالے دینے لگے تھے، چنانچہ تیسری صدی ہجری میں غالباً سب سے پہلے امام ابوعیسیٰ ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے کتاب العلل میں ائمہ فن کی کتابوں کا حوالہ دیے اور اپنے پیش نظر ماخذوں کی نشاندہی کرنے کا اہتمام کیا تھا، چنانچہ موصوف کتاب العلل میں رقمطراز ہیں:

"جامع ترمذی میں جو باتیں علل احادیث، رجال و تاریخ کی بیان کی ہیں وہ میں نے بخاری کی التاریخ الکبیر سے لی ہیں اور اقوال فقہاء اور علل حدیث کے سلسلہ میں پیشوایان فن ہشام

ابن حیوہ (المتوفی سنہ ۱۴۶ھ) عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج (المتوفی سنہ ۱۵۰ھ)
سعید بن ابی عروبہ (المتوفی سنہ ۱۵۶ھ) مالک بن انس (المتوفی سنہ ۱۷۹ھ) حماد بن سلمہ
(المتوفی سنہ ۱۶۷ھ) عبداللہ بن المبارک (المتوفی سنہ ۱۸۱ھ) یحییٰ بن زکریا بن
ابی زائدہ (المتوفی سنہ ۱۸۲ھ) وکیع بن الجراح (المتوفی سنہ ۱۹۶ھ) عبدالرحمٰن بن مہدی
(المتوفی سنہ ۱۹۸ھ) وغیرہ اہل علم و فضل کی تصانیف پیش نظر رہی ہیں[1]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اندر تصانیف کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک عالم دوسرے عالم کی کتابوں کا حوالہ دیتا تھا، حوالہ کی صورت بھی ترقی پذیر رہی ہے، چوتھی صدی میں جب ہر موضوع پر کتابوں کا ذخیرہ زیادہ فراہم ہو گیا تو مصنفین نے اوائل کتاب میں اپنے ماخذوں کی نشاندہی کرنا ضروری قرار دیا تاکہ قاری کو موضوع سے متعلق مصنف کے پیش نظر تحقیقی و مستند نسخوں کا علم ہو سکے اور اقتباسات کو سمجھنے میں مدد مل سکے، نیز مصنف کی کتاب بھی مستند سمجھی جائے، کبھی ایسا کیا جاتا تھا کہ مصنف کتابیات کی وضاحت جداگانہ رسالہ میں کرتا تھا، چنانچہ ابو داؤد سجستانی المتوفی سنہ ۲۷۵ھ نے کتاب السنن کی کتابیات ایک مستقل رسالہ میں جو رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکہ فی وصف سننہ کے نام سے موسوم ہے، بیان کی تھیں[2]۔ ان مقاصد کے پیش نظر مصنف ابتدا میں کبھی کتابوں کے نام نقل کرتا اور کبھی کتاب کے آخر میں ذکر کرتا اور بعض مواقع پر دوران بحث دوسرے مصنفین کی شہادتوں پر اعتماد کرکے حوالوں سے کتاب کو زینت دیتا جو اس کے خزائن کتب یا اس کی دسترس میں نہیں ہوتی تھیں، تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں قاری کو وہ کتابیں مل سکیں، وہ ان سے استفادہ

---

[1] ملاحظہ ہو سنن الترمذی، مطبع العلوم دہلی، سنہ ۱۲۶۵ھ ص ۶۴۷۔ [2] رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ فی وصف سننہ، تحقیق محمد الصباغ، اضواء الشریعۃ عدد پنجم، جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۹۴ھ، ص ۲۷۸۔

کرسکے، چنانچہ ابن فارس المتوفی ۳۹۵ھ نے معجم مقائیس اللغۃ میں کتابیات کے اس اسلوب کو اختیار کیا، اور مقدمۂ کتاب میں بنیادی پانچ کتابوں، کتاب العین خلیل، کتاب غریب الحدیث ابو عبید، کتاب المنطق ابن السکیت، کتاب الجمہرۃ ابن درید کو بیان کرکے لکھا کہ ان کے علاوہ لغت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ بھی پیش نظر رہی ہیں، ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کتابوں سے ماخوذ ہے[1]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مصنفین نے تیسری صدی ہجری میں کتاب کے آخر میں اور چوتھی صدی ہجری میں آغاز کتاب میں کتابیات پیش کرنے کی جو اساس قائم کی تھی، اس پر بلا تعرض آج تک عمل جاری ہے، یہ طرز عمل قاری کی مصنفین اور کتابوں تک رہنمائی میں مدد دیتا اور کتابیاتی مقاصد کو پورا کرتا تھا۔

مواد کی حیثیت اور تبصرہ | پانچویں صدی ہجری میں کتابیات کے استعمال کا رواج عام ہوگیا تھا مورخ اسلام ابن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ نے الانباہ علی قبائل الرواۃ میں جن کتابوں سے استفادہ کیا، ان کو مقدمۂ کتاب میں نام بہ نام شمار کراکر کہا ہے:

"میں نے اس کتاب کو انساب کی بنیادی کتابوں سے ترتیب دیا ہے، وہ یہ ہیں (۱) کتاب ابی بکر محمد بن اسحاق (۲) کتاب ابی المنذر ہشام بن محمد بن سائب کلبی (۳) کتاب ابی عبیدہ معمر بن المثنی (۴) کتاب محمد بن عبدہ ابن سلیمان (۵) کتاب محمد بن حبیب (۶) کتاب نسب قریش ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن عبید عدوی (۷) کتاب نسب قریش زبیر بن بکار (۸) کتاب نسب قریش مصعب بن عبد اللہ زبیری (۹) کتاب انساب العرب علی بن کیسان کوفی (۱۰) کتاب علی بن عبد العزیز جرجانی (۱۱) کتاب

---

[1] معجم مقائیس اللغۃ لابن فارس عیسی البابی الحلبی قاہرہ ۱۳۶۶ھ ج ۱، ص ۳-۵

عبد الملک بن حبیب الاندلسی ۔ اس کے علاوہ فقرے اور جملے میں نے حدیث و آثار اور کتب تاریخ و ادب سے لیے ہیں[1]"

موصوف نے جب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لکھی تو اس میں بھی کتابیات کو آغاز کتاب میں بیان کیا اور فرمایا :

"میں نے اس کتاب میں جو لکھا ہے وہ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب سے، ابن اسحاق کی کتاب سے، طبقات واقدی سے[2] تاریخ واقدی سے منقول ہے[3]۔ بعض کتابیں نہیں مل سکیں، ان کا حوالہ دوسری کتابوں کے حوالے سے نقل کیا، ان کو بھی بتا دیا ہے، مثلاً ہم نے جو مصعب بن عبداللہ، ابن المدائنی اور ابومعشر کے حوالے سے نقل کیا ہے وہ کتاب[4] ابن ابی خیثمہ سے ماخوذ ہے[5]، تاریخ بخاری، تاریخ ابو العباس محمد بن اسحاق سراج، ابن جریر طبری، ذیل المذیل، ابو البشر دولابی کی کتاب المولد والوفاۃ سے مستفاد ہے۔ صحابہ[6] کی جنگیں، شہادت، آنحضرت کی زیارت، ملاقات[7]، اسلام یہ باتیں طبقات کبیر ابن سعد سے لکھی ہیں، اس کے علاوہ جو باتیں ہیں، وہ ابو علی سعید بن عثمان بن السکن کی کتاب الحروف فی الصحابہ[8] اور ابو محمد جارود کی کتاب الصحابہ، کتاب ابو جعفر عقیلی اور کتاب ابن ابی خیثمہ سے منقول ہے۔ میں نے ابن ابی حاتم رازی کی کتاب اور ازرق دولابی یعقوبی کی کتاب الصحابہ کا بھی مطالعہ کیا ہے، اس کتاب میں ان کتابوں کے علاوہ بھی معلومات ہیں جو شیوخ سے سنی ہیں[9]، اور انساب کی کتابوں کا تذکرہ ہم نے کتاب الانباہ میں کیا ہے[10]۔"

---

[1] ملاحظہ ہو الانباہ علی قبائل الرواۃ ص ۴۵۔ ۴۶ یہ کتاب القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم کے ساتھ مطبعۃ السعادۃ قاہرہ سے سنہ ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ [2] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب تحقیق علی محمد البجاوی مطبعۃ نہضۃ مصر سنہ ۱۳۸۰ھ ج ۱ ص ۲۰۔ ۲۱ [3] ایضاً ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۳ [5] ایضاً [6] ایضاً ص ۲۴ [7] ایضاً ص ۲۵۔

شمس طبسی کے کلام کا ایک قدیم مجموعہ

از

ڈاکٹر ریحانہ خاتون، لکچرر شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی

شمس طبسی کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبدالکریم تھا، شمس اواخر چھٹی اور اوائل ساتویں صدی ہجری کا مشہور شاعر گذرا ہے، اس کا تذکرہ لباب الالباب عوفی (تالیف ۶۱۸ھ) اور آثار البلاد قزوینی (تالیف ۶۷۴ھ) میں خصوصیت سے پایا جاتا ہے، عوفی اس کا معاصر تھا، اور اس نے بخارا میں اس کو صدر الدین محمد نظام الملک کے دربار میں دیکھا تھا، اسی وزیر کی مدح میں شمس طبسی کے کئی منظومات ہیں، شمس کا تعلق طبس خراسان سے تھا، وہ رضی الدین نیشاپوری کا شاگرد اور خاقانی کا معاصر تھا، محمد عوفی نے اس کو اس عہد کے تین اور ہم نام شعراء سے بہتر بتایا ہے، اور مولف آثار البلاد قزوینی کے نزدیک اس کے اشعار خاقانی سے بہتر ہوتے تھے، سال وفات ۶۲۴ھ یا ۶۲۶ھ بتائی جاتی ہے۔

شمس طبسی خاصا مقبول شاعر تھا، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شعراء کی اکثر بیاضوں میں اس کے متعدد منظومات نقل ہیں، اس سلسلہ میں مونس الاحرار کلاتی (۷۰۲ھ) مونس الاحرار جاجرمی (۷۴۱ھ) مجموعۂ لطایف وسفینۂ ظرایف ہروی (۸۰۲ھ) مجموعۂ قصائد نسخۂ علی گڑھ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان میں سب سے زیادہ جاجرمی نے اپنے مجموعہ میں اس کے

اشعار شامل کیے ہیں۔

شمس طبسی کے دیوان کے نسخے کم پائے جاتے ہیں، ایرانی دانشمند تقی بینش نے جس کی توجہ سے دیوان کا ایک انتقادی متن شائع ہوا ہے، سات نسخوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے دو نہایت قدیم ہیں، ایک چیسٹر بیٹی کلکشن ڈبلن میں ہے، جس کی کتابت سنہ ۶۹۹ھ میں ہوئی، اور دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کا ہے، جو سنہ ۷۱۳ھ کا مکتوبہ ہے، اور نسخے دسویں صدی سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے ہیں۔

شمس طبسی کے دیوان کا ایک مجموعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں ہے، جس کی کتابت سنہ ۷۲۱ھ میں ہوئی، گویا اس شاعر کے تمام دریافت شدہ نسخوں میں باعتبار قدامت اس کا تیسرا نمبر ہے، اس لحاظ سے اس نسخہ کی اہمیت اظہر من الشمس ہے، اس میں چونتیس [۳۴] ورق ہیں، ہر صفحہ میں تیئیس [۲۳] سطریں ہیں، درمیان سے چند ورق غائب ہیں، ابتدا اور انتہا محفوظ ہے، خط نسخ ہے لیکن بڑے اہتمام سے اس کی کتابت ہوئی ہے، قصیدے عنوان کے ساتھ ہیں، یہ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، کتابت کا یہ التزام قابل توجہ ہے کہ ہر دو مصرعے کا آخری لفظ سرخ روشنائی میں ہے، اس مجموعہ میں ترپن [۵۳] قصیدے اور دس [۱۰] رباعیاں ہیں، موجودہ حالت میں اشعار تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوں گے، شمس طبسی نے زیادہ اشعار نہیں کہے ہیں، رضا قلی خاں ہدایت کے مجمع الفصحاء میں اشعار کی تعداد تقریباً دو [۲] ہزار لکھی ہے، تقی بینش مصحح دیوان شمس طبسی نے جو نسخہ مرتب کیا ہے اس میں دو ہزار دو سو اٹھاسی [۲۲۸۸] اشعار ہیں، اس میں چونسٹھ [۶۴] قصیدے، اکیس [۲۱] قطعے، پانچ غزلیں اور اٹھائیس [۲۸] رباعیاں ہیں، ان کے علاوہ ان کے تین [۳] قصیدے، تین [۳] قطعے، ایک غزل، تین [۳] رباعی اور ایک مستزاد کی نسبت مشکوک ہے، البتہ اس بات کا بخوبی امکان ہے کہ اصل نسخہ نیلہ منظومات پر مشتمل تھا، علی گڑھ کے نسخہ میں غائب شدہ اوراق کی تعداد کا قطعی تعین نہ ہو سکنے کی وجہ سے

یہ بات طے نہیں ہو سکتی کہ کتنے مندرجات نسخۂ ہذا سے الگ ہو چکے ہیں، بہرحال اس میں موجود بقیہ اور متقطعات، الحاق حصوں کے اصل نسخے میں شامل ہونے کے امکانات بھی کم ہی معلوم ہوتے ہیں، اس نسخے کے سلسلہ میں چند امور نہایت درجہ قابل توجہ ہیں:

(۱) اس کے حاشیہ پر جابجا مختلف مواقع پر اشعار کا اضافہ ہوا ہے، بعض جگہ متعدد صفحات پر پوری کی پوری نظمیں ملتی ہیں، یہ اضافے خاصے پرانے ہیں، ایک جگہ احدی والف سنہ ۱۰۰۱ ہجری درج ہے۔

(۲) رباعی جہاں شروع ہوتی ہے، وہاں ورق یا اوراق غائب ہیں اور اس سے فوراً پہلے جو قصیدہ ہے وہ بھی ناتمام ہے، واضحاً کچھ رباعیاں مفقود ہیں، ممکن ہے ایک آدھ قصیدہ بھی غائب ہو۔

(۳) درمیان میں ص ۲۲ پر ایک قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

اے بخت پایدار تو دست اماں گشادہ　　کلک ظفر نیام تو ملک جہاں گشادہ

اس کے بعد کا ورق نہیں، اس کی بنا پر یہ قصیدہ ناتمام ملتا ہے اور اس کے فوراً بعد ایک قصیدہ کا یہ شعر ملتا ہے:

بخواہ بادۂ گلگوں کہ در گذر گہ باغ　　زغنچہ زد گر تقدیر جام می نازد

مطبوعہ دیوان ص ۲۴ کے تقابل سے معلوم ہوا کہ اس قصیدہ کے ابتدائی آٹھ شعر غائب ہیں، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

صبا ز مہد ہوا چوں دم مسیحا زد　　گل از حجاب عدم خیمہ سوئے صحرا زد

دوسرے مفقود اشعار یہ ہیں:

ز لالہ چہرۂ صحرا چناں فروغ گرفت　　کہ بر سپہر شفق دار عکس صہبا زد

زمانہ از پے آں روسپید مہرۂ زمد — کہ گل ز تخت چمن لاف تخت دارا زد
جمال زہرہ پس پردۂ خجالت ماند — زبسکہ بلبل خوش نغمہ راہ عنقا زد
ہوا نگر کہ زمیں پر تو تجلی برق — چو شعلہ در دل سنگین طور سینا زد
مگر ز غیرت دامن زمانہ آگہ نیست — کہ بر عذار جہاں آبروئے عذرا زد
بگوش بلبل آشفتہ دل چہ دمدمہ — کہ روز و شب ز پے آں در تقاضا زد
زہے بتے کہ دل آفتاب گوہر ملد — ز عکس روئے تو چوں تیغ زنگ سودا زد

(۴) سنہ کتابت آخری صفحہ پر لفظوں میں سات سو اکیس ہجری درج ہے، کاتب کا نام مٹا ہوا ہے، صرف "الجیلانی" پڑھا جاتا ہے، شروع میں ایک طلائی شمسہ کے اندر "دیوان شمس الدین طبسی" بڑے اہتمام سے درج ہوا ہے۔

(۵) یہ نسخہ گولکنڈہ کے قطب شاہی سلاطین کے کتاب خانے میں رہ چکا ہے، چنانچہ سرورق پر ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) اور محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) تینوں بادشاہوں کی مہریں ثبت ہیں، اوپر ابراہیم قطب شاہ کی مہر ہے، جس کا سجع یہ ہے:

شہے کہ نقش نگیں ساخت مہر آل مقیم — بعبد سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

اس کے نیچے ایک بڑی مہر محمد قلی قطب شاہ کی ہے، اس کا سجع حسب ذیل ہے:

ملک جہاں مرا کہ بزیر نگیں شدہ — از حکم بادشاہ جہاں آفریں شدہ

تیسری مہر کا سجع پڑھا نہیں جا سکا ہے۔

(۶) اس مجموعہ کے ابتدائی اٹھائیس[۲۸] قصیدے اسی ترتیب سے ہیں، جیسا کہ انڈیا آفس کے نسخے کے ہیں، یہ نسخہ ۱۰۳۱ھ کا ہے اور صحت متن کے لحاظ سے بقول تقی بینش نہایت قابل توجہ ہے،

دونوں نسخوں کی ترتیب کی یکسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اصل نسخے کی ترتیب بھی اسی طرح ہو
ان دونوں نسخوں میں ابتدائی قصیدے کا مطلع یہ ہے :

هر دل که سوی عرصهٔ تحقیق راه یافت — در سایهٔ سرادق عزت پناه یافت

یہ قصیدہ مدح باری تعالیٰ میں ہے، اس بنا پر اصل دیوان میں اس کا سب سے پہلا قصیدہ
ہونا مسلم ہے، یہی قصیدہ جاجرمی نے منجملہ اور قصیدہ کے 'توحید کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

(۷) اس دیوان میں مندرجہ حسب ذیل تین قصیدے کسی اور نسخے میں نہیں پائے جاتے

ای برق هنر پاره گر لمعهٔ شهابی — یا عکس نورگستر شمشیر آفتابی

(ورق ۹۱ ا)

یہ قصیدہ صدر الدین محمد نظام الملک کی مدح میں ہے، جس کے لیے شمس طبسی نے متعدد
قصیدے لکھے ہیں، چنانچہ اس قصیدہ کے متصل پہلے والا قصیدہ :

زلف تو شد کمین گه آشوب روزگار

بھی اسی ممدوح کی مدح میں ہے :

ای بخت پایدار تو دست لسان گشاده — کلک ظفر نیام تو ملک جهان گشاده

اس قصیدے کے آخری ابیات ورق گم ہو جانے کی بنا پر مفقود ہیں، تیسرا قصیدہ رباعی کے
فوراً پہلے ہے، لیکن کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکا، اس کے چند ہی اشعار میں مطلع
کے یہ الفاظ پڑھے جا سکے ہیں :

ای زیر آسمانی ... ... (ورق ۱۴۳ ب)

(۸) اس مجموعہ میں صرف دس رباعیاں ہیں ان میں سے کوئی کسی نسخے میں شامل نہیں،
نسخے کا آخری ورق ہے، اس پر کاغذ چسپاں ہے، اس سے اس کے پڑھنے میں خاصی دقت اٹھا

ی ہے کہ اس کی رباعیاں بالکل نہیں پڑھی جا سکی ہیں، جتنا کچھ پڑھی جا سکی ہیں، وہ ذیل میں درج ہیں:

این خط کہ رخ ترا ہمی آراید   طوطی ست کہ بر بوئے شکر می آید
گر دل بری شکر ز وشی شاید   زاں پیش کہ طوطی شکرت می باید

از عشق تو در تنم رواں می سوزد   شرحش چہ دہم کہ بر چہ ساں می سوزد
از دل ..... چو کنم رگ جاں می گسلد   وز گریہ چو شمع دل و جاں می سوزد

گر یار بر اندی کہ اندر دل چیست   یا گفت .... کی دلدارم چیست
بوذی کی ..... دل نیا نستی مرد   بوذی کہ بکام دل بشا نستی زیست

کو دل کہ خون جگر آرم باد   یا صبر کہ روزے بسر آرم باد
کو شیفتہ و تیرہ روزے چوں من   تا در غم او دمے بر آرم باد

دوش از غم تو ... دیدہ بر ہم نزدم   ورز انک نزدم بدانک دم نزدم
زا ..... کردم ... کند آتش دل   با روز ہمی سوختم و دم نزدم

اے چشم من از سراب سیم آ . ی   وے اشک من از پستہ تو عنابی
در نرگس چشم تو عجب می مانم   کو تازہ چگونست بدیں بے خوابی

... ... از ملک جہاں می خواہی
طغیانی اشک من ببیں و دور مشو   گر سبزہ و گر آب رواں می خواہی

پہ گل مر مردہ مگیر (؟)   ادمردہ تست خردہ بر مردہ مگیر
بر کنارت طبقی زر وارد (؟)   بے خرد کی ارچہ کند خردہ مگیر

مجموعۂ کلام شمس طبسی کا یہ نسخہ املائی اعتبار سے قابل توجہ ہے، اس کی حسب ذیل خصوصیات ہیں:

(۱) دال اور ذال کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، جیسے بود کے بجائے بوذ، شود کے بجائے شوذ

[illegible]

[illegible]

(۲) حرف کاف [illegible] کی [illegible] : [illegible]

[illegible] [illegible]

(۳) حرف کاف علت 'کہ' جدا شکل میں ملتا ہے، جیسے:

بے گرد موکب تو کہ اکسیر دولت است

اور کبھی 'کی'، کی شکل میں، جیسے،

شمشیر یل کی طوطی ہندی نژاد رنج

(۴) حرف کاف علت 'کہ' کی صورت میں، جیسے:

انصاف دہ کہ مقابلہ' مہربان بخت الخ

(۵) حرف اضافہ 'بہ' متصل ملتا ہے جیسے بگوش، اسی طرح 'نہ' جو فعل منفی کی علامت ہے، متصل آتا ہے جیسے نیابی۔

(۶) 'می' جو علامت استمرار ہے، کبھی پیوست اور کبھی جدا ملتی ہے، 'است' دوسرے جزو سے پیوست آتا ہے، جیسے دولتست، کششست۔

(۷) ہمزہ کے استعمال کی یہ صورتیں ہیں:

(الف) یائے خطاب، جیسے نۂ سحاب، یعنی سحاب نیستی۔

(ب) ہمزۂ اضافت، ایسے الفاظ میں جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں، جیسے:

چوں چہرۂ تو قاعدۂ روز بر گرفت

خیمۂ الفت، دیدۂ تر۔

(...) قابل توجہ ہے کہ ہائے مختفی میں ہمزہ کا استعمال نہیں ہے، جیسے کنہ یا فنی (...)

(۶) واو عطف پر جیسے : چرخ ؤ مدار فلک

(۷) ایسے تمام الفاظ جو فارسی کے ہوں یا عربی کے اگر الف پر ختم ہوتے ہیں تو اس میں بکثرت [illegible] ہے، جیسے ہواؤ سینہ، سلہار۔

(۸) یائے تنکیر کی صورت میں جیسے

دیدۂ تر دامنم گشتت دریائی کزو

(اکثر ایسے الفاظ جو 'ی' پر ختم ہوتے ہیں، اضافت کی صورت میں نہ ان کے اوپر ہمزہ ہے اور نہ نیچے زیر جیسے طوطی ہندی نژاد)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طاوس جیسے لفظ محض ایک واو سے ملتے ہیں، اور وہ بھی بدون ہمزہ اسی طرح رای، سوی، روی، موی بغیر ہمزہ آئے ہیں۔

(۸) 'ی' کے املا میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نسخہ میں عام رواج کے برخلاف اس کے نیچے دو نقطے نہیں ملتے، جیسے طوطی، ہندی میں نقطے نہیں ہیں۔

(۹) گ، پ، چ، کاف، بے اور جیم سے ظاہر کیے گئے ہیں، لیکن ژ پر تین نقطے ہیں، ش، ث پر تینوں نقطے ہیں، 'س' سادہ ہے، اس کے نیچے تین نقطے جو بعد میں بہت ملتے ہیں نہیں ملتے ہیں۔

(۱۰) مد اور تشدید کا اکثر التزام ملتا ہے۔

دیوان کے اس اہم نسخے کے انکشافات سے کئی فوائد متصور ہیں۔

اول یہ کہ کم از کم تین قصیدے (ایک مکمل اور دو نامکمل) اور دس رباعیاں اس نسخے کی بدولت ایک ایسے شاعر کی دستیاب ہوئی ہیں جس کا کلام دو ہزار ابیات سے کچھ ہی زائد ہے، یہ

[illegible] یہ جاننا چاہیے کہ یہ دوسرے درجے کا شاعر ہے، جس کا تذکرہ فارسی کے اکثر تذکروں اور تاریخوں کی کتابوں میں ملتا ہے اور جس کے کلام کا انتخاب اہم بیاضوں کی زینت ہے۔

دوم یہ کہ اس شاعر کے کلام کا ایک ناقدانہ متن تیار ہوا ہے، علی گڑھ کے نسخے کی مدد سے اس کے متن میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے، ضمناً عرض ہے کہ محقق موصوف نے ایک قصیدہ کو جس کا مطلع یہ ہے:

دوش در موکب سیاہ ظلام　　　خوارشد خسرو ولایت شام

کا انتساب شمس کی طرف مشکوک قرار دیا ہے (دیکھیے ص ۱۱۹ - ۱۲۰) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قصیدہ محض ایک نسخہ میں جس کی کتابت ۱۲۵۰ھ ہے، شامل ہے، لیکن یہ قصیدہ ہمارے پیش نظر نسخے میں موجود ہے، اس بنا پر اس کا انتساب شبہہ سے پاک ہے، اور یہ یقیناً شمس طبسی کا اپنا قصیدہ ہے یہ قصیدہ صدرالدین محمد نظام الملک کی مدح میں ہے، جس کی تعریف میں طبسی کے چند اور قصائد دیوان میں موجود ہیں۔

تیسرے یہ کہ فارسی کے قدیم قلمی نسخوں میں ایک اور قابل ذکر نسخے کا اضافہ ہوا ہے۔

چوتھے یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں فارسی کے چند قدیم ترین نسخوں میں اس کا شمار ہے، دیوان شمس طبسی کے دو[2] اہم نسخوں کا حال معلوم ہو سکا ہے، لیکن یہ دونوں نسخے مختلف شعراء کے مجموعہ میں شامل ہیں، بخلاف علی گڑھ کے نسخے کے کہ یہ کسی مجموعہ میں شامل نہیں، بلکہ الگ نسخہ ہے۔

ان دونوں نسخوں میں پہلا چیسٹر بیٹی ڈبلن کے ذخیرہ میں ہے، اس نسخہ میں حسب ذیل [illegible] شاعروں کا کلام شامل ہے، ان میں کمال اسماعیل، عبدالواسع جبلی، رشید وطواط، ابوالفرج رونی، ازرقی، شمس طبسی، نجیب جرباذقانی، رفیع لنبانی، امامی ہروی اور انوری ہیں۔

[illegible] مجموعہ کی کتابت کی تاریخ ۲۳ ذی الحجہ ۶۹۹ھ ہے، جو نسخہ میں کئی جگہ مذکور ہے [illegible]

گیارہ اوراق پر مشتمل ہے، لیکن اس کے ابتدائی آٹھ ورق غائب ہیں، یہ نسخہ مصور ہے، اس کے مندرجات کی تفصیل دیوان شمس طبسی تصحیح تقی بینش تعلیقات ص ۱۴۳ تا ۱۴۵ مندرج ہے۔

دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کا ہے، یہ ۱۳ھ کا ہے، کاتب کا نام عبدالمومن علوی کاشی ہے، یہ نسخہ بھی ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں حسب ذیل چھ شاعروں کے دیوان کا انتخاب پایا جاتا ہے: امیر معزی، اثیر اخسیکتی، ادیب صابر، نظام الدین محمود قمر اصفہانی، شمس طبسی، ناصر خسرو، یہ نسخہ مصور ہے، اس میں شمس طبسی کے کم و بیش دو ہزار اشعار ہیں، تقی بینش کے انتقادی متن میں شمس طبسی کے دیوان کا یہ حصہ جو اس مجموعہ میں شامل ہے، بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

ان دونوں نسخوں کی اس قدر تفصیل سے اندازہ ہو سکے گا کہ علی گڑھ کا نسخہ نہایت اہم ہے اور شمس طبسی کے کلام کی اشاعت میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سیمنار

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۴)

۲۲ر فروری ۸۲ء کی صبح کی نشست کی صدارت ندوۃ المصنفین کے صدر جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے کی اور اس کی کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے انجام دیے، سب سے پہلے اس نشست میں ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب قطر یونیورسٹی نے اپنا مقالہ المستشرقون والتاریخ کے عنوان سے پیش کیا، اس کا اردو خلاصہ جناب مولوی محمد رضوان ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے پیش کیا، جس سے ان کی علمی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب | ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب نے فرمایا کہ ندوہ اور اس کے فارغین نے مستشرقین کے افکار کے متعلق اس وقت کلام شروع کیا، جب کہ دنیا میں افکار و نظریات کی ایک کشمکش تھی، استشراق کی تحریک میں تطور ہے، مستشرقین نے پہلے تو علوم اسلامیہ کو اپنی زبان میں منتقل کیا، اور ان کا نشر و اشاعت بھی کی، لیکن بعد میں ان کا نقطۂ نظر بدل گیا، انھوں نے ایسی کتابوں کی نشر و اشاعت کی جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر تھیں، ان کی وجہ سے مسلمانوں کی نئی نسل میں غلط خیالات پھیلے، تحریک استشراق ایک طرح سے مسلمانوں کو ان کے ماضی سے متنفر کرنے کے مترادف ہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ استشراق ایک علمی تحریک ہے، مگر یہ امر واقعہ نہیں، اس کے اصل مقاصد اور [illegible] کے

تحت یہ تحریک کام کر رہی ہے، مستشرقین پر صرف الزام تراشی کافی نہیں بلکہ ان کے زہر کا تریاق پیش کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس بات سے خوشی ہے کہ دارالمصنفین کی خدمات اس لحاظ سے نہایت قابل قدر ہیں کہ اس نے اسلامی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ معتبر بنا کر لکھوایا اور طبع کیا، مستشرقین کا خاص نشانہ اسلامی تاریخ ہی ہے جس کو انھوں نے محرف اور مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی، اسلامی تاریخ کے غیر اہم واقعات کو اہم بنا دیا اور اہم واقعات میں برے پہلو دکھائے، اسلامی تاریخ کے بہت ایسے واقعات ہیں جن کی واقعیت اور حقیقت میں کلام ہے، لیکن مستشرقین کے نزدیک انہی کی اہمیت ہے، اسلام اور مسلمان مخالف تحریکوں کو انھوں نے مرکزی حیثیت دے دی، اسلامی تاریخ میں جو فتنے اٹھتے رہے وہ ان کی نظر کو بھائے اور انہی کو اہمیت دے کر مسلمانوں کو اصلی اسلامی فکر سے دور کرنے کی کوشش کی، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کی کتابوں میں جو غلطیاں ہیں وہ سامنے لائی جائیں، پھر اسکول اور کالج کے طلبہ کے لیے معیاری کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان کی عمر کے لحاظ سے تاریخی واقعات تو دیانت داری کے ساتھ پیش کیے جائیں لیکن دین کی خیر خواہی بھی ملحوظ رکھی جائے، تاکہ مسلمان طلبہ کے ذہن کی صحیح تربیت ہو، مثلاً واقعہ جمل اور واقعہ تحکیم کو اس طرح نہ لکھا جائے کہ اس کا تہائی حصہ تو ان واقعات کے لیے صرف کیا جائے جس میں صرف انتشار اور ہنگامے رہیں، اور دوسرا تہائی حصہ بھی اسی انتشار پر ملے جلے ذہنی سے متعلق ہو، اگر ایسا کیا گیا تو دو تہائی حصہ ذہن میں صرف الجھن پیدا کرنے والا ہوگا یہ تو مناسب نہیں کہ تاریخی واقعات لکھنے میں اختراع سے کام لیا جائے، لیکن اس کا لحاظ ضرور رکھا جائے کہ مستشرقین بڑی چابکدستی بلکہ سبک دستی سے واقعات کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو وہ نہایت سیاہ اور تاریک نظر آئیں، ایسے ادارہ کے لیے جہاں تاریخ نویسی کا کام ہو رہا ہے، ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ہر سطح کے معیار کے مطابق معتبر تاریخ لکھ کر پیش کی جائے۔

جب یہ مقالہ ختم ہوا تو ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے اعلان کیا کہ جناب عبدالکریم سا تو صاحب جاپان سے آگئے ہیں، وہ مکہ مکرمہ کی مسجد کونسل کے ممبر ہیں اور جاپان میں اسلام کے بہت بڑے داعی اور مبلغ ہیں، وہ اس مجلس میں تشریف فرما ہیں، ان کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کرسی کے بغل میں اسٹیج پر جگہ دی گئی۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی | دوسرا مقالہ جامعہ ملیہ کے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا مشہور مستشرق سر ہملٹن گب پر تھا، ان کا پورا مقالہ تو معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شائع ہوگا لیکن اس مجلس میں وہ اس نشست میں جو کچھ پڑھ چکے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

پروفیسر صاحب نے فرمایا: مشرق کے مذاہب اور ان کے تہذیب و تمدن کے مطالعہ کیلئے مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک ممتاز، عظیم، اور وقیع شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنا دیا، مستشرقین نے علم کے ایک بڑے خزینہ کو جو وقت کے دبیز دھندلکوں میں دفن تھا نکالا، نادر و نایاب کتابوں کا پتہ چلایا، انھیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں بہت سی نادر کتابوں کو ایڈٹ کر کے نہایت اہتمام سے شایع کیا، ان پر حواشی لکھے اور بعض کی شرحیں بھی کیں، مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے شایع کیے جن سے مشرق و مغرب کے علماء و محققین نے استفادہ کیا، انھوں نے تحقیق و تنقید کے ارتقار پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام کو علمی مقاصد کا خاطر یا وقار بنانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذاہبوں کے مطالعہ میں انھوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اس طرح علم الاستشراق کو انٹر ڈسپلنری علم بھی بنا دیا، ہمیں ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں میں جو کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں سب سے بڑی

کیونکہ ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انھوں نے دعویٰ تو کیا معروضی مطالعہ کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی تعصبات سے دامن بچا سکا ہو، خاص طور سے اسلام، قرآن، پیغمبر اسلامؐ اور قانون اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ غیر معروضی ہی نہیں بلکہ اکثر مستشرقین کے یہاں ان کا تعصب صاف طور پر نمایاں ہے، مستشرقین میں ایک تعداد یہودیوں کی ہے، مگر بڑی تعداد عیسائیوں کی ہے، اس کے سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، اس کی داستان صدیوں پرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ داستان چودہ سو برس پر پھیلی ہوئی ہے اس میں کئی اتار چڑھاؤ ہیں، اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن داستان کا بنیادی نقطہ ایک اور صرف ایک رہا ہے، بیسویں صدی کے تیسرے دہے اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویہ میں بھی تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کے سیاسی اور معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق کا انحطاط علمی اعتبار سے ہوا اور اب مستشرقین میں ایسے عالم نہیں ملتے جیسے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے جس کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے مگر وہ بھی کلی طور پر غیر جانبدار نہیں ہے، اس کی بعض تحریروں میں اس کے نظریات اور خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے اپنے پیش روؤں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سر ہملٹن گب سے ہے، علمی دنیا نے گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز بھی ان کو ملے، کئی علمی اور ادبی سوسائٹیوں کے ممبر بھی رہے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، مغرب میں ان کے عقیدت مندوں نے انھیں صف اول کے اسلامی اسکالرس میں شمار کیا ہے، مسلمان بھی ان کی محققانہ بصیرت اور مورخانہ ژرف نگاہی کے قائل ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابیں

ان کے وسیع مطالعہ، تشریح کی غیر معمولی صلاحیت، فکر کی شادابی اور گہری بصیرت کی شاہد ہیں، انھوں نے جدید عربی کے ارتقا پر بھی مضامین لکھے جن میں اس زبان وادب کے جدید رجحانات پر سیر حاصل بحث کی ہے وہ اپنے معاصر مستشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان وادب سے کہیں زیادہ واقف تھے بلکہ اس سے گہرا تعلق بھی رکھتے تھے، ان کے ایک مضمون اسلامک بایوگرافی کل لٹریچر سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں عربی ادب کے وسیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ عربی ادب کے شیدائیوں میں تھے، ابن خلدون کا چالیس برس تک مطالعہ کیا اور اسی سے علم وآگہی اور مسرت وانبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی نظر میں ابن خلدون اپنے تخیل کے ساتھ ایک حیات آفریں، رنگین اور رعنا شخصیت کے مالک ہیں، وہ ان کی تحریروں کو معنوی لذت سے پھیکا قرار دیتے ہیں، مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی طلاقت لسانی سے فراوانی کا احساس ہوتا ہے، اس کے خیالات آبشار کی طرح گرتے نظر آتے ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پرجوش بے ربطی کے ساتھ نیم ظلمتوں میں کھو جاتا ہے، لیکن وہ اپنی خوش وضع اور خوش رنگ عبارت میں اس کی بڑی قدرت ظاہر ہوتی ہے، وہ جملوں کی تراکیب، فقروں کی ترتیب، چست و نفیس ہم آہنگی کے قابو میں رہتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار ایسی تربیت یافتہ شائستگی ولطافت سے کرتا ہے کہ اس کی تحریر کی معنویت اس کے دلائل کے تابع ہو جاتی ہے، اس کا خاص میدان تاریخ و ثقافت ہے، ان دونوں کے ارتقا ونشو ونما میں زبان وادب کے رول کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف تھے تاریخ وتمدن کے موضوعات پر گب کے کچھ اپنے نظریات تھے، اسی لیے واقعات کو اپنے انہی خیالات کی روشنی میں دیکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ عربوں کی قبائل کی مخالفت' فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینے سے کوئی مناسب اور مستقل حل حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور سے داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام کے جھنڈے

ہ آپ کو وابستہ کرلیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلعم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے
پتا بھی انھیں کے ماتحت کی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا
ہ مقصد یہ تھا کہ قبائل کا رخ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دیا جائے، اس میں کامیابی ہوئی، اور
فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا، گب اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بدوی قبائل نے اسلام کو
سانی، اخلاقی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا
نیوی و ادی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے ان کا تعلق پیدا ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے
ب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور شام و عراق کی اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ سے دیکھنے
کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق نہیں ہے، اس سے
یق کی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے، جس پر یورپ کے جدید محققین ناز کرتے ہیں، یہی رویہ گب کا
م حدیث کے بارے میں ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں اپنے حسن بیان اور مخصوص طرز استدلال سے
سحور کرکے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ اسلامی قوانین
ر ان کے نفاذ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوگیا تھا، خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی
لما ر اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھی
ن تضاد سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو علما ر نے خطرناک تصور کیا، اس مسئلہ کا انھوں نے
ل ڈھونڈا کہ پیغمبر اسلام کے معاصرین کے واسطے سے احادیث بیان کرنا شروع کر دیں جن میں
اضح مسائل سے متعلق روایتیں حضرت محمدؐ سے منسوب ہوتی تھیں، ان کی پابندی کو ضروری قرار دیا،
ر ان کی حیثیت آیات قرآنی سے کمتر نہیں سمجھی گئی، اور جب گب حدیث اور تدوین حدیث کا ذکر
ستے ہیں تو اس کو علما ر کی مصنوعی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں، اس طرح وہ حدیث کی اہمیت کو اپنے
سلمان قارئین کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو

سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے گہرا شغف ہے، انھوں نے بارھویں صدی کی
اور غیر معمولی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور ان پر جو مضامین لکھے وہ جدید طرز کی تحقیق
نمونے ہیں، ان کے خیال میں سلطان صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں نہیں تھے جو مح
گرد و پیش کے حالات کی پروردہ ہوتی ہیں، بلکہ خود ایک بڑے مقصد کے لیے اپنے ذہن
کے سہارے نہ صرف حالات کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات بھی پیدا کیے اور سیاسی
اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی، پروفیسر گب نے لکھ
اس عہد کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ ملتے ہیں جن کی مدد سے صحیح اور مثبت نتیج
جا سکیں، اور جو تاریخ و تنقید کے سخت سے سخت معیار پر کھرے ثابت ہوں، لیکن سلطان صلا
کی زندگی سے متعلق خوش قسمتی سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دستیاب ہیں، گب نے ا
کتابوں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تحقیق کے اعلیٰ معیار کے مط
ہے، وہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ ایک
حکمران مسلسل تین سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے مستعد دشمن کے مقابل
ڈٹا رہا، جبکہ اس عہد کا فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا بمشکل ہی متحمل ہو سکتا تھا، ان کے خیا
یہ صورت صرف اس لیے ممکن ہو سکی کہ باوجود اس کے کہ سلطان صلاح الدین کوئی ماہر جنگ یا ...
حکمران نہ تھے، پھر بھی ان کی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں
مختلف النوع عناصر اور باہم متحارب سیاسی قوتوں کو اتحاد اسلامی کے لیے ایک مرکز پر متی
مجتمع کر سکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی خوبیوں سے وہ متا
تھے اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کامیابیوں میں سب سے زیادہ اس بات کو
تھا کہ ان میں بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کا احساس برتری!!

جیسی انھوں نے دوست و دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتا، وہ سادہ لوح نہ تھے، لیکن ان میں غضب کا انکسار اور سادگی تھی، ان کی ایمانداری بے داغ تھی اور بلور جیسی چمک رکھتی تھی، ان کے دشمن اس بات پر حیران تھے کہ سیاست اور جنگ دونوں میں ان کے عزائم اور طور طریقے کیوں مختلف ہوتے ہیں، وہ مکر و فریب سے کوسوں دور تھے اور دوسروں کے مکر و فریب کو بھی شاذ ہی سمجھ پاتے تھے، ان کے اسلامی اخلاق نے انھیں معاہدوں کا احترام کرنا سکھایا، وہ ہر قیمت پر معاہدوں کی پابندی کرتے تھے اور معاہدہ توڑنے والے دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اسے عہد شکنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی، ہمارا خیال ہے کہ شاید کسی عیسائی مورخ یا سوانح نگار نے مستند ماخذوں کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد اور تاریخ و تنقید کے سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدین کی ایسی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہوگی جیسی گب نے کی ہے، لیکن تاریخ و ادب سے ہٹ کر جب گب قرآن پاک و سیرت رسولؐ کے موضوعات پر لکھتے ہیں تو اکثر مقامات پر اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اور کیا کی جاسکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور تعصب و جانبداری کی وہ روایت جو ان کو اپنے علمی ماحول اور ورثہ میں اپنے پیشروؤں سے ملی تھی، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہوجاتی ہے، قبل اس کے کہ دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے کچھ اقوال یہاں نقل کریں، وہ لکھتے ہیں کہ ان استعاروں میں سے جہاں عیسائی عقیدہ روایتی طور سے محفوظ ہے، ذہنی طور پر میری تشفی ہوجاتی ہے، کیونکہ یہ استعارے اور علامتیں روحانی صداقتوں کی ان بلندترین عظمتوں کی ترجمان ہیں، جہاں تک میرے فہم کی رسائی ہے بشرطیکہ ان علامتوں اور استعاروں کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جس میں کسی تجسیمی اور تشبیہی عقیدہ کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے عمومی تصورات میں ان کا

بیان ہو جو کائنات کے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں قطع نظر اس سے کہ گب کے اس قول کا حقیقی مالہٗ و ما علیہ کیا ہے، اتنی بات صاف ہے کہ وہ اپنی نظر میں پکے عیسائی تھے، اور ہمارے نزدیک انھیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ سے انھیں ذہنی و روحانی تسکین حاصل تھی اسے وہ اپنائیں، مگر اس بات کی خوشی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے ہیں۔ اسی لیے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ مسلمانوں کے عقائد اور حضورؐ کی سیرت اقدس پر لکھتے ہوئے انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی عیسائیت "تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی ہے جسے آج سے صدیوں پہلے ایک مسلمان دانشور اور عالم البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کے سلسلہ میں اپنایا تھا، دوسروں کے مذہبی عقائد و مذہبی روایت کے موضوع پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کا مطالعہ کر کے اپنے نتائج کو قلمبند کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف و تالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے ماننے والوں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کر دیے جائیں کہ شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، اب اگر لکھنے والا کسی اور عقیدہ یا نظریہ کا حامل ہے، یا اپنے نظریہ یا کسی اور کے نظریہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہیے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریہ کو الگ سے اور پوری وضاحت سے پیش کرے، افسوس ہے کہ مستشرقین قرآن پاک اور سیرت رسول پر لکھتے ہوئے اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں، اور کچھ اس طرح کا غلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال و عقیدت کو اپنے قاریوں کے ذہن میں بٹھا دینا چاہتا ہے، حیرت یہ ہے کہ پروفیسر گب جیسے بالغ نظر مصنف بھی جس کی علمیت و متانت کے

بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن، اس عیب سے پاک نہ رکھ سکے، پروفیسر گب نے اسلام پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کا نام محمڈن ازم ہے، مارگولیتھ نے اسی نام سے ۱۹۱۱ء میں ایک کتاب لکھی تھی، پروفیسر گب نے اس خیال سے کہ بقول ان کے ۱۹۱۱ء کی علمی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، جذبات اور تھے، اور چونکہ ہر دور کے ذہنی تحفظات و تعصبات کی پرچھائیاں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی ہیں، خواہ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے اسلام پر ایک نئی کتاب لکھنا ضروری سمجھا، وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ بات پسند نہیں کہ انھیں محمڈن اور اسلام کو محمڈن ازم کہا جائے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کو محمڈن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں ایسا کہنا غلط بھی نہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو امت محمدیہ کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جو مسلمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے جز کی اہمیت ان کے ذہن میں تمام مضمرات کے ساتھ موجود رہتی ہے، جبکہ کلمہ کے پہلے جز پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا اعتقاد اور ایمان ہو سکتا ہے۔ اگر محمدؐ کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کے منکرین کو کبھی مسلم کہا گیا ہو اور ان کو اسلامی برادری کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے راسخ العقیدہ مسلمان شارحین کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ طور سے کلمہ کا اقرار کرتا ہو غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا۔

پروفیسر ضیاء الحسن نے اپنے مقالہ کا اتنا حصہ پڑھ کر کہا کہ بعض اور اہم پوائنٹ ہیں لیکن چونکہ وقت نہیں ہے، اب آپ سوال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی: اس مقالہ کے بعد پروفیسر رشید الحق اپنا مقالہ پیش کریں گے، اس کے بعد صاحبین سوالات کر سکتے ہیں، وقت کم ہے، اس کے بعد چائے کا وقفہ بھی ہے، ڈاکٹر رشید الحق کے

مقالہ کا عنوان پروفیسر ولفریڈ کانٹ ویل اسمتھ ہے۔

ڈاکٹر مشیر الحق: جناب صدر، مضمون کا جو ابتدائی حصہ ہے میں نے اس میں پروفیسر کینٹ ویل اسمتھ کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات دی ہیں، ان کو وقت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں، مختصراً اتنا بتا دوں کہ ان کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورنٹو میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ اب تک تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی اور سویڈش زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ وقت انھوں نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان میں لاہور کے فارمن کرسچین کالج میں ایک استاذ کی حیثیت سے گذارا، جہاں ان کو ہندوستانی مسلمانوں سے ملنے کا پورا اتفاق ہوا اور ان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی یہ آئی کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ برصغیر کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ پورے طور سے نہ کیا جائے، صرف مڈل ایسٹ پر کنسنٹریٹ کرنے سے صحیح اسلام کا پرسپیکٹو نظر نہیں آ سکتا۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب 'ماڈرن اسلام ان انڈیا' لاہور ہی کے قیام میں ۱۹۴۳ء میں شائع کی جس کا شمار آج بھی کلاسیکی ادب میں کیا جاتا ہے۔ اسمتھ اس وقت تک تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ دیتے تھے، جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کو اپنے مارکسی نقطۂ نظر کی وجہ سے مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بھی بننا پڑا۔ لاہور سے واپسی کے بعد انھوں نے پرنسٹن میں فلپ کے حتی کی نگرانی میں مجلہ الازہر، تجزیہ و تنقید کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں وہ کمپیریٹو ریلیجن کے پروفیسر ہو کر میک گل یونیورسٹی چلے آئے جہاں دو ہی سال کے عرصہ میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی اور اس میں ان کا تقرر ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہوا۔ ان کا خاص نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ اسلام یا کسی بھی مذہب کے مطالعہ کے

سلسلہ میں جب تک جس مذہب کا مطالعہ کیا جارہا ہو، اگر اس کے ماننے والے تقریباً اتنے ہی تعداد میں موجود نہ ہوں جتنی تعداد میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں اس وقت تک مذہب کا صحیح مطالعہ ایمانداری کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا، اسی بنیاد پر انھوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ اپنے دوران قیام میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں اساتذہ وطلبہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تناسب پچاس پچاس فیصدی ہونا چاہیے ۱۹۶۴ء میں ان میں یہ تبدیلی آگئی کہ صرف اسلام کے مطالعہ کے بجائے دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا جائے، اس کے لیے میکگل کا میدان ان کے لیے ذرا محدود تھا، اس لیے وہ ہارورڈ چلے گئے، وہاں انھوں نے کئی مذاہب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اس کے تعلیمی سینٹر کو انھوں نے رہائشی سینٹر میں تبدیل کردیا، جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے، یہ تو ان کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک تھی، اب میں ان کے خیالات کی بھی ایک جھلک پیش کرتا ہوں

سمتھ اپنے فکر وعمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی ان کے مذاہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں، تقویٰ ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں، یہ خدا اور انسان کے باہمی تعلق کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا فرد کی مذہبی زندگی اتنی ہی قابل رشک ہوگی، سمتھ کے نقطۂ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت کہتے ہیں اور دوسرے کو اجتماعی روایات، انفرادی کیفیت کو سمتھ اپنی زبان میں faith اور ہماری زبان میں ایمان کہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر کوئی شخص مذہبی نہیں ہوسکتا، لیکن ایمان کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، یہ چونکہ ایک اندرونی کیفیت ہے اس لیے ضروری نہیں ہے کہ ایمان میں حالات کے تحت تغیر و تبدل نہ ہوسکے اور نہ ہر شخص کے ایمان کا پلہ برابر ہوسکتا ہے، دوسرے لفظوں میں سمتھ ایمان ہر کس بقدر ہمت اوست کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر کمیت وکیفیت کے فرق کے باوجود مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیروؤں کی اجتماعی روایات کا ——

Cumulative Tradition نام دیتے ہیں منظر عام پر آتا رہا ہے۔ کہا
جاسکتا ہے اگرچہ روایت زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے تبدیل ہوتی رہتی ہے تاہم ان روایت
میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے اس لیے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں
اور چونکہ روایات، زمان و مکان کے فرق سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں اس لیے اگر اس جہت سے دیکھا
جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا وجود ثابت ہوجاتا ہے، لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو
مذہب کا معیار مانا جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی
اجتماعی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں، لیکن ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال
نہیں کیا جاسکتا یہی وجہ ہے کہ اسمتھ اپنی تحریروں میں faith کو ہمیشہ واحد کے صیغہ میں لکھتے ہیں
اپنی پرانی تحریروں میں انھوں نے جہاں کہیں faiths جمع کے صیغہ میں لکھا تھا اسے دوبارہ اشاعت
کے وقت forms of faith (ایمان کی مختلف شکلوں) میں بدل دیا۔ ایمان اسمتھ کے نزدیک
ایک نفسانی کیفیت کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، جس کی
رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کردیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے
اور یہ ایک شکل اختیار کرلیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی ہم اس کے تابع اور
فرماں بردار بندے ہوں گے، اس اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ اسلام کہتے ہیں، اسلام ان کے
نزدیک مکمل ایمان کے اظہار کا نام ہے، اس نتیجہ پر پہونچ جانے کے بعد اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں ان
الدین عند اللہ الاسلام لیکن اس کی تشریح میں وہ ہم سے اختلاف کرتے ہیں، ہم یہاں اسلام کو اسم معرفہ
سمجھ کر اپنا اسلام مراد لیتے ہیں اور اسمتھ اسے اطاعت خداوندی کے معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں
اسلام کے اسم فاعل مُسلم کی تشریح بھی وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح سے کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے
مسلم کا مطلب ہے فرماں بردار بندہ، لیکن اب اصطلاحاً مسلمان ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو تاریخی مذہب اسلام کی

یہودی کو قدرتیہ نجات سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے واسطے دو الگ الگ ہم معنی لفظ مسلم اور مسلمان استعمال کریں جن میں اول الذکر کو لغوی معنی میں لیں اور آخر الذکر کو اصطلاحی معنی میں تو پروفیسر سمتھ بلا کسی جھجک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہوں لیکن اسی بات کو وہ عربی میں مسلم کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں لَسْتُ بِمُسْلِمٍ کہنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے، کیونکہ اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے فرماں بردار بندے نہیں اور یہ بات ان کے عقیدہ وعمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کا وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ پائے ہیں اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندۂ مسلم کی زندگی ہے لیکن اصطلاحی معنوں میں مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں پیدا نہیں ہوئے، دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوے سے متفق نہیں کہ اصطلاحی طور سے مسلمان ہوئے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جا سکتا، انھوں نے جس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے وہی سپردگی ان کے نزدیک الاسلام ہے، کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کی تشریح کے مطابق دین یا ریلیجن خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں، پروفیسر سمتھ کا اصرار ہے کہ اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علماء کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلیجن کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر صبح و شام اپنی زبان میں اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام کا ورد کر رہے ہیں، اس کے باوجود انہیں اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے لیکن وہ خود مسلمان نہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب یہ واضح کر دیا جائے کہ عیسائی علماء اور پادری اور خود سمتھ جس اسلام کو اپنا دین کہتے ہیں وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہے جو صدہا برس کے تاریخی و سماجی عوامل کے ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مرادف بن گیا ہے، سمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہمعصر مسلمانوں کے بارے میں انکا خیال ہے کہ وہ لوگ اسلام کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں، یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے مکمل، جامع اور مستقل نظام ہے

قوم کے مفہوم میں ایک قرآن اول کے مسلمانوں کے لیے جیسا تھا، مثلاً آیات وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ اور رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتاتے ہیں: الاستسلام لامری والانقیاد بالطاعۃ علی ما شرعت لکم من حدودہ وفرائضہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان بھی طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے کیونکہ وہ بھی یہ سمجھتے ہیں اسلام اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر تفصیلات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض من وعن وہی ہیں جنھیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اس لیے مسلمان مصنف کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کرلے، اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے، وہ اطاعت الٰہی کو شریعت اسلامیہ میں محدود نہیں سمجھتے، شریعت اسلامیہ اسمتھ کے نزدیک عملی مذہب کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ اجتماعی روایات کہتے ہیں، جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے۔

اسمتھ کو شماریات سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لیے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (۸۵ء۱/۲) اور ۱۵ (۱۴ء۹/۲) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ [illegible]ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے [illegible] کی ہوجاتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے اور صرف ... میں ۷ (۷۔۱/۲) اور ۹۳ (۹۲۔۹/۲) کی نسبت رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی: ذرا وقت کا لحاظ رکھیں۔

پروفیسر مشیر الحق: کیا میرا وقت ختم ہو چکا ہے؟ میرے مقالہ میں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ہے جس میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ اسلام کو محمڈن ازم کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

اسمتھ کو پوری طرح اصرار ہے کہ مسلمانوں کو مسلم اور اسلام کو اسلام ہی کہا جانا چاہیے، اور اس سلسلہ میں وہ اتنے سخت رہے ہیں کہ اپنی تحریروں اور ریڈیو کی تقریروں کے ذریعہ تقریباً پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے اس پر زور دیتے رہے ہیں کہ مسلم ہی استعمال کیا جائے، بلکہ جس زمانہ میں پروفیسر گب کی کتاب محمڈن ازم شایع ہوئی تھی جس کی طرف پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اشارہ کیا ہے تو اسمتھ نے اس نام کو پسند نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے تھے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ ناشر کی اپنی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا ہے لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے اور گب کی کتاب کا عنوان بالکل بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا اور اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے جو ضیاء صاحب اپنے مقالہ میں پیش کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ سے جو تعلق ہے اور کلمہ کا جو دوسرا جزء ہے اس پر جتنا اصرار ہے اس کی روشنی میں اور خود مسلمانوں کی زندگی اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کرکے انھوں نے پیش کیا ہے کہ مسلمانوں کو کوئی شخص محمڈن یا اسلام کو محمڈن ازم کہتا ہے تو پھر اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بنیاد ہے، اس زبانی تقریر کے بعد پروفیسر مشیر الحق نے اپنے مقالہ کا آخری حصہ پڑھا جو یہ تھا:

آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ افسانہ کیوں لکھتا ہے یا شعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری نظروں سے نہیں گذرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بد دیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی

غلط تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس طرح چند مسلمانوں کے دل میں گھس کر انھیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیلی مذہب کا امکان نہیں رکھتا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کاسموپولیٹن ہوتا جارہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی یا ایک لاادریا (Agnostic) خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار بدھسٹ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انھیں ایک دوسرے کے مذاہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہیے، یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعوی میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خلوص نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچے میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود انہی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں آخر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے، تو پھر میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں، شکریہ، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد کچھ سوالات کیے گئے۔

مولانا تقی الدین ندوی: سوال کرتا ہے، پروفیسر اسمتھ کے بارے میں جناب بشیر صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں خاص طور سے الاسلام اور الایمان کے بارے میں، میرا خیال ہے کہ یہاں اَل کو اسمتھ صاحب سمجھے ہی نہیں، اَل یہاں تخصیص کے لیے ہے الاسلام سے خاص اسلام مراد ہے اور الایمان سے خاص ایمان مراد ہے، یہ وہ اصطلاح ہے جسے قرآن نے

استعمال کیا ہے اور جس کے بارے میں کہا ہے کہ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ اور یہ اسلام وہی ایمان جسے اسمتھ یہ کہتا ہے کہ پہلی صدیوں میں کچھ اور سمجھا جاتا رہا اور بعد کی صدیوں میں کچھ اور، درآنحالیکہ قرآن خود کہتا ہے اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا اسلام مکمل اور جامع تو نازل ہی ہوا، یہ جس طرح پہلی صدیوں میں سمجھا جاتا رہا بعد کی صدیوں میں بھی سمجھا جاتا رہا، اور طبری کی ایک عبارت نقل کر کے یہ کہنا کہ شروع کی صدیوں میں مسلمانوں کو فی امرہ ونہیہ میں اختلاف نہیں ہوا تو اس کی مراد وہ امر خدا کی پابندی ان حدود میں ہے جن کو خدا اور پیغمبر اسلام نے متعین کیا ہے، ہر شخص کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، قرآن کی ایک اصطلاح ہے اور اسی اصطلاح کے مطابق ایمان و اسلام کو اسمتھ صاحب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، لیکن اسمتھ نے ایک طرف تو یہ کہا کہ ہم ایمان کے لغوی اور اصطلاحی معنی مراد لے رہے ہیں، کون سے اصطلاحی معنی اور کون سی اصطلاح؟ اگر وہ اس اصطلاح کو مراد لیتے ہیں جو قرآن نے مراد لی ہے تو پھر کوئی اختلاف ہی نہیں، لیکن وہ اس کو لغوی معنی میں اطاعت خداوندی سے مراد لے رہے ہیں تو یہ حقائق کے بھی خلاف ہے اور اصطلاح کے بھی خلاف، میرے خیال میں ان کو غلط فہمی اَل سے ہوئی ہے، اَل تخصیص کے لیے ہے، مخصوص اسلام اور مخصوص ایمان مراد ہے، یعنی وہ اسلام جو قرآن نے پیش کیا ہے نہ کہ وہ اسلام جو ہر شخص پیش کرے۔

مشیر الحق صاحب:۔ جو بات مولانا نے فرمائی وہ تو میں خود ہی کہہ چکا ہوں، مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں اور اسمتھ کے نقطۂ نظر میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، اب یہ بات کہ اَل کا جو فرق ہے اسے اسمتھ سمجھے بھی ہیں کہ نہیں، یہ مجھ پر بھی بڑا ظلم ہے اور اسمتھ پر بھی ہوگا، مقالہ پیش کرنے کے لیے تو ۵، منٹ کا وقت دیا گیا اسے بھی کاٹ چھانٹ دیا جائے، اس مقالہ کا مقصد اسمتھ کے خیالات کو پیش کرنا تھا، ظاہر ہے ہم ان کی ساری باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے، جہاں اختلاف تھا وہ پیش کر دیا گیا، صرف ایک کنکر پھینکنا ہے تالاب میں کہ ممکن ہے کسی خدا کے بندے کو شوق پیدا ہو جائے کہ بھئی ان کو پورا پڑھیں۔

تقی الدین صاحب:۔ تو آپ نے پورا پڑھ لیا ہوتا، اخیر تک، تاکہ بات واضح ہو جاتی۔

[illegible] صاحب: میں نے پڑھ لیا لیکن یہاں پیش کرنے کے لیے اتنے چھوٹے سے مقالہ کو پورا وقت نہیں دیا گیا، پھر ایک لمبے مقالہ کی کہاں گنجائش نکل سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس میں ان چیزوں کو سمجھتے نہیں، جس طرح مستشرقین کی تحریروں پر گفتگو ہوتی رہی ہے، اس میں یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ہماری چیزوں کو کس طرح پیش کرتے ہیں، ہم مستشرقین کی صف میں اس کو رکھتے ہی نہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار | ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ نے سوال کیا کہ اسلام ہر دور میں رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ دین ہے، اس کی اصلاح شدہ اور آخری شکل محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تو اگر اس کو محمدیت یا محمڈن ازم اور اس کے پیروؤں کو محمدی یا محمڈن کہیں تو کیا حرج ہے؟

مفتی عتیق الرحمن صاحب | مولانا تقی الدین صاحب کا ارشاد اپنی جگہ پر درست ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں لہجہ کی اتنی کرختگی نہ ہونی چاہیے جو مولانا نے اپنے جذبۂ اخلاص کی بنیاد ہی پر اختیار کیا ہوگا، مستشرقین کے مسئلہ کے بارے میں ہمیں اس لحاظ سے بہت تنقیحات اور چھان بین کرنی پڑے گی کہ مستشرقین کے جو نظریات ہیں خود ہم مسلمانوں پر ان کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں، ہمارا جو قدیم طبقہ ہے وہ کسی اور ڈھنگ سے سوچتا ہے اور جو جدید طبقہ ہے وہ اور طریقے سے سوچتا ہے، بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں خود ہمارے یہاں اختلافات بہت ہیں چاہے ہم ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن بہرحال اختلاف ہے، ان اختلافات میں کسی نے اگر کوئی پہلو اختیار کر لیا ہے جو ہمارے یہاں مشہور و معروف نہیں ہے تو ہمیں اس پر زیادہ ناراض نہ ہونا چاہیے، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تشریحات کے بعد مسئلہ صاف ہو جائے گا، یہ بات بھی ہے کہ مقالات کا جب ہجوم ہوتا ہے تو وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے، مقالہ نگار کو تکلیف ہوتی ہے کہ وہ بہت سے اہم پہلوؤں کو ظاہر نہیں کر پاتا، اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ مقالات کے پہلوانوں کی دنیا الگ ہے، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کسی پہلوان کو زیادہ وقت یا کم وقت ملا، بس ایک اندازہ ہے اسی لحاظ سے غور کرنا چاہیے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی | جناب عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ نے یہ سوال کیا کہ اسلام جو

وجود میں رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ دین ہے اس کی اصلاح شدہ اور آخری شکل محمد رسول اللہؐ لے کر آئے، تو اگر ہم اس کو محمدیت اور اس کے پیرووں کو محمدی یا انگریزی میں محمڈن کہیں تو کیا حرج ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے اس دین کا نام اسلام رکھا ہے جو ہر پیغمبر لے کر آیا ہے، حضرت ابراہیم کے بعد کئی اولو العزم پیغمبر حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ آئے اور پھر آنحضرتؐ آئے، کہیں مسلمانوں کو خطاب کر کے قرآن نے کہا ہے کہ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (حج: ۷۸) تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اس دین کو اسلام کا نام دیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان موجود نہیں تھے، ابراہیمؑ کے بعد جتنے پیغمبر آئے اور جو امتیں ہوئی ہیں، وہ پیغمبر اسلام کے داعی تھے اور امتیں اسلام کی متبع تھیں لیکن ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے کہ محمد رسول اللہؐ نے اسی اسلام کو جو ہمیشہ سے آ رہا ہے کی تحریفات کو دور کر کے اس کو اپنی شکل میں پیش کیا ہے اور اب وہی اسلام معتبر ہے جس کو رسول اللہؐ نے پیش کیا تھا اور جو آپؐ لے کر آئے اور اس میں کہ اب اسلام کو محمدیت کہا جائے اور امت اسلامیہ کو محمدیون کہا جائے میں اس میں فرق سمجھتا ہوں، اس میں یورپ کی ایک سازش تھی، کہ مسلمانوں کو محمڈن کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا، اور یہ سازش بڑی ذہانت پر مبنی تھی، اس کی تائید شیر الحق صاحب کے مقالے سے بھی ہوتی ہے، اور ہندوستان کے مسلمان کسی وجہ سے بھی جس میں بدنیتی کا شبہہ میں نہیں کرتا اس میں محبت رسولؐ کا بھی دخل ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے اداروں کا نام شروع شروع میں محمڈن اورینٹل کالج، محمڈن عربک کالج یا ایک زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھا اور اب محمڈن لا کے نام سے ہمارا اسلامی قانون ہے، وہ اس وقت تک رائج ہے لیکن بعد میں مسلمانوں کو خود اس کا احساس ہوا اور کئی اداروں اور تحریکوں کا نام بدل گیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پڑ گیا اور ہم مسلمانوں کو اس پر اصرار کرنا چاہیے کہ اسلام کو اسلام کہا جائے اور مسلمانوں کو مسلمین اور امت مسلمہ کہا جائے هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ سے قرآن مجید نے اس پر یہ آخری مہر لگا دی ہے، اسلام نے اس کا اتنا لحاظ کیا ہے کہ اپنی تقویم کا نام بھی محمدی تقویم نہیں رکھا بلکہ ہجری تقویم

کہ دنیا میں جتنی قومیں موجود ہیں وہ کسی نہ کسی شخصیت کی طرف منسوب ہیں۔ عیسوی تقویم ہندوؤں کی تقویم یا خود ہندوستان میں جو تقویم رائج تھی وہ بھی ایک مشہور بادشاہ کے نام سے تھی۔ مسلمانوں نے اپنی اسلامی تقویم کا نام ہجری رکھا اس لیے کہ اس میں ایک پیغام ہے، میں پورے احترام کے ساتھ جو ایک ادنیٰ مسلمان غلام کو ہو سکتا ہے کہہ سکتا ہوں کہ محمدی کہلانے میں یا محمدیت میں وہ پیغام نہیں ہے، یعنی وہ ذہن کو کسی عقیدہ کی طرف متوجہ نہیں کرتا، وہ شخصیت کی طرف مائل کرتا ہے، اس کا نفسیاتی وذہنی اثر یہ ہوتا ہے کہ اصل چیز شخصیت سمجھی جاتی ہے، اور اسلام یہ بتاتا ہے کہ اصل چیز ہے عقیدہ، اور وہ شخصیت اس لیے محترم و محبوب ہے کہ اس نے عقیدہ کو سکھایا ہے اور اس نے دعوت پیش کی، قربانیاں دیں اور وہ خدا کی محبوب ترین شخصیت تھی اگر بے ادبی نہ ہو تو اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کی حس اتنی بیدار و حساس تھی کہ ایک اعرابی نے کہا تھا کہ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ (جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں) آپؐ تاب نہ لا سکے اور فرمایا: اجعلتني لله ندًا، ما شاء الله وحدهٗ ما شاء الله وحدهٗ (کیا تم مجھے اللہ کا شریک بناتے ہو، تنہا خدا چاہے، تنہا خدا چاہے) اور اسی طریقہ سے مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے) تو اس میں بھی آپؐ نے تھوڑا فصل کرنا چاہا مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ (جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے) یعنی اسم موصول کا لفظ بیچ میں آگیا ہے، لیکن آپؐ نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ اللہ اور رسول کا نام اس طرح آئے جس طرح ہماری بعض مسجدوں کی محرابوں میں لکھا جاتا ہے اللہ محمد، اللہ محمد، بعض مرتبہ تو مجھے خیال آتا ہے کہ بڑے چھوٹے بھائی تھے یا دو بزرگ تھے جن کا نام ساتھ ساتھ لکھ دیا گیا ہو، میں اس کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اس پر یہ کہوں کہ آپ کا خط نسخ پھیر دیا جائے یا الگ الگ لکھا جائے، لیکن ایک موحد مسلمان کے ذہن کو چوٹ لگتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس بارہ میں ہمیشہ حساس اور ذکی الحس ہونا اور بیدار مغز رہنا چاہیے کہ وہ کسی سازش کے شکار نہ ہوں، اور بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، ہمارا ایمان ہے، اس کے باوجود ہم نہیں چاہیں گے کہ اسلام کو اسلام کہا جائے اور مسلمانوں اور اس کے پیروؤں کو امت مسلمہ کا نام دیا جائے، ان

دونوں میں فرق یہ ہے کہ ہم کہیں کہ وہ اسلام جسے صحیح شکل میں رسول اللہؐ لے کر آئے تھے اور جس کا کلمہ ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، لیکن ہم اسلام کو اسلام ہی کہیں گے، اور خط کا شکر ہے جیسا کہ مشیر الحق صاحب نے بتلایا کہ احمد صاحب کو بھی اس کا احساس ہے کہ اسلام کو اسلام ہی کہنا چاہیے، محمڈن ازم نہیں کہنا چاہیے، باقی میں اخیر میں یہ عرض کروں گا کہ شروع سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اس علمی مذاکرہ کا وہ نقطہ جس پر تقریباً ابھی تک سب کا اتفاق رہا ہے کہ مستشرقین اپنی ساری روشن خیالیوں اور اپنے سارے وسعت مطالعہ اور وسعت ذہنی کے باوجود بہرحال وہ یہودی اور عیسائی ہیں، اور مشیر صاحب نے بھی اس کا اظہار کیا ہے، ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ یہودی اور عیسائی ہیں، اور جیسا کہ پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے کہا کہ وہ دعویٰ تو کرتے ہیں معروضی نقطۂ نظر کا، لیکن کانٹ کی آخری تحقیقات سے دو سو برس پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ عقل مجرد کا وجود نہیں ہے، میں اس سے آگے بڑھ کر کہوں گا کہ علم مجرد کا بھی وجود نہیں ہے، تحقیق مجرد کا بھی وجود نہیں ہے، اس میں قدیم عقائد جو راسخ ہو چکے ہیں، رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں، خاندانی روایات تک، ماحول کے اثرات، مسلمات، بے اصل مسلمات کا سایہ اس طرح پڑتا ہے کہ اس میں مدعی کو یا داعی کو یا محقق کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس نے جو نظریہ علم مجرد اور تحقیق خالص کے طور پر پیش کیا ہے وہ تحقیق خالص ہے یا ممزوج ہے، یا ایک آمیزہ ہے پرانے اثرات کا، مستشرقین کی تحقیقات نے ایک اور مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے محض اپنے سلامت قلب اور تائید الٰہی سے جو بات آج سے سوا تین سو برس پہلے کہی تھی کہ نہ تو عقل خالص کا وجود ہے نہ کشف خالص کا، سب متاثر ہوتے ہیں، تحت الشعور سے اور تحت الشعور کے اندر جو مکنونات ہیں، جو مخزونات ہیں، جو پہلے سے خزانہ ہے، اس سے متعلق ہوتے ہیں، میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔ اس کے بعد مذکورۂ بالا خیالات کو مولانا نے عربی زبان میں بھی پیش کیا ——— (دوسری نشست یہیں ختم ہوئی۔)

دار المصنفین کے بین الاقوامی سمینار

سے متعلق

ایک اہم مکتوب

کراچی :- ۲۹ اپریل ۱۹۸۲ء

محترمی و مکرمی جناب سید صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نامۂ گرامی مورخہ ۸ اپریل ۱۹۸۲ء کے لئے ممنون ہوں، اور کلماتِ خیر کے لئے بصمیم قلب متشکر، میں کل شام کو ہی شمالی کوریا اور چین کے ۲۰ روزہ دورے سے واپس آیا ہوں، اور اب پرسوں پشاور اسلام آباد اور لاہور جا رہا ہوں،

میں نے تجاویز پر آج اطمینان سے غور کیا، چند اشارات درج ذیل کرتا ہوں،

۱- سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ان تجاویز کا انگریزی اور عربی ترجمہ ہونا چاہئے اور یہ تجاویز فوری طور پر ایک مناسب خط کے ساتھ ان ۱۹ ارکان کو بھجوا دیجئے جن کا ذکر ان تجاویز میں ہے، ان حضرات کو علم ہونا چاہئے کہ وہ کس کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے ہیں، اور ان سے تعاون کی درخواست کرنی چاہئے،

۲- دار المصنفین میں ایسے علمائے اسلام کی فہرست ضرور ہونی چاہئے جو اسلامیات پر کام کر رہے ہیں اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، ان اکابر رجال کو تجویز نمبر ا پر متوجہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے مطالعہ میں اس مسئلے کو پیش نظر رکھیں اور خلاف اسلام تحریرات کا

[illegible]

۱- میری راے ہے کہ ان سب حضرات کرام کو انگریزی اور عربی میں یہ تجاویز بھجوائی جاتی مناسب ہوں گی، کیونکہ ایسے ہی محققین سے دوسری تجاویز کا بھی گہرا تعلق ہے،

۲- چند سال ہوئے کہ مکۃ المکرمہ میں اولین کانگریس عالمی تعلیم پر ہوئی تھی، میں بھی اس میں مدعو تھا، اور وہاں میں نے بعض اہم تجاویز سامنے رکھی تھیں ان میں ایک اہم تر یہ ہے کہ تمام عالم اسلام میں پرائمری تعلیم میں یکسانیت پیدا کرنی چاہئے، اور نصاب تعلیم مرتب کرکے پوری یکسانیت کے ساتھ تمام عالم اسلام میں نافذ و رائج کرنا چاہئے، اس قسم کی دوسری تجاویز بھی تھیں، مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی آج تک عمل نہیں ہوا ہے، اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ڈاکٹر علی اشرف صاحب (معرفت ملک عبد العزیز یونیورسٹی مکۃ المکرمہ) سے رابطہ قائم فرمالیجئے کہ انہی کو یہ مقام حاصل تھا کہ وہ یہ کانفرنس وہاں کرائیں، اس کانفرنس کی روداد بھی بڑے اہتمام سے لندن میں چھپی ہے،

۳- میری راے میں تجویز نمبر ۲ اس دائرہ میں بمشکل ہی آسکتی ہے کہ جو مستشرقین پر عالمی کانفرنس (اعظم گڈھ) نے متعین کیا ہے، اس پر عمل مشکل ہوگا، اور اس سے مقاصد کانفرنس کا گہرا تعلق بھی نہیں ہے،

۵- اگر ہم اپنی جد و جہد کو اس حد تک مرکوز رکھیں کہ مستشرقین اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے سے باز آجائیں اور فکری و علمی انداز پر بعض مستشرقین کو راہ صحیح بتا سکیں تو اس سے دائرۂ کار کا احترام ہوسکے گا،

۶- خود ہندوستان میں ایسے علمائے کرام موجود ہیں کہ جو اس انداز سے کام کرسکتے ہیں، ان کے حاصل مطالعہ اور نگارشات کی اشاعت کا اہتمام ہونا چاہئے،

یہ چند نکات ہیں کہ جو اس وقت ذہن میں آئے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ ڈاکٹر سلمان صاحب منٹگمری واٹ کے سب سے زیادہ نقاد تھے، اور اپنی تنقید میں انھوں نے مجھ پر اور پاکستان پر حملے

بھی کے جن کو صدر مجلس ہونے کے باوجود میں نے نظر انداز کر دیا، تجویز نمبر ۲ کا تعلق بھی شبلی [illegible] سے ہے، میری رائے ہے کہ اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے ڈاکٹر مسلمان صاحب ہی کو کوئی ایک کتاب دینی چاہئے، اگر وہ "فرسٹ کلاس" انگریزی ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری میں قبول کرنے کے لئے تیار رہوں،

میری ایک تجویز یہ ہے کہ اس کانفرنس کی ایک مختصر روداد ضرور شائع کرنی چاہئے، اور اس روداد کو نہ صرف مسلمان محققین کو بلکہ جس حد تک ممکن ہو مستشرقین کو بھیجوانی چاہئے تاکہ ان کو یہ احساس ہو کہ ان کی فکر و نظر پر گرفت کے لئے ایک ادارہ عالم وجود میں آگیا ہے، اس مختصر روداد میں مقالات نہیں دیئے جائیں گے، مگر کانفرنس کا مقصد اور منشاء واضح کیا جانا چاہئے، اور کانفرنس کی رائے اور عزائم کا اظہار ہونا چاہئے،

"معارف" مجھے ملتا ہے، اپریل کا بھی جلد مل جائے گا،

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے،

احترامات فائقہ،

آپ کا مخلص

حکیم محمد سعید

مقالات شبلی جلد ششم

سلسلہ مقالات شبلی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہو، یہ اس سلسلہ کی چھٹی جلد ہے، جس میں مولانا شبلی مرحوم کے وہ معرکۃ الآرا تاریخی مضامین درج ہیں جو انھوں نے عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے رد میں لکھے مثلاً کتب خانہ اسکندریہ، اسلامی شفاخانے، اسلامی کتب خانے اور تراجم وغیرہ،

ضخامت ۲۴۲ صفحے، قیمت: ۱۰ روپے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث (الجزء الثانی) مرتبہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰۰ قیمت ۷۵ روپے، پتہ:- حافظا ہاؤس پرنٹرس اینڈ پبلشرس، ۱۳ میلا پورس اسٹریٹ مدراس، ۱۴

یہ کتاب ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو مولانا محمد یوسف کوکن نے جدید عربی ادب کے موضوع پر کالی کٹ یونیورسٹی میں دیئے تھے، اس کی پہلی جلد پر کئی ماہ قبل معارف میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب دوسری جلد شائع ہوئی ہے، اس کے شروع میں مہجر (ہجرت گاہ) کے ادیبوں کا تذکرہ ہے جو خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں معاشی بدحالی کی وجہ سے مصر، شام، اور لبنان وغیرہ کی سکونت ترک کرکے یورپ کے ملکوں میں جا بسے تھے، اور شمالی و جنوبی امریکہ میں خاص طور پر ان کی نئی آبادی ہوگئی تھی، ان میں اکثر مسیحی تھے، مگر وہاں جانے کے بعد بھی انھوں نے عربی زبان و ادب سے اشتغال اور دلچسپی قائم رکھی، اپنے ادارے قائم کرکے اخبار و رسالے نکالے اور کتابیں شائع کیں، لائق مصنف نے اس طرح کے تقریبًا ۳۹ اہل قلم کے حالات و واقعات زندگی قلم بند کئے ہیں، اور ان کے علمی، ادبی، تنقیدی، اور شعری سرمایہ کی قدر و قیمت دکھائی ہے، اس ضمن میں شمالی امریکہ کی ادبی تنظیم الرابطۃ القلمیہ، جنوبی امریکہ کی العصبۃ الاندلسیہ اور ایک اور ادبی انجمن الرابطۃ الادبیہ کے اغراض و مقاصد کا خاکہ پیش کیا ہے، اور ان کے موسسین او

جن کو ہم مہجری ادباء کہتے ہیں پہلے حصہ میں وہ مصنفین کے بارہ، اور دوسرے حصہ میں بیس ادیبوں کے حالات اور ان کی ادبی و شعری خدمات کا جائزہ لیا ہے، پہلے حصہ کے مشاہیر کے نام یہ ہیں، امین ریحانی جبران خلیل جبران، میخائیل نعیمہ، بشارہ الخوری، ایلیا ابو ماضی، میشال معلوف، الدکتور احمد زکی ابوشادی وغیرہ، اور دوسرے حصہ میں جمیل صدقی الزہاوی، فواد خطیب، معروف رصافی، محمد کرد علی، اور مصطفی صادق رافعی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، اس کتاب میں جدید عربی ادب میں ڈرامہ و افسانہ کی ابتدا و ترقی اور کچھ ممتاز ڈرامہ و افسانہ لکھنے والوں کا ذکر بھی ہے، عربی زبان و ادب کی خدمت و ترقی میں حصہ لینے والے عیسائی مصنفین و اہل قلم کی مساعی بھی دکھائی گئی ہیں، سب سے آخر میں الاستشراق والمستشرقون کے زیر عنوان خلفائے عباسیہ کے زمانہ سے بارھویں صدی ہجری تک کے یہودی و عیسائی فضلاء کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اس میں مصنف نے اسلامی علوم پر مشتمل کتابوں کی ترتیب و تحشیہ کے ساتھ اشاعت اور اسلام پر ان کی بعض مفید خدمات کو سراہا ہے، مگر ان کے تعصب و عناد کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کی ذات گرامی کو خاص طور پر طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے اس سلسلہ میں ماضی قریب کے ان مسلمان علماء و فضلاء کا ذکر بھی آگیا ہے جنھوں نے مستشرقین کے زہر کا تریاق مہیا کیا، مثلاً سر سید احمد خاں، امیر علی، مولانا شبلی، سید جمال الدین افغانی مفتی محمد عبدہ، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اور عباس محمود عقاد، اس کتاب میں جن اہل قلم کا تذکرہ ہے وہ سب بیسویں صدی کے ہیں، اور بعض اب بھی بقید حیات ہیں، اس کے مطالعہ سے عربی زبان و ادب کے نئے رجحانات و میلانات اور جدید افکار و تحریکات کے متعلق بھی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، مصنف نے مسلمانوں کی طرح عیسائی اور یورپین فضلا کے کمالات اور ان کی اسلامی علوم اور عربی زبان کی خدمات کا فراخدلی سے اعتراف کیا ہے اور ان کے

نظریات و خیالات پر بحث و تبصرہ کئے بغیر بے کم و کاست ان کو پیش کیا ہے، انھیں اردو کا عربی دونوں میں لکھنے پر یکساں اچھی قدرت ہے، مگر ایک جگہ ذہینا (ص ۱۲۱) لکھا ہے، عربی میں یہ استعمال نہیں ہوتا، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، اگر وہ مصنفین کے سنین وفات کے اعتبار سے کتاب مرتب کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

باقیات ایک جہاں مرتبہ مولوی ظہیر احمد باقوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ ۱۵ روپیے، پتہ: ادارہ صفیر انجمن ترقی اردو باقیات صالحات ویلور

جنوبی ہند کا مشہور مدرسہ باقیات صالحات ویلور تقریباً سوا سو ۱۲۵ برس سے مفید دینی و تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، زیر نظر کتاب میں اس درس گاہ، اس کے بانی اور دوسرے سرگرم کارکنوں اور اساتذہ کے متعلق مضامین یکجا کئے گئے ہیں، چند مضامین میں اس درس گاہ کی خصوصیات اور تعلیمی خدمات وغیرہ کا ذکر ہے، اس سلسلہ کا ایک مضمون دار المصنفین کے سابق رفیق ڈاکٹر مولانا محمد یوسف کوکن عمری کا بھی ہے، مدرسہ کے بانی مولانا عبد الوہاب ویلوری مرحوم کا ذکر خیر دو ۲ مضامین میں ہے، ایک مضمون میں ان کے فرزند اور مدرسہ کے سابق ناظم مولانا محمد ضیاء الدین مرحوم کا تذکرہ ہے، کئی اور مضامین میں اس گلستان علم کے دوسرے رنگ برنگ پھولوں کا ذکر ہے، بعض حضرات کے نثر و نظم بھی درج ہیں، ایک مضمون میں مدرسہ باقیات کے طلبہ و اساتذہ کی اردو زبان سے دلچسپی بھی دکھائی گئی ہے، اور مدرسہ کے متعلق ملک کے بعض اکابر کی رائیں، اور اس کے صد سالہ جشن کے بارہ میں ان کے تاثرات بھی نقل کیے گئے ہیں، آخر میں نظموں کا حصہ ہے، گو مضامین کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے، تاہم اس کتاب سے مدرسہ کی خصوصیات اور اس سے وابستہ اہم اشخاص کے متعلق گوناگوں باتیں معلوم ہوتی

ہیں جیسے قرآن [illegible] کا ترجمہ [illegible] لکھتے ہیں

ترانہ:- از جناب ابرار اعظمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ:- نونہال تخلیقی اکیڈمی خالص پور اعظم گڈھ،

جناب ابرار اعظمی صاحب نے اپنے دینی، تعلیمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے چھوٹے بچوں اور بچیوں کی مناسب تعلیم و تربیت کے لئے اپنے وطن میں ایک اسکول قائم کیا ہے، اور بچوں کے ذوق کی مفید کتابیں مرتب کرنے کا پروگرام بھی بنایا ہے، یہ انوکھا ترانہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اسمیں گو تعلیم و تربیت سے زیادہ بچوں کے ذوق و دلچسپی کو مدنظر رکھا گیا ہے تاہم اس میں اللہ کی عظمت کے ساتھ بعض بنیادی اسلامی عقائد کا ذکر بھی آ گیا ہے، اور اس کا لحاظ بھی ہے کہ اس کی مشق سے بچوں کا تلفظ درست ہو، شروع میں علم کی اہمیت اور مسلمانوں کی تعلیم سے غفلت کا ذکر بھی ہے، لیکن اس کا نام نونہال تخلیقی اکیڈمی کے بجائے نونہال تربیتی یا تعلیمی اکیڈمی رکھنا چاہئے تھا، خلق و تخلیق صرف خدا کی شان ہے، افسوس کہ ترقی پسندوں کے اثر سے اسلام پسند حضرات بھی ان لفظوں کو خدا کے بجائے عام انسانوں کے لئے استعمال کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے،

بچوں کی نظمیں، از جناب جگن ناتھ آزاد، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۸، قیمت ۲ روپیہ، پتہ:- ترقی اردو بورڈ نئی دہلی

ترقی اردو بورڈ نے بچوں کے ادب کی متعدد کتابیں شائع کی ہیں، اب اس نے اردو کے مقبول شاعر اور ادیب و مصنف جناب جگن ناتھ آزاد کی نظموں کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، وہ اکابر ہی کی طرح بچوں کیلئے اچھی نظمیں کہنے میں شہرت رکھتے ہیں، امید ہے کہ بچے اپنی دلچسپی اور پسند کی ان رنگ برنگی نظموں کو شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے،

ض

... کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوش سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبہ ہائے صدارت، ان کی دوسری تقریروں تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ اُن کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت :- ۲۵ روپے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوا اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلی نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی انہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل، اور مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں،

طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپیہ،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت :- ۳۰ روپیہ

"منیجر"

[illegible]

[illegible] بزم تیموریہ [illegible]

[illegible] کے [illegible] ہندوستان [illegible]

تذکرہ مصنف کے قلم [illegible] سے بہتر [illegible]
دوسرے [illegible] صحت [illegible] اس کو [illegible] اٹھائے ہوئے کہیں کہیں
بہت [illegible] ہیں [illegible] کی سہولت کے لیے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا
اس میں [illegible] شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق [illegible]
کی تفصیلات بہ دلچسپ انداز میں جمع کی گئی ہیں کہ [illegible] سلطنت تیموریہ [illegible]
[illegible] بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع [illegible]
کے سامنے آجاتا ہے۔ پہلی جلد میں [illegible] سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور
ان کے دربار کے امرا، شعرا اور فضلا کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر
روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہان اور ان کے دربار کے امرا کی علم دوستی
اور ان کے دور کے شعرا، ادبا و فضلا [illegible] کمال کے تذکرہ [illegible] کے علمی کمالات
[illegible] رقعات [illegible] عالمگیر [illegible] آخری دور کے [illegible] فرمانروا
اور شاہ ظفر وغیرہ اور تمام تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں [illegible] بیگم [illegible] جہاں آرا
[illegible] صاحب [illegible] زیب النسا بیگم وغیرہ [illegible]
[illegible] کارناموں پر روشنی ڈالی ہے [illegible] قیمت [illegible] روپے [illegible] ۱۲ روپے

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمن

[illegible]